[illegible]

کراچی

Karachi Foundry & Engineering Co.

KAKA STREET - LAWRENCE ROAD

KARACHI - 3

Telephone : **31108** *Cable* : **'CASTINGS'**

Government Approved Contractors and Builders . . .

ARCHITECTS AND ENGINEERS



Experts For . . .

- SEWERAGE
- WATER SUPPLY
- R. C. C. WORKS

Famous for Construction of Modern Style Residential and Commercial Buildings





Leading Manufacturers of

— o —

R. C. C. Pipe Machinery

—: o :—

Letters Scales

—: o :—

Measures Weights

—: o :—

Wire Nails

—: o :—

All types of C. I. Specials

—: o :—

Sluice Valves
Fire Hydrants

—: o :—

Manhole covers & frames

—: o :—

Soil Pipes

—: o :—

Steel Windows & Grills
and
General Steel Fabrication

ENCOURAGE PAKISTAN PRODUCTS TO BUILD THE NATION STRONG

Please Contact Personally Or On Telephone For Your Requirements.

رجسٹرڈ نمبر 82037

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ماہنامہ مہر نیمروز کراچی

اپریل سنہ ۱۹۵۹ء

جلد ۴ شمارہ ۱

ادارہ:-

حسن مثنیٰ ندوی

علی اکبر قاصد

کشفی

مقام اشاعت:-

(۱) ۲۶/۲ بہار ہاؤسنگ سوسائٹی۔ ہاؤسنگ یونین ایریا، کراچی ۵

(۲) دفتر رسالہ مہر نیمروز، کوئی روڈ صدر —— کراچی ۳

قیمت:-

سالانہ:- مبلغ چھ روپے (۶/-)

ششماہی:- مبلغ تین روپے چار آنے

فی رسالہ:- آٹھ آنے (۸/)

حسن مثنیٰ ندوی ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر نے ... پریس میں چھپوا کر ۲۶/۲ بہار ہاؤسنگ سوسائٹی ... [illegible]

اس شمارے میں

پہلی کرن

از عشق ہویدا شد این نکتہ کہ من ہستم

یہ مصرعہ بلکہ پورا شعر اس قدر زبان زد ہے کہ آپ نے بھی اس کو بارہا سنا ہوگا، بارہا پڑھا ہوگا اور طرح طرح سے
ں کے مزے لئے ہوں گے، پورا شعر یوں ہے ؎

در بود و نبود من اندیشہ گمانہا داشت
از عشق ہویدا شد این نکتہ کہ من ہستم

"میرے ہونے نہ ہونے کی نسبت لوگوں کی فکر خام نے بھی کیسی کیسی قیاس آرائیاں نہ کر ڈالیں، (خدا انکا بھلا کرے)
عشق کی طرف سے نکتہ یہ بے نقاب ہوا کہ میں ہوں"

شاعر کے اس شعر میں "من" سے مراد چاہے حقیقتِ مقیدہ رہی ہو یا حقیقتِ مطلقہ، مہر نیمروز کی زبان میں تو یہ حقیقت بالکل
یقت واقعہ ہو گئی ہے:-

ہوا یہ کہ پہلے رسالہ میری غیر حاضری و علالت کی وجہ سے دو تین بار بے وقت اور بے ترتیب نکلا، اس کے بعد ایک قانونی
ہ کی زد میں آ گیا۔ چاند گہن، سورج گہن بھی تو ایک نکتے ہی کی زد ہے، یہ ایک مکمل چوک تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ مطلع غبار آلود ہو گیا
ر کیا تھا؟ اندیشے اور گمان! ——— کسی نے اسے مرحوم و مغفور سمجھا، کسی نے ہمدردی و غمگساری کو ایک فریضہ جانا،
ر کسی نے یہ سوچا کہ لاؤ اس کا نام ہی اچک لو، آخر دنیا میں آفتاب رائے بھی تو کتنے ہی ہو گذرے ہیں، اور سورج بنسیوں کی بھی
ئی کمی نہیں رہی ہے، کیا ضروری ہے کہ یہ جہانتاب کسی ایک کا ہو کر رہے!

لیکن حق تو یہ ہے کہ مہر نیمروز یا تو ایک اسد اللہ غالب کے نام کے ساتھ وابستہ تھا، یا پھر آج اس "مومن مبتلا" کے نام صادق
جو لوگ مہر و دل کے تپتے تھے ان کو اس ابتلا کا بڑا غم تھا اور وہ بڑے درد سے کہتے تھے کہ ؎

ہائے مومن شہادت بے اجر — بہر وصل صنم قتیل ہوا
تھا عجب کوئی آدمی مومن — مر گیا کیا ہی نوجوان افسوس

حالانکہ عشق میں مرنا کوئی بات نہیں، ایک پرانی ریت ہے،

مرے ہے عشق میں جب تک نہ ہو ادا — بلائے جاں ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا
خدا کو یاد دلاتے تھے نزع میں احباب — ہزار شکر کہ اس دم وہ بدگماں نہ ہوا

بہر حال ان تمام باتوں کے باوجود مومن مبتلا اپنے ندیموں غمگساروں کو برابر یقین دلاتا رہا کہ بھئی

میں ایک سخت جان ہوں مگر دو گھڑی پوچھو

بلکہ

موت تک زندگی کا وقفہ ہے　　یعنی آگے چلیں گے دم لیکر

البتہ یہ ضرور ہے کہ ع

تم نکلے بہر سیر تو نکلا ماہ نیمروز بھی

تو واقعی دیکھ لیجئے کہ ماہ نیمروز گہن سے نکل آیا ــــــ اور اپنی کائنات از سر نو اس کی خاطر ہمہ تن متوجہ اور مستعد ہو گئی :-

اب اس کے انتظامی معاملات ایک نہایت ہی تجربہ کار بزرگ کے سپرد کر دیئے گئے ہیں پچھلے دنوں ادارت کی ادبی سرگرمیوں کا انتظامی معاملات پر بڑا اثر ڈالا تھا مگر اب امید قوی ہے کہ ادبی سرگرمیاں انتظامی معاملات پر کسی پہلو سے بھی اثر انداز نہ ہونگی اور نظام علمی میں آئندہ کوئی فرق نہیں آنے گا۔ رسالہ ہر ماہ وقت پر اپنے چاہنے والوں کے ہاتھوں میں ہوگا اور ہم سے بھی زیادہ ان کو خوشی ہوگی کہ

اے ذوق کسی ہمدم دیرینہ کا ملنا　　بہتر ہے ملاقات مسیحا و خضر سے

پچھلے تین سال کے عرصے میں ماہ نیمروز نے تنقید و تخلیق پر ادب و تاریخ پر، تہذیب و ثقافت پر، علم و فن اور قانون و معاشرہ پر یک رنگیوں کی زندگی اور اس کی بوقلمونیوں پر اپنے خصوصی انداز میں فکر انگیز باتیں پیش کی ہیں اور یاران نکتہ داں کے فہم و فراست کو اک صلائے عام کی صورت میں طرح طرح سے چھیڑا ہے ــــــ اور اس لطیف چھیڑ کو بالعموم آپ کی نظروں میں بھی مرتبہ حاصل رہا ہے ــــ جس پر ہم بجا طور سے اک سرور کی سی کیفیت اپنے دل میں پاتے ہیں کہ

تحسین سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا

ہمیں یقین ہے کہ یہ مرتبۂ قبول اس کو برابر حاصل رہے گا بلکہ آپ کا تعاون اس کے حسن و خوبی اور افادیت میں اضافہ کرے گا۔

کلیم الدین احمد

اقبال کا نظریۂ فن

یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی فنکار تو ہو مگر فن کی ماہیت کا اسے علم نہ ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تخلیق کے مراحل بھی اس کی سمجھ میں نہ آئیں۔ وہ کام کرتا ہے خاص ڈھنگ سے کرتا ہے۔ لیکن وہ شاید یہ نہ بتا سکے کہ ایک خاص ڈھنگ سے کیوں کرتا ہے۔ اتنا تو وہ ضرور جانتا ہے کہ اس کے عمل کا رخ صحیح ں کی رگ و پے میں ایک احساس دوڑتا رہتا ہے کہ چیز "بس ایسی" ہونا چاہیئے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس میں خفیف سا بھی اگر کچھ تغیر ہوا تو چیز و جائیگی۔ لیکن ان باتوں کا سبب وہ ہمیں نہیں بتا سکتا۔ البتہ نقاد اسے بڑی آسانی سے بتا سکتا ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ تخلیق کا مادہ تنقید ے سے بالکل مختلف ہے، یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں۔ بلکہ بسا اوقات تو ان میں فرق کرنا بھی دشوار ہوتا ہے۔ عموماً ید فنکار کے تحت الشعور میں اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ وہیں فنکار کی قوت تخلیق کی تربیت کرتا ہے۔ اور صحیح رستے پر لگاتا ہے۔ لیکن فنکار کو اس کی خبر ں ہوتی۔ اس لئے بہت ممکن ہے کہ خود فن کے متعلق کسی فنکار کے خیالات کوئی قدر و قیمت نہ رکھتے ہوں۔ کسی دوسرے شخص کی طرح وہ بھی غلطی ۔ اس کے خیالات بھی غیر متعین اور محدود سے ہوں۔ بلکہ سراسر غلط ہوں، بات بالکل واضح ہے کہ اس مخصوص جماعت کی اکثریت کبھی فن پر غور و فکر رتی، یا کرتی بھی ہے تو اپنے خیالات کو ظاہر نہیں کرتی۔ اگر کسی نے کچھ ظاہر بھی کیا تو اسکی صورت چند منتشر و پراگندہ جملوں یا مہمل بے جوڑ باتو ہوتی ہے۔ اور یہ باتیں بھی اغلباً باریک گہری اور بیش قیمت نہیں ہوتیں۔ آرٹسٹ اپنے فنی کارناموں کی تخلیق میں کچھ ایسا منہمک رہتا ہے ہیں اتنا خون جگر اس کا صرف ہو جاتا ہے۔ کہ وہ اپنی پوری توجہ تنقید کی طرف مبذول ہی نہیں کرتا۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کام میں تو دیگر اد ماً بھی کم و بیش کامیاب ہو سکتا ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ جب تنقید کا کام کوئی ایسا شخص اپنے ذمے لیتا ہے جس کے اندر قوت تخلیق بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے تو وہ تنقید اعلیٰ درجے کی ہوتی ہے اور عظیم المرتبت ہوتی ہے۔ تخلیق اور تنقید دو علیحدہ چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی تے کے دو رخ ہیں۔ دنیا میں ہر شے اگر مکمل ہوتی تو پھر سب سے بڑا فنکار سب سے بڑا نقاد بھی ہوتا۔ لیکن یہ دنیا اور دنیا کی چیزیں ناقص ہیں عموماً ایک اچھا فنکار اچھا نقاد نہیں ہوتا۔

فرض کیجئے کوئی فنکار تنقید سے بالکل ہی بے بہرہ ہو، پھر بھی وہ اگر کچھ تنقیدی خیالات ظاہر کرتا ہے۔ تو ہم ان خیالات سے بھی ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس کی ذات سے تعلق رکھنے والی ہر چیز سے ہمیں دلچسپی ہوتی ہے۔ یہ کچھ انسانی فطرت کا تقاضہ ہے کہ ہم شخصوں کے کارناموں کی ہیئت چیزی اور حسن و خوبی کے سمجھنے بوجھنے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ چاہتے یہ ہیں کہ "ساری" ہی باتیں معلوم ہو جائے وہ غیر متعلق ہی کیوں نہ ہوں، ایڈیسن کہتا ہے "میں نے دیکھا ہے کہ کسی کتاب کے پڑھنے والے کو کتاب کے [illegible]

پیدا نہیں ہوتی جب تک اسے یہ نہ معلوم ہو کہ اس کا مصنف کالا ہے کہ گورا، خوش مزاج ہے یا تند خو، شادی شدہ ہے یا غیر
دہ بلکہ اور بھی کچھ اسی قسم کی معلومات جن سے مصنف کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس لئے بالوں کی وضع قطع اور اس کی ناک کی تراش
سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے، حتیٰ کہ ہم یہ تک جاننے کے لئے بے چین رہتے ہیں کہ اسے لباس کس قسم کا پسند ہے، اس کے کتنے بچے ہیں۔ یہ
کی بات نہیں ہے۔ کہ فن کے ساتھ ساتھ دوسری اور بہت ساری چیزوں کے بارے میں ہم اس کے خیالات جاننا چاہتے ہیں، فن
ت، اس کی قدر و قیمت، نظام زندگی میں اس کا خصوصی مرتبہ و مقام، ان تمام چیزوں پر وہ جب روشنی ڈالتا ہے۔ تو چاہے اس
ت بہت زیادہ روشن اور تابناک نہ ہوں۔ مگر ہم ان سے لطف اٹھاتے ہیں، ہمیں کچھ امید سی ہوتی ہے کہ وہ تخلیق کے مختلف مراحل
سے آشنا کریگا، ان دشواریوں سے آگاہ کریگا جو فنکار کو پیش آتی ہیں، یہ بتائیگا کہ وہ کس کس طرح ان کو عبور کرتا ہے، ان
یزوں پر نئی روشنی ڈال کر وہ ہماری معلومات میں اضافہ کریگا۔ کم سے کم وہ اپنے تخلیقی کارناموں کے سمجھنے میں ہماری مدد کر سکتا
ں بتا سکتا ہے کہ یہ کارنامے اس کے نزدیک کتنے معنی خیز اور قیمتی ہیں۔

نظری اعتبار سے کہہ سکتے ہیں کہ فنکار فن کی ماہیت سے واقف ہونے کا سب سے زیادہ حقدار ہے لیکن حقیقت کچھ اور ہی ہے فنکار کی
کچھ ایسی دشواریاں حائل ہیں۔ کہ وہ منزلِ مقصود تک مشکل ہی سے پہونچتا ہے، وہ اگر کسی فلسفہ زندگی کا حامی ہے تو پھر دشواری اور
اس کا فلسفہ ہے۔ اس کا مخصوص فلسفہ اس کے سارے خیالات کو اور تخیل کو ایک خاص رنگ میں رنگ دیتا ہے، وہ ہر شے کو اپنے
مائد و تصورات کی روشنی میں دیکھنے لگتا ہے۔ اگر فنکار اور فلسفی مرادف الفاظ نہیں ہیں۔ نہ ہر فنکار کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ کوئی مخصوص
و متعین فلسفۂ حیات بھی پیش کرے، وہ تو صرف اپنے ذاتی، حسین تجربات کا اظہار کرتا ہے، ایسے تجربات جو بیش بہا اور عدیم المثال ہو
ایسی چیزوں کا بیان کرتا ہے جن کو وہ کسی خاص لمحے میں دیکھتا اور محسوس کرتا ہے، ایسی چیزیں جو نایاب حسن اپنے اندر رکھتی ہیں۔ اور فطر
تی ہیں۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ ایک فنکار کوئی فلسفہ حیات بھی پیش کرے اور یہ فلسفہ مختلف اعتبارات سے اس کے لئے معین و مددگار
ت ہو سکتا ہے یعنی اس کے فنی کارناموں کو یگانگت اور موزونیت بخشنے والا۔ ان کو ایک کامل سالمے (کل) میں منسلک و مربوط کرنے
س کی انشا کو انفرادی اور پرزور بنانے والا لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہی فلسفہ سدِّ سکندر کی طرح اس کی راہ میں حائل بھی ہو
۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنے لئے صرف انھیں چیزوں کو چن لیتا ہے۔ جو اس کے خیالات کے نظام میں آسانی سے سما سکتی ہوں اور
سما سکتیں انھیں مسترد کر دیتا ہے، چند چیزوں کو لے لیتا ہے باقی سے کنارہ کش ہو جاتا ہے، اس کے تصور میں یہ وسعت نہیں
ہ ساری چیزیں اس میں سما جائیں۔ اس کا دماغ کیا ہے! گویا جنگل کے بیچ میں کوئی مختصر سا مرغزار۔ کہ اس مرغزار میں ہر شے
سے رکھی ہے۔ ہر چیز صاف صاف نظر آتی ہے۔ ایک موزوں آرائش ہے۔ کم و بیش ایک مکمل تنظیم ہے۔ ہر شے گویا اپنے نظام میں ترتیب
استہ ہے۔ باقی اُن بے شمار چیزوں کی اُسے کوئی خبر نہیں جو اس کے ارد گرد "جنگل" میں موجود ہیں، اس کے علاوہ فن کو وہ
ے فلسفے کا خادم بنا لیتا ہے۔ فن حصول مقصد کا ایک ذریعہ بن جاتا ہے، وہ اس آئینہ میں اپنے فلسفے کی عکاسی کرتا ہے، اور ستم تو
کہ وہ فن، فن کی ماہیت، فن کے مقاصد اور فن کا خصوصی مقام وغیرہ ساری چیزیں اپنے فلسفے کی "ضروریات" کو مدِ نظر رکھکر
رتا ہے۔

اقبال ایک فنکار ہیں، اور ان کے نظریۂ فن کو ان کے فلسفے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ان کے نظریۂ فن پر بحث کرنے سے پہلے
ری ہے کہ ان کے تنقیدی رجحانات و خیالات کو کم و بیش موزوں اور مختصر صورت میں پیش نظر رکھا جائے۔ اقبال کچھ کہنا چاہتے ہیں،

فطرت نقالی کی پیروی کرسکتا ہے، کمزور اور بیکار قسم کی نقالی ہی اس کی ساری کائنات ہوگی، فن اور تخلیق مترادف ہیں، اور فن الفرادی داخلی قسم کا ہوتا ہے۔ وہ حسن جسے فنکار تلاش کرتا ہے کوئی خارجی حقیقت نہیں، فنکار کی ذات سے الگ اس کی کوئی ہستی نہیں ہوتی جو فنکار کی روح میں ہوتا ہے۔ بقول "کولرج اے ولیم" ہمیں تو وہی چیز واپس ملتی ہے۔ جو ہم اپنے فیض سے عطا کرتے ہیں۔ ہماری ہی سے فطرت کی زندگی ہے۔ وہ فنکار جو فطرت کے آگے سر تسلیم خم کرلیتا ہے۔ گویا خود اپنی موت کا حکم صادر کرتا ہے۔ ایسا فنکار فطرت کی نامکمل ہی پیش کرسکتا ہے اس کی عکاسی سرد اور بے جان ہوگی، حقیقی فنکار فطرت کی حدود کو وسیع تر کرتا ہے وہ فطرت کے خزانوں میں اور زیادہ زریں چیزوں کا اضافہ کرتا ہے اس کے کارنامے فطرت کے کارناموں سے بھی زیادہ اچھے، زیادہ حسین اور زیادہ مکمل ہوتے ہیں وہ ایک نئی اور زیادہ حیرت انگیز دنیا بناتا ہے، اور یہ نئی اور حیرت انگیز دنیا اس کی اپنی زندہ اور زندگی بخش روح کا کرشمہ ہوتی ہے روح کا جو ابدیت کی حامل ہے۔ اور جس کی پہنائیوں کی کوئی حد نہیں، وہ فنکار خوشنمائی اور بدنمائی، اچھائی اور برائی کو دیکھتا ہے۔ اور کی مکمل تصویریں بناتا ہے، بناتا بھی ہے اور مٹاتا بھی ہے۔ ساری پرانی، بیکار اور بھدی چیزیں فنا ہو جاتی ہیں اور ایک نئی، زیادہ زیادہ حسین دنیا اسی خاکستر سے پیدا ہو جاتی ہے۔

فن حقیقی فن، بغیر آزادی کے کبھی پھول پھل نہیں سکتا کیونکہ فنکار کی روح غلام کے جسم میں کبھی زندہ نہیں رہ سکتی، غلامی گویا کی چنگاری کو، روح کو بجھا دیتی ہے، غلام اپنی قوت ایجاد کھو بیٹھتا ہے، اس سے قوت تخلیق سلب ہو جاتی ہے۔ وہ ہر نئے پن، زندگی جدت سے نفرت کرتا ہے۔ اور صرف پامال ہی رستے پر چلتا ہے۔ کوئی زندہ، بلند و برتر اور بلندی بخشنے والا فن غلاموں کی قوم میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور غلامی کا دوسرا نام ہے موت۔ غلاموں کی موسیقی میں زندگی کی آگ نہیں ہوتی، قوت، سکت اور بل کے بدلے غلامی اپنے ساتھ نا امیدی لے آتی ہے، وسیع ترین پیمانے پر پھیلی ہوئی مسرت و سرخوشی ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاتی ہے، اندوہ و نا امیدی اس کا نغمہ ہیں اور نام زندگی کے بدلے موت، مصوری کا بھی یہی عالم ہوتا ہے، مصور بھی نہ تو نئے نقشے اور مرقعے بنا سکتا ہے، نہ پرانے نقشوں اور مرقعوں کو سکتا ہے، وہ بھی زندگی کے بدلے موت ہی کا پیغام بر ہوتا ہے۔

فن سیل رواں کی طرح تیز و تند اور سر بلند و سرکش ہے، ایسا سیلاب ہے جو ساری آلائشوں کو بہا لیجاتا ہے۔ اور ہمیں ایک نئی زندگی بلندی اور وسعت نظر بخشتا ہے۔ یہ ایک لطیف دیوانہ پن ہے۔ اک آگ ہے جس کا ایندھن فنکار کا قیمتی خون ہے، فن۔ ہر فن۔ خیز ہوتا ہے اور یہی معنی خیزی، اس زور، اس گرمی کا سبب ہے جس سے اس کے بنائے ہوئے پیکر، احساس زندگی کی شدت سے کپکپا ہیں، اقبال کہتے ہیں جو تاج محل کو دیکھو جب وہ چاندنی کی ملائم روشنی میں موتی کی طرح چمک رہا ہو، پھر تمہیں فن، اصلی فن، کا راز معلوم جائیگا۔ تم اس عشق کا بھید پا لوگے جو پاک ہے، معطر و معنبر ہے اور ایک ابدی و جاودانی نغمہ ہے۔ تمہیں ایسا عشق نظر آئیگا جو حسن اور کی قدر و منزلت کو سمجھتا ہے، جو حسن کو ظاہر بھی کرتا ہے۔ اور مستور بھی، وہ عشق جو زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے عشق ہمارے جذبات کو بخشتا ہے، معمولی سے معمولی چیزوں کو بھی قدر و منزلت عطا کر دیتا ہے عشق کے بغیر تو زندگی غم و الم کا مسکن ہے، بدصورت سے بد عشق بدصورتی و بدنمائی کو حسن و جمال میں تبدیل کر دیتا ہے، شیرینی، حلاوت اور نور عطا کرتا ہے، عشق سے تخیل گرم جوش و گرم گو کر اٹھتا ہے اور حسین سے حسین نقشے بنانے لگتا ہے مرقعے تیار کرنے لگتا ہے، عشق ہی سب کچھ ہے اور ما سوائے عشق کچھ بھی نہیں۔

عشق اور عقل، فلسفہ اور فن، (یا شاعری) اقبال کا محبوب موضوع ہے۔ عشق ہمیں براہ راست منزل مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔ اور عقل بھول بھلیاں میں خود گم ہو جاتی ہے۔ فلسفہ سے حقیقت عیاں ہے جس میں کوئی شک نہیں موجود نہیں، حالانکہ یہ [illegible] [illegible] آتی ہے، لہٰذا عقل جس سے دنیا [illegible] عشق کا [illegible] ہے، یہ عشق ہی کا [illegible]

ابدیت و جاودانی کا راستہ مشاہدۂ عقل کائنات کے اسرار و رموز کا انکشاف تو کرتی ہے اور کر سکتی ہے لیکن ہمیں روحانی تشفی اس سے نہیں ہوتی لیکن ہمارے دل کو صرف عشق سے ہوتی ہے۔ یہ ہماری حماقت ہے جو ہم عشق کے بدلے عقل کی پیروی کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ آفتاب کو لیکر نہیں تلاش کیا جاسکتا ہے کہ عقل شیطان کی ودیعت ہے، اور عشق کا ذمہ دار انسان ہے۔

اقبال شاعر تھے اور شاعری کے موضوع پر انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کافی تفصیل سے اردو اور فارسی اشعار میں کیا ہے شاعری اہمیت اور اہمیت، شاعر کے اوصاف، شاعر کے فرائض، اس کی ذمہ داریاں، ان تمام عنوانات پر انھوں نے بار بار اظہار خیال کیا ہے۔ لازمی تھی، اور اس تکرار کی وجہ بھی آسانی سے سمجھ میں آتی ہے۔ یہ خیالات اکثر ان کے دماغ میں چکر لگاتے رہتے تھے اور وہ ان کے نزدیک اہم تھے۔ وہ ان کو بار بار الٹ پلٹ کر دیکھتے تھے اور معمولی معمولی تغیر کے ساتھ بار بار دہراتے تھے۔ یہ خیالات جنکی وہ تکرار کرتے ہیں نہیں لیکن کافی دلچسپ ہیں۔ شاعر کو جیسے ایک مقدس اضطراب لاحق ہے، یہی اضطراب یہی بے اطمینانی اور کسی ایسی چیز کی، وتمنا جو کبھی میسر نہ آسکے اور حسرت کی یہی آگ جس میں وہ پڑا تپتا اور جلتا رہتا ہے، شاعری ہے۔ شاعر کی روح بے چین، تیز و تند اور بلند نہ ہوتی ہے۔ اسے قناعت و آشتا سے کوئی واسطہ نہیں، حسین ترین چیز سے بھی اسے کامل تشفی نہیں ہوتی، وہ ہمیشہ ایسی چیز کا جویا ہے جو مل نہیں سکتی اور یہ اچھا بھی ہے کیونکہ حصول مقصد کے معنے ہیں موت۔ حصول سے روح اور اس کی وجہ زندگی ختم ہو جاتی ہے بھی ہاتھ آجائے تو یہ روح زندہ نہیں رہ سکتی۔ پھر اس کی زندگی کی ضرورت ہی باقی نہ رہیگی تکمیل کی تمنا، وہ اندرونی احساس اور وہ اندر ہی اندر بھڑکتی رہتی ہے بجھ جائیگی۔ تو اچھا ہے۔ جو منزل ہمیشہ دور رہتی ہے۔ اور وہ انعام کبھی ہاتھ نہیں آتا۔ اصل چیز سفر ہے ہیں۔ اور سفر بھی ایسا جو کبھی ختم نہ ہو، شاعر کا دل کبھی سیراب نہیں ہوتا۔ وہ پروانے کی طرح ستارے کا طالب ہے۔ اور رات کی طرح ا۔ وہ مصیبت بھری دنیا سے دور بسنے والی کسی شے کا پرستار ہے۔ کوئی خوبصورت پھول اسے مل جائے تو وہ مطمئن نہیں ہو جاتا۔ خوب تر اور حسین تر پھول کی تمنا سے معمور ہو جاتا ہے، اگر آسمان کے تارے توڑ کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے جائیں۔ تب بھی وہ قانع ہو ہو جاتا، بلکہ چاند کا تقاضا کرنے لگتا ہے کسی محدود شے کے حصول پر اس کی مسرت محض سرسری اور آنی ہوتی ہے۔ اس کا دل تو کسی ایسی تنائی ہے جس کی کوئی حد نہ ہو، کوئی انتہا نہ ہو،

یہ دنیا، اور اس دنیا کی حسین، شاندار، حیرت انگیز و بیش بہا چیزیں بھی شاعر کی نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔ کیونکہ وہ اپنے کے جادو سے بات کی بات میں ان سے بھی زیادہ حسین اور بیش بہا دنیا تعمیر کر سکتا ہے، وہ حسن کا پجاری ہے وہ حسن کی تخلیق بھی کر سکتا معمولی سے معمولی چیز کو بھی غیر معمولی اور حیرت ناک بنا دیتا ہے۔ وہ بیک جنبش بدنمائی کو حسن و خوبصورتی میں تبدیل کر دیتا ہے، وہ کی ان دیکھی بھالی چیزوں کو کچھ ایسی عجیب شان اور ایسی چمک دمک بخش دیتا ہے۔ جو اس دنیا میں تو موجود نہیں، شاعر اس زمین بے نیاز کسی فلک نشان پہاڑ کی بلند چوٹی کی طرح ستاروں سے باتیں کرتا ہے، اور اپنے دامن میں بسنے والوں کے لئے پیغام بھی لاتا ہے زندگی اور حیات جاوید کا پیغام۔

شاعر کو پوری طرح سے سمجھنا ممکن نہیں، وہ ایک تپتی تلملاتی ہوئی روح ہے، جو کبھی نہ بجھنے والی آرزو کی آگ میں پڑی دہکتی رہتی ہے۔ شاعری اسی شعلہ زن آرزو کا نام ہے۔ لیکن اس حقیقت کے سامنے جس کو شاعر ظاہر و بے نقاب کرتا ہے، الفاظ کی کوئی وقعت نہیں غیر حسین، ناقص اور محدود ہونے کی وجہ سے روح کی بے پناہ وسعت و پہنائی پر حاوی اور محیط ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ الفاظ سے جذبات و احساسات کے لطیف تر نازک اور پیچیدہ نقوش کو پوری طرح اجاگر کہاں کرتے ہیں۔ بلکہ اکثر حجاب ہی بن جاتے ہیں شاعر جو کچھ پیش کرتا ہے وہ دراصل اس کے لطیف احساسات کا ایک ناقص عکس ہوتا ہے۔

شاعر کے اوصاف خصوصی اسے عام سطح انسانی سے بلند تو کر دیتے ہیں لیکن ہے وہ انسان ہی ۔ اور انسانوں ہی سے گفتگو کرتا ہے ۔ وہ الگ تھلگ
رہتا ہے پھر بھی انسانیت سے یک قلم علیحدگی اختیار نہیں کر سکتا ۔ وہ شعاع خورشید بن کر کسی پہاڑ کی چوٹی پر نہیں جا بستا ۔ نہ ستارہ
ہی فلک بوس مینارے پر جا بیٹھتا ہے ۔ اسے تو بہرحال اپنی پرواز بلند سے پلٹ کر نیچے آنا ہے ۔ اور نیچے والوں ہی سے باتیں کرنی ہیں وہ
بستی کا فرد ہے اور اہم ترین فرد ہے ۔ اپنی کبھی نہ ختم ہونے والی جستجو اور اپنی شعلہ زن آرزو کی وجہ سے وہ گویا ایک " دل " ہے ۔ جو اپنی
اور متوازن دھڑکنوں سے ہمیں زندگی بخشتا ہے زندہ رکھتا ہے ۔ مردہ ہے وہ قوم جس میں کوئی شاعر نہیں ، شاعری آفرینش ہے ، مگر وہ
پیش ، ایسے مردوں کی نہیں جن کی زندگی کا دار و مدار صرف سانس کی آمد و شد پر ہو ، بلکہ اُن مردوں اور جوانمردوں کی جو حقیقی معنوں میں
ہوں ، جنکی نبضوں میں کائنات کی موزوں اور متوازن رفتار والی دھمک جاری ہو ۔ اسی لئے جو شاعر ایسے جوانمرد پیدا کرتا ہے ۔ وہ
مرتبے کرد " کی فہرست میں داخل ہے ۔ مگر جو قوم آزاد نہیں ، جو قوم مردہ ہے ، اس میں بہت سے شعر گو ایسے پائے جاتے ہیں جو قوم
اور نئی سے نئی زنجیریں بناتے رہتے ہیں ۔ اور زندگی چنگاری کو سلگتے ہی بجھا دیتے ہیں ۔ یہ شعر گو مردہ ہیں ۔ اس لئے زندگی کے
سے آگاہ نہیں ، یہ بدی کو اچھائی ، نقصان کو نفع اور بدصورتی کو حسن سمجھتے ہیں ، یہ پھولوں کو چھو لیتے ہیں تو پھولوں کی خوشبو جاتی رہتی ہے
کے قریب جاتے ہیں تو بلبل اپنا نغمہ بھول جاتی ہے ، ان کی " عطا " ایسی خواب آور دوا ہے کہ ہم زندگی کی جد و جہد سے غافل ہو جاتے
یک ایسا زہر ہے جو ہماری قوت و توانائی کو تحلیل کر دیتی ہے ختم کر دیتی ہے ۔ اور پھر ہمارے گیتوں میں کچھ اس قسم کی چیزیں داخل
ہیں جیسے ـــــ " زندگی کا حاصل موت ہے ، پھر زندگی کو غرق محنت کیوں رکھا جائے . . . . . ۔ ان بکھیڑوں سے تو الگ ہی رہنے
ہی سے جنگ کرنے میں بھلا مسرت کہاں ؟ بڑھتی ہوئی طوفانی موجوں کے ساتھ ہو کر آگے بڑھنے میں سکون کہاں نصیب ؟ دیکھو ہر
آرام میسر ہے ؟ ہر چیز اپنی اپنی جگہ سکون کے ساتھ موت سے ہمکنار ہو جانے کے لئے تیار ہوتی رہتی ہے ، ساری چیزیں اپنے وقت
کی عمر کو پہنچتی ہیں ، گرتی ہیں اور فنا ہو جاتی ہیں ، کاش ہمیں بھی یہ آرام طویل ، یا موت ، یہ مرگ سیاہ یا خوابوں سے بھری ہوئی راحت
ملے ۔ اس قسم کے شاعروں کو برق و رعد پر کوئی دسترس حاصل نہیں ، اس کا باغ ، باغ عدن نہیں ، سراب ہے ۔ یہ جس حسن و جمال
کی ہے اس کو حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ، یہ اپنی روح کی جلن اور تپش سے مجبور ہو کر نہیں لکھتا ۔ اس کے پہلو میں وہ شعلہ بیتاب
، وہاں تو ایک مضغۂ بیجان ہوتا ہے ، یہ اپنے ہموطنوں کے اندر کوئی نئی روح نہیں پھونکتا ، یہ تو ناپائدار شہرت اور محض بے ثبات
ود چاہتا ہے ، اس کے گیت مہمل اور بے کار ہوتے ہیں ۔ یہ گیت وہ ہیں کہ قافلہ گذر چکا ہے ، یا سارے اہل قافلہ مر چکے ہیں ۔
کا کوئی سننے والا باقی نہیں ، یہی سبب ہے کہ ان گیتوں میں کوئی اثر نہیں ہوتا ۔ اور نہ کبھی ہو سکتا ہے کیونکہ یہ غزل خوان یہ معنی
اضطراب مقدس ، اُس تڑپ ، اور اس آتش نفسی سے محروم ہے جس سے شعر میں جان پیدا ہوتی ہے ۔ اور جس کے ذریعے ایک شاعر
اپنے عصر کے لوگوں میں ایک نئی روح پھونک دیتا ہے ، ایک بہتر اور برتر زندگی کی تڑپ عطا کر دیتا ہے ۔

اقبال لکھتے ہیں کہ ہمارے ملک کو ایسے نام کے شاعروں کی ضرورت نہیں جو بظاہر حسین لیکن بیکار نغمے رو رو کر گاتے ہیں ، اور
سا کو اور زیادہ غمناک کر دیتے ہیں اور جو موت و ہلاکت و تباہی کے نقوش کو مٹاتے نہیں ، ایسے شاعر بیکار ہی صرف نہیں بلکہ
راہ نجات میں حائل ہونے والے پتھر ہیں ۔ آج دنیا کو ایسے شاعر کی ضرورت ہے جو زندگی اور امید کا پیغام لائے ، ایسا
جو چنگاریاں پیدا کرے ، ایسی چنگاریاں جو بڑھ کر دہک کر بھڑک کر گلخن بن جائیں ، شعلے ہی شعلے اور آگ ہی آگ ــــ ایسا
شاعر جو قوم کو خواب مرگ سے جگاتا ہے ان کے جمود کو توڑ کر انہیں وحدت فکر کے رشتے میں پروتا ہے اور جرأت و عزم کے
ساتھ منزل کی سمت مستقبل کی طرف بڑھاتا ہے ، اقبال خود اسی قسم کے شعراء کے حلقے میں داخل ہونا چاہتے تھے ، وہ اکثر اپنی

شاعری کا ذکر کرتے ہیں اور بار بار اپنے مقصد پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ ان سے اقبال کے کارناموں اور ان کی اہمیت کے سمجھنے میں
ملتی ہے ۔ اِن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے خیال میں موجودہ زمانے میں شاعر کے فرائض کیا تھے ۔ اقبال لکھتے ہیں کہ ہم
زمانے میں شاعری بے اثر ہو گئی ہے ، یہ بیکار سی ایک چیز ہو گئی ہے ، ایک طویل مرثیہ بن گئی ہے ۔ وقت آگیا ہے کہ کاہلی سے اور
کی محبت سے ہم دست بردار ہو جائیں ۔ ایک ایسے طوفان کی ضرورت ہے جو ساری آلائشوں سے ہمیں پاک   شاہین
بلند پرواز و باہمت بن جاؤ ۔ برق کی طرح تیز اور رخشاں ، پھر پیکار زندگی کے لئے تیار ہو جاؤ ۔ پرانے ، از کار رفتہ ، مہمل نغ
ختم کر دو اور نئے اور مفید نغمے سناؤ ۔ لیکن تمدنی اور مذہبی روایات سے منہ نہ موڑو بلکہ نیا آشیانہ اپنی پرانی ہی دیکھی بھالی
پہچانی شاخ پر بناؤ ۔ یہ ہے اقبال کا پیغام ، مگر تغیر و تبدیل نئے لوگوں کو جگانے والے کسی پیغام کے بغیر کبھی ممکن نہیں ، اقـ
ملٹن کے ہمنوا ہیں کہ " میری نظروں میں ایک طاقتور اور شاندار قوم کی تصویر پھرتی ہے ۔ ایسی قوم جو کسی طاقتور آدمی کی طرح
اٹھی ہو اور اپنے شکست نا آشنا پرچم کو لہرا رہی ہو ۔ میرے سامنے ایک بہادر ، جوان شاہین ، دوپہر کے چمکتے سورج سے
ملا رہا ہے ، اپنی بینائی کے سوتوں کو نور کے ابدی سرچشمے سے پھر سیراب کر رہا ہے " ، اقبال ایک پیغام لائے ہیں ۔ اور محسوس
ہیں کہ یہی پیغام بیداری کا سبب بنے گا ، ان کو احساس ہے کہ ان کا دل رازِ حیات سے آگاہ ہے اور وہ دنیا کو اس راز سے آشنا
ہیں ۔ وہ ایک نئی غیر فانی زندگی کا پیغام لائے ہیں لیکن لوگ نہ سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں نہ شاعر کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں ،
نظمیں ان کا خونِ جگر ہیں ، ان کا لختِ دل ہیں جس کو وہ اپنے زمانے والوں کے سامنے بڑی محبت سے پیش کرتے ہیں ، لیکـ
اِن کو سمجھ نہیں پاتے ۔ فلسفے اور عشق کا اتحاد و امتزاج بڑا مشکل کام ہے ، مگر یہ مشکل کام انھوں نے اپنے ہاتھ میں لیا ۔ اور
کرتے ہیں کہ اس مہم میں وہ کامیاب بھی ہوئے ۔ ان کا فلسفہ محض چند بے جان خیالات کا مجموعہ نہیں ۔ انھوں نے اس فلسفے
اپنی رگ رگ میں محسوس کیا ہے اور بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے اس لئے امید کرتے ہیں کہ دوسرے بھی اسی طرح محسوس کر
وہ عشق جو اُن کے دل میں جاگزیں ہے ۔ اور وہ عشق جس کی بدولت وہ سکون نا آشنا ہو گئے ہیں ، الفاظ کے آئینے میں جلوہ گر
اور اِن کا نظموں کے جھین پردے سے اِن کا عشق بیتاب صاف چمکتا دمکتا نظر آتا ہے ۔ شعلۂ عشق کی لپیٹ وہ اپنے دل میں
کرتے ہیں مگر یہ نہیں معلوم کہ " یہ آیا کہاں سے " اس دنیا میں ساری چیزیں فانی ہیں ، انسان موت کے بعد اسی خاک میں مل جاتا
سے پیدا ہوا ہے لیکن یہ عشق اسے بتاتا ہے کہ یہاں ایک ایسی چیز بھی ہے جو خاک سے نہیں بنی ، جو فانی نہیں ہے ، جو "الہ
ہے ، جس کی تعلیم پرواز ہے ، گو خود قفس کی بے بسی نہیں ، اقبال اسی عشق کے گیت گاتے ہیں ، البتہ ان کی باتیں صاف صاد
ہوتیں ، بلکہ استعاروں میں ہوتی ہیں ، وہ بڑے رنگین نقوش بناتے ہیں ، ان کے معانی اُبلی تلواریں نہیں ، چھپی برچھیاں
اقبال اکثر شاعر کے نام سے بھی انکار کرتے ہیں ، فلسفہ ان کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور وہ جن فلسفیانہ خیالات کو قیمتی سمجھ
ان کا اظہار کرتے ہیں ، وہ کہتے ہیں کہ میں شاعر نہیں ہوں ، شاعری کو محض اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا ہے ، مجھے جو کچھ کہنا ہے
شعر کی صورت میں پیش کرتا ہوں تاکہ مختصر ، موثر ، پرزور اور دلنشیں پیرائے میں یہ خیالات پیش ہوں ، میں شاعری نہیں کرتا
فن کے لطیف نکات سے واقف نہیں ، اس قسم کے جملے اکثر ان کے ہاں ملتے ہیں " یہ ہے اقبال کا نظریۂ فن ، اور یہ ہیں شاعر
اِن کے خیالات ، وہ نقاد نہ تھے ، اس لئے وہ نقادوں کے طریقوں سے واقف نہیں ۔ فن کو پوری طرح سمجھنے کے لئے اس سے علیحدگ
کرنی پڑتی ہے ورنہ پہلے سے اگر کوئی تصور ذہن میں موجود ہو تو پھر غلطی کا احتمال ہے ۔ کیونکہ فلسفہ ، خصوصاً وہ فلسفہ جو کا
اور زندگی کے اسرار کو فاش کرنا چاہتا ہے خیالات کو ایک خاص رنگ میں رنگ دے گا ۔ اور پھر ویسی رنگ سارے خیالات دیا

بیگا۔ پہلے سے قائم کئے ہوئے تصوّر کی روشنی میں فن کو سمجھنا اور اس کے اسرار سے واقف ہونا دشوار ہے؟ اقبال فلسفی ہیں یا اسے لو
کہ وہ چند فلسفیانہ خیالات پھیلا کر پیش کرنا چاہتے ہیں اس لئے وہ فن کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں، وہ فن کو فلسفۂ خودی
ہونا چاہتے ہیں، یہاں مجھے اقبال کے فلسفۂ خودی، اس کے معنے اور اس کی اہمیت سے بحث نہیں؛ یہ سمجھنا بھی کچھ مشکل نہیں کہ اقبا
نظریۂ فن کو اپنے خیالات کے نظام میں جگہ کیوں دی، لیکن نتیجہ تشفی بخش نہیں: "شاعری، موسیقی، سیاسیات اور مذہب، ہر چیز
قدر و قیمت یہی ہے کہ وہ ہماری خودی کو برقرار رکھیں ورنہ ان کی وقعت خواب و خیال سے زیادہ نہیں۔ خودی کے اسرار سے جو لوگ آگاہ
وہ اپنی جادو بھری قوت سے ایک چشمے کو بحرِ ذخار بنا سکتے ہیں، خودی ہی سے ہماری زندگی روشن اور تابناک ہے، زندگی کیا ہے خودی
نہ، خودی کا شعلہ، خودی کا "ہونا" اسی خودی نے شاعری اور موسیقی کی یہ دنیا بنائی اور بسائی ہے" یہ چند مثالیں نہیں، ہر جگہ
اسی قسم کے خیالات نظر آتے ہیں، ظاہر ہے کہ اقبال کے نظریۂ فن میں ان کے فلسفۂ خودی کی پوری آمیزش ہے۔

افسوس ہے کہ اقبال نے اپنے تنقیدی خیالات نثر میں ظاہر نہیں کئے۔ شعر کو تنقید کا ذریعہ بنانا کچھ زیادہ موزوں نہیں، اس صورت
خیالات کو صفائی اور اختصار کے ساتھ پیش کرنا ناممکن ہے، الفاظ صحیح طور پر استعمال نہیں ہوتے، روزمرہ کی گفتگو میں ہم اپنے خیالات کو
و کاست پیش نہیں کرتے، اس کا ہمیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہماری باتیں کچھ غیر متعین سی ہیں، اور تنقید میں ضروری ہے کہ خیالات صاف
ف ظاہر کئے جائے تاکہ غلط فہمی کا کوئی احتمال باقی نہ رہے۔ لیکن نقاد عموماً اس کا خیال نہیں رکھتے اسی لئے زیادہ تر تنقید صحیح معنوں میں
تنقید نہیں ہوتیں۔ بلکہ ہماری غیر متعین ذاتی رایوں کا غیر متعین اظہار ہوتی ہیں اور شعر کی صورت میں یہ نقص زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے، فنی
تقاضے کی ضرورتوں کو مد نظر رکھ کر الفاظ کا استعمال ہوتا ہے تو صاف صاف اور بے کم و کاست اظہار خیال کا لحاظ نہیں رہتا، پھر
ری کرنے کی خواہش اور مشکلیں پیدا کر دیتی ہے، کوئی حسین لفظ، کوئی نیا استعارہ، کوئی دلچسپ نقش، غول بیابانی بن جاتا ہے اور
و کو سرگرداں و پریشان کر دیتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی اچھے شعر تو نکل آتے ہیں لیکن اچھی تنقید نہیں ملتی۔ اقبال کی نظموں پر نظر
نے سے جن میں انھوں نے تنقیدی خیالات نظم کئے ہیں، یہ بات ظاہر ہو جائیگی کہ جس قسم کی زبان وہ استعمال کرتے ہیں وہ سائنٹفک
کے لئے موزوں نہیں کیونکہ صحت بیان اس میں ممکن نہیں، یہ زبان رنگینی و تخئیل کی حامل ہے لیکن غیر متعین بھی ہے۔ یہ تو ہر شخص پر
ہے کہ اقبال کچھ کہنا چاہتے ہیں، انھوں نے کچھ غور و فکر کیا ہے، اور جن نتیجوں تک وہ پہونچے ہیں ان کو دوسروں تک پہونچانا چاہتے
لیکن صاف ستھرے منطقی اور رساٹنٹفک بیان کے بدلے ان کے یہاں لطیف رنگین شاعرانہ اور غیر متعین بیانات ملتے ہیں۔

فلسفیانہ رنگ آمیزی سے قطع نظر، جو لوگ مغربی تنقید سے آگاہ ہیں ان کو اقبال کے خیالات نئے معلوم نہیں ہوں گے۔ اقبال
ہر خیال کے لئے کوئی مغربی مثال پیش کرنے کی ضرورت تو نہیں ہے، لیکن شیلی کے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے دیکھئے کہ مشابہت و
لت کس قدر نمایاں ہے:۔

"شاعری الوہیت کی حامل ہے، یہ علم کا مرکز بھی ہے اور دائرہ بھی، اس کوزے میں سارے سائنس بند ہیں اور ہر سائنس شاعری
اسر لیس ہے...... شاعری عقل نہیں جسے ہم اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکیں، دنیا میں جو چیزیں حسین ترین ہیں۔ ان کو
ری ابدیت و جاودانی بخشتی ہے...... الوہیت کا جلوہ جو انسان کے اندر ہوتا ہے اس کو شاعری فنا ہونے سے بچاتی ہے......
۔ شاعری سارے خیالات کو حسین بنا دیتی ہے، یہ حسین چیزوں کے حُسن کو اور دوبالا کرتی ہے اور بد نمائی کو حسن میں تبدیل
تی ہے...... جس چیز کو بھی یہ مس کرتی ہے اسے بالکل بدل دیتی ہے...... ہر شے کی زندگی، دیکھنے والے پر منحصر
...... شاعری ہمیں ایسی دنیا میں لیجا کر بسا دیتی ہے جس کے مقابلے میں یہ جانی پہچانی دنیا بے ڈھنگی سی معلوم ہوتی ہے

...... یہ ہماری آنکھوں سے پردہ اٹھا کر زندگی کے حیرت انگیز حسن کا جلوہ دکھاتی ہے...... کسی عظیم قوم کی، اور اس کے خیالات اور نظم و نسق کے اندر حسین تغیر پیدا کرنے میں، یہ شاعری ایک نقیب، ایک رفیق اور پیرو کار کا کام کرتی ہے...... شعراء سمجھ میں نہ آنے والے وجدان کے حامل ہیں، وہ ایک آئینہ ہیں جس میں مستقبل اپنا عکس "حال" میں ڈالتا ہے اور ایسے الفاظ ہیں جو ماورائے فہم حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں، وہ فوجی ترانہ دموسیقی کی طرح جنگ پر ابھارتے ہیں لیکن اپنے پیدا کردہ ولولہ و جوش کو محسوس نہیں کرتے، وہ لوگوں کو متاثر تو کرتے ہیں لیکن خود متاثر نہیں ہوتے، وہ عالم کے فرماں رواں ہیں جنھیں دنیا تسلیم نہیں کرتی۔

شاہ عطا الرحمن کاکوی

غلطیہائے مضامیں مت پوچھ

اب ذرا جناب نیاز[1] کے بعض ارشادات عالیہ و نظریات بالغہ کا جائزہ لینا چاہتا ہوں، وہ خود کو صرف شاعر اور نقاد ہی نہیں بلکہ استاد بھی سمجھتے ہیں اور بے تکلف دوسرے شعراء کے کلام پر اصلاحیں دے دیتے ہیں ۔ انھوں نے نہ صرف اصغر، جگر، نوح، سیماب، وحشت وغیرہ کے کلام پر اصلاحیں دی ہیں بلکہ غالب کے بھی بعض اشعار میں ترمیم پیش کی ہے، اقبال بھی اس سے محفوظ نہیں رہے۔

غالب کا ایک شعر نسخہ حمیدیہ میں ہے ؎

خور شبنم آشنا نہ ہوا ورنہ میں اسد ✽ سرتا قدم گذارش ذوق سجود تھا

جناب نیاز فرماتے ہیں کہ" ذوق سجود بے محل معلوم ہوتا ہے کیونکہ آفتاب شبنم کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے ۔ ممکن ہے ذوق صعود ہو"۔ انہوں نے یہ غور نہیں کیا کہ صعود و نزول کا لفظ نہیں ۔ خور اور شبنم تو محض استعارے کے الفاظ ہیں شعر کا مفہوم ۔ تو صاف ہے کہ میں سراپا ذوق سجود ہو رہا ہوں لیکن محبوب اس پر بھی میری طرف ملتفت نہیں ہوتا ۔ سجود کا لفظ ہرگز بے محل نہیں۔

سیماب کا ایک شعر ہے ؎

اپنا رشتہ نغمہ سنجان چمن سے جوڑ کر ✽ جمع کر دشت و دمن کا افتخار منتشر

جناب نیاز فرماتے ہیں کہ،، ہو سکتا ہے کہ کوہ و دمن لکھ کر کوہ و دامن کوہ مراد لیں لیکن تنہا دمن کوئی لفظ نہیں ۔ دمن دامن کا مخفف ہے جس سے دامن کوہ مراد ہے ۔ یہاں دمن تنہا استعمال نہیں ہوا بلکہ دشت کے ساتھ استعمال ہوا ہے ۔ اقبال فرماتے ہیں ؎

دشت بہ کاشمر کشا کوہ و تل و دمن نگر ✽ سبزہ جہاں جہاں ببیں لالہ چمن چمن نگر

دشت بمعنی صحرا اور دمن یعنی دامن کوہ ۔ دشت میں بھی تو کوہستان ہوتا ہے ۔ گرچہ " کوہ " کا لفظ استعمال نہیں ہوا لیکن جب دمن سے دامن کوہ مراد ہے تو کوہ کا تخیل خود بخود سامنے آجاتا ہے کیونکہ کوہ کے بغیر دامن کوہ کا وجود نہیں ہو سکتا ۔ میں اس وقت فارسی شعراء کے کلام سے " دشت و دمن " کی ترکیب کی سند نہیں پیش کر سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ اس میں کوئی خرابی نہیں۔

اقبال کا ایک شعر ہے ؎

عالم جوش جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ ✽ کہئے کیا حکم ہے دیوانہ بنوں یا نہ بنوں۔

---

[1] نگار ستمبر ۱۹۵۲ء [2] نگار نومبر ۱۹۴۲ء

اس شعر پر نیاز صاحب کی تنقید یہ ہے "پہلے مصرع میں جب جوشِ جنوں یعنی جوشِ دیوانگی کا اعتراف کر لیا گیا تو پھر دیوانہ نہ بننے کا سوال باقی ہی نہیں رہتا۔ ہاں اگر یہ کہا جاتا کہ کہئے کیا حکم ہے دیوانہ رہوں یا نہ رہوں" تو البتہ درست ہو سکتا تھا۔ علاوہ اگر مصرعہ بدستور رکھا جائے تو پھر پہلے مصرعہ میں لفظ جنوں نہ ہونا چاہئے۔ یہ مصرعہ یوں ہو سکتا تھا ؎

عالمِ جوشِ محبت میں سبھی کچھ ہے روا

حالانکہ لفظ عالم دونوں مصرعوں میں بے ضرورت ہے" اصلاح نیاز صحیح نہیں۔ "عالمِ جوشِ جنوں" کہنے سے یہ بات کہاں ظاہر ہوتی ہے کہ شاعر حالتِ جنوں میں ہے۔ وہ تو صرف یہ کہہ رہا ہے کہ جب جنوں طاری ہوتا ہے تو اس عالم میں ہر چیز روا ہو جاتی ہے۔ آپ کا کیا دیوانہ بنوں یا نہ بنوں۔ شعر اسقام سے پاک ہے اور اصلاح نیاز سے بے نیاز۔

جگر کی ایک غزل نگار میں شائع کر کے جناب نیاز نے اس پر تبصرہ فرمایا، مطلع ہے ؎

ہر قدم لاکھ نشیب آئے سہی طوفانوں کے ✤ حوصلے پست نہ ہونگے کبھی دیوانوں کے

اس پر نیاز صاحب رقم طراز ہیں کہ "شعر کے پہلے مصرعہ میں ہر قدم کے بعد "پر" لانا ضروری ہے"[۲] لیکن میرا خیال ہے کہ ضروری نہیں، سند میں یہ شعر پیش کرتا ہوں ؎

غالب ۔ ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے ✤ میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

ذوق ۔ ہر قدم پاؤں میں سر کھتے ہیں خارِ سرِ دشت ✤ اے جنوں تو نے تو کانٹوں میں گھسیٹا مجھ کو

جگر کا دوسرا شعر ہے ؎

موجِ مے، رنگِ شفق، لالہ و گل، مطلعِ صبح ✤ چند عنواں ہیں مرے شوق کے افسانوں کے

اس پر نیاز صاحب کا ارشاد ہے کہ "تیسرے ٹکڑے کی ترکیب باقی تین ٹکڑوں سے علیحدہ ہے، اس کی ترکیب بھی اضافی ہونا چاہئے تھی (نفی؟) مطلع صبح میں کافی آورد و تصنع ہے۔ یہ مصرع یوں ہونا چاہئے ؎

موجِ مے، رنگِ شفق، نکہتِ گل، نورِ سحر

دوسرے مصرع میں عنواں میں اعلان نون ضروری تھا مگر اس کا لحاظ نہیں کیا گیا"[۳] لیکن میرا خیال ہے کہ عنواں میں اعلان ضروری نہیں، سند ملاحظہ ہو ؎

داغ ۔ خط نہ آیا جو وہاں سے تو نہ آئے لے داغ ✤ نامہ بر زندہ پھر آئے کہ عنواں اٹھا۔

ذوق ۔ اسکی مشک پہ سیر اور نگار رخ مرقوم ✤ کریں آنکھوں پہ رقم قوس قزح کا عنواں۔

ذوق ۔ اور اگر یہ نہیں مضموں تو کسی مہوش کی ✤ زلف پہ گل ہے دیا کاکل عنبر افشاں۔

ذوق کا پہلا شعر تو سند میں پیش کیا گیا ہے اور دوسرا شعر محض اس لئے دیا گیا ہے کہ عنواں بہ سکون نون عنبر افشاں کا ہے۔ رہ گیا پہلا اعتراض تو اسکے متعلق یہ عرض ہے کہ اصلاح مناسب تو ہے لیکن جو اصول تحریر فرمایا گیا ہے صحیح نہیں۔ ذوق کے مصرع ملا

۱۔ نگار ۔۔ ۱۹۵۰ء ۲۔ نگار ۔۔ ۱۹۵۲ء ۳۔ نگار ۔۔ ۱۹۵۳ء

(۱) = برگ گل تر، لالۂ احمر، سرو و صنوبر، نرگس شہلا

(۲) = مرغ خوش الحان، ابر برستاں، بہر گل بستاں، خورم و خنداں

جگر کا تیسرا شعر ہے ؎

زندگی جس سے عبارت ہے محبت زندہ   وہ سکوں صرف ہے آغوش میں طوفانوں کے

نیاز صاحب فرماتے ہیں کہ "دوسرے مصرعے میں سکوں میں اعلان نون ضروری تھا۔ عام قاعدہ ہے کہ فارسی کے تمام مفرد الفاظ جو نون پر ختم ہوتے ہیں ان میں اعلان نون ضروری ہے لیکن مضاف الیہ کی صورت میں اعلان نون ناجائز ہے۔" لے

میرا خیال ہے کہ مفرد فارسی الفاظ جو نون پر ختم ہوتے ہیں ان میں اعلان نون ضروری نہیں۔ اسناد ملاحظہ ہوں ؎

ذوق = بیتابی دل لفظوں میں کیا آئے کہ ہر حرف ؛ دکھلا رہا گاہ ہے حرکت گاہ سکوں ہے

داغ = کہتا ہے ناصح کرو دوا مجھکو تپش میں ہے مزا ؛ کس طرح ہو دل کو سکوں وہ دیکھے میں یوں کہاں

اقبال = سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں ؛ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

کیا نیاز صاحب کے ارشاد کے مطابق فارسی الفاظ مثلاً بیان، مکان، نشان، آسمان، کاروان، پاسبان، دربان، گمان، یقین، حسین، زمین، آستین، افسون، محزون وغیرہ اگر مجرد استعمال ہوں تو اعلان نون ضروری ہے؟ اس عجیب و غریب نظریئے کے خلاف ایک دو دس بیس نہیں سیکڑوں مثالیں موجود ہیں جن میں طوالت کے خوف سے انہیں نظر انداز کرتا ہوں۔ اب رہا یہ خیال کہ مضاف الیہ کی صورت میں اعلان نون ناجائز ہے میں اس خیال کی تائید کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں ایک بات سمجھ میں نہیں آتی مضاف الیہ کی صورت میں تو اعلان نون ناجائز ہے لیکن ایسے الفاظ جو مرکب ہیں۔ ان میں اعلان نون کیوں ہوگا۔ اسکو بھی ناجائز ہونا چاہیئے۔ مگر سکو کیجیے کہ داغ و امیر نے خط زدہ مرکب الفاظ کو بہ اعلان نون استعمال کیا ہے ؎

امیر = ہر قدم پر برنگ نقش قدم ؛ دم ترے ناتوان لیتے ہیں۔

" = نہیں ساقی یہ قلقل مینا ؛ ہچکیاں ہم جان لیتے ہیں۔

" = دہن زخم چومتے ہیں وہ تیغ ؛ کیا مزے بے زبان لیتے ہیں۔

داغ = منزل شوق طے نہیں ہوتی ؛ تھکیاں ناتوان لیتے ہیں۔

" = تیرے خنجر سے بھی تو اے قاتل ؛ نوک کی نوجوان لیتے ہیں۔

" = اچھی کہی کہ غیر کے گھر تک ذرا چلو ؛ میں آپکا نہیں ہوں نگہبان جائیے

نیاز صاحب فرماتے ہیں کہ "تنہا لفظ چشم بغیر کسی ترکیب کے آنکھ کے معنی میں اردو ادب میں کہیں نظر نہ آئیگا یعنی یہ کبھی نہ کہینگے کہ اسکی چشم اچھی ہے۔" نثر میں تو نہیں لیکن نظم میں چشم کا استعمال بغیر کسی ترکیب کے بکثرت نظر آتا ہے۔ میں ہر شاعر کے کلام سے اسکی سند پیش کر سکتا ہوں۔ اختصار کے خیال سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

میر : جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے ؎ اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے
قائم : جب موج پہ اپنی آ گئی چشم ؎ دریا دریا بہا گئی چشم
جرأت : اس چشم پہ آنکھ پڑتے دل نے یہ کہا ؎ جادو برحق ہے کرنے والا کافر
ذوق : گردش ہے اسکی چشم کی کیوں تیرے دل کے گرد ؎ کافر کو کام کعبے کے ہے کیا طواف سے
غالب : بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب ؎ چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا!
امیر : زلف سنبل سرو قد غنچہ دہن عارض سمن ؎ چشم نرگس گوش گل کانٹے ہیں مژگانِ بہار
داغ : نرگسی چشم ہے بلا کی شوخ ؎ شوخ بھی اور انتہا کی شوخ
شاد : اے چشم رات دن تجھے رونے سے کام ہے ؎ ملتے ہیں دونوں وقت ذرا تھم کہ شام ہے

ڈاکٹر عندلیب شادانی کا ایک شعر ہے ؎

گریباں میں ہیں اور کچھ پھول بالوں میں سجائے ہیں ؎ چمن کو لوٹنے والے گلستاں بن کے آئے ہیں

نواب آفر لکھنوی "نشاط رفتہ (شادانی) پر تنقید کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ "میرا دعویٰ ہے کہ یہ شعر اس زمانے محبوب کی تصویر نہیں ہو سکتا۔ گریباں میں پھول ہونا پرانے زمانے کی ایک رسم تھی جب عورتیں انگیا میں پھول رکھ لیتی تھیں" اس پر جناب نیاز نے حاشیہ میں یہ نوٹ تحریر فرمایا کہ "اس شعر کی شان نزول کے متعلق خود ڈاکٹر صاحب نے یہیں لکھنؤ کے ایک ادبی اجتماع میں فرمایا تھا کہ ایک بار انکے یہاں بعض احباب مدعو تھے جن میں چند خواتین بھی تھیں انہوں نے صحن باغ درختوں سے پھول توڑ توڑ کر اپنے آپ کو سنوارنا شروع کیا اور جب جانے لگیں تو بے ساختہ یہ شعر شادانی صاحب کی زبان گیا اس لئے سب سے بڑا نقص اس شعر میں یہ ہے کہ "گلستاں بن کے آئے ہیں" کی جگہ "گلستاں بن کے جاتے ہیں" ہونا چاہئے چمن کو لوٹنے سے پہلے پھول نہ انکے گریباں میں تھا نہ بالوں میں"۔[1]

لیکن خود شادانی صاحب نے اپنی کتاب "تحقیقات" میں اس شعر کی شان نزول یہ بیان کی ہے کہ کسی صاحب جو میونسپل کمشنر تھے گارڈن پارٹی تھی۔ خواتین نے میزبان کی اجازت سے پھول توڑ توڑ کر اپنے اپنے بالوں اور گریبانوں کو سجایا اور اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئیں۔ اس وقت شادانی صاحب نے برجستہ یہ شعر سنایا جس پر سارا مجمع جھوم گیا۔ اگر یہی واقعہ ہے تو نیاز کا اعتراض رفع ہو جاتا ہے۔

اثر صاحب نے اپنی مندرجہ بالا تنقید میں شادانی صاحب کا یہ شعر بھی درج کیا ہے ؎

یہ قمقمے ہیں نور کے کہ آسمان کے تارے ہیں ؎ بہار کے طلسم نے زمیں پر اتارے ہیں

اس پر نیاز صاحب کی تنقید ہے کہ "آسمان بہ اعلان نون چاہئے" لیکن شواہد اس کے برعکس ہیں کہ ہر شاعر نے لفظ آسمان بہ اعلان نون استعمال کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

---

[1] [illegible]

میر ۔ ہم کبھو غم سے آہ کرتے تھے !! ٭ آسماں تک سیاہ کرتے تھے
غالب ۔ ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے ٭ بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا
غالب ۔ نوید امن ہے بیداد دوست جاں کے لئے ٭ رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لئے
مومن ۔ نہ ربط اس سے نہ یاری آسماں سے ٭ جفا بہر عدو لاؤں کہاں سے
ذوق ۔ ہزار لطف ہیں جو ہر ستم میں جاں کے لئے ٭ ستم شریک ہوا کون آسماں کے لئے
آتش ۔ زمیں چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا ٭ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
امیر ۔ زمیں کو ہم سے غبار آسماں ہم سے خلاف ٭ نہ ہم زمیں کے لئے ہیں نہ آسماں کے لئے
داغ ۔ یا رب بنا دے تو اسی صورت کا اور کچھ ٭ اس آسماں سے تنگ ہیں یہ آسماں نہ ہو

اسی مضمون میں شادانی صاحب کے اس مصرع پر ؎

شمع تھی کہ بجھ گئی پھول تھا بکھر گیا

اثر صاحب نے یوں اصلاح دی ہے ؎ شمع تھی کہ بجھ گئی گل تھا جو بکھر گیا۔ اس پر نیاز صاحب کا نوٹ حاشیہ میں ہے۔ "تھا دب کر ادا ہوتا ہے اور اس محل پر اس کا دبکر نکلنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔" میں پوچھتا ہوں کہ کون شاعر ایسا ہے جس نے "تھا" استعمال کیا ہو اور استعمال میں الف نہ دب گیا ہو۔ ایسی ایسی سخت قیود جناب نیاز ہی کو مبارک ہوں۔ جواز کی مثال سنئے ؎

غالب ۔ دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجا ٹھنڈا ٭ نالہ کرتا تھا و لے طالب تاثیر بھی تھا
داغ ۔ مست تھی آنکھ تری دل تھا ہمارا بیخود ٭ ہم نے دونوں کو دم معرکہ غافل دیکھا
ذوق ۔ آپ آئینۂ ہستی میں ہے تو اپنا حریف ٭ ورنہ یاں کون تھا جو تیرے مقابل ہوتا
امیر ۔ دل کو اُس زلف کا لازم تھا تصور اتنا ٭ کہ دھواں آہ کا بھی عنبر سارا ہوتا

شادانی صاحب کے اس شعر کے دوسرے مصرع پر اثر صاحب نے اصلاح دی ؎

شادانی ۔ ناداں ہی ہو کے بھی ناداں نہیں ہیں ہم ٭ خود ہم نے جان جان کے کتنے فریب کھائے
اصلاح اثر ۔ ناداں ہی ہو کے بھی ناداں نہیں ہیں ہم ٭ خود ہم نے جان بوجھ کے کتنے فریب کھائے

اور جناب نیاز نے یہ نوٹ تحریر فرمایا ہے کہ "پہلے مصرع میں دونوں جگہ ناداں کو باعلان نون نظم ہونا چاہئے" نیاز صاحب یہ نظریہ بھی صحیح نہیں۔ جواز کی مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

سودا ۔ اس باغ میں نے ناداں تیرا کہ مزہ کیا ہے ٭ پاؤں سے جو تو خوں میں ہے سر بسر آلودہ
ناسخ ۔ [illegible] ہو ناسخ ٭ ناداں نہیں دنیا میں کوئی تم سے زیادہ
ذوق ۔ [illegible] سے نکل ٭ دیکھ پچھتائیگا تو یہ ساقط ناداں [illegible]

مومن ـ لاکھ ناداں سبھی کیا تجھ سے بھی ناداں ہوگئے

شاد ـ یہ نہیں کہتا ہیں اے دل وصلِ جاناں ہے محال ٭ کیوں ڈراتا ہے ناداں گفتگو مشکل میں ہے

داغ ـ ناداں ہے دوست کچھ خبرِ نیک و بد نہیں ٭ مجھ بیگناہ پر یہ ستم جس کی حد نہیں

نگار اپریل و مئی ۱۹۵۵ء میں کسی صاحب نے لفظ "نغمگی" کی صحت و عدم صحت کی بحث چھیڑ دی تو جناب نیاز نے جواز کے خلاف فتویٰ دیا۔ انکی دلیل یہ ہے کہ "گی" کا لاحقہ ہمیشہ اسم صفت، اسم فاعل اور اسم مفعول کے ساتھ ہوتا ہے نہ اسم کے ساتھ، اس لئے نغمگی کا استعمال ناجائز ہے۔ لیکن غالب، نظیری اور عرفی نے غنچہ سے غنچگی، نظارہ سے نظارگی، قطرہ پیمانہ سے پیمانگی اور پردہ سے پردگی کا استعمال کر کے ان ترکیبوں کا جواز ثابت کر دیا ہے۔ واضح رہے کہ یہ سب الفاظ نہ اسم صفت بلکہ محض اسم ہیں۔ بلکہ پروانہ سے پروانگی بھی مستعمل ہے ؎

غالب ـ گل غنچگی میں غرقۂ دریائے رنگ ہے ٭ اے آگہی فریب تماشا کہاں نہیں

〃 ـ کو یک شرر کہ ساز چراغاں کروں اسد ٭ بزم طرب ہے پردگی سوختن ہنوز

〃 ـ لذت تقریر عشق پردگی گوش دل ٭ جوہر افسانہ ہے عرض تحمل ہنوز

〃 ـ تکلف بر طرف نظارگی ہیں بھی سہی لیکن ٭ وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

〃 ـ از دہر قطرگی ست کہ در خود گمیم ما ٭ اما چو دار سیم ہماں قلزمیم ما

عرفی ـ چناں ز لطف تو نظارگی ہجوم آورد ٭ کہ عارض تو نہ بینم ز ازدحام نگاہ

نومبر ۱۹۵۵ء کے نگار میں شفا گوالیاری کے مجموعۂ غزل "نبض حیات" پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب نیاز نے انکے اس

چلے تو ہیں تلاش آستاں میں اے شفا ہم بھی ٭ مگر اپنا ہی پہلے سنگ در آیا تو کیا ہوگا

یہ اعتراض صادر فرمایا ہے کہ "تلاش کا استعمال اضافی صورت میں محل نظر ہے کیونکہ تلاش بہ معنی جستجو ہندی ہے۔ مصرع یوں ہونا چاہئے "چلے ہیں جستجو آستاں میں اے شفا ہم بھی"۔ اگر لفظ تلاش بہ معنی جستجو ہوتا تو اساتذہ اسے ترکیب کے ساتھ ہرگز استعمال نہ کرتے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

سودا ـ تلاش خضر بہر منزل مقصد نہ کر سودا ٭ کوئی خود رفتگی سے راہبر بہتر نہیں ہوتا

میر ـ تلاش دل نہیں کام آتی اس زنخ میں سے گئے ٭ کہ چاہ میں تو ہے مرنا پڑا اشتا ور کا

آتش ـ عدم سے جانب ہستی تلاش یار میں آئے ٭ ہوئے گل ہم کس وادی پر خار میں آئے

مومن ـ ہجر بتاں میں مجکو ہے مومن تلاش قبر ٭ تم پر حرام خوار تو کل نہ ہو سکا

غالب ـ ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لئے ٭ وحشت کدۂ تلاش دیدنے کے لئے

لطف یہ ہے کہ ایرانی شعرا بھی تلاش بہ معنی جستجو استعمال کرتے تھے چنانچہ عرفی شیرازی کا شعر ہے ؎

شاہد عصمت تلاش بحث من سے کے کند ٭ خون حیض دختر رز چو شد از لبہائے من

سید عبدالقدوس ہاشمی

انجم مانپوری

بالآخر ۲ر اگست ۱۹۵۸ء کو انجم صاحب کا ان کے وطن شہر گیا صوبہ بہار میں انتقال ہوگیا، موت نے کسے چھوڑا ہے جو انہیں چھوڑ دیتی، بڑی عمر پائی سال سے تقریباً ۷ سال عمر ہو چکی تھی، آخر کبھی نہ کبھی تو مرنا ہی تھا، لوگ بالآخر مر ہی جاتے ہیں۔ وہ بیچارے بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔

بات کوئی عجیب سی تو نہیں ہے۔ مگر کیا کیا جائے کہ دل روئے بغیر نہیں مانتا، بڑی خوبیوں کے اور نہایت یار باش آدمی تھے، اور میرا تو ایک تک رات دن کا ساتھ رہا تھا۔ انجم صاحب کیوں نہ یاد آئیں گے۔

جب سے ہوش سنبھالا اپنے شہر اور اپنے ضلع میں انجم صاحب کا نام ایک کامیاب اور دولتمند کاروباری کی حیثیت سے سنتا رہا، کبھی خیال بھی نہ آیا کہ یہ تعلیم یافتہ ادیب اور شاعر بھی ہوں گے طویل ملاقات کا کبھی موقع نہ ملا تھا۔ پھر ہماری اور ان کی عمروں میں تفاوت اتنا تھا کہ انہیں اپنے بزرگوں ہی کا ست سمجھتا رہا۔ اپنا دوست سمجھنے کی جرأت اور ایسے ادبی کہاں کر سکتا تھا، ہمارے ہاں شرفا کی تہذیب یہ تھی کہ ندوہ سے فاضل کا امتحان پاس کر لینے باپ ہو چکنے کے بعد بھی بڑے بھائی یا ماموں جان کے سامنے پان کی ایک گلوری منہ میں ڈالنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ بزرگوں کے ملنے والے ہی سمجھے جاتے تھے۔ اس لئے انہیں اپنا بزرگ ہی سمجھا کیا۔ اگر انجم صاحب کو کبھی دیکھا بھی تو اپنے رشتہ کے ماموں مشہور لیڈر قاضی احمد حسین صاحب (موجودہ ایوان بالا، بھارت) کے ساتھ۔

اپریل ۱۹۳۱ء میں قاضی صاحب کا پیغام مجھے مخدوم پور ضلع گیا میں ملا کہ شہر میں آکر ملو۔ تعمیل میں حاضر ہوگیا، وہاں احمد ماموں اور محمد ماموں دونوں کے سامنے مجھے انجم صاحب سے ملایا گیا۔ اور حکم دیا گیا کہ شہر گیا سے ایک ماہوار ادبی رسالہ ندیم کے نام سے جاری کروں، البتہ دیا جناب انجم صاحب کا شاندار خوبصورت مکان اس کا دفتر ہوگا، اور میرا قیام بھی وہیں رہے گا۔

استاذ محترم علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو دار المصنفین جانے کے لئے لکھ چکا تھا، اس لئے اس نئی تجویز کی اطلاع انہیں دی اور وہاں سے منتقل ہو جانے پر میں نے دار المصنفین جانے کا خیال ترک کر کے ندیم کی ادارت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ رسالہ ندیم نکلا اور بڑی شان سے نکلا، گیا میں کوئی اچھا پریس نہ تھا بھائی سید منظر علی ندوی مرحوم کے بہتی پریس پٹنہ میں رسالہ چھپتا تھا اور گیا سے شائع ہوتا تھا۔ نفیس کتابت عمدہ طباعت، بہترین کاغذ خوبصورتی اور تصویروں سے مزین ماہوار ۸۰ صفحات پر نکلتا تھا۔ مضامین کے اعتبار سے بھی رسالہ خاصا اچھا ہوتا تھا۔ انجم صاحب اس کے مالک، مدیر اعزازی کسان کا معین و مددگار۔ انتظامی کام ایک منیجر منشی محمد یعقوب کے سپرد تھے اور مولا بخش جبرائی ادارت و انتظام دونوں میں شریک تھا۔

نومبر ۱۹۳۱ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد مجھے عربی مخطوطات پر کام کرنے کیلئے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں بلا لیا گیا اور اس بزم ادب سے دور جا پڑا، اس کے بعد بھی ان سے مراسلات کا سلسلہ اب تک جاری رہا اور جب کبھی میں بہار جاتا تو ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں سال

ندیم انہوں نے میرے چلے جانے کے بعد بھی آب و تاب کے ساتھ جاری رکھا۔ اور کئی سال کے بعد اسے مولانا سید ریاست علی ند
کر دیا۔ پھر کئی ہاتھوں سے گزر کر یہ رسالہ پٹنہ سے نکلنے لگا۔ اور شاید اب حال ہی میں بند ہو گیا۔

۱۹۳۶ء کے یہ چند مہینے انجم صاحب مرحوم کے ساتھ گزرے، اور بہت ہی اچھے گزرے، روزانہ شام کو کئی گھنٹے تک اہل علم
ایک جمگھٹا ہوتا۔ دریا کے کنارے خوشبودار پھولوں کے قریب برآمدے میں نشست ہوتی، انجم صاحب کی طرف سے خاطر مدارات، چا
اور حقہ، شعر خوانی، ادبی نکات اور علمی مباحث، ایسی بہتر مجلس کہ چند دنوں میں ذوق ادب پیدا ہو جاتے۔ اور تو اور مولا بخش چپراسی
اردو نوشت و خواند سے واقف ایک پچاس سالہ آدمی تھا، اس محفل شعر و ادب کے فیض سے شعر کہنے لگا تھا، اور اس نے اپنا تخلص مس

انجم صاحب کا گھر اہل علم کا مرکز اور اہل ادب کا مہمان خانہ تھا۔ الہ آباد کے مشہور شاعر منشی سکھدیو پرشاد بسمل وہاں مہمان آتے منشو
بہار (شاگرد داغ) منشی اندھو کشور پرشاد کشتہ۔ اس محفل میں بارہا شریک ہوئے۔ مولانا شفق عماد پوری، رضا ہمدانی، اور الیاس و
کی رونق بڑھاتے۔ تقریباً ہر روز کے آنے والوں میں مولوی عسکری، مولوی محمد طفیل (طوطی میاں)، خواجہ جلال کے علاوہ اور بھی چند ارباب علم و

انجم صاحب کا پورا نام نور محمد تھا، انجم تخلص نام پر اس طرح غالب آ گیا تھا جیسے مرحوم خواجہ حضرت کے نام عبدالرؤف پر عشرت۔ یا
عام طور پر شاعروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کا نام بھی بہت کم لوگوں کو معلوم تھا۔ شہر گیا پھلگو ندی کے کنارے پر آباد ہے۔ وہ پھلگو
بقول برہمن پنڈت دان کرنے سے بیکنٹھ مل جاتا ہے اس ندی کے دوسرے کنارے پر ایک چھوٹی سی بستی ہے مانپور۔ یہی بستی حضرت
ہے۔ ان کے والد کا نام میاں باقر حسین تھا۔ یہ تجارت پیشہ آدمی تھے، انجم صاحب ان کے چہیتے اور سب سے چھوٹے فرزند تھے۔ ابتداً
کی مالی حالت کچھ بہت اچھی نہ تھی، اس لئے انجم صاحب کے تینوں بڑے بھائی کچھ اچھی طرح تعلیم نہ پا سکے تھے۔ انجم صاحب کی تعلیمی عم
کی مالی حالت کچھ بہتر ہو گئی تو انہیں اچھی طرح اردو فارسی پڑھا کر عربی کی تعلیم کے لئے لکھنؤ کے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بھیج دیا، جہاں اگرچہ انہو
تکمیل نہ کی لیکن کئی سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے اس کے بعد پڑھنا لکھنا چھوڑ کر اپنے تجارتی کاموں میں لگ گئے اور اسے پھیلا کر اتنی وسعت
کے نمایاں دولتمندوں میں شمار ہونے لگے۔

وہ شہر کی مجلس بلدیہ کے کئی بار ممبر بھی منتخب ہوئے۔ اور نمایاں کام کیا، ایک بار وہ ڈسٹرکٹ جج کے اجلاس پر اسیسر بھی ہو گئے تھے
اپنی نظم میں اس طرح بیان کیا ہے۔

بلا قصور کٹہرے میں بند دن بھر ہوں ✤ اسیر ہوں میں خدایا کہ میں اسیسر ہوں
سمجھتے ہیں وکلا مجھ کو اک بزاخفش ✤ مگر نگاہ میں جج کی میں اس سے بڑھ کر ہوں
مجھے خبر نہیں کیا چیز ہے ثبوت و گواہ ✤ میں جی حضور فقط ہوں، میں [illegible] ہوں

یہ ایک طویل نظم ہے جس میں اسیسر کی گت بنائی گئی ہے اور خوب بنائی گئی ہے۔

جس زمانے میں ندیم کا پہلا پرچہ نکلا تھا، اس وقت انجم صاحب کی عمر تقریباً پچاس سال ہو چکی تھی، غالباً وہ ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے
تھے۔ ان کے گھر کوئی اولاد نرینہ نہ تھی، کئی لڑکیاں تھیں اور سب بیاہی جا چکی تھیں انجم صاحب کے سامنے ان کی نواسیاں کھیلتی تھیں، مگر ز
کی زندہ دلی کا یہ عالم تھا کہ وہ ایسی نکسیک نوجوان تھے روز و شب ہنسی ٹھٹھے، طنز و لطائف، بڑھاپا ان کی ہنسی سے گھبرا کر دور
چھوڑ گیا تھا۔

چھوٹا قد، سانولا رنگ، نازک سے خط و خال۔ صرف ٹھوڑی پر چھوٹی سی داڑھی، باریک بخیہ کی ململ کا کرتا اور ایک لنگی باندھے ہوئے وہ آرام کرسی پر بیٹھے ہوتے اور لطیفے بیان کیا کرتے۔ شعر سنتے، شعر سناتے، لوگوں پر آوازے کستے، خود ضحکہ بنتے اور دوسروں کو ضحکہ بناتے۔ ان کی زمینداری کا سارا انتظام اور اس قدر منظم تھا کہ انہیں بہت ہی کم وقت اسے دینا پڑتا تھا۔ ان کا منیجر یا ان کا منشی کبھی کبھی کوئی بات پوچھنے کو آجاتا، ورنہ انہیں بزم آرائی کیلئے فرصت ہی فرصت تھی۔

۱۹۳۱ء سے پہلے نہ جانیں کب سے ان کی یہ محفل قائم تھی لیکن اس کے بعد سے تو زندگی کے آخر وقت تک یہ محفل قائم ہی رہی اور مختلف سالوں میں اس کے ارکان بدلتے رہے۔ کبھی کبھی اس محفل میں شطرنج اور تاش بھی ہوتا تھا۔ جن لوگوں کو ان کھیلوں سے دلچسپی تھی وہ ان کھیلوں سے دل بہلاتے تھے مگر کبھی کوئی شرط یا قمار بازی کی شکل نہ ہوتی تھی۔ خدا جانے کب کے پرانے بدنما سے مہرے اور ایک نہایت فرسودہ سی بساط ملا فرش لاکر دے دیتا اور خواجہ جلال صاحب صوفی میاں مرحوم کے ساتھ شطرنج کھیلنے لگتے، اسی طرح تاش کے پتے بھی نہایت فرسودہ اور گھسے گھساتے تھے۔ خدا جانے لوگوں کو ان پتوں سے کھیلنے میں کیا لطف آتا تھا۔ خود انجم صاحب ہر حلقہ اور ہر بزم کے شریک تھے، وہ ادبی مباحثوں میں بھی حصہ لیتے اساتذہ کے اشعار پیش کر کے محاورات اور روزمرہ کے استعمال کی سندیں بھی پیش کرتے اور تاش والوں کے ساتھ مل کر تاش بھی کھیلتے، میر و شکار کی کہانیاں بھی بیان کرتے اور شطرنج میں پیدل کی شہ اور پیل چینٹ بھی بنایا کرتے۔

آج سے تقریباً تیس سال پہلے فارسی داں اتنے کمیاب نہ تھے، اس محفل میں اردو شعر و ادب کے ساتھ ساتھ فارسی زبان اور اساتذہ کے کلام پر بھی بحث ہوتی تھی، بدیہہ گوئی کے کمالات ظاہر ہوتے، اور مصرعوں پر مصرعے لگائے جاتے تھے۔ اور کبھی کبھی پرانے اساتذہ کے کلام پر تبصرے بھی ہوتے۔

انجم صاحب اگرچہ کافی دولتمند آدمی تھے لیکن وہ وسطانی بلکہ پست وسطانی طبقہ سے ترقی کر کے دولتمندوں کے زمرہ میں شریک ہوئے تھے اس لئے ان کی نظر پست وسطانی طبقہ کی گھریلو زندگی پر گہری تھی وہ اپنی طنزیات میں بھی ہمیشہ اسی طبقہ کی ترجمانی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، خصوصیت کے ساتھ صوبہ بہار کے بگڑے ہوئے زمیندار طبقہ کو وہ بہت اچھی طرح جانتے تھے، اور ان کی ہر گفتگو اور ان کی ہر تحریر میں اس طبقہ کے خلاف طنز کا ایک علمبردار دکھائی دیتا تھا۔ اگرچہ وہ بہت سخت مذہبی آدمی نہ تھے مگر مذہب سے بیگانہ بھی نہ تھے۔ وہ اکبر کی طرح مصلحانہ شاعری نہیں کرتے تھے مگر تہذیب نو کے دلدادہ نہ تھے، اس لئے ان کے طنز کا نشانہ اکثر ولیتی صاحب لوگ بھی ہوا کرتے تھے۔ وہ ایک خوش باش اور رنجان و مرنج آدمی تھے۔ نفرت کا جذبہ اپنے دل میں بہت کم آنے دیتے تھے اس لئے سیاسیات میں ان کا حقیقتہً کوئی مسلک نہ تھا، وہ سب کے دوست تھے، اور مجھے یاد نہیں کہ کبھی میں نے انہیں سنجیدگی کے ساتھ کسی سیاسی مسئلہ پر اظہار رائے کرتے ہوئے پایا ہو، یوں بھی تاجر طبقہ کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ہر جانے والے کو پھول پہنا کر رخصت کرے اور آنے والے کے گلے میں مالا ڈال کر خوش آمدید کہے، اور یہ مسلک اس طبقہ کی معاشی زندگی کے لئے ایک حد تک مفید ہوتا ہے، اور انجم صاحب ایک تاجر ہی تو تھے، اس لئے وہ اپنی افتاد طبع اور پیشہ کی اقتضا، دونوں وجوہ سے اس طریقہ پر کاربند تھے۔ ان کے تعلقات ہر قسم کے لوگوں سے تھے اور سب سے خوشگوار تعلقات رکھتے تھے۔ وہ رائے ہری ہر پرشاد جیسے متعصب اور تنگ خیال فرقہ پرست سے بھی تعلقات رکھتے تھے اور جگیشر پرشاد خلش جیسے کانگریسی سے بھی۔ وہ عالموں اور ادیبوں کی قدر کرتے تھے اور سادہ لوح دیہاتیوں سے کبھی نہ گھبراتے تھے۔

انہوں نے اپنی زندگی میں بہت سی نظمیں اور غزلیں کہیں، طنز و مزاح نگاری کی جس کے مجموعے شائع اور مقبول ہیں، لیکن ان کی نظموں میں سے دو تین نظموں نے ہماری محفل میں بڑی داد حاصل کی۔ ایک تو "سہرا" جس کا مطلع ہے۔

ایک مدت سے تمنا تھی کہ جاکر سہسرام ٭ چشمِ عبرت کو دکھاؤں آسمانِ انقلاب

اس نظم میں شیر شاہ سوری کے روضہ کا بڑا ہی دلدوز اور عبرت خیز نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ اور دوسری حدیث دیگراں جس میں انہوں نے ملک کی سیاسی حالت کا مرقع نہایت پسندیدہ اور ادیبانہ انداز میں کھینچ کر نظم کو اس فارسی شعر پر ختم کیا ہے۔

گر نۂ واقف از افسانۂ انجم شنو ٭ داستانِ خود مگوید در حدیثِ دیگراں

ان چند سطور میں ان کی نثر و نظم پر تنقید و تبصرہ مقصود نہیں، یہ کام کسی اور صاحبِ نظر کے لئے چھوڑتا ہوں، یہ صرف ایک صحبتِ دیرینہ افسانہ ہے، اور یادداشت کے وہ نقوش ہیں جو صفحۂ قلب سے صفحۂ کاغذ پر منتقل کر دیئے گئے ہیں۔ خدا بخشے انجم صاحب بہت ہی دلچسپ اور بہت ہی خوش مزاج ساتھی تھے، اس لئے ان کی یاد بھی بہت دنوں تک آتی رہے گی شاید اس وقت تک جب کہ میں خود بھی ایک افسانہ ہو جاؤں، اور کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ،

بس اتنی سی حقیقت ہے فریبِ خوابِ ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

سلیم اللہ فہمی

فرخ احمد

فرخ احمد، صورت سیرت اور مزاج، ہر اعتبار سے ایک مکمل شاعر ہیں۔ سراپا یہ کہ ایک معمولی شیروانی جس کے دو بٹن اوپر کھلے ہوئے، منہ میں پان، منحنی جسم لیکن چہرے پر ایک خاص دمک، بڑی بڑی آنکھوں میں عقابی کیفیت، والہانہ انداز گفتگو میں حتمی بے پناہی اعتماد، انکسار کا یہ عالم کہ اپنے کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ کردار بلند، صوم و صلوٰۃ کے پابند۔ شاعرانہ صلاحیتوں کا تو پوچھنا ہی نہیں بہتا ہے، ابلتا ہوا، موجیں مارتا ہوا۔

ضلع جیسور محکمہ ماگورا رمانجہ آئیلی گاؤں میں ۱۰ر جون ۱۹۱۸ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید حاتم علی، ایک خوش حال صاحب شخص تھے۔ سرکار سے انہیں "خان صاحب" کا خطاب بھی ملا تھا۔ گاؤں کے مکتب میں فرخ احمد کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ ۱۹۳۷ء میں کلکتہ گئے۔ اسکول کی تعلیم ختم کر کے۔ اپنی اعلیٰ تعلیم کا زمانہ رپن کالج اور اسکاٹش چرچز کالج میں گزارا، سیاست سے کوئی خاص دلچسپی نہیں لیکن جب بی اے آنرز میں تھے، تو لاہور ریزولیشن پاس ہوا۔ اس کا اثر اتنا ہوا کہ پڑھنا ہی ختم ہو گیا، اشتراکیت سے دلچسپی پیدا ہوئی لیکن یہ شعلہ ابھرنے سے پہلے ہی سرد پڑ گیا اور دل و دماغ اسلامی تعلیمات اور اسلامی مساوات کے گرویدہ ہو گئے۔ اقبال سے عقیدت پیدا ہو گئی اور اب یہ کیفیت ہے کہ اقبال کا نام سنتے ہی فرخ احمد کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے ہیں۔

اقبالیات انکی شاعری کا محور ہے، یہی نہیں کہ انہوں نے اقبال کو اچھی طرح سمجھا ہے، بلکہ ان کے فلسفے میں بھی ڈوب گئے ہیں یہ مشرقی پاکستان میں کسی اور شاعر کو نصیب نہیں۔

ان کی پہلی نظم ۱۹۳۵ء میں رسالہ "بلبل" میں شائع ہوئی عنوان تھا "جوبن سینا"۔ ان کی نظم سات ساگر رمانجی (سات سمندر کا ملاح) ۱۹۴۴ء میں چھپی اور دوبارہ ۱۹۵۲ء میں ــــ یہ نہایت ہی مقبول نظم ہے۔ ۱۹۴۵ء میں "سراج منیرا" چھپی ۱۹۵۷ء میں ایک "اقبالیر کبیتا" (اقبال کی نظمیں) شائع ہوا، اس میں ۲۳ نظمیں ہیں جن میں سے نو اقبال کا ترجمہ ہیں۔ زیادہ تر "اسرار خودی" سے "کچھ" ملت سے اور ایک "بال جبریل" سے" ــــ

- - - - - - - - - - - - - - - - - - -

نظموں کا ایک چھوٹا سا مجموعہ ۱۹۴۷ء میں چھپا اس کا نام ہے "آزاد کرو پاکستان"

مناسب ہوگا اگر اس منزل پر ان کے کلام کا کچھ ترجمہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے۔

"سات ساگر رمانجی" (سات سمندروں کا ملاح) کے کچھ بند پیش ہیں ــــ

جاگے مانجی! دیکھو ساتوں سمندر پار کا جھنڈا اٹھاتے ہوئے تیرے در تک آ پہنچے ہیں ــــ

مانجھی اپنی آنکھ کھول ـــ

تیرے بادبانوں میں اب کشتی کھینچنے کی طاقت نہیں رہی دیکھ بھینی بھینی مست ہوا دل کا کنول کھلا رہی ہے۔

لیکن آہ تیری آنکھیں اب بھی نہ کھلیں۔ دیکھو سیاہ ناگ پھن پھیلائے غصے میں کھڑا ہے ــ اور اس کے ارد گرد ان گنت انسان منڈلا رہے ہیں۔ خدا کے لئے تو اب بھی اپنی آنکھیں کھول ـــ ورنہ تیرا مستقبل ہمیشہ کے لئے تاریک ہو جائے گا۔ ـ ـ ـ ـ

آخر تیرے قلب و نظر ہراساں کیوں ہیں۔ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

دیکھ آج بھی تیری زندگی کے اُفق پہ کتنے ہی بیل نظر افروز ہوئے ہیں۔ اور کتنے ہی کنول تیری آنکھوں میں شعلہ ریز ہیں۔

تجھے اپنا وہ پہلا سفر یاد نہیں ـــ جب انجان پھولوں کے کسی اجنبی وطن میں تیرا جہاز ـــ رواں دواں تھا۔؟

جب تیری زندگی کی کل کائنات سمندر کی بیکل موجوں کے سہارے تھی اور جب تیرا جہاز اُفق کی تتلی پہ دوروں کو تیرتا ہوا آندھیوں سے آزمائی کرتا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ آج طوفانِ حشر تیری چیرہ دستیوں سے پوری کائنات لرز رہا ہے ـــ اور نظام موت اپنا اہم جبڑا کھولے ہوئے ہے میرے مانجھی ہمت نہ ہار آگے بڑھ جا۔

یہ طوفان کچھ بھی نہیں ـ

اٹھ لنگر اٹھا اور اپنی منزل کی طرف چل پڑ۔

رات کی تاریک چادر پھیلتی جا رہی ہے لیکن اس وقت بھی شاہی در کھلے ہوئے ہیں۔ ـ ـ ـ ـ ـ ـ

دور فاقہ کش نیم جاں اپنی آنکھوں میں اشک غم کی بوندیں لے کر اٹھ رہے ہیں۔

راہرو اٹھ اور کوچ کا بگل بجا۔

مانجھی تو بھی خواب گراں سے چونک

تو صحرا سے گذرتا چلا جا۔

تیری منزل وہی ہے۔ وہیں خضر کی شیریں نہر رواں ہے۔ مانجھی بادبان کھول دے ـــ دیکھ شاہی دروازے تیرے استقبال کے لئے کھلے ہیں "

ان کی ایک اور معرکۃ الآرا نظم کے کچھ تبدیلے ـــ عنوان ہے : ـــ "زندگی اور موت "

موت کے چھپے بیچ زندگی کا نغمہ پھوٹ رہا ہے ـ اور روشنی کی کلیاں کھل رہی ہیں ـ گھپ اندھیری راتوں میں ہر قدم خضر کو ساتھ لے کر اس راہ سے گذر چکے ہیں ـ اور ہم نے اپنی ہمت اور شجاعت کے بھروسے موت کے دریا میں چھلانگ لگا دی

خوف نہ اندیشہ

خدا کے سوا کوئی مددگار نہیں

مصیبت کے کتنے پہاڑ ٹوٹے مگر ـ ـ ـ ـ

سر نہ جھکا

آج بھی ہم نئی زندگی کی ترنگیں سن رہے ہیں ـ کن قافلے کے تاریک راستے بھی اسی کی نور فشانی سے جگمگا رہے ہیں

رہا ہے جس کی آواز موت کی خوفناک سانسوں سے بھی زیادہ تیز ہے۔ زمین کانپ اٹھتی ہے۔
خواب کے کہر آلود شہر میں ایک آفتاب طلوع ہوا ہے۔ اس کی کرنیں کتنی تیز ہیں۔
اس روشنی میں ہم ایک نامعلوم افق کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں
فن کار کسی کے آگے زندگی کی بھیک نہیں مانگتا۔ بھیک تو ہماری سیہ بختی کی علامت ہے۔

میں ایک بار پھر کالی کملی والے کا چراغ لیکر آگیا ہوں ایک بار پھر نور کے فوارے چھوٹنے لگے۔ موت کے پیچ و خم کبھی نہ ختم ہونے
والی زندگی، نئی زندگی مسکرا رہی ہے، اس کے نغمے فضا پر بال کشا ہیں۔

اے کعبے کے پیغمبر! اس گہری تاریکی میں شکوک کیوں جاگ رہے ہیں

——— . ———

ہم زندگی کو تباہی و بربادی سے دوچار نہیں کر سکتے۔ - - - - - - - -
ہم اپنی راہ خود تلاش کریں گے
اپنے سود و زیاں کو ہم خود سمجھ سکتے ہیں۔

موت کے پیچ و خم اب خطرہ نہیں
موت کے شکوک پر ہم نے غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ دو تاریکیوں کے درمیان زندگی کا نغمہ جاگ رہا ہے غنچے چٹک رہے ہیں۔
کھل رہے ہیں۔"

اس نظم سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ علامہ اقبال کی طرح فرخ احمد کو آنحضرت صلعم سے کس درجہ بے پناہ عشق ہے۔ فرخ احمد کا ایمان
اسلام ہی مسلمانوں کی ہر مصیبتوں کا واحد علاج ہے۔ اور اسلامی سلطنت کا قیام ناگزیر! وہ اگلی روایات سے اپنا رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں،
ہماری ماخذ کی طرف پھر رجوع کرنا چاہتے ہیں۔ وہ دل سے چاہتے ہیں کہ اسلامی ممالک میں جو الفاظ مشترک ہیں وہ بنگلہ میں سمو دئے جائیں۔ اس کا
ثبوت خود ان کی ایک نظم ہے، ——— ان ہی کے الفاظ میں سنئے، ترجمہ کی ضرورت نہیں، مطالب آسانی سے سمجھ میں آجائیں گے۔

——— ؛ ———

عزیز ترانہ بولکیر لو ہوتے گوڑ ہا ای پاکستان! عزیب لپنے چھے آزادی اے ویشے، عزیب بچالے تار مان،
پاک حکومت عزیز بر تورے ہوبے روشنائی پرتی گھرے گھرے آئینے شے تارا انصاف آر آنی بے تو یا بید حال آزادی لیشے
بیر خستے مکتور دوگیں پہنے! عزیز بر تیلگے عزیز سر دسے عزیز برمت ملسے بادشاہ نواب امیر بر نوئے ای نعیغے ہوبے بلند ہو عزیز بر
نشے پر چم تالو ہتے گوڑے ہے جادلن لا دنیا جہاں اے جوڑ مسلم شو کولے سر بھائی مسلم ای بر پہلے چہاڑ آر پدیکے تالی اے مسی اللہ

اور مفتی توحید سپاہی شہوانی اور چمپکلے جاوے بلا و پیڑے خدا مار کی مدد چاہی۔

بنگال کے تمام رسائل میں ان کا کلام برابر شائع ہوتا رہتا ہے ۱۹۴۶ء کے شائع شدہ تذکرۃ الشعراء (کاپیہ بلنیم) میں ان کی تیر ہیں شگفتہ نشان یابی (رلسے علم بردار) اور سات ساگر را نجی سے کچھ حصے سیالو یونیورسٹی کے بنگلہ ادب کے نصاب میں ان کی نظم تو تن (دنیا سفر) شامل ہے۔ طنزیہ چیزیں بھی خوب لکھتے ہیں حیات دراز خان کے نام سے ان کی مشہور طنزیہ راجہ راج (رلسے) بہت دلچ ہے۔ بچوں کے لئے گانے اور نظمیں بھی لکھتے ہیں۔

مشرقی پاکستان کا ادبی منظر اس عنوان سے پی ای این نے انگریزی میں ایک کتاب جنوری ۱۹۵۵ء میں شائع کی ہے۔ سید علی صاحب کا ایک مضمون اس میں شعراء سے متعلق ہے۔ فرخ احمد کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے ۔

نئی پود کے شعراء میں سب سے پرانے فرخ احمد ہیں۔ یہ سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ پرگو ہیں۔

اقبال کی طرح فرخ احمد نے یہ محسوس کیا ہے کہ مسلمانوں میں زندگی اور ایمان دونوں چیزوں کا فقدان ہے۔ آج کے سماجی دور میں جو غلط تقسیم ہے۔ اس کا بھی انہیں شدید احساس ہے کبھی کبھی جب وہ ان دونوں حقیقتوں کو مدغم کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو فرار سے دور پہونچتے ہیں لیکن اب کچھ دنوں سے وہ بہت زیادہ واقعیت کی طرف متوجہ ہیں۔ ان کے ابتدائی کلام میں ہمیں رومانی پہلو کی چاشنی ملتی ہے۔ اور سماجی حالات کی عکاسی کم مسلمانوں کی اگلی شان و شوکت کا اعادہ کرنے میں الفاظ کا انتخاب ایسا ہوتا ہے کہ بڑی پیاری اور حسین آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں اپنے منتشر خیالات کا ذخیرہ سنوارنے کے لئے کوئی خاص اہتمام نہیں کرتے۔ ان کی ہر نظم خطِ مستقیم پر آگے بڑھتی ہے۔ ابتدا، وسط اور خاتمہ کا کوئی خاص اہتمام نہیں اور یہ اس لئے کہ فرخ جو لکھتا ہے عالم کیف میں لکھتا ہے۔ اس کی نظمیں جو اس لئے مبہم نہیں کہ ان میں خیال کی گہرائی ہوتی ہے اور اس گہرائی کو وہ من و عن پرجوش الفاظ میں پیش کر دیتا ہے۔

ناقدوں کے لئے فرخ احمد ایک اختلافی مسئلہ بنے ہوئے ہیں کم و بیش ہر زندہ شاعر کا یہی حال ہوتا ہے۔ بہر حال ناقدین احمد کے متعلق جو رائے بھی قائم کریں اس حقیقت سے شاید کسی کو انکار نہ ہو، کہ فرخ احمد خلا میں ہاتھ پیر نہیں مارتا اس کی منزل متعین اس کا آئیڈیل اس کے سامنے ہے مستقبل ہی فیصلہ کر سکتا ہے، کہ وہ اپنی منزل کو پاتا ہے یا نہیں۔

علامہ فضل حق آزاد

رازِ چمن

اُف یہ جمالِ جوشِ گل اُف یہ بہارِ رنگ و بو — نغمۂ عندلیب کے بجتے ہیں تار چار سو
پھولوں کو گدگدا گئی آہ یہ کِس کی آرزو — لالے کا ہو گیا جگر کس کے فراق میں لہو

چشمِ پُر آب بن گئی شبنم لالہ اک طرف
بھر گیا خونِ ناب سے گل کا پیالہ اک طرف

رازِ چمن نہ کھل سکا لاکھ اِدھر اُدھر پھری — خانہ بخانہ، شاخ شاخ، دشت و جبال دَر پھری
کس کو خبر کہ بے خبر آہ کدھر کدھر پھری — ہات لگا نہ مدعا شام پھری سحر پھری

لغزشِ گام ہو گئی صرفِ خرام ہو گئی
یونہی نسیمِ صبح کی عمر تمام ہو گئی

پرویز شاہدی

روایتِ آدم

(منظرِ امام کی شادی پر)

(۱)

خرد نے سمجھایا۔
بہت لطیف ہے تمثیلِ آدم و حوا
حیات بخش ہے افسانۂ خلد و گندم کا
وہ ایک پسلی سے تخلیقِ پیکرِ زیبا
وہ حسن کی دنیا

(۲)

وہ عیشِ بے تابی
وہ تابناکیٔ عارض، وہ شانِ شادابی
وہ اضطرابِ نظر، وہ ادائے سیمابی
وہ راتِ خلد کی اور وہ نشاطِ بے خوابی
وہ سعیٔ خودیابی

(۳)

وہ لغزشِ آدم
وہ دستِ شوق کی شوخی، وہ گیسوئے برہم
وہ پرخلوص نوازش، وہ بے حجاب کرم
وہ قدسیوں کے اشارے، وہ چشمکِ پیہم
وہ رشک کا عالم

(۴)

وہ عشوۂ فطرت
پسِ حجابِ سزا، وہ تبسمِ حکمت
وہ ترکِ گلشنِ جنت، وہ وادیٔ غربت
وہ فکرِ گندم و جو اور وہ بازوئے ہمت
وہ جہاں فزائی

(۵)

وہ ابتدائے سفر
کہاں وہ خلد کی گلیاں، کہاں یہ راہگزر
کہاں وہ عالمِ ساکن، کہاں یہ شام و سحر
ہر اک قدم پہ نئے موڑ اور نئے منظر
وہ جھجکی جھجکی

(۶)

ہوئی نظر روشن
فروغِ حسن سے رخسارِ ہمسفر روشن
شعاعِ چشمِ محبت سے دشت و در روشن
قدم قدم پہ اجالے، شجر شجر روشن
یہ سہ گئذا

(۷)

وہ روشنی کیا تھی؟
شعاعِ سوزِ طلب، شعلۂ تمنا تھی
فروغِ چہرۂ ادراکِ حسنِ دنیا تھی
ضیائے شمعِ شعورِ حیات افزا تھی
چراغِ فردا تھی

(۸)

دیئے جلے کتنے
تھے ہر قدم پہ اندھیروں کے مرحلے کتنے
چلے زمیں پہ اجالوں کے قافلے کتنے
ہوئے شریکِ سفر تازہ ولولے کتنے
بڑھے حوصلے کتنے

(۹)

ہم آج کے انساں
اسی روایتِ عزمِ بشر پہ ہیں نازاں
اسی لطافتِ تمثیل کا ہیں حسنِ بیاں
اسی فسانۂ تخلیق کی ہیں طرزِ رواں
نگاہ و دل کی زباں

(۱۰)

روایتِ آدم
شعورِ راہ نوردی و ہمتِ آدم
جواں خرامیٔ حوا، رفاقتِ آدم
اک ایک گام پہ تخلیقِ جنتِ آدم
مسرتِ آدم

(۱۱)

اسی روایت پر
چلا ہے قافلۂ آرزو و شوقِ بشر
اسی پہ آج بھی ہے گام زن شعورِ سفر
اسی کی تم کو بھی کرنی ہے پیروی ظاہر
نئی ہو شان مگر

(۱۲)

یہ موسمِ گل بار۔
ہے عہدِ عطر فروشیٔ گیسوئے خمدار
ہے دورِ حوصلہ افزائیٔ لب و رخسار
ہے فصلِ جوشِ تجلی و بارشِ انوار
دل و نظر کی بہار

(۱۳)

چمن مبارک ہو۔
فروغِ جلوۂ سرو و سمن مبارک ہو
بہارِ یاسمن و نسترن مبارک ہو
حیاتِ گل رخ و گل پیرہن مبارک ہو
دلہن مبارک ہو

(۱۴)

سفر مبارک ہو۔
یہ ہم خرامیٔ فکر و نظر مبارک ہو
یہ ہم عنانیٔ قلب و جگر مبارک ہو
یہ جشنِ فتحِ شعورِ سفر مبارک ہو
ظفر مبارک ہو

(۱۵)

تمہاری راہ گذر
وہی ہے، جس سے گزرتا رہا ہے عزمِ بشر
وہی ہے، گرچہ بدلتے رہے نصابِ سفر
وہی ہے، گرچہ ہیں کچھ اور وقت کے تیور
بڑھے چلو مظہر!

(۱۶)

ہے منتظر منزل
جو رہ نمانہ ہو رفتار اس سے کیا حاصل
دکھاتے جاؤ زمانے کو سوزِ آتشِ دل
سجاتے جاؤ نقوشِ قدم سے اک محفل
نہیں سفر

(۱۷)

امامِ خود آگاہ!
ملی ہے دل کو جو سائے میں گیسوؤں کی پناہ
نصیب ہر بنِ مُو ہو فروغِ نورِ نگاہ
یہی بلندیٔ منصب یہی ہے رفعتِ جاہ
نظر نہ ہو گمِ راہ

(۱۸)

خدا کرے مظہر!
تمہارے شوق کا نبّاض ہو شریکِ سفر
مزاجِ وقت سمجھ کر بدل سکے تیور
قدم قدم سے ملے ہوں اہلِ نظر سے نظر
ہو دلِ

(۱۹)

مری دعا پرویز
کہ ہم سفری کی خوشی ہو شوق انگیز
جہاں قدموں سے رفتارِ زندگی ہو تیز
اک ایک سانس مثالِ نسیم نکہت بیز
ہو راہ میں گل ریز

ل نسیم

سفید بال

ہ کے جانے کے بعد بھی خورشید لیٹی رہی۔ اور جب اس کی بوڑھی خادمہ نے آکر دروازے پر دستک دی تب بھی وہ صرف کروٹ بدل کر ہی رہ گئی۔ وہ ابھی تک اس
یں مدہوش تھی یہ کیف و سرور سے لبریز رات اس کے ذہن پر بڑے گہرے اثرات چھوڑ گئی تھی۔ اب بھی وہ سلیم کے بھرے بھرے بازوؤں کا تصور کر کے زیر
ا۔

ب دوبارہ اس کی خادمہ نے آکر دروازہ پر دستک دی اور لرزتے لہجہ میں بولی۔
بی جی اٹھئے — پانی تیار ہے "۔
وہ ایک جمائی لے کر شب خوابی کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں اٹھ کر قدِ آدم آئینہ کے سامنے آ بیٹھی۔ اسے اپنے چہرے کے گرد بکھرے بال بڑے پیارے
، اور وہ بے اختیار پھر مسکرا دی۔ اور جب اس نے ایک طویل سی انگڑائی لی تو اس کے جسم میں تناؤ پیدا ہو گیا — اور جوڑ جوڑ درد کرنے لگا۔ اس نے
کی جیسے اس درد کی اذیت اسے لطف پہنچا رہی ہو۔ اور پھر جھوتے ہاتھوں سے اس نے بکھرے بالوں کو سمیٹ کر پیچھے کی طرف ڈالا تو ایک دم چونک پڑی۔
ہ نے چمک رہا ہو۔ مانگ کے داہنی طرف سیاہ بالوں کے اوپر ایک مہین سی سفید لکیر چمک رہی تھی — جیسے گناہ کے گھور اندھیرے میں نیکی کی روشن مگر باریک
ائی لینے کے بعد خورشید کے چہرے پر جو سنہرا پن چھا گیا تھا۔ وہ کافور ہو گیا۔ اور اس لذت آمیز ایذا کا لطف بھی جیسے کمرے کی محدود فضا میں سمٹ کر

ے سر میں ایک سفید بال دیکھ کر خورشید کو ایسا محسوس ہوا جیسے اب اس کی زندگی میں اندھیرا بڑھنے لگا ہے۔ آنکھوں میں روشنی کم ہونے کے دن آگئے
فید بال اس کی اس باغی جوانی پر قہقہہ لگا رہا ہے۔ یہ احساس بڑا تلخ تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ بال تو ایک ایسی صبح کی تمہید ہے۔ جو میری جوانی کی شام بن کر
ات کو بوڑھا اور اعضا کو مضمحل کر دے گی — اور یہ سوچتے سوچتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
ہ اب تو بڑھاپا چھانے لگا۔ زندگی کی وہ سرمستیاں ختم ہونے کے دن آ گئے۔ جو جھومتے بادلوں کی طرح اٹھیں اور میرے وجود پر چھا گئیں۔ ہائے اب وہ
جو میرے حال کو بہت پیچھے پھینک دے گا۔ اس حال کو جس میں میں ہوں اور سلیم ہے۔ یہ جوان اور حسین راتیں اب میری زندگی میں نہیں آئیں گی۔ صرف
ہوں گی اور اس زمانہ کو یاد کرنے کے لئے مایوسیوں سے لبریز طویل دن — وہ دن جو میرے دل کا سکون چھین لیا کریں گے۔ وہ دن جن میں تپتا ہوا
ور پگھلا دینے والی تیز دھوپ — اور وہ دن جن میں ان سفید بالوں کی تعداد بڑھا کرے گی — ہائے کیسا حسین — کیسا پیارا زمانہ گذر جائے گا —
ی حسین اور مشکبو ہوتی تھیں اور آئندہ کے دن — آف —"
شید کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ مستقبل کی تاریکیاں دیکھ کر نہ جانے کیوں ماضی کی روشنی یاد آ جاتی ہے ایسی روشنی جس میں رنج والم کی صرف
جھلکی میں لیکن ان کا حقیقی وجود نہیں ہوتا۔

شید کی جوانی ایک بپھرے ہوئے دریا کا شباب تھی جو راہ میں آنے والے ہر شخص کو بہا لے گئی۔ اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے والے تو کئی تھے لیکن زمانے کا

رخ دیکھ کر اس بہاؤ کا ساتھ دینے والا صرف خالد ہی تھا —— خالد کی تشنگی جب تک قائم رہی وہ اس تیز رو دریا کے ساتھ بہتا رہا —— اس نے خورشید کے ابلتے ہوئے جذبات کو —— مچلتی ہوئی تمناؤں کو تھپکا —— وہ خورشید کی امی کا ایک دور کا رشتہ دار بھی تھا اور وہ رشتے کو زیادہ محکم کرنا چاہتی تھیں۔ لیکن یہ خالد تو ان کے خیال کے بالکل برعکس نکلا۔ اس نے تو صاف الفاظ میں خورشید پر آوارگی کا الزام لگا کر شادی سے انکار کر دیا —— اور خورشید نے جب یہ سنا تو غصے سے اپنے ہونٹ چبا ڈالے۔ خالد کے سارے خاندان کو آوارگی کا الزام دے کر بھی اسے سکون نہ ملا۔ تو اس نے خالد ہی کے حریف اور کالج کے بدنام لڑکے رفعت سے دلچسپی لینی شروع کر دی۔

خورشید کی امی اور ڈیڈی کو تو خالد کے بیان ہی سے خورشید کے مستقبل کی بے انتہا فکر ہو گئی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ اس بات کے زیادہ پھیلنے سے قبل خورشید کسی سے ہمیشہ کے لیے منسلک ہو جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے تو انہوں نے اس کا کالج جانا بند کرا دیا —— لیکن جب بھی وہ رفعت سے ملتی رہی تو اس کے ڈیڈی نے بلا کر اسے سمجھایا

" خورشید نادانی کی انتہا ہوا کرتی ہے۔ خالد کے اس بیان کے بعد تو میرا سوسائٹی میں نظریں اٹھا کر بیٹھنا مشکل ہو گیا ہے۔ تمہیں خود ہی چاہیے تھا کہ تمہارا آئندہ اٹھنے والا ہر قدم دانشمندی کے ساتھ اٹھتا۔ مگر تم نے بڑی بے احتیاطی کا ثبوت دیا۔ اور بدنامی کا راستہ اختیار کر لیا۔ اس لڑکے رفعت کو میں قطعاً پسند نہیں کرتا۔ بال بڑھا کر خود کو ترقی پسند کہنے والا یہ لڑکا ہرگز تمہارے معیار کا نہیں ہے۔ والدین ہمیشہ اپنی اولاد کی بھلائی چاہتے ہیں۔ اب تمہاری بہتری بھی اسی میں ہے کہ اس لڑکے کے ساتھ گھومنا پھرنا بند کر دو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں تمہاری نسبت میجر ممتاز سے طے کرنی چاہتا ہوں۔

اور خورشید نے پہلی بار ڈیڈی کی یہ بات بغیر کسی دلیل کے مان لی۔ اور دوسرے دن جب وہ کلب میں میجر ممتاز سے ملی تو اس کے چہرے پر حیا کی سرخی چھائی ہوئی تھی۔

دوسرے ہی مہینے خورشید اور میجر ممتاز ایک ہو گئے۔ چٹانوں سے سر ٹکراتے ہوئے دریا کو سیدھی اور ہموار راہ مل گئی۔ ہنستے کھیلتے دن گزرتے رہے۔ گزرتے رہے ——

میجر نے جس شام اپنی شادی کی پانچویں سالگرہ منائی —— اسی شام خورشید نے محسوس کیا کہ میجر نے جس گرمجوشی سے سالگرہ منانے کی تیاری کی تھی، اتنی ہی اس کی باتوں میں سرد مہری بڑھ گئی ہے۔ لیکن جب اس نے یہ دیکھا کہ میجر نے صفیہ بیگم کے بچے پر زیادہ خوشی کا اظہار کیا ہے اور ان کی خوبصورت سی بچی گود میں لے کر کئی بار چوما ہے۔ تو وہ کسی سوچ میں گم ہو گئی۔

خورشید نے چاہا کہ وہ اس بات کو زیادہ اہمیت نہ دے۔ خوبصورت بچوں کو سب ہی چاہتے ہیں لیکن ایک ٹیس خود اس کے دل میں اٹھ رہی تھی۔ ایک کسک سی سینے میں پیدا ہو رہی تھی۔ ایک نامکمل سا ارمان اس کے دل میں پرورش پا رہا تھا۔ کہ وہ بھی کسی خوبصورت بچے کو گود میں بھینچ کر پیار کرے —— اور —— نہیں خوبصورت بچے کو گود میں اٹھائے —— دیکھے اور پھینک دے —— جیسے کوئی کھلونے کو پھینکتا ہے لیکن۔ ۔ ۔ ۔ نہیں نہیں —— "

شادی سے پہلے اس نے طے کر لیا تھا۔ کہ وہ بچوں کی جھنجھٹ سے ہمیشہ دور رہے گی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ دو چار بچوں کی پیدائش کے بعد ہی سینہ ڈھل جائے اور پیٹ کی کھال تھل تھل کرنے لگے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اف —— بچوں کی پیدائش ایک نوجوان لڑکی کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ اور اب اچانک —— اس نے یہ محسوس کیا کہ اس کی پرمسرت زندگی کو اسی المیہ کی جستجو ہے۔

اب تک تو وہ اس بات سے بھی مطمئن تھی کہ میجر نے بچے کی پیدائش کی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس نے اس موضوع پر خورشید سے کبھی گفتگو تک نہیں کی تھی۔ بڑے خلوص کے ساتھ خورشید کے جھکے ہوئے بالوں کی لٹ اپنی آنکھوں پر رکھ کر کہتا۔

" میں جنت میں ہوں خورشید مجھے سونے دو نا ——"

لیکن اب خورشید نے سوچا کہ شاید وہ اس خیالی جنت میں بچوں کو تلاش کرتا ہوگا۔ یا پھر اپنے پریشان خیالوں کو یکسوئی پہنچانے کے لئے اس جنت میں کھویا رہتا ہوگا۔

ایک دن خود ہی خورشید نے میجر سے کہا۔

یہ بیگم کی بچی بہت پیاری ہے۔ کبھی کبھی اسے یہاں بلوا لیا کیجیے۔ "
شید چاہتی تھی کہ اس بچی کو ایک کھلونے کی طرح میجر کے سامنے ڈال کر اس کو پریشان خیالی سے بچا لے۔ لیکن میجر نے حیرت اور حسرت سے اسے دیکھا ——

دوسرے دن اس نے خورشید سے کہا۔
"گ —— اگر تم اس وقت ڈاکٹر زبیر کے پاس چل سکو تو بہتر ہے "
شید نے حیرت سے میجر کو دیکھا —— اور پھر اس کی بات کا مفہوم سمجھ کر اسے ایک دھچکا سا لگا۔ اور وہ تنک مزاج ہونے کے باوجود خاموش رہی۔ اس نے میجر تبدیلی کے لئے اور ڈاکٹر کے ہاں چلنے پر رضامند ہو گئی۔ ڈاکٹر زبیر سے معائنہ کرانے کے بعد وہ فوراً گھر پہنچ گئی۔ میجر کو اس نے ڈاکٹر کی ڈسپنسری ہی میں چھوڑ دیا۔ اس طاری ہونے لگی۔ ظلم اور غصے سے اس کا دل پھٹنے لگا —— وہ نہیں جانتی تھی کہ میجر اس حد تک بچوں کا خواہشمند ہے کہ اس کا معائنہ تک ——

میجر ممتاز ڈاکٹر کے ہاں سے آئے تو ان کے چہرے پر مایوسی کے آثار صاف معلوم ہو رہے تھے۔
نے خورشید سے کہا۔
شید —— مجھے ڈاکٹر کے کہنے کی پرواہ نہیں ..... میں تمہیں لیڈی ڈاکٹر س..... "
نے فوراً ہی میجر سے پوچھ لیا۔
کیا تم بچوں کے بہت ہی خواہشمند ہو —— "
میجر نے بڑی معصومیت سے اثبات میں سر ہلا دیا۔
خورشید نے ایسا محسوس کیا۔ جیسے میجر کو اس کی تمنا نہیں —— وہ بچے چاہتا ہے خواہ وہ اس کی کوکھ سے پیدا ہوں یا کسی اور کی —— اس کو بس بچوں ۔

خورشید نے سوچا —— میجر کی اس خواہش کے لئے میں کیوں کٹھ پتلی بن جاؤں —— یہ میری توہین ہے کہ میں ہر ڈاکٹر کے ہاں معائنہ کے لئے جاؤں —— ہے۔ مجھے تو پرواہ نہیں —— محض میجر کی خواہش کے لئے میں بھی بچے کی متمنی ہوں —— ورنہ مجھے تو یہ سلسلہ شروع ہی سے جھنجھٹ معلوم ہوتا ہے ہر کی انا نے سر اٹھایا —— اس کی زندگی میں پھر ہلکا سا تلاطم پیدا ہوا۔ اور کچھ دن کے بعد کلب سے واپس آتے ہوئے۔ جب میجر نے کار کا رخ گھر کے رت کیا تو بپھر گئی۔ اس نے صاف لیڈی ڈاکٹر کے ہاں جانے سے انکار کر دیا۔ میجر نے خاموشی سے گاڑی کو موڑا۔ اور گھر آ گیا۔ دوسرے دن خورشید پاس وسکی کی خالی بوتلیں۔ سگریٹ کے ادھ جلے لاتعداد ٹکڑے، آدھا صوفے اور آدھا زمین پر، مدہوش پڑا میجر نظر آیا تو خورشید نے سوچا ——
—— تو ممتاز کی یہ بچوں کی خواہش دیوانگی کی حد تک پہنچ چکی ہے "
پھر بھی وہ اپنی ضد پر قائم رہی۔ وہ مر جائے گی لیکن کبھی بھی ڈاکٹر کے ہاں ہرگز معائنہ کے لئے نہیں جائے گی۔ آخر تضحیک کی حد ہوتی ہے میجر سراسر میری توہین

کے بعد میجر نے پھر درخواست کی کہ وہ پھر ڈاکٹر کی معائنہ کے لئے چلے —— یہ سن کر خورشید غصے سے سراپا لرز اٹھی۔ اس نے اپنے ہونٹ چبا ڈالے —— کیفیت کو نظر انداز کر کے نہ جانے کیا دلیل میں دوبارہ کہا تو خورشید چیخ اٹھی —— اس نے بڑے سخت الفاظ میں میجر سے کہہ دیا کہ اب میرے بچانے تم —

کہ اس بات پر جھگڑا ہو گیا —— اس نے حکم دیا کہ خورشید اپنا فیصلہ بدلے اور ڈاکٹر کے ہاں معائنہ کے لئے چلے۔ خورشید نے صاف انکار

دہی الفاظ دہرائے ——— میجر نے گولی مارنے کی دھمکی دی اور خورشید نے پولس اسٹیشن ٹیلیفون کر دیا۔ بات مقدمے بازی تک پہنچی ——— لیکن میجر نے عدا بٹھانے کے بجائے خورشید کو طلاق نامہ بھیج دیا ——— طلاق نامہ وصول کر کے خورشید نے ایک ٹھنڈی سانس لی ——— لیکن اچانک ہی ——— اس کی آنکھوں آنسو آ گئے۔"

اس نے شادی کے بعد کے یہ پانچ سال ایک امانت دار بیوی بن کر گزارے تھے۔ حالانکہ کلب میں کتنی مرتبہ مسٹر کریم نے اس سے رقص کے لئے درخواست کی تھی لیکن اس نے بڑے شائستہ الفاظ میں معذرت چاہ لی کتنی ہی مرتبہ فخر الدین نے اپنی کار میں لے گھر چھوڑنے کے لئے کہا۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر ——— انکار کر

"نہیں مسٹر فخر الدین۔ آپ زحمت نہ کیجئے۔ ممتاز ابھی آتے ہوں گے وہ آ کر پریشان ہوں گے"

یہ سوچ کر خورشید کو میجر پر غصہ آنے لگا ——— "میں نے اپنی تمام خواہشات اور جذبات کو دفن کر دیا ——— اور اس نے ——— اس ایک ذلیل سی خواہش کے لئے مجھے ہمیشہ کو چھوڑ دیا۔

خورشید کو میجر پر جتنا غصہ آتا وہ اپنے سینے میں اتنی ہی گھٹن سی محسوس کرتی ——— جتنی بار وہ میجر کو برے الفاظ میں یاد کرتی اتنی ہی مرتبہ وہ اپنے ہم کنے کی بھی ناکام کوشش کرتی ——— اب اسے میجر کی ایک ایک برائی یاد آنے لگی ———

"میں اچھا ہوا نہ بیچارہ ——— کم بخت شراب پی کر تو جانور بن جاتا تھا ——— اور پھر ذلیل کی کتنی بری عادت تھی اسے ——— دن رات فا اور پھر بد تمیز کتنا کہ بات کرنے کا شعور تک نہیں ——— وہی فوجیوں کی سی اکڑفوں ——— تو بہ ——— اب کون اس کی باتیں یاد کر کے اپنا وقت کرے ———"

لیکن وہ ذرا ذرا سی بات پر میجر کو یاد کرتی ——— رہ رہ کر پچھتاتی کہ کیا حرج تھا معائنہ کرانے میں ——— ایک بچے کے ہونے سے تو عورت پر برا اثر نہیں پڑتا ——— کاش اس دن میں نے میجر کی بات مان لی ہوتی ——— " یہ پانچ سال کا تعلق پانچ دن میں ختم ہو کر رہ گیا ——— خورشید کی یاد بہت ستاتی ——— اس کے سینے میں گھٹن بڑھنے لگتی۔ تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے ——— وہ طلاق نامہ حاصل کرنے کے بعد کئی بار ——— بلکہ بار تھی ——— رونے سے دل کا غبار ہلکا تو ہو جاتا ——— لیکن پھر وہی خیالات ——— جب وہ میجر کی برائیاں یاد کر کے دل کو تسکین دینے کی ناکام سعی کرتی اسے میجر کی اچھائیاں بھی یاد آنے لگتیں۔

اسی طوفان اور ذہنی خلفشار میں اس کے دن رات بسر ہو رہے تھے راتوں کی نیندیں بھی اس کے خیالات کی طرح شاید میجر کے پاس چلی جاتی ایک دن اسے معلوم ہوا کہ میجر نے شادی کر لی ۔ شدت جذبات سے مغلوب ہو کر وہ خوب روئی۔ پھر اس نے انتقامی جذبے کے تحت میجر کو مبارک بھیج دیا ——— اور وہ خورشید پھر بیدار ہو گئی۔ جو میجر سے وابستگی کے بعد سو گئی تھی۔

اسی شام کو خورشید نے آئینے کے سامنے بیٹھ کر گھنٹوں میک اپ کیا۔ بڑی دیر تک وہ صرف ڈال ڈال ڈال ہی گنگناتی رہی ——— اور پھر وہ کلب گئی اس نے مسٹر کریم کے ساتھ رقص کیا۔ اور فخر الدین کی موٹر میں گھر پہنچی ———

دوسرے دن اس کے ڈیڈی نے بلا کے اسے سمجھایا۔

"دوسرے کی یاد کے سہارے کوئی کب تک زندگی گزار سکتا ہے۔ زندگی کے ٹھوس اور تلخ تقاضے کسی کی یاد میں زندہ نہیں رہنے دیتے۔ بھول جاؤ ——— اس نے شادی کر لی ہے۔ میری خواہش ہے کہ اب تم بھی......."

"ڈیڈی ——— میں جس طرح رہتی ہوں۔ رہنے دیجئے۔ کسی کی بھی خواہش کو پورا کرنے کے لئے میں زندہ رہنا نہیں چاہتی ——— میری بھی چند خواہشات ان کو کوئی نہیں سمجھتا ———"

اس دن کے بعد سے انھوں نے کچھ نہیں کہا۔ بلکہ دل کو یہ کہہ کر تسکین دی کہ وہ سمجھتی ہے کہ ماں کے ساتھ باپ بھی مر گیا۔

خورشید کی زندگی میں آب و تاب پھر بڑھنے لگی ـــــ اس کی خواہشات پھر لہریں لینے لگیں۔

ڈھلان پھر شروع ہو گئی تھی۔ بہاؤ میں پھر تیزی پیدا ہو گئی ـــــ اور وہ راہ میں آنے والی ہر شے سے پھر ٹکرانے لگی ـــــ خورشید کے ساتھ ساتھ وقت تھا۔ کبھی تیز تیز ـــــ کبھی آہستہ آہستہ اس کی عمر کے ساتھ ساتھ اس کی خواہشات کا تقاضہ بھی بڑھ رہا تھا۔ اس کے ڈیڈی اپنی تمناؤں کے ساتھ ابدی ۔ اب خورشید وقت بے وقت ہونے والی پند و نصائح سے بھی آزاد ہو چکی تھی۔ اب تک تو وہ فخرالدین کے گھر جا کر خاموشی سے دو ایک پیگ پینے ج" کھیلنے کے لئے رضامند ہو جاتی ـــــ یا مسٹر کریم کی درخواست پہ خاموشی سے ان کے ہونٹ قبول کر لیتی ـــــ مگر اب تو بات ہی دوسری ہو گئی۔ جب فرمان پر برج کھیلنے کی دعوت دی تو خورشید نے سرگوشی کے لہجہ میں کہا۔

یہیں آ جاؤ ـــــ"

ایک دن مسٹر کریم اپنے بھاری بھرکم جسم سے ایک سانولے سلونے نوجوان کو چپکائے کلب آئے۔ تو خورشید کو یہ نوجوان بڑا پیارا معلوم ہوا۔ اس کی آنکھوں میں ہوئی ـــــ اور اس کا جی چاہا کہ اس نوجوان کے ساتھ رقص کرے ـــــ دو ایک پیگ پیئے۔ اور برج کھیلے ـــــ جب مسٹر کریم نے خورشید سے ان کا تعارف کرایا۔ تو بڑی گرمجوشی سے ملی ـــ

وہ رات خنک اور چاندنی سے بھرپور تھی۔ اور اس رات جب جب آرکسٹرا نے،

You are , my Sweet Heart
If there was One, that's you
My life was an uncomplete , dream without you.

گایا تو خورشید نے بڑے دھیمے لہجے میں مسٹر کریم کے ساتھی نوجوان سے کہا۔

"مسٹر سلیم ـــ آیئے رقص کریں ـــــ"

اور وہ دونوں جب فلور پر پہنچے تو ـــــ تو خورشید نے بہت باتیں کیں ـــــ بہت سی باتیں سنیں ـــ اور جب رقص ختم ہوا تو خورشید دوسرے دن ملنے کا وعدہ لے چکی تھی۔ اس رات خورشید نے گھر آ کر بھی دو تین پیگ پیئے ـــــ اور اپنے اسپرنگ والے پلنگ پر لیٹے لیٹے وہ کئی بار اچھلی ـــــ اور اب سلیم تو خورشید ہی کا ہو کر رہ گیا ـــــ جیسے کوئی عیاش مرد کسی نوخیز چھوکری کو داشتہ بنا کر اپنے گھر میں ڈال لے اسی طرح خورشید نے سلیم کو رکھ چھوڑا ـ وہ اس کی ہر جائز اور ناجائز بات بلا چوں و چرا مان لیا کرتی ـــــ لیکن سلیم بھی بس اسی کا ہو کر رہ گیا تھا۔

یہ باتیں سوچتے ہوئے خورشید کھو سی گئی ـــــ اور ان یادوں کے جال سے جب وہ نکلی تو سامنے آئینہ اس کے چہرے کی اضطرابی کیفیات کی غمازی ـــــ اس نے آئینہ میں اپنے چہرے سے نظریں ہٹائیں تو وہ پھر سفید بال میں آ کر الجھ گئیں۔ اور خورشید ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی ـــــ

اس کے مزاج میں کچھ تبدیلی سی ہونے لگی۔ اس سفید بال نے اس کے دل و دماغ میں ایک چمک سی پیدا کر دی ـــــ آئینہ میں سفید بال کو دیکھتے دیکھتے محسوس ہوا۔ جیسے یہ بال اس کی زندگی میں پاکیزگی اور تقدس کے دیس سے آنے والا سفیر ہے۔ پھر اس نے ایسا محسوس کیا کہ اس سفید بال نے اس کی ے تمام سیاہ نقطوں کو اپنی باریکی میں چھپا لیا ہے۔ اور وہ نیکی کا مجسمہ بن گئی ہے ـــــ دور آسمانوں سے ایک انجانی اور ان دیکھی سی مخلوق اس پر پھول برسا ہے۔ اور خورشید سراپا سفید لباس میں ملبوس ان پھولوں کے درمیان کھڑی مسکرا رہی ہے۔ اس تصور سے اس کے جسم میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی ٹھ گئی۔ اس نے پھر گھور کر اپنے سفید بال کو دیکھا ـــــ نہ جانے کیا سوچا ـــــ پھر لرزتا ہوا ہاتھ بڑھایا۔ اور بہت احتیاط سے اس سفید

بال کو اپنے سر سے نوچ لیا۔

"اتنی متبرک شے۔ میرے سر کے قابل نہیں ـــ"

اس کے بعد خورشید نے محسوس کیا، کہ وہ تیس سال کی خورشید نہیں ـــ بلکہ بہتو برس کی ایک لڑکی ہے ـــ لیکن اس ایک بال کو توڑنے کے بعد اس کو اچانک ہی دوسرا سفید بال نظر آیا ـــ اب جو خورشید نے ذرا توجہ سے سفید بال تلاش کرنے شروع کئے تو معلوم ہوا کہ ایک ہی سفید بال تھا نکل گئے ہیں ـــ وہ سر تھام کے آئینہ کے سامنے ہی بیٹھ گئی ـــ

اس کی ملازمہ نے کمرے میں آکر اطلاع دی۔

"بی بی جی فون آیا ہے۔"

اس نے مردہ سی آواز میں پوچھا ـــ

"کس کا ہے۔"

"جی ـــ سلیم بابو کا۔"

خورشید نے گھوم کر ملازمہ کو دیکھا ـــ پھر اپنے لرزتے ہوئے ہاتھ میں ٹوٹے ہوئے سفید بال کو دیکھا، آئینے کی طرف گھوم کر سر میں چمکتے سفید بالوں پر نظر ڈالی ـــ کچھ سوچا ـــ اور مسکرادی۔

بوڑھی ملازمہ حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"بی بی جی! ـــ"

"ہاں جاؤ اس سے کہدو کہ اب وہ یہاں کبھی نہ آئے ـــ پردیس سے ان کے بچے آگئے ہیں۔"

یہ کہکر خورشید آپ ہی مسکرادی ـــ

قیصر سلیم
ایک چینی کہانی سے

پاکدامنی کے مینار

[شہر سوکوت سے پرے ایک اور چھوٹا شہر ہے۔ جو نیلگوں پہاڑیوں اور ویشان جھیل کے درمیان واقع ہے۔ ایک پرانی اور کھردی ...کے کنارے دور تک ایک قطار میں مینار بنے ہوئے کھڑے ہیں۔ یہ نظارہ چین کے شہروں کے علاوہ دیہاتوں میں بھی عام ہے۔ یہ ...ماضی کے ان مردوں اور عورتوں کی یادگاریں ہیں جنہوں نے شہنشاہِ وقت سے اپنے کارناموں کی بنا پر اعزاز حاصل کیا ہے۔ ان میں ...ی کے مینار بھی ہیں جو ان بیواؤں کے نام پر تعمیر کئے گئے ہیں۔ جنہوں نے عین عالم شباب میں اپنے شوہروں کو کھو دیا اور تمام عمر نہایت ...ئی کے ساتھ صرف اپنے شوہروں کی یاد میں گزار دی۔ ذیل کی کہانی انہی میناروں سے متعلق ہے۔]

"مہوا، اندر آجاؤ"، مسز وان نے بلند آواز میں بیٹی کو پکارا۔ "اب تم بڑی ہوگئی ہو۔ اس طرح گلی میں جھانکتے رہنا ٹھیک نہیں ہے۔" مہوا شرم سے سر جھکائے ہوئے اندر آگئی۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی چہرہ شفتالو کی کلیوں جیسا، ہونٹ گلابی اور دانت ...نیلے تھے۔ مزاج میں بیساختہ پن اور آزادہ روی کے علاوہ کسی قدر ضد کا مادہ بھی تھا۔ ماں کے پاس سر جھکائے ہوئے وہ چلی گئی دل اس کا ابھی تک گلی ہی کی طرف لگا ہوا تھا۔

"آخر دوسری لڑکیاں بھی تو دیکھ رہی ہیں" اس نے اپنے دیکھنے کا جواز پیش کیا۔

باہر گلی میں فوجیوں کی ایک کمپنی مارچ کرتی ہوئی جا رہی تھی۔ ان کے بوٹوں کی آواز سے پوری گلی میں ایک عجیب شور برپا تھا۔ ...ں اور مرد اپنے اپنے گھروں سے یہ نظارہ دیکھ رہے تھے اور فوجیوں کی روانگی سے متعلق قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ بوڑھی اور ادھیڑ ...تو چوکھٹ سے باہر نکل کر دیواروں سے لگ کر کھڑی ہوگئی تھیں۔ لیکن جو جوان اور نو عمر تھیں وہ پردوں اور چلمنوں کے پیچھے سے جھانک ...تیں۔

مہوا پردے سے باہر نکل کر گھر کے سامنے ایک اونچے پتھر پر جاکر کھڑی ہوگئی جہاں سے اچھی طرح دیکھا جا سکتا تھا۔ ایک طویل القامت ...ن نے اسے دس بارہ قدم پیچھے ہی سے دیکھ لیا تھا اور جب وہ اس کے قریب سے گزرا تو دفعتاً جیسے چہرے پر ایک ہلکا سا ...م دوڑ گیا۔ کیپٹن نے اسے دیکھا اور مارچ کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

یہ فوجی بریگیڈ تیس میل جنوب میں واقع شہر سوکوت سے ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لئے جا رہا تھا۔ جو نیلگوں پہاڑیوں میں

چھپ چھپ کر قرب و جوار کے دیہاتوں پر دن دھاڑے حملے کر رہے تھے۔ ہانگ وانگ جیسے چھوٹے شہر میں فوجیوں کے قیام و طعام کا انتظام نہیں تھا۔ بہت سے مندر خالی کرائے جا چکے تھے لیکن افسروں کو تو گھروں ہی میں قیام پذیر ہونا تھا۔ جہاں انہیں سونے کے آرام دہ بستر میسر آ سکتا۔ ۔

کیپٹن کے ذہن میں بھی یہ بات تھی اس لئے اس کی یہ حرکت قابل گرفت نہیں قرار دی جا سکتی تھی کہ اس نے لڑکی کی طرف کیوں یا اس مکان کو یاد رکھنے کی کوشش کیوں کی سپاہیوں کے سونے اور کھانے کا انتظام کر کے وہ اسی سہ پہر کو مہوا کے مکا آیا اور اپنی میزبانی قبول کرنے کی پیشکش کی اس مکان میں دو بیوائیں رہتی تھیں۔ ایک تو مہوا کی ماں اور دوسری اسکی دادی۔ لیکن ک کو ان کی بیوگی کا علم نہیں تھا۔ وہ تمام باتیں سمجھاتے ہوئے کہنے لگا کہ اسکی یہ مہم عرصہ دو ماہ تک رہے گی اور اسکا زیادہ تر وقت باہر گا لیکن جب وہ اس شہر میں ہوگا تو اسے سونے کے لئے بستر کی ضرورت ہوگی اس لئے اگر یہ عورتیں سونے کا انتظام کریں تو وہ بیحد احسان مند

لڑکی جسے کیپٹن نے صبح دیکھا تھا اس کی باتوں میں بیحد دلچسپی لے رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کیپٹن کے قیام سے متعلق ا اور دادی سے لفظ ہاں سننے کے لئے بیچین ہے۔ دادی کی عمر ساٹھ سال سے تجاوز کر چکی تھی اور اسوقت وہ سر پر ایک سیاہ مخملی کپ باندھے تھیں۔ ماں جن کی عمر پینتیس ۳۵ کے قریب ہو چکی تھی، لانبے قد کی دبلی پتلی مگر خوبصورت عورت تھیں۔ ستواں ناک اور باریک دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہو بہو مہوا کی تصویر ہیں۔ جوانی ہی میں انہیں بیوگی کا لبادہ اوڑھنا پڑا تھا۔ اور جب سے وہ اپنی پاکدا پارسائی کے تحفظ کی خاطر جذبات کی لو دیتی ہوئی چنگاریوں کو سرد کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھیں۔ آج مدت کے بعد اس گھر میں ج تین پیڑھیوں سے صرف عورتیں رہتی آئی تھیں ایک اجنبی مرد کو دیکھ کر تینوں کے دل میں بیک وقت خواہش ہوئی کہ اسے مہمان بنا لیں کیپٹن عام فوجیوں سے علیحدہ لانبے قد اور چوڑے شانوں کا ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ پیانگ ملٹری اکیڈمی سے اسنے گریجویٹ کیا تھا اسکی باتیں اور طور طریقے نہایت مہذب اور با سلیقہ تھے۔ نام اسکا لی سانگ تھا۔

"میں آپ خواتین کو کھانے پینے کے لئے زحمت نہیں دونگا مجھے صرف سونے کی جگہ چاہئے جہاں ہاتھ منہ دھو سکوں اور فوقتاً چائے کی ایک پیالی مجھے مل جایا کرے۔"

"یہ گھر آپ کے لائق نہیں" مسز وآن نے کہا "لیکن اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو جب آپ شہر آئیں یہیں قیام کریں۔"

مکان تاریک تھا لیکن صاف ستھرا اور ہر چیز نہایت قرینے سے رکھی ہوئی تھی۔ فرنیچر بوسیدہ مگر خوش وضع تھے۔ لکڑیوں پر رنگ اڑ چکا تھا۔

جب دونوں بیواؤں نے کیپٹن کو دیکھا تھا تو سب سے پہلا خیال ان کے دل میں یہی آیا تھا کہ ان کی مہوا کے لئے عین وق ایک آدمی آگیا ہے جب کہ وہ شادی کی عمر کو پہنچ چکی ہے۔ وہ بیحد حسین اور دلکش تھی۔ ماں کی ستواں ناک اور ذہین آنکھیں اسے ملی تھ ماں جیسے نکھرے اور صاف نقوش مہوا کے نہیں تھے۔ وہ شادی کی عمر کو پہنچ چکی تھی اور اس سے شادی کرنے کے خواہاں بھی کئی تھے لیکن وہم بھی سبھوں کے ذہن پر حاوی ہو چکا تھا کہ وآن کا یہ گھرانا مردوں کے لئے بڑا نحس ہے۔ اس خاندان میں دو بیوائیں تو پہلے سے ہی

دونوں کے شوہروں کی موت شادی کے فوراً ہی بعد واقع ہوئی تھی۔ اب چونکہ لگاتار دو مرتبہ یہ نحس واقعہ ہو چکا تھا اسلئے تیسرا ہی ہو سکتا تھا۔ اسلئے جو بھی مہوا سے شادی کا ارادہ رکھتا ہے صحیح معنی میں وہ اپنی موت کو دعوت دے رہا ہے یا خودکشی کرنے جا رہا ہے۔ ان کے پاس سوائے اس مکان کے کوئی اور جائداد نہ تھی اسلئے لوگ ادھر متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ جوان لڑکوں نے مہوا میں دلچسپی لینی بھی چاہی تو ان کے والدین نے سختی سے انہیں روک دیا اور مہوا چپ چاپ بغیر منسوب کی بات چلے انیس ۱۹ سال کی عمر کو پہنچ کر ایک بھرپور دوشیزہ بن چکی تھی۔

کیپٹن کی آمد سے اس گھر میں نمایاں تبدیلی واقع ہو گئی۔ یہی گھر جو برسوں سے کسی مرد کی آواز سے ناآشنا تھا اب ہر وقت قہقہوں سے گونجنے لگا کیپٹن نے مہوا میں کافی دلچسپی لینا شروع کر دی — ۔بوڑھی دادی کے لئے اسکے دل میں ہمدردی احترام کا جذبہ کار فرما ہونے لگا اور مسز وآن کے لئے وہ صرف ایک بہادر نڈر اور حسین نوجوان تھا۔

ایک روز کیپٹن جب کیمپ سے واپس آیا تو مسز وآن اسے اندر ہال میں ملیں۔ وہاں کتابوں کی ایک الماری پڑی تھی جس میں جلدوں والی ضخیم کتابیں بند تھیں۔ کلاسیکی ادب کے علاوہ سستے رومان اور ڈرامے بھی تھے۔ چند ایک بچوں کے ادب پر بھی تھیں انہیں ایک نظر دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ مدتوں سے یہ یونہی بند پڑی ہیں۔ کیپٹن نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "آپ کے پاس تو کتابوں کا ایک عمدہ ذخیرہ موجود ہے"

"آپ چاہیں تو انہیں دیکھ سکتے ہیں۔ یہ تمام کی تمام میرے شوہر کی جمع کی ہوئی ہیں" مسز وآن بولی۔

"اور یہ بچوں کی کتابیں کس لئے ہیں؟ جب کہ یہاں ایک بھی بچہ نہیں ہے!!"

بیوہ کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی "میری تعلیم کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن میں کمسن بچوں اور نوعمر لڑکیوں کو پڑھایا کرتی ہوں"

اور یہ بالکل درست تھا۔ "لڑکیوں کا نفسیاتی تجزیہ" کی ایک جلد کے علاوہ دوسری صدی کی مورخ عورت پاچاؤ کی لکھی ہوئی کتاب "عورت کے فرائض" کی کئی جلدیں اور زیا کوانگ کی تصنیف "خاندان کی تعمیر" کی دو چار جلدیں موجود تھیں۔ جنہیں چینی ادب میں کلاسیکی مقام حاصل تھا۔

"تو اسطرح گزر اوقات کرتی ہیں آپ؟ میں حیران تھا کہ آپ دونوں ماں بیٹی گھر کا خرچ کس طرح پورا کر لیتی ہیں"

مسز وآن ہنس پڑیں "۔ انتظام ہو ہی جاتا ہے۔ جب ماں اور میں جوان تھی تب ہم سلائی بنائی اور بیل کاڑھنے کا کام کرتے تھے۔ اب میں گھر ہی پر پڑھایا کرتی ہوں۔ لڑکیاں آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ بعض چند مہینوں میں اپنا سبق ختم کر لیتی ہیں اور بعض سال بھر یا اس سے زیادہ عرصہ لیتی ہیں۔ لوگ اپنی لڑکیوں کو میرے پاس صرف اس لئے بھیجتے ہیں کہ انہیں معلوم ہے کہ میں صحیح تربیت دیتی ہوں جن کی ان لڑکیوں کو ضرورت ہے تاکہ وہ اچھی دلہنیں بن سکیں"

کیپٹن اسوقت پچاؤ کی کتاب "مشہور کہاوتیں" دیکھ رہا تھا جس میں فلسفیانہ انداز میں اخلاقیات کے درس مرتب کئے گئے تھے مسز وآن نے کہا "یہ بھی میرے مرحوم شوہر کی خریدی ہوئی ہے مگر ہم عورتوں کے لئے یہ کتاب موزوں نہیں ہے

میں نے کہا کہ میں کچھ زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہوں۔ ایک عورت کے لئے صرف اتنی ہی تعلیم ضروری ہے جس سے وہ ایک ماں، ایک بہن، ایک بیٹی اور ایک بہو کے فرائض کو جان سکے اور ساتھ ہی ان اصولوں سے بھی واقف ہو سکے جو اسے طاعت و فرمانبرداری اور پاکبازی و پارسائی کا سبق دیتے ہیں۔"

"مجھے یقین ہے کہ جن لڑکیوں نے آپ سے تربیت حاصل کی ہوگی وہ ان تمام اصولوں سے اچھی طرح واقف ہو گئی ہوں گی اور سمجھتا ہوں کہ آپ کے شوہر ایک سخت قسم کے معلمِ اخلاق واقع ہوئے ہونگے۔"

موضوعِ گفتگو بیوہ کے لئے دکھ کا باعث تھا۔ اس لئے وہ خاموش رہیں۔ کیپٹن ان کی باتوں میں پاکیزگی اور تفاخر کا امتزاج دیکھ کر ایک طرح کی جاذبیت اور دلکشی محسوس کرنے لگا۔ اسے منزوان کی بیٹی مہوا سے محبت تھی لیکن اس نے محسوس کیا کہ منزوان مہوا سے کہیں زیادہ حسین ہیں اور ان میں صبر کی بے پناہ قوت موجود ہے۔ وہ اچھی چیزوں کو سراہنا بھی جانتی ہیں اور انہیں مطمئن ہو کر زندگی گزارنے کا سلیقہ بھی آتا ہے لیکن کیپٹن کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ خاندان میں ان بیواؤں کو ایک اعلیٰ و ارفع مقام حاصل ہے۔ اور خاندان والوں کی طرف سے ان کے لئے "پاکدامنی کا مینار" حاصل کرنے کی ایک تحریک اٹھائی جا چکی ہے۔

لن چنگ سے واپسی پر کیپٹن کو پتا چلا کہ اس مکان کے عقب میں ایک باغیچہ بھی ہے۔ ہوا یوں کہ ایک صبح جبکہ مہوا بازار گئی تھی کیپٹن چونکہ ہیں وہ اِدھر اُدھر مہوا کو تلاش کر رہا تھا منزوان سے پوچھ بیٹھا "بڑی بی کہاں ہیں؟"

"غالباً باغیچے میں ہوں گی چلیں باغیچہ بھی دیکھ لیں" منزوان نے کہا۔

باغیچہ مکان کی بہ نسبت کافی کشادہ اور وسیع تھا۔ ناشپاتی کے چند درختوں کے علاوہ وہاں پھولوں کی بیلیں اور گوبھی کی کیاریاں بھی تھیں۔ کہیں کہیں دیگر اقسام کی سبزیاں بھی لگی ہوئی تھیں۔ باغیچہ ہر چہار طرف سے پڑوسیوں کے مکانوں سے گھرا ہوا صرف جنوب کی طرف تنگ گلی کا ایک دروازہ کھلتا تھا۔ دروازہ کے پاس ہی ایک کوٹھری تھی اور کوٹھری سے ملحق مرغیوں کا ایک باڑہ تھا۔ بی ایک چوبی کرسی پر بیٹھی ہوئی سرما کی دھوپ کے مزے لے رہی تھیں۔ منزوان سیاہ کپڑوں میں ملبوس، بالوں کو کنپٹیوں سے اوپر باندھے ہوئے کیپٹن کے ساتھ چہل قدمی کرنے لگیں۔ ان کے چہرے پر وہی پاکیزگی اور وہی نکھار تھا اور آنکھوں میں وہی مدھم چمک تھی جنہیں دیکھتے ہی کیپٹن کو یقین سا ہونے لگتا تھا کہ وہ اب بھی جب چاہیں دوسری شادی کر سکتی ہیں۔

"کیا آپ خود ہی اس باغیچے کی نگہداشت کرتی ہیں؟"

"نہیں" میزبان نے جواب دیا۔ "چانگ سب کچھ کرتا ہے۔"

"یہ چانگ کون ہے؟"

"یہ ہمارا مالی ہے۔ جب کھیرے، ککڑیاں، خربوزے اور گوبھیاں تیار ہو جاتی ہیں تو وہ انہیں اچھے داموں میں فروخت کر... وہ نہایت ہی ایماندار شخص ہے۔ وہ اس کوٹھری میں رہتا ہے" منزوان نے کوٹھری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اسی لمحے مالی دروازے سے اندر داخل ہوا۔ وہ گہرے رنگ کا تھا اور اچھے خوبصورت اور تنومند جسم والا۔ دھوپ میں چمک...

اسکی قریب چالیس سال کی تھی اور چہرے پر کچھ ایسی بشاشت اور تازگی تھی کہ معلوم ہوتا تھا وہ ہر قسم کے تفکرات سے آزاد ہے۔
مسز وان نے کیپٹن سے چانگ کا تعارف کرایا اور چانگ ایک سادہ لیکن دلکش مسکراہٹ کے ساتھ کنوئیں کے پاس چلا گیا۔
ہت پانی نکالنے کے بعد ڈول اور ہاتھ کی مدد سے اوک بنا کر پینے لگا۔ پانی پینے کا یہ انداز کیپٹن کو بیحد پسند آیا اور ساتھ ہی مسز وان
پٹن کی تائید کی وہ کہنے لگیں: "میں نہیں جانتی کہ اسکے بغیر کس طرح گھر کا کام چل سکے گا۔ ایک پیسہ اجرت نہیں لیتا ہے۔ اسے صرف
ہتے اور سونے کے لئے کوٹھری، بس، اس سے زیادہ اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پیسے آخر کس لئے چاہئیں۔ وہ
، نہ بیوی نہ بچے۔ اسکی ماں جب تک زندہ تھی اسی گھر میں رہا کرتی تھی۔ اب اسکا کوئی نہیں ہے۔ بالکل اکیلا۔ دور کا بھی کوئی رشتہ
۔ میں نے تو صاحب اسقدر محنتی، ایماندار اور نفاست پسند شخص نہیں دیکھا۔ پچھلے سال میں نے اسے ایک جیکٹ بنا کر دیا تھا تو
تنی خوشامدیں کی تھیں تب جا کر اسنے اسے قبول کیا تھا۔ وہ جو کچھ ہم سے لیتا ہے اسکا کئی گنا وہ اس گھر کے لئے کرتا ہے۔"
دوپہر کے کھانے کے بعد کیپٹن پھر باغیچے میں گیا۔ چانگ اسوقت مرغیوں کے باڑے کو درست کر رہا تھا۔ کیپٹن بھی اسکا ہاتھ بٹانے
مسز وان کے متعلق اس سے گفتگو شروع کر دی۔

"آہ! کیا کہنے ہیں صاحب ان کے!" چانگ نے کہنا شروع کیا: "یہ نہ ہوتیں تو میری ماں اتنے آرام سے اپنی عمر کو نہ پہنچ پاتیں۔ یہ سب
فیض ہے۔ سنا ہے کہ انہیں پاکدامنی کا مینار ملنے والا ہے۔ بڑی بی کے شوہر کا انتقال اسوقت ہوا تھا جب کہ ان کی عمر بیس سال
ماں کے اکلوتے لڑکے کی شادی ان سے ہوئی۔ یہ بہت پرانی بات ہے۔ میں نے سنا کہ وہ بھی ایک صبح جب کہ بالوں میں کنگھی کر رہے
یک فرش پر گر کر مر گئے۔ اسوقت مسز وان صرف اٹھارہ سال کی تھیں اور امید سے تھیں۔ آخر مہوا پیدا ہوئی۔ یہ ایک اور بدنصیبی تھی۔ لڑکا
گھر کا نام چلتا۔ اور پھر آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ ایک عورت تمام عمر بیوہ رہ کر گزار دے۔ وہ چاہتیں تو نسل قائم رکھنے کے
دوسری شادی کر سکتی تھیں لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ بڑی بی نے چاہا بھی کہ اپنی بہو کے لئے کسی لڑکے کو متبنی بنا لیں لیکن آپ
ہیں کہ مختلف گھرانوں میں قدرت کچھ مختلف انداز میں کام کرتی ہے۔ بعض گھرانے اتنے پھلتے پھولتے ہیں کہ چھ چھ سات سات اولاد
ہے اور بعض گھرانوں کا چراغ یونہی بجھ کر رہ جاتا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ وان کا گھرانا مردوں کے لئے بڑا نحس ہے۔ اس لئے کوئی اپنا
بچے کو تیار نہ ہوا۔ بس لے دے کر ایک مہوا رہ گئی ہے۔ کپتان، تم اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" چانگ نے یکایک سوال کر ڈالا
خوبصورت اور پیاری لڑکی ہے۔ اور یقین ہے کہ وہ ایک نہایت اچھی بیوی ثابت ہوگی۔"
کیپٹن مالی کی زبان سے مہوا کے حسن کی تعریف سن کر مسکرایا اور پوچھنے لگا: "یہ پاکدامنی کا مینار کیا بلا ہے؟"
"ارے، تم نہیں جانتے؟ اب تک شہر بھر میں صرف ہر گھرانے کو یہ مینار نصیب ہوا ہے۔ وان قبیلے کے لوگ چاہتے ہیں کہ ان کے
ے کو بھی یہ اعزاز مل جائے۔ انہوں نے شاہی محلہ والوں کو ان بیواؤں کے لئے لکھا ہے جو اسی وان گھرانے کا ایک فرد ہے۔ بڑی بی کو
بیوگی برقرار رکھے ہوئے چالیس سال تو ہو چکے ہیں۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ شاہی محلہ شہنشاہ کے پاس ان بیواؤں کے اعزاز میں
پاکدامنی تعمیر کروانے کے لئے ضرور درخواست دے گا۔"

"اچھا تو یہ پیغام ہے؟"

"تو اور کیا کپتان، میں تم سے بھلا مذاق کیوں کرنے لگا! اور پھر یہ کوئی مذاق کی بات ہے بشہنشاہ خود یہ اعزا گا اور سنا ہے کہ مینار تعمیر کروانے کے اجازت نامہ کے علاوہ شاہی خزانے سے ایک ہزار تائیل بھی ملیں گے۔ اور وا بی مستحق بھی ہیں، میری مالکن ابھی جوان اور خوبصورت ہیں۔ اب بھی کئی ایسے ہوں گے جو ان سے شادی کرنے کو تیار ہو جائیں وہ تو اس گھرانے میں صرف بوڑھی ساس کی خدمت کے لئے رہ گئی ہیں تاکہ بڑی بی کا بڑھاپا عافیت سے کٹ جائے۔ کہ اگر وہ شادی کر کے کہیں اور چلی جاتی ہیں تو بوڑھی بی تنہا رہ جائیں گی۔ آپ ان کے اس خیال کی ضرور تعریف کریں گے۔ بعد ان کی امیدیں مہوا کی شادی سے وابستہ ہیں کہ ان کے شوہر کا نام چلتا رہے"

کیپٹن لی سانگ اب پہلے سے بھی زیادہ مہوا میں دلچسپی لینے لگا۔ ڈاکوؤں کی گرفتاری سے زیادہ مقدم اب اسکی نظر میں ی گرفتاری تھی۔ اور مہوا کے محبت کرنے کا انداز بظاہر بڑا معنوی تھا۔ بالکل سوسائٹی گرلز کی طرح جو اظہار محبت میں ذرا نہ مہوا بھی جو کچھ محسوس کرتی سانگ کے سامنے اگل ڈالتی۔ اس نے کسی بھی محسوس جذبے کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ یہ انداز بظاہر معنو لیکن سچی اور پرخلوص محبت میں ہمیشہ ایک خاص قسم کی کشش ہوتی ہے جسے انسان صرف محسوس کر سکتا ہے کیپٹن نے اس کشش کو شد سا محسوس کیا اور دونوں بچوں جیسی حرکتیں کرنے لگے۔ دوڑ بھاگ کھیل کود شرارتیں، چہلیں۔ غرض اس قسم کی تمام حرکتوں نے گھر کی بزرگ عورتوں پر ان کی محبت کو آشکارا کر دیا۔ لی سانگ کی عمر ستائیس سال کی تھی اور وہ ابھی غیر شادی شدہ تھا سلئے بڑی بی نے کہ یہ جوڑا ایک قدرتی جوڑا ہے اور قدرت نے خود ہی سارا انتظام کر دیا ہے۔ اور یہی سوچکر انہوں نے تمام احتیاطی تدابیر اختیار کر کر دیں تاکہ پاکدامنی کے مینار کا تصور جوان کے ذہن میں تھا کسی طرح منہدم نہ ہونے پائے۔ خود وہ پچھم والے کمرے میں سوتیں اور مہ اور مہوا کے لئے انہوں نے اندرونی حصے کے پورب والے کمرے میں انتظام کر دیا۔ جونہی رات کے کھانے سے فراغت حاصل ہوتی ا حصے کا دروازہ بند کر دیا جاتا۔ مسز وان نے تو یہاں تک احتیاط برتنا شروع کی کہ بستر پر جانے سے قبل اپنے کمرے کی چٹخنی بھی چڑھا کر لگی۔ لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ وہ محض اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہیں۔ کیپٹن جب کیمپ میں ہوتا ہے تو روزانہ شہر سے باہر ا سے ملا کرتا ہے۔ مہوا بھی اکثر و بیشتر سہ پہر کو گھر سے باہر چلی جایا کرتی اور رات گئے تک لوٹتی۔ اور اس قسم کی بے ضابطگیاں انہی دنوں عمل میں آتیں جب یہ سمجھا جاتا کہ کیپٹن شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔

ایک روز مہوا کو گھر لوٹنے میں کافی دیر ہو گئی۔ جولائی کا مہینہ تھا اور دن کافی لمبے تھے۔ شہر سے باہر ایک سڑک پر چلتے چلتے اور مہوا تالاب کے کنارے کنارے ایک سایہ دار راستے پر نکل پڑے جو سیدھا پہاڑی کے دامن کو جاتا تھا۔ سہ پہر کا سورج ٹھنڈا ہو اور یہ ایک نہایت خوشگوار سہ پہر تھی پہاڑی پر کھڑے سرسبز و شاداب درختوں کو چھوتی ہوئی ٹھنڈی ہوا ادھر سے ادھر دوڑ لگا اور تالاب سے دور ایک خوبصورت جھیل نظر آ رہی تھی۔ کیپٹن کے ساتھ بیٹھ کر مہوا نے محسوس کیا کہ اب اسکی زندگی کا خلا جاتا رہا حیات کی تکمیل ہو چکی ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے تاعمر محبت کرتے رہنے کی قسمیں کھا چکے تھے۔

باتوں باتوں میں مہوا نے اپنی ماں کا ذکر چھیڑ دیا کہ جب وہ جوان تھیں تو ان کے حسن کا چرچا ہر ایک کی زبان پر تھا اور بیسیوں سرداروں نے شادی کی درخواست کی چکے تھے۔ لیکن انہوں نے ایک ایک کر کے سب کو ٹھکرا دیا اسکے بعد مہوا نے یہ کہہ کر کیپٹن کو حیرت میں ڈال دیا کہ اگر میں ان کی جگہ ہوتی تو کب کا دوسرا بیاہ کر چکی ہوتی،

"تو کیا تم اپنی ماں پر فخر نہیں کرتیں ؟"

"بیشک کرتی ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایک عورت کو لازماً ایک مرد کے ساتھ گھر بسانا چاہیئے۔ پتہ نہیں کیوں، اخلاقیات کا سبق سنتے سنتے میرے کان پک گئے ہیں اور میں انہیں ایک ڈھونگ سمجھنے لگی ہوں"

"پھر بھی یہ ایک پارسا عورت ہی کا کام ہے کہ اسطرح پوری زندگی گزار دے" سانگ نے کہا۔

"آخر عورت کس لئے پیدا کی گئی ہے" مہوا نے تیزی سے کہا: "اسی لئے تاکہ شادی کرے، گھر بسائے اور اسکے بچے ہوں۔ کیوں؟ ماں کا عین جوانی میں بیوہ ہو جانا کتنا اذیت ناک تھا۔ خاص کر جب ہم اتنے غریب ہیں۔ میں ان کی قدر کئے بغیر نہیں رہ سکتی لیکن ——"

"لیکن کیا؟"

"مجھے پاکدامنی کے ان میناروں پر ذرا یقین نہیں آتا۔ جب میں ہوش گوش والی ہوئی جبھی سے میں نے ان کے متعلق سوچنا شروع کر دیا تھا۔ ماں ایک حوصلہ مند عورت ہیں اور اپنے خیالات میں بالکل اٹل"

اسکے بعد سانگ نے "پاکدامنی کے میناروں" کی بابت دریافت کیا جو مہوا کی ماں اور دادی کو ملنے والے تھے۔

"یوں تو مجھے خوشی ہے اگر ماں کو یہ اعزاز نصیب ہو جائے" مہوا بولی "لیکن جب ہماری شادی ہو جائے گی اور ہم یہاں سے چلے جائیں گے اسکے بعد دادی کی صحت کا بھی کیا ٹھکانہ ہے، کب جواب دے جائے —— پھر ماں یہ ایک ہزار تائیل لے کر کیا کریں گی۔ سونے سونے چوبیس سال اور تنہا رہ کر کس طرح گزار سکیں گی۔ یہ اعزاز اور یہ مینار کس کام کا۔ ایک روز یہی ہوگا کہ چپ چاپ مر جائیں گی۔ اور سادھو کی طرح انہیں کوئی دیکھنے والا بھی نہ ہوگا"

لی سانگ خاموش رہا۔ آخر وہ اس لڑکی سے کس طرح بحث کر سکتا تھا جسے زندگی سے بے حد پیار تھا اور جو دو بیواؤں کی ویران اور زندگی کی حصہ دار رہ کر اب حقیقت پسندانہ گفتگو کرنے لگی تھی۔

دونوں کچھ دیر خاموش رہے کہ یکایک پہاڑیوں کے پیچھے ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھ کر مہوا نے کہا: "اوہو، سانگ اب تو شام ہو گئی مجھے تو بھاگ کر گھر پہنچنا چاہیئے"

غرض اسی طرح دونوں کی ملاقاتوں کا سلسلہ چلتا رہا اور کانوں کان یہ خبر پڑوسیوں کے ذریعے مسز وان تک پہنچ گئی کہ دونوں ایک شہر سے باہر اس راستے پر بھی دیکھے گئے ہیں جو پچھم کی سمت پہاڑی کے دامن کو جاتا ہے۔ آخر وہ کس طرح خاموش رہ سکتی تھیں انہوں نے بیٹی سے سوال کر ہی ڈالا اور بیٹی نے نہایت سعادت مندانہ طور پر اپنے "جرم" کا اقرار کر لیا اور یہ بھی ظاہر کر دیا کہ کیپٹن نے اس سے شادی کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اتنا سننا تھا کہ ماں کا پارہ چڑھ گیا اور وہ تیز آواز میں بولیں میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میری

اپنی بیٹی ہی اس گھر کی ذلت کا باعث بنے گی۔ تیری دادی اور میں نے شہر میں ایک مثال قائم کر رکھی ہے۔ اور تو نے ہماری گھرانے کے نام کو بٹہ لگا دیا۔ پڑوسیوں کو جب تیری ان حرکتوں کا علم ہوگا تو کیا وہ انگلی اٹھانے سے باز آجائیں گے؟ یہ میری اپنی بیٹی، اُف!"

"ماں! مجھے نہ شرمندگی ہے اور نہ افسوس، بیشک میں اس سے محبت کرتی ہوں" مہوا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا: "میں اب بڑی ہو گئی ہوں تم کس طرح چاہتی ہو کہ اس خالی خولی گھر میں میں اپنے آپ کو بھی برباد کر ڈالوں جہاں پیار و محبت کا نام تک نہیں ہے۔ ماں! تم زندگی کو پاکیزگی اور پاکدامنی کا نام دیتی ہو مجھے اس میں سوائے خلا کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔"

مسز ڈان بیٹی کے منہ سے یہ باتیں سن کر حیران و ششدر رہ گئیں "کیا کہہ رہی ہے لڑکی" انہوں نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"ماں، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں" بیٹی نے کہا: "ماں! تم پھر شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔ ابھی تو تم بالکل جوان ہو"

"تیرے منہ میں کیڑے پڑ جائیں کمبخت!"

ایک ذہین اور مکمل طور پر تربیت یافتہ لڑکی ہی اس طرح ماں کے منہ پر سچائی کا تھپڑ رسید کر سکتی تھی لیکن اسے ذرا احساس نہ تھا کہ اسکی ماں کو کتنا دکھ پہنچا ہے اور اسکے الفاظ نے کتنے نشتر چبھو دیئے ہیں اور دوبارہ شادی کرنے کا خیال کس قدر وحشت ناک، مکروہ اور غیر متوقع ہے۔

"کیا تمام عمر یہی تربیت دی ہے میں نے؟ ذرا بھی شرم و حیا کا پاس نہیں رہا تجھے؟" اور مسز ڈان رونے لگیں۔ روتے روتے انہوں نے چلا چلا کر بین کرنا شروع کر دیا کسے معلوم تھا کہ ایک بات، ایک فقرہ بلکہ محض ایک لفظ بعض اوقات کس قدر اثر انگیز ہوتا ہے۔ انیس سال تک برداشت کی ہوئی تمام اذیتوں کا نچوڑ آج تلخ آنسوؤں کی شکل میں آنکھوں سے رواں تھا۔ کیا کچھ نہیں برداشت کیا تھا انہوں نے! آج اپنی بیٹی ہی ان پر ہنس رہی تھی، انکی تمام قربانیوں کا مذاق اڑا رہی تھی —— ایک ایسی بیوہ ماں کا مذاق جس نے بیٹی کی تربیت ہی کو مقصدِ حیات بنایا۔ بچپن سے آج تک اس نے کسی بیوہ پر کسی کو منہ آتے نہیں سنا تھا، اسکی پاکدامنی کو کسی نے نہیں جھٹلایا تھا۔ بیوہ کی کو جھٹلانا ایسا ہی تھا جیسے کوئی سورج کی روشنی کو جھٹلا دے۔ اور پھر اب جبکہ وہ انیس سال نہایت خاموشی سے گزار چکی تھی۔ دوبارہ شادی کرنے کا خیال کتنا مہمل اور کتنا بعید از قیاس تھا۔ وہ چاہتی تو مہوا کی پیدائش کے بعد ہی دوسری شادی رچا سکتی تھی —— لیکن انیس سال گزر چکے تھے۔

اور انیس سال بعد کے اس واقعہ نے ان پر اتنا اثر کیا کہ انہوں نے پھر بیٹی کے طنز کا کوئی جواب نہ دیا۔ بیٹی طنز لاکھ سچا اور بجا سہی لیکن ماں کے دکھوں کا مداوا نہ بن سکا۔ وہ چپ چاپ ہتھیلیوں میں سر کو دئیے روتی رہیں۔

کچھ دیر بعد ان کے آنسو تھمے اور ذہن نے ایک نیا موڑ اختیار کیا۔ مہوا اگر کیپٹن کے ساتھ رہ کر ہی خوش رہ سکتی ہے تو اس میں کیا برائی ہے۔ کیا حرج ہے اگر وہ ایک جوان مرد سے ملی ہے جبکہ وہ خود جوان ہے —— لیکن —— لیکن —— اور ذہن اُلجھ کر رہ گیا۔

آخر کار مسز ڈان نے فیصلہ کیا کہ جب تک کیپٹن واپس نہیں آجاتا ہے مہوا کے معاملات کا سلجھانا مشکل ہے۔ پھر انہوں نے سوچا کہ ممکن ہے کیپٹن شہر ہی میں ہو اور مہوا اسے آگاہ کرنے چلی جائے یا اس کے ساتھ کہیں فرار ہو جائے اسلئے انہوں نے مہوا کو اپنے کمرے

، باہر تالا ڈال دیا۔

تین دن بعد جب کیپٹن واپس آیا تو اتفاق سے اس وقت مسز وان ہی سے اسکی ملاقات ہوئی۔

"مہوا کہاں ہے؟" آتے ہی اس نے پوچھا۔

"وہ بالکل ٹھیک ہے اور اندر ہے"

"باہر کیوں نہیں آتی؟"

"مجھے اسی سوال کی توقع تھی" مسز وان نے ہونٹوں کو بھینچتے ہوئے کہا "میں سمجھی کہ تم شہر ہی میں کہیں ہو گے اور حیران ہو رہے ہو گے کہ وہ ساتھ اٹھکھیلیاں کرنے کیوں نہیں گئی"

"اٹھکھیلیاں کیسی؟" سانگ نے حیرت سے پوچھا "میں تو آج ہی صبح شہر آیا ہوں"

"بہانے بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سب کچھ جان گئی ہوں" مسز وان کے لہجے میں غم و غصے کی ہلکی آمیزش تھی۔

کیپٹن خاموش رہا۔ اتنے میں گھر کے پچھواڑے سے مہوا کے چلانے کی آواز سنائی دی "مجھے باہر آنے دو۔ سانگ میں یہاں ہوں سانگ۔ باہر نکالو سانگ"

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" سانگ چلایا اور دوڑتا ہوا اندر گھس گیا۔ مقفل دروازے کے دھڑ دھڑانے کی آواز قریب ہوتی جا رہی تھی۔ مسز وان نے بھی اندر ہال تک کیپٹن کا پیچھا کیا۔ بڑی بی بھی اپنے کمرے سے نکل آئیں۔ اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی کیپٹن کے پاس آئیں اور ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھتی ہوئی بولیں "بیٹا! کیا تم اس سے شادی کرو گے؟"

سانگ نے حیرت سے اپنا سر جھکا لیا۔ وہ اب تمام باتیں سمجھ گیا۔ اندر مہوا چلاتی رہی "سانگ، سانگ مجھے باہر نکالو"

"بیشک میں اس سے شادی کروں گا۔ اب آپ لوگ دروازہ کھولیں گی کہ نہیں"

دروازہ کھول دیا گیا اور مہوا کیپٹن کی آغوش میں آ گری "مجھے اپنے ساتھ لے چلو سانگ۔ اپنے ساتھ لے چلو"

اب ماں کی حالت غیر تھی اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ کیپٹن نے معذرت چاہی، ہاتھ جوڑے اور بار بار کوشش کی کہ کسی طرح ان کا رونا دھونا کم ہو جائے۔ اس نے سارے الزامات اپنے سر لے لیے لیکن ایسا معلوم ہوا کہ انہیں کیپٹن کے معافی مانگنے یا مہوا کے رونے چلانے سے تعلق نہیں ہے۔ وہ بس روتی رہیں جس کا سبب کیپٹن کی سمجھ میں نہ آ سکا۔ اپنی ساری کوششیں رائیگاں دیکھ کر کیپٹن اداس ہو گیا۔ اس وقت ذہن میں مہوا سے شادی کرنے کے خیال کے علاوہ کوئی اور خیال نہ تھا۔ اس نے قسمیں کھا کھا کر ماں کو یقین دلانا شروع کیا کہ وہ ضرور مہوا سے شادی کرے گا۔

آخر چند روز بعد حالات بدل گئے۔ ماں کے دل میں بیٹی کی محبت جاگ اٹھی اور بیٹی کی خوشی کو وہ اپنی خوشی محسوس کرنے لگیں اور وعدے کا ساتھ کیپٹن کے گھر والوں نے بھی دیا اور ان کی شادی کی بات طے پا جانے کے بعد جلد انتظامات تکمیل پا گئے اور کسی دقت کے بغیر مہوا کیپٹن کے ساتھ بیاہ دی گئی۔

کائنات میں غالباً صرف انسانی ذہن ہی ایک ایسی شے ہے کہ جس کے بارے میں قطعی طور پر کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ ایک پل میں یہ کیا صورت اختیار کرے گا کوئی نہیں جانتا۔ مہرآ کی شادی کے بعد منزوان کے ذہن کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ عظیم ذہنی انقلاب سے دوچار ہو گئیں۔

تین ماہ بعد بڑی بی اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ کیپٹن تنہا تجہیز و تکفین میں منزوان کی مدد کو آیا۔ منزوان نے اسے تب کے مورث اعلیٰ آئے تھے، انہوں نے شاہی محلّم کا وہ خط بھی دکھایا تھا جس میں انہوں نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ پاکدامنی کے ضرور سفارش کریں گے اور اب گویا یہ یقینی امر ہے کہ اس گھرانے کو یہ مینار مل جائے گا۔ خاندان کے تمام افراد یہ خبر سن کر بےحد مسرور ہیں۔ انہوں نے ان بیواؤں کو "پاک دیویاں" کے نام سے موسوم کرنا شروع کر دیا ہے جو بذات خود ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔

منزوان نے یہ تمام باتیں اپنے داماد سے سرسری طور پر کہہ ڈالی تھیں جن کے اظہار میں نہ کسی قسم کا جذبہ تھا اور نہ خوشی بلکہ کہیں نہ شک و شبہ کا بھی اظہار کیا تھا۔

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔" کیپٹن سانگ نے کہا۔ "کیا آپ خوش نہیں ہیں؟"

"کیا معلوم، کہو مہرآ کیسی ہے؟"

کیپٹن نے خوشخبری دی کہ جلد ہی ولادت ہونے والی ہے اور وہ مارے خوشی کے تھر تھر کانپنے لگی۔ "تم نے تو اتنی دیر تک نہ بتایا۔ یہی تو ایک خاص خبر ہے!"

"مگر مینار کے آگے اس کی کیا اہمیت ہے۔" کیپٹن نے کہا۔

"مینار!" منزوان نے حقارت آمیز لہجے میں کہا۔ "چھوڑ دو ان باتوں کو۔"

اس غیر معمولی اعزاز کی بابت منزوان کا یہ ردّعمل دیکھ کر کیپٹن بےحد متحیّر ہوا۔ اسے مہرآ کی وہ باتیں یاد آنے لگیں جو اس نے اس کے متعلق کہی تھیں کہ تقریباً بیس سال کی قید تنہائی میں یہ اعزاز ان کے کس کام آئے گا؟ تو کیا انہوں نے بھی اسی زاویئے سے سوچا ہے۔ کیپٹن کے ذہن میں یہی سوال بار بار ابھرنے لگا۔

"تمہارا خیال ہے کہ میں اسے قبول کر لوں؟" یکایک منزوان نے اسی موضوع کی طرف پلٹتے ہوئے پوچھا۔

"یہ حماقت ہو گی اگر اسے نہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" کیپٹن کی آواز گلے میں رندھ گئی اور اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ جب مینار کی منظوری مل جائے گی تو آپ کی بیوگی کو اعلیٰ ارفع مقام حاصل ہو جائے گا۔ اور آپ امر ہو جائیں گی۔"

تجہیز و تکفین کے بعد منزوان واپس گھر چلی آئیں جہاں ماتمی جھنڈیوں اور دروازے کے پردوں نے ایک ہیبت سی طاری کر رکھی تھی اور اب گھر میں ایک گمبھیر سناٹا تھا اور منزوان کے ذہن میں الجھاؤ پیدا کرنے کے لئے وقت کے لامتناہی سلسلے۔ ۔ ۔ وہ جس تنہائی کے بارے میں سوچتیں اسی قدر ان کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا جاتا۔ ابھی چند مہینے پیشتر کی تو بات تھی کہ بڑی بی، ان کی لڑکی مہرآ اپنے جاں افروز قہقہوں سے گھر میں زندگی کی ایک لہر دوڑا رکھی تھی لیکن اب۔ ۔ ۔ ؟ اب تو تابڑ توڑ کئی واقع، کئی حادثے گزر چکے۔

مہتا کا ارمان، اسکی شادی، بڑی بی کی موت اور شہرت وعزت کی یہ ہولناک بلندی ۔۔ اور ۔۔۔ اور ۔۔۔!

چانگ اپنی مالکن کو اداس دن گئیں دیکھ کر اور بھی پھرتیلا بن گیا۔اب تو وہ مہتا کی جگہ بازار سے سودا سلف بھی لانے لگا اور سبزیاں فروخت کر کے اسنے آمدنی کی ایک صورت بھی پیدا کر دی۔غرض یہ کہ تمام گھریلو تفکرات سے اس نے اپنی مالکن کو نجات دلادی اور باہر کی دنیا سے جس قسم کی ضرورت بھی پیش آتی وہ اسے پورا کرنے کی کوشش کرتا رہتا

منزوان باورچیخانے سے اپنے اس ایماندار محنتی اور وفا شعار مالی کو کام کرتے ہوئے دیکھا کرتیں اور کبھی کبھی تنہائیوں سے اکتا کر دو باتیں کرنے باغیچے میں بھی چلی جایا کرتیں۔ باغیچہ ہر چہار طرف سے گھرا ہوا اور بند تھا۔ پڑوسی انہیں کسی صورت میں بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔اسطرح دونوں کے درمیان ایک طرح کا دوستانہ پیدا ہو گیا۔آخر دونوں ہی تنہائی کے ڈسے ہوئے تھے ۔۔۔!

اسی درمیان میں خاندان کے مورث اعلیٰ تجہیز وتکفین کے لئے شاہی محل سے تین ہزار تائیل کا عطیہ لے کر آ گئے اور اب مینار اور ایک ہزار تائیل کی منظوری میں کسی قسم کے شبہے کی گنجائش باقی نہ تھی۔تمام کاغذات مکمل ہو چکے تھے۔

مورث اعلیٰ جب واپس چلے گئے تو چانگ نے اپنی مالکن کو دلی مبارکباد دی اور بے پناہ فخر محسوس کرنے لگا۔اس کے ذہن میں محض ایک ہی خیال تھا کہ اسکی مالکن اب جلد ہی شہر کی ایک نمایاں اور معزز خاتون مشہور ہو جائے گی۔

ان سب کے باوجود منزوان کا ذہن پرسکون اور مطمئن نہ تھا۔بار بار ایک خیال ان کے ذہن پر ہتھوڑے دیتا رہتا اور بارہا وہ اس خیال کے اظہار کے لئے باغیچے چلی جاتیں مگر صرف سبزیوں کے متعلق پوچھ گچھ کر کے رہ جاتیں۔ہر مرتبہ پچھلے برسوں کی تمام تپسیا اور پارسائی و پاکدامنی آڑے آتی اور یہ پریشان کن خیال الفاظ کی صورت اختیار نہ کرنے پاتا۔چانگ جو بیحد ایماندار اور وفا شعار تھا اپنی مالکن کو عورت ہی نہیں گردانتا تھا۔وہ تو اسے دیوی سمجھتا تھا۔محض دیوی ۔۔ جو پاک اور مقدس تھی۔

مہتا کے ہاں جب بچی پیدا ہوئی تو دونوں میاں بیوی نو مولود بچی کو لے کر منزوان کے پاس آئے۔منزوان نے جب اپنی نواسی کو دیکھا تو بیساختہ اسے گود میں لے لیا اور اس پھولی پھولی سی چینی کی گڑیا کو اپنی چھاتی سے لگا کر زندگی کی بھرپور حرارت محسوس کرتی رہیں۔آج برسوں کی مدت کے بعد ان کی گود میں ایک بچی ہمک رہی تھی۔اور منزوان اس کم عمری میں نانی بن جانے پر بے حد خوش تھیں۔

"آج تم دونوں میاں بیوی کو دیکھ کر میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔اور تم بھی یقیناً اپنی اس بچی اور اپنے شوہر پر انتہائی فخر محسوس کر رہی ہو گی"

مہتا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔اسنے سوچا کہ اب ماں کے دل میں انسانی ہمدردی خوب بھر گئی ہے اور انہوں نے یقیناً اسے معاف کر دیا ہے۔لیکن اسی دن اسنے ماں کو تنہائی میں بیٹھی ہوئی فکر مند دیکھ کر یہ اندازہ لگایا کہ ماں کے چہرے پر اب وہ اگلا سا اطمینان نہیں ہے بلکہ تفکرات کی گہری لکیریں نمایاں ہو گئی ہیں۔

اور اسی دن کیفی کے ساتھ وہ ذہنی حادثہ بھی پیش آیا جس نے ساری کایا پلٹ دی۔ہوا یوں کہ جب وہ باغیچے جا رہا تھا

اسکی نظر چانگ پر پڑ گئی جو اسوقت زمین کھود رہا تھا۔ چانگ نے دیکھتے ہی اپنی کوٹھری میں لے گیا جہاں وہ سویا کرتا تھا کپتان کو حیرت تو ضرور ہوئی لیکن وہ چانگ کی صورت دیکھنے لگا جس میں بیک وقت مسرت بھی تھی اور الجھاؤ بھی تھا۔

"کپتان میں ایک جاہل آدمی ہوں مجھے مشورہ دو کہ میں آخر کیا کروں" چانگ کہنے لگا۔

"کس بارے میں ؟"

"اپنی مالکن کے بارے میں" چانگ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

"کیا کوئی خاص مصیبت آ پڑی ہے ؟"

"نہیں کپتان، یہ بات نہیں ہے۔ بلکہ اس معاملے میں صرف تم ہی مشورہ دے سکتے ہو کہ آخر کروں تو کیا کروں ؟"

"تو تمہارا بھی اس معاملے سے تعلق ہے کیا ؟"

"ہاں"

"پھر تو پوری بات بتانی چاہئے کہ میرے یہاں سے جانے کے بعد تم دونوں کے مابین کون سی بات پیدا ہو گئی !"

مالی نے آہستہ آہستہ پوری بات بتانی شروع کر دی اور جوں جوں اصل واقعہ سامنے آتا گیا کپتان کی قوت سامعہ جواب دینے لگی جیسے وہ مزید باتیں سننا نہیں چاہتا ہو یا جو کچھ سن چکا ہے اس پر اسے قطعی اعتبار نہ آ رہا ہو۔

گرمیوں کی ایک رات تھی اور چانگ صرف تہبند باندھے چٹائی پر لیٹا ہوا تھا کہ اسے اپنی مالکن کے پکارنے کی آواز سنائی دی "چانگ!" چاند اسوقت مغربی آسمان پر نہایت آب و تاب سے چمک رہا تھا اور اسکی کرنیں ٹھیک چانگ کے بستر پر تھیں۔ چانگ نے سر اٹھا کر دروازے کی طرف نگاہ کی تو دیکھا کہ مالکن کھڑی ہیں۔ وہ انہیں دیکھتے ہی بڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور جاکر دریافت کیا کہیں "کوئی کام تو نہیں ہے اسوقت !"

"نہیں" مسز وان نے کہا "تم واقعی بڑی گہری نیند سوتے ہو۔ میں نے مرغیوں کے چیخنے چلانے کی آواز سنی تو سمجھی کہ کہیں کوئی جنگلی بلا نہ ہو چلو کرتے سنا گیا ہو۔"

مرغیوں کے باڑے تک پہنچنے کے لئے مسز وان کو لازماً چانگ کی کوٹھری کے قریب سے ہو کر گزرنا تھا۔ اسوقت رات کے تین بج چکے تھے اور تمام گھاس شبنم سے بھیگ چکی تھی۔

"جاکر سو جاؤ چانگ" مسز وان نے کہا "ممکن ہے تمہیں سردی لگ جائے۔ بغیر جیکٹ کے باہر کھڑے رہنا ٹھیک نہیں" لیکن چانگ اپنی مالکن کے اصرار کے باوجود انہیں باورچی خانے تک چھوڑ آیا۔ واپس آکر وہ دیر تک سوچتا رہا کہ آخر مرغیوں کے چیخنے چلانے کی آواز اس نے نہیں سنی جنگلی بلے تو آتے ہی رہتے ہیں لیکن مرغیوں کا باڑا نہایت محفوظ ہے۔

دوسرے دن پھر مالکن نے ہدایت دی "مرغیوں کے باڑے کو نہایت مضبوطی سے بند رکھا کرو تاکہ کوئی جیز اندر نہ آ سکے"

"آپ مطمئن رہیں" چانگ نے کہا۔

تیسری رات کو خلاف توقع مرغیوں کے ساتھ آخر یہ حادثہ پیش آ ہی گیا کہ ایک موٹی سیاہ مرغی جنگلی بلے کی نذر ہو گئی۔ چانگ کی
ی آواز سے محسوس کیا کہ کوئی اسکے جسم پر چادر ڈال رہا ہے اور اب اسے جھنجوڑنے لگا ہے۔
کیا بات ہے ؟" وہ اٹھ بیٹھا۔ دیکھا تو یہ مالکن تھیں۔
"ابھی ابھی جنگلی بلا دیوار سرا رکر گیا ہے "
چانگ پھرتی سے جیکٹ پہن کر مالکن کے ساتھ ہو گیا اور دونوں جائے وقوع کا معائنہ کرنے چل پڑے۔ باڑے میں ایک جگہ بہت
خ تھا۔ مالکن نے انگلی سے اس جگہ کی طرف اشارہ کیا جہاں انہوں نے بلے کو دیکھا تھا۔ وہ دیر تک بلے کے پیروں کے نشان ڈھونڈ
ہیں نشان نہ ملا۔ البتہ دیوار کے پاس پھولوں کی کیاری میں سوئی۔ کالی مرغی مردہ پڑی تھی۔ گردن کے پاس گہرا زخم تھا۔ چانگ اپنی
ی کی معذرت چاہنے لگا لیکن مسز وان نے نہایت نرمی سے کہا "کوئی بات نہیں۔ اپنا کیا نقصان ہوا۔ میں اسے کل کے کھانے کے لئے
ہوں "
"ایک بات پوچھوں !" چانگ نے کہا "آپ رات کو سوتی نہیں ہیں کیا ؟"
"ہاں، میں اکثر جاگتی رہتی ہوں۔ علاوہ اسکے نیند بھی میری بڑی ہلکی ہے۔ میں نیند میں بھی دھیمی سے دھیمی آواز سن سکتی ہوں "
بعد ازاں دونوں مالی کی کوٹھڑی تک گئے۔ لیکن مسز وان دروازے ہی پر کھڑی رہیں۔ چانگ نے دیکھا کہ مالکن کے لباس اور ناخنوں
ے دھبے پڑے ہوئے ہیں۔ اسنے مری ہوئی مرغی کو فرش پر پھینک دیا اور مالکن کے ہاتھ دھونے کے لئے پانی لے آیا۔ وہ جب ہاتھ
چکیں تب چانگ نے دریافت کیا کہ "آپ اسوقت چائے پئیں گی یا ۔ ۔ ۔ ؟"
پہلے تو مالکن نے انکار کیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ تیار ہو گئیں۔
"میں آپ کے کمرے میں لیتا آؤں ؟" چانگ نے پوچھا۔
"نہیں یہیں ٹھیک ہے "
"بس ابھی لایا "
"جلدی کرنے کی ضرورت نہیں ہے" مسز وان بولیں اور چانگ کے بستر پر بیٹھ گئیں۔ چٹائی اور چادر کے کھردرے پن کو محسوس کرتے ہوئے
کہا "چانگ، مجھے علم نہیں تھا کہ تمہارے پاس ابھی چادر نہیں ہے۔ کل ایک عمدہ چادر مجھ سے لے لینا "
دوسرے دن جب کھانے پر مرغی لائی گئی تو پھر انہوں نے چانگ کو جنگلی بلے کے متعلق بتاتے ہوئے کہا "باڑے کا وہ سوراخ بند
ر نہیں ؟"
"جی ہاں"
"سمجھ لو۔ وہی بلا آج پھر آ جائے گا۔"
"کیوں، آپ کو کس طرح معلوم ہوا ؟"

"اسلئے کہ رات وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ تھا بڑا بزدل ابھی تو آہٹ پاتے ہی شکار چھوڑ کر بھاگ گیا۔ وہ چوزوں پر مر رہے گا۔ اور وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ چوزے کہاں رہتے ہیں۔ وہ اگر سمجھدار ہوا تو آج رات پھر آئے گا"

"چنانچہ میں نے تہیہ کر لیا کہ آج تمام رات جاگ کر گزاروں گا" مالی نے واقعہ کا تسلسل قائم رکھتے ہوئے کہا "اور کمبخت بلے کو رہوں گا۔ سرشام ہی میں لیمپ کو دھیما کر کے جھاڑیوں کے پیچھے ایک تپائی پر بیٹھ گیا ساتھ میں ایک موٹی سی لاٹھی بھی رکھ لی جو کسی بھی بلا باہر نکال سکتی تھی ——— چاند سر پر سے ہوتا ہوا پچھم کی طرف اترتا جا رہا تھا۔ لیکن ابتک کسی بلے کا پتہ نہ تھا مجھے جھپکی سی آنے لگی اور میں ہی کہہ رہا تھا کہ اپنی کوٹھری میں چلا جاؤں۔ اسی اثناء میں مالکن کی دھیمی آواز سنائی دی اور میں ٹھٹک گیا ———" چانگ!

میں نے مڑ کر دیکھا تو سامنے مالکن سر سے پیر تک سفید لباس میں میری جانب بڑھ رہی ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ماکو محل سے باغ کی سیر کو نکلی ہے۔ قریب آکر انہوں نے آہستہ سے کہا "کچھ دیکھا تم نے؟"

"نہیں تو" میں نے جواب دیا۔

"آؤ تمہاری کوٹھری میں چل کر انتظار کریں" انہوں نے کہا۔

"وہ رات زندگی کی تمام راتوں سے سہانی اور پیاری رات تھی کپتان! ہم دونوں اس کوٹھری میں بیٹھے تھے جبکہ سارا عالم میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسی صبح انہوں نے مجھے نئی چادر دی تھی جو اسقدر سفید تھی کہ میں اس پر بیٹھ کر اسے خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر بھی بیٹھے کھڑکی سے آتی ہوئی چاند کی روپہلی کرنوں کو دیکھتے رہے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ہم ایک دوسرے کو برسہا برس سے جانتے چلے آتے ہیں۔

"ہم وہاں بیٹھ کر دنیا جہان کی باتیں کرتے رہے بلکہ یوں کہا جائے کہ مالکن ہی دنیا بھر کی باتیں پوچھتی رہیں ——— باغیچے کی زندگی اور زندگی کی تمام مصیبتوں اور مسرتوں کے بارے میں پوچھ گچھ کرتی رہیں۔ آخر میں انہوں نے میری پچھلی زندگی کے بارے میں بھی پوچھنا شروع کر دیا اور یہ بھی پوچھا کہ میں نے ابتک شادی کیوں نہیں کی۔ میں نے یہی کہا کہ میں بیاہتا زندگی کے خرچ پورے نہیں...

"اور اگر خرچ پورا ہو جائے تو کیا شادی کر لوگے" مالکن نے کہا۔

"ہاں ضرور" میں نے کہا اور مالکن پر جیسے بیہوشی طاری ہو گئی، چاند کی روشنی میں ان کا زرد چہرہ اور جواہر کی طرح چمکتی ہوئی آنکھ مجھے ایسی لگیں کہ یہ مالکن نہیں بلکہ کوئی آسمانی شے زمین پر اتر آئی ہے۔ میں خوفزدہ سا ہو گیا۔

"کیا آپ واقعی مالکن ہیں یا ماگو پری، جو اپنے سفید لباس میں چاند کی کرنوں کے ساتھ نیچے اتر آئی ہے" میں نے پوچھا۔

"چانگ احمق نہ بنو ——— میں پری وری نہیں ہوں"

"لیکن مجھے وہ اور بھی غیر حقیقی معلوم ہونے لگیں۔

"اسطرح کیوں گھور رہے ہو۔ میں واقعی ایک عورت ہوں۔ مجھے چھو کر دیکھو" اور انہوں نے اپنا بازو میری طرف بڑھا دیا۔ ... نے اسے چھوتے ہی محسوس کیا کہ ان کے جسم میں کپکپی دوڑ رہی ہے۔

اف کیجئے، میں نے خواہ مخواہ آپ کو خوفزدہ کر دیا۔ یقین مانئے، ایک لمحے کے لئے مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔
، ماگوپری زمین پر اتر آئی ہے۔"

کیا میں واقعی اتنی حسین ہوں چانگ؟" انہوں نے کہا۔ "خدا کرے میں تمام عمر ایسی ہی رہوں۔ اچھا، یہ بتاؤ، کیا ماگوپری بھی اس
ن کی طرح محبت یا شادی کرتی ہے؟"

مجھے کیا پتہ؟ میں نے تو ماگوپری کو کبھی دیکھا ہی نہیں ہے۔"

کے بعد انہوں نے ایک ایسا سوال کیا کہ میں حیران رہ گیا۔ "آج رات اگر ماگوپری تمہارے پاس آجائے تو کیا تم اس سے محبت
یہ کہ مجھے تم کس روپ میں پسند کرو گے، ماگوپری کے روپ میں یا محض ایک عورت —؟"

ہوں مذاق کرتی ہیں مالکن، میں کس طرح ایسی جرأت کر سکتا ہوں۔"

ہیں، بالکل سچ کہہ رہی ہوں — کیا تمہیں خوشی نہیں ہوگی اگر ہم دونوں ——— مہوا اور کپتان کی طرح — میاں بیوی
ی تمام کر دیں؟"

الکن، کیا کہہ رہی ہیں آپ —؟ اور اس مینار کا کیا ہوگا؟"

چھوڑو مینار دینار کو — میں صرف تمہیں چاہتی ہوں — ہم نہایت ہنسی خوشی زندگی کے دن گزار سکیں گے۔ مجھے لوگوں کے
ی پرواہ نہیں ہے۔ میں بیوگی کے پورے بیس سال گزار چکی ہوں اور یہ بہت ہے۔ مینار کے لئے اور دوسری عورتیں
گی،" اتنا کہہ کر انہوں نے مجھے چوم لیا۔

راب کپتان، بتاؤ کہ میں کیا کروں؟" چانگ نے کہانی ختم کرتے ہی پوچھا۔ "میں کیسے اس گھرانے کی بڑائی کو مٹی میں ملا دوں لیکن
ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ انہوں نے ابھی ابھی مجھ سے شادی کرنے کو کہا ہے۔ ذرا غور کرو۔ یہ مالکن کا امر ہے —!
ہا ہے کہ وہ میرے ساتھ تمام عمر خوش رہ سکیں گی اور میں اسی طرح گھر کی تمام ذمہ داریاں سنبھالے رہوں گا جیسا کہ اب سنبھال رہا ہوں
، کیا کروں؟"

بی ساگ کے ذہن میں چانگ کی تمام باتیں دھیرے دھیرے اتر چکی تھیں۔ اس نے ایک ایک فقرہ اور ایک ایک لفظ کو
لینے کی کوشش کی تھی اور اب جبکہ پھر چانگ نے اپنا سوال دہرایا تو ذہن پر کافی بوجھ محسوس کرنے کے بعد اس نے کہا "کیا کرو؟
، شادی کر ڈالو" اور کیا!"

ں نے آناً فاناً مہوا کو خبر دی اور مہوا بلا تامل کہہ اٹھی "یہ تو نہایت خوشی کی بات ہے۔" پھر اسنے آہستہ سے شوہر کے کان میں کہا:
نے ہی وہ مرغی ماری ہوگی اور میرا خیال ہے کہ چانگ جیسے مردوں کے لئے بھی پاکدامنی کا مینار نصب ہونا چاہئے۔"

ت کے کہنے کے بعد کپتان نے مہوا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "ماں، میں سوچتا رہا ہوں کہ یہ ہماری بچی آپ کے لئے بخت
ست بنی ہوگی۔ اب پتہ نہیں کب ہمارے ہاں بیٹا ہوگا جو اس گھرانے کا نام چلا سکے گا۔"

منزوان نے اوپر سر اٹھا کر کیپٹن کی طرف دیکھا اور کیپٹن اسی طرح سر جھکائے نگاہیں زمین پر جمائے آہستہ آہستہ کہتا گیا "آپ اسے مذاق میں نہ لیں کہ میں آپ کے متعلق یہی سوچ رہا ہوں ماں، کہ بڑی بی کی موت کے بعد آپ بالکل تنہا رہ گئی ہیں۔ کس طرح آپ تمام کاٹ سکیں گی۔ چانگ ایک ایماندار شخص ہے۔ آپ اگر اجازت دیں تو میں اس سے بات کروں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ آپ سے شادی کر کے وان گھرانے کا نام اختیار کرنے پر فخر محسوس کرے گا۔"

منزوآن سر سے پاؤں تک کانپ گئیں اور ان کا چہرہ تمتما اٹھا صرف اتنا کہہ سکیں "ہاں، وان گھرانے کا نام۔ ۔ ۔ ۔" اور دوڑ کر اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئیں۔

اور جب مالی سے ان کی شادی ہو گئی۔ تو خاندان والوں کی عظمت کا مینار زمین بوس ہو گیا۔ مورش اعلیٰ صرف اتنا کہہ سکے ـــ "عورت، عورت ہے۔ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

محمد عمر میمن

"مونا لزا"

ہ ایک موسمِ گرما کی خاصی گرم صبح تھی اور یونی ورسٹی کی حدود میں ہزار ہا قسم کی سرگرمیاں اپنے نقطۂ عروج پر تھیں۔ خوبصورت، جمیل لڑکیاں
خرامی، تمکنت اور وقار سے رنگ برنگی تتلیوں کی مانند ادھر سے ادھر منڈلاتی پھر رہی تھیں اور منچلے خوش پوشاک لڑکے سینہ پھیلائے بڑے فخر
انداز میں ایک ڈپارٹمنٹ سے دوسرے تک گلگشت کر رہے تھے پورا کوری ڈور (CORRIDOR) طرح طرح کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ نرم، ہلکی
ترنی آوازیں جو ایک دوسرے میں اس طرح ..... ہو گئی تھیں کہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہزار ہا شہد کی مکھیاں ایک ساتھ بھنبھنا رہی ہوں،
یا جیاں ہاتھوں میں ضخیم کتابوں کا بوجھ سنبھالے اپنی کلاسوں کی جانب رواں دواں تھے، اور ——— یونی ورسٹی کینٹین (CANTEEN) کے بیرے
ن میں چائے کی کشتیاں اٹھائے مصروفِ کار تھے۔ ایک پرسکون تازگی بخشنے والی بڑی سبک خرامی سے چل رہی تھی۔ اور گارڈن کے موزیک
ندہ چمکیلی روشوں پر ہزار ہا رنگین پھول ہوا کے مدہوش پرمسرت اور شادمانی سے یوں جھوم رہے تھے۔ جیسے حسین ہسپانوی دوشیزائیں
ن۔ رول کی موسیقی پر بڑی تیزی اور بیباکی سے رقص کر رہی ہوں۔

اور اس سہانے سے ایک نوجوان جو اکثر بجھا بجھا سا رہتا تھا۔ آج بھی حسبِ سابق کسی گہری بےچینی، کسی اندرونی تاسف سے یوں ہی مضطر
لہریں غلطاں سا تھا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے ڈانواں ڈول خیالات قلابازیاں کھا رہے تھے۔ اس کی فکر کا کوئی معین محور نہ تھا۔ وہ ایسا کوئی بہت
بت بھی نہ تھا کہ اسے حسن کے دیوتا کیوپڈ (CUPID) سے ہی تشبیہ دی جا سکتی لیکن پھر بھی اس کے سانولے رنگ میں بے پناہ کشش تھی۔ جاذبیت
.. جانے آج کیا بات تھی ... حسبِ سابق اس کے الجھے ہوئے بال اسی بےترتیبی سے اس کی پیشانی پر آج نہیں پھیلے ہوئے تھے اور
رح آج اس کی ڈاڑھی بھی بڑھی ہوئی تھی .... پھر کچھ یوں ہوا کہ اس کی آنکھیں کسی اندرونی مسرت سے چمکنے لگیں وہ آنکھیں ... جنہیں
مناطیسی کشش تھی، اسکے چلنے کا انداز بھی۔ سیدھا سادہ سا تھا۔ ناپ ناپ کر تول تول کر وہ قدم رکھتا ہوا ہاتھوں میں کیٹس (KEATS) کی
کا مجموعہ اور سوپاساں کی کہانیاں تھامے دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔ جوں ہی وہ کوری ڈور کے نزدیک پہنچا جانے کہاں سے ہوا کا ایک شریر جھونکا
اور مسکراتے ہوئے دھیرے سے اس کے بالوں کی ایک لٹ کو چومتا ہوا نکل گیا۔ لیکن بظاہر وہ اس حقیقت سے بالکل بےخبر تھا۔ جانے وہ کیا سوچ
اور کسکے متعلق؟ جانے آج کون خوشگوار یا ناخوشگوار واقعہ پیش آنے والا تھا .... پھر اس نے ایک نگاہ غلط انداز سامنے کے کنج پر ڈال جہاں
ے سرخ پھولوں کا جال سا بنا ہوا تھا جس پر شہد کی مکھیاں اور دیدہ زیب خوشنما رنگوں والی شوخ تتلیاں خوشی اور مسرت کے لازوال جذبے
ڈتی پھر رہی تھیں۔ جیسے وہ بہت خوش تھیں۔ جیسے یہ گرم دن اب کبھی نہ ختم ہونگے۔ جیسے اب سردیاں کبھی نہ آئیں گی اور وہ انہیں یوں گردکرتی
میں پھولوں کی محبت میں باہر نکلتا پڑے گا۔ شوخ گلاب شباب کے انوکھے جذبے کی شدت سے یوں ان تتلیوں کو لپٹ کر دیوانہ وار رقص و سرود
خوشی سے مسکرا رہے تھے۔ موزیں نوکیلے طرح لپک رہے تھے۔

دفعتاً اس کا چہرہ کسی انجانے جذبہ سے جو یقیناً بہت ہی خوشگن تھا بالکل اشارہ دھیرے سے سیمینار (SEMINAR) میں داخل ہوگیا۔ "کیا تم میرے ساتھ کافی ہاؤس چل سکو گے کمال ـــ ؟" اس نے اپنے دوست سے پوچھا جو اس وقت اپنے کو شیلی (SHELLEY) کی دلکش نظموں میں ڈبوئے دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے تصورات کی جنت بسا رہا تھا ۔۔۔۔۔۔

اچھا تم ۔۔۔۔ ہاں ، میرا خیال ہے مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا ۔۔۔۔۔ ! اس نے فضا میں ترنم ریز مسکراہٹیں بکھیرتے ہوئے رضامندگی کا اظہار کیا ۔۔۔۔۔

جوں ہی وہ زینے سے اتر رہے تھے ۔ ان کی نگاہیں کسی چمکیلی شے کی جگمگاہٹ اور رم جھم سے خیرہ ہوگئیں ۔۔۔ ایک جیتی جاگتی حسن کی تمام جلوہ سامانیوں سے مزین تصویر بجلی کی طرح لمحہ بھر کے لئے ان کے سامنے چمکی اور پھر دور خلاؤں میں بتدریج تحلیل ہوگئی ۔ دونوں نے ایک رزقی ہوئی نگاہ حسن کے لازوال شاہکار [illegible] پر ڈالی ۔۔۔۔۔

[illegible] ۔۔۔۔ مجھے یقین ہے ۔۔۔ بہار نے اپنی صدیوں پرانی زندگی میں بھی اس سے خوبصورت کوئی پھول نہ دیکھا ہوگا ۔۔۔ !"

"ہاں ! وہ فطرت کا سب سے حسین سب سے دلکش شاہکار ہے !" کمال نے تائید میں سر ہلا دیا ۔ اور اس کا دل کسی انجانے جذبہ سے تیز بہت تیز دھڑکنے لگا ۔ ' ۔۔۔۔۔۔۔ جانے آج کیا ہونے والا ہے ۔ ؟ اس کے چہرہ پر سرخی پھیل گئی ـــ شاید اس لئے کہ وہ اس سے محبت کرتا تھا ۔ وہی کیا اس کی عمر کا ہر ایک جوان اس پرستش پر اپنے کو قابل فخر سمجھتا ۔ آرٹ کا مایۂ ناز شاہکار تھی ۔ کسی شاعر کے حسین ترین تخیل سے بھی زیادہ حسین و ۔ ! کسی بت تراش پگملین (PYGMLION) کا حسین ترین مجسمہ گیلیٹیا (GALATEA) جس سے اس کے خوابوں کی تمام تعبیریں وابستہ تھیں ۔۔۔ اور اگر کہیں کیٹس (KEATS) اس کے حسن لازوال کی ایک ہلکی سی جھلک کہیں پوری چھپے دیکھ لیتا تو وہ شاید اپنے کو روئے زمین پر سب سے خوش قسمت انسان تصور کرتا جسے فطرت نے ایک ایسی دلفریب و دلکش صورت دکھا دی تھی اور اگر شیلی کا ہاں سے گزر ہوتا تو اسکے حسن کی ایک ایک صنو فشاں لہر اس کی شاعری کے قالب میں دھڑک دھڑک اٹھتی اس کی عمر بھی رہ رہتی جب فطرت خوبصورتی اور حسن عطا کرنے میں انتہائی مہربانی اور فراخدلی کا ثبوت دیتی ہے !

اس کا متناسب الاعضاء جسم ، متناسب قد و قامت اور اس کا حسن ایک شاعر کے نزدیک ایک لافانی غزل تھی ۔ اور ایک موسیقار کے لئے وائلن پر بجایا ہوا کوئی دلفریب ، سریلا نغمہ ایک صنم تراش کے لئے وینس کا پرتو لیکن کچھ ایسے بھی تھے ۔ جنہوں نے اس کے اندر کی چھپی ہوئی عورت کو بھی دیکھا تھا کسی شاعر کی طرح اسے محض غزل ہی نہیں تصور کیا تھا ۔

اسکی مسکراہٹ ـــ معصوم اور پاکیزہ تھی ۔ مونا لیزا سے حد درجہ مشابہ تھی مبہم مبہم ـــ ! اور اس کی آنکھوں کی دبیز نیلاہٹوں میں کتنی محبت کتنا خلوص اور کتنی گہرائی تھی ۔۔۔ نہیں ـــ کسی نے آج تک سمندر کی گہرائی کا کہاں اندازہ لگایا ہے ۔ !

اور اس دلکش تصویر کو فطرت کے جمالیاتی ذوق کا سب سے عظیم کارنامہ نہ مانی والی تو اس کی رنگین تھیں خم بہ خم ۔۔ گھری گھری کالی کالی پریشان زلفیں جنکو دیکھنے سے ایک گہری تازگی ۔ بخش ٹھنڈک کا احساس ہوتا تھا ۔ بے ترتیبی سے اس کے بال اس کی پیشانی پر یوں پریشان اور بکھرے تھے ۔ جیسے دور ۔ کہیں ویرانے میں میٹھے رسیلے گیت بکھر گئے ہوں ـــ اور وہ ـــ لیکن اس سے بے خبر کوری ڈور سے گزرتی ہوئی دور خلاؤں میں دھیرے دھیرے تحلیل ہوگئی یہاں تک کہ اس جگہ اس کی بجائے اس کی شبیہ کا ہالہ سا بن گیا ۔ وہ یقیناً خوبصورتی کا لازوال پیکر تھی اور ایک ازلی خوشی اور مسرت ۔ جسکی تخلیق کا مفہوم فنا میں نہیں ـــ بقا میں مضمر دستور رہتا ـــ اور اگر حسن سچائی بھی ہے ۔ تو وہ سچائی بھی تھی ۔ لیکن گوشت پوست کے روپ میں ـــ اور ضروری ہے کہ سچائی کی پرستش کی جائے ـــ اس نے بھی تو اس کی پرستش کی تھی ۔

وہ بجلی کی طرح اس کے سامنے چمکی ، ایک تارے کی طرح ٹوٹ کر روشنی کی ایک لمبی لکیر اپنے پیچھے اس کے ذہن میں چھوڑ گئی تھی اس نے سنجیدگی سے اس کے متعلق سوچا ۔ وقت کی سبک خرامی نے اس کے لئے ہزاروں ایسے مواقع فراہم کر دیئے جب اس نے اس کے حسن کو دیکھنے خواب اور

(باقی [illegible])

سی مناسب پناہ گاہ کی متلاشی تھی۔ جہاں وہ دنیا کے تمام ہنگاموں کو بھول جائے۔ شاید وہ اسے اس کی زلفوں کی گھنی چھاؤں میں مل سکتی یکن کیا یہ ایک بے سود کوشش نہ تھی ـــــ؟

مون تو اس کے اپنے کمرے میں بھی تھا۔ لیکن چین کہاں تھا۔ وہاں رات کو بھی سکون بھی تو تھا۔ لیکن وہ نیند کہاں سے لاتا۔ مسلسل کئی راتوں بے خوابی میں رہا۔ یہ عجیب تجربہ تھا۔! اسکی زندگی کا سب سے حسین انوکھا اور سب سے دلکش تجربہ اس نے اپنے تصور میں زمانے کے صدیوں ت، بندھن رسمیں سب توڑ دیں۔ اس نے نیل گگن سے مسکراتے حسین انجم دلکش چاند سب کو نوچ لیا تھا۔ لیکن شاید وہ انہیں اپنی جگہ ا بھول گیا تھا۔ اور اس طرح زندگی دنوں سے ہفتوں اور ہفتوں سے مہینوں میں بدل کر گزرتی گئی۔ ایک موہوم سی امید کے سہارے! ر ایک روز جب وہ کنٹین میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس کی جھکی ہوئی نظر نے ادھر ادھر منڈلاتے ہوتے ایک عجیب نظارہ دیکھا ـــ بین ہو گیا۔ اس نے دیکھا وہ اسے اپنی انتھاہ نیلگوں آنکھیں سے زندگی کا تمام تر حسن اور پیار سمیٹے دیکھ رہی ہے۔ اور جوں ہی دونوں لیں ـ وہ کامن روم میں رینگ گئی۔ یہ ایک نگاہ ـ جانے کیا کہہ گئی۔ ایک معمہ بن گئی اس کے لئے ایک ناقابل فہم معمہ۔ ایک ہلکی سی ے دلمیں فروزاں ہو گئی ـ اس کے تاریک دلمیں روشنی بکھیرنے لگی ـ!

سی شام ـــ جب خاموشی سے سکوت کے انتھاہ ساگر میں ڈوبی ہوئی سورج کی الوداعی سنہری قرمزی کرنیں میدانوں سے ہم آغوش ہی سونا بکھیر رہی تھیں۔ اسنے پھر اسے دیکھا.......... ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں....... سطح زمین پر پھیلی ۔ جیسے زندگی سے معمور کوئی کشتی سمندر کی شفاف اور چکنی سطح پر بڑی ... جاری ہو۔ بغیر ہچکولے کھائے ہوتے . . ھیرے۔

وہ اپنے خیالات میں منہمک دنیا و مافیہا سے بے خبر دھیرے دھیرے اپنے قدم اٹھائے چلی جا رہی تھی۔ پلکیں پتلیوں پر اس طرح سایہ فگن بسی نیم باز ادھ کھلی خوابیدہ کلی پر پتیاں! وہ بالکل اپنی ظاہری حالت سے بے خبر نظر آ رہی تھی۔ لیکن پھر بھی اس قدر پرکشش اور جاذب ں نے اسے دیکھا دل تھام کر رہ گئے اور پھر غنودگی میں جیسے اپنے آپ سے ہی بولے۔ "کتنی سندر ـ بھلی۔ کتنی البڑ کتنی خوبصورت ہو تم آج ـ کنول کے خوابیدہ پھول سے بھی دلکش!"

س کا نرم و نازک وجود اس وقت سائنس کی کاپیوں، ضخیم اناٹمی (ANATOMY) کی کتابوں اور سامان جراحت (DISSECTION APRATUS) دبا جا رہا تھا۔ اور جوں ہی وہ اس کے نزدیک آئی اس نے اپنی نرم نرم مخملیں نگاہیں۔ اس کی طرف پھیریں۔ جنمیں محبت، شفقت اور ترحم لرزاں تھے سنہری کرنیں اس کے خوابیدہ چہرہ سے ٹکرا کر قوس و قزح کے تمام رنگوں سے بھی کہیں زیادہ دلکش رنگوں کو جنم دے رہی تھیں، فطرت کی دل آویز ترین تخلیق!" اس نے جیسے اپنے آپ سے کہا "نہیں۔ کبھی نہیں۔ فطرت نے اسے ہرگز ڈیسکٹنگ روم (DISSECTINGROOM) سارا دن محنت کرنے کے لئے نہیں یا مائکروسکوپ (MICROPE) سے ننھے ننھے مائکروبس (MICROBES) کا تجزیہ کرنے کے لئے ہرگز ں تخلیق کیا ـ!"

پھر اچانک اسے محسوس ہوا شاید وہ اس سے کچھ کہنے کا متمنی ہے: دھیمے ڈوبتے ہوئے سورج کی بالکل آخری دھندلی سی سرخی اور کی بہت بڑھاتی! لیکن وہ کہنا کیا چاہتا ہے ـ؟ شاید یہی ہر محبوب کے لئے..... مشکل ترین سوال ہے۔ وہ بات جو کہی نہیں جاتی ـــ جب دل کی دھڑکنیں شدت سے تیز ہو جاتی ہیں.... وہ لڑکھڑا گیا۔ وہ فیصلہ نہ کر سکا... اس کی معصوم پاکیزہ مسکراہٹ رچال دیکھ کر اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے وہ اسے ملامت کر رہی ہے۔ میں بھی کتنا احمق ہوں۔ وہ تو ہر انسان کے لئے مقدس ترین دیوی۔ جسے صرف چاہا ہی جا سکتا ہے۔ پرستش ہی کی جا سکتی ہے۔ حاصل نہیں کیا جا سکتا!" اس نے محسوس کر ہی لیا اس کے

تمام گذشتہ خیالات تیزی سے واپس ذہن میں پہنچ کر ست ہونے لگے — لیکن اس کے معصوم چہرہ پر دوسری نگاہ ڈالتے ہی اس کی ہمت بڑھ گئی وہ نہیں سمجھ سکا اس صدیوں کے فاصلہ کو کیسے توڑے؟ کیا بولے؟ — آخر کار اسد . . . . ہوئے . . . جو اس کے ہونٹ کے اور بہت ہی لرزتی آواز میں آگے بڑھتے ہوئے وہ بولا . . . .

"شاید مجھے نہیں معلوم آپ بھی کبھی میرے متعلق کچھ سوچتی ہوں گی!" جوں ہی وہ بولا ایک سرخی اس کے چہرہ پر پھیل گئی۔ وہ لمحہ بھر کے لئے ٹھٹھکی پھر حیا کی دل آویز آگ اس کے سارے وجود میں . . . کر گئی ایک نئی فکر اس کے ذہن میں بجلی کی طرح کوندی جس تیقن، خود اعتمادی اور محبت اور پرستش سے وہ بولا تھا۔ وہ اس کی گہرائی محسوس کئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس کی آنکھوں میں پاکیزگی تھی اور اور وہ —— بڑی شدت سے یہی سوچ رہا تھا۔ ممکن ہے — بہت ممکن — کہ وہ اس کے چہرہ پر اپنی نگاہیں گاڑ کر ایک ایسا جواب دے گی جو — بہت ممکن ہے — اس کی تمام آرزوں کا خون کر دے —— لیکن وہ کچھ نہ بولی — کچھ بھی تو نہیں — وہاں بولنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ اس کے خدو خال کے اتار چڑھاؤ اس کے تمام تر جذبات کی مکمل ترجمانی کر رہے تھے۔

"اوہ —— میں صرف اسی قدر کہنا چاہتا ہوں کہ آپ ہمدردی سے میرے متعلق سوچیں!" اس نے جذبات سے بھرپور آواز میں اٹکتے اٹکتے پھر کہا . . . . .

"میں آپ کی مہربانی کے لئے آپ کی، شکرگزار ہوں . . . . میں نہیں جانتی کہ اس قسم کے موقع پر مجھے کیا کہنا چاہیے . . . جو کچھ میں جانتی ہوں وہ یہی ہے۔ کہ ایک جوان انسان کے لئے سب سے بڑی خوش قسمتی اور مسرت کا یہی تو ایک موقع ہوتا ہے۔ جب کوئی اسے اپنے دل کی تمام گہرائیوں اور دھڑکنوں کے ساتھ والہانہ چاہتا ہے۔ اور ہم عورتیں تو یہی چاہتی ہیں کہ کوئی ہمیں چاہے!"

اس کی نس نس میں مسرت کی لہریں دوڑنے لگیں۔ اور وہ بھی محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ جو کچھ اس نے کہا وہ اس ترنم ریز جلترنگ سے مشابہ آواز تمام عمر اس کے دماغ میں گونجتی رہے گی۔!

"لیکن!" اس نے مزید اسی وقار، تقدیس اور تمکنت سے کہا "کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے مخلص دوست ہی کی حیثیت سے رہیں —— اس سے آگے کچھ نہیں —— کچھ بھی نہیں — فہم کا تو یہی تقاضا ہے۔ ہم فاصلہ پر ہی رہیں۔ بہت نزدیک رہنا ملنے کی تڑپ کو مجروح کر دے گا۔ ایک دوسرے کے لئے مقدس جذبات رکھتے ہوئے بہتر یہی ہے۔ کہ ہم مقررہ دوری پر رہیں —— دو دل ایک ساتھ دھڑکیں تو بیکار محض بن کر رہ جاتے ہیں —— فاصلہ سے دھڑکیں تو انہیں سوز جنم لے لیتا ہے! . . . . یہ فاصلہ اور دوری ہی تو ہے جس سے چیزوں کا صحیح یقین عالم وجود میں آتا ہے —————— اس لئے کہ —————— جب ستارے اپنی محبت سے مجبور ہو کر ایک دوسرے سے ملنے کے لئے اپنے درمیان حائل فاصلہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں —————— تو —— تو وہ ملتے نہیں —— ایک دوسرے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتے ہیں۔!"

اپنا آخری جملہ مکمل کرتے ہوئے وہ اسی تقدیس سے ڈیسکٹنگ روم ز (DISSECTING ROOM) کی طرف اسے مبہوت چھوڑ کر چلی سورج کی آخری کرن نے بھی ڈوب کر اس کی امیدوں کا خاتمہ کر دیا . . . . . . ابد کی مبہم سی کرن تھی بھی اس دلکے دبیز اندھیاروں میں دم توڑ کر رہ گئی۔

اس کے خیالات مجروح ہو گئے اور خاموشی سے گزرتی ہوئی زندگی کا سارا سکون اطمینان ختم ہو گیا۔ جذبات کی حدت سے دل مشتعل ہو گیا۔

اور پھر اس شب جب چاند کی ٹھنڈی پر سکون روشنی ہر سو پھیلی ہوئی تھی . وہ پائیں باغ میں نکل آیا اور رات کی رانی

اعر لکھنوی

غم حبیب مبارک ہے زندگی کے لئے ٭ چراغ ڈھونڈ لیا ہم نے روشنی کے لئے
وہیں پہ مصلحتوں نے چھڑ دیا تجھ سے ٭ جہاں پہ تیری ضرورت تھی زندگی کیلئے

کسی طرح نہ گئی زندگی کی عُریانی ٭ ہزار وقت نے بدلے ہیں پیرہن اب تک
اڑا رہی ہے زمانے کے حادثوں کا مذاق ٭ مری جبیں کی یہ ہلکی سی اک شکن اب تک

گزر گئے وہ نگاہ کرم بچائے ہوئے ٭ ہم اس امید میں بھی تھی کوئی پہچانے
عدم کے دکش پہ ماتم ہے کائنات وجود ٭ حقیقتوں کو سنبھالے ہوئے ہیں افسانے

شریک غم خود اُن کا غم نہیں ہے ٭ یہ جینا خودکشی سے کم نہیں ہے
وہ کیوں دیکھے گلوں کی مسکراہٹ ٭ جسے اندازۂ شبنم نہیں ہے
فریب ماہ و انجم کھانے والو ٭ خود اپنی روشنی بھی کم نہیں ہے

وفا کی اندا پسندیوں کو نشاط دل سازگار کیوں ہے ٭ یہ سوچ کر اب تڑپ رہا ہوں کہ زندگی کو قرار کیوں ہے
مری تمنا کا ماحصل ہے چمن میں پھولوں کی مسکراہٹ ٭ مجھے کچھ اس سے غرض نہیں ہے بہار کیا ہے بہار کیوں ہے
اسے تو عقل و جنوں سے ہٹ کر فقط محبت ہی طے کریگی ٭ جہاں کوئی آرزو نہیں ہے وہاں ترا انتظار کیوں ہے

طے ہجر کے مرحلے کئے ہیں ٭ ہم ان کے بغیر بھی جئے ہیں
غم جب بھی ملا ہے کوئی تازہ ٭ کچھ دیر کو مسکرا لئے ہیں

جلیل قدوائی

خود ہی تو ہر گھڑی مجھے تڑپائے جاتے ہیں
پھر خود ہی میرے دل کو بھی سمجھائے جاتے ہیں

شوخی سے کام لینے میں ان کو نہیں ہے باک
شوخی کا نام لینے سے شرمائے جاتے ہیں

آنکھوں میں اپنی تو مجھے دیتے نہیں جگہ
آنکھوں میں میری پھر بھی مگر آئے جاتے ہیں

اس درجہ ان کو میری وفا پر ہے اعتماد
بے خوف ہو کے مجھ پہ ستم ڈھائے جاتے ہیں

دل کو سکوں، جان کو آجائے گا قرار
دھڑکے یہ تجھ سے مل کے مجھے کھائے جاتے ہیں

تھی آرزو کبھی کہ محبت کرے کوئی
اب میرے عشق سے بھی وہ گھبرائے جاتے ہیں

کچھ اور سوچنے نہیں دیتے مجھے جلیل
ایسے خیال و فکر پہ وہ چھائے جاتے ہیں

نمیر بخاری

جلوے ذوقِ نظر کے دم تک
کوئے بتاں سے صحنِ حرم تک

زندگیِ دل نوحۂ غم تک
ہستیِ شبنم شوخیِ رم تک

ایک ہے عالم اہلِ جنوں کا
دستِ تہی سے ساغرِ جم تک

گرمیِ بزمِ عالمِ امکاں
حسن کے دم سے عشق کے دم تک

درد کی لذت غم کی لطافت
سوزِ دروں سے شعلۂ نم تک

روح کا آنچل دونوں جہاں پر
زیست کا دامن حدِ عدم تک

سوزِ عمل سے سب بیگانے
نطقِ عرب سے فکرِ عجم تک

راہِ وفا مشکل تو نہیں تھی
چل نہ سکے تم چار قدم تک

عشق کا مسلک حسن نوازی
حسن کا پرتو باغِ ارم تک

سجدوں کی محدود ہے دنیا
لوحِ جبیں سے نقشِ قدم تک

فکر ختن پیما ہے بخاری
اک آہو کی شوخیِ رم تک

(صادق نوید)

آنکھیں پرنم زلفیں برہم
پچھلی شب برسات کا موسم

بکھرے بکھرے گیسو جیسے
سارا عالم درہم برہم

میری دنیا غم کی دنیا
میرا غم ہے دنیا کا غم

دل کے اشارے کوئی نہ جانے
ہلکے ہلکے مبہم مبہم

زیست کی راہیں ایسی راہیں
جیسے زلفوں کے پیچ اور خم

ہو گئے اسفر دریا دریا
قطو قطرہ اشک پیہم

عشق نوید اک تلخ حقیقت
حسن کا جادو عالم عالم

(اظہر حسین نادر)

ہر چند کہ زخم دل نہاں ہے
صورت سے مگر مری عیاں ہے

کیا شرح بیانِ آرزو ہو
جو بات ہے ایک داستاں ہے

پھر چھیڑا کسی نے تیرا قصہ
پھر دل کو خیالِ دوستاں ہے

اس طرح بہار اب کے آئی
جو پھول ہے واقفِ خزاں ہے

اللہ رے شوقِ جبہ سائی
ہر گام پہ ایک آستاں ہے

نادر کو جو پوچھتا ہے اے دوست
اس کا بھی کوئی کہیں نشاں ہے

نجیب اختر حسان

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

ب تک اس سلسلے کا عنوان "چہ دلاور است - - - - - " رہا ہے لیکن اس بار "دزدے کہ بکف چراغ دارد" کا ٹکڑا بڑھا
۔ اس سے آپ کو اس ادبی چوری کی سنگینی کا اندازہ ہو سکے گا۔
۱۹۴۰ء میں الہ آباد بورڈ نے انٹرمیڈیٹ کے طلبا کو اردو میں علم شہریت یا مدنیت کے مطالعے کا موقع دیا تھا۔ اس وقت اردو
نی علم سے متعلق کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو تعلیمی ضرورتوں کے لئے مناسب اور کافی ہوتی۔ پروفیسر نواب علی قریشی صدر شعبۂ تاریخ
ج کانپور نے ۱۹۴۲ء میں "اصول تمدن" کے نام سے ایک جامع کتاب لکھی جسے ہری ہر پبلیشنگ ہاؤس کانپور نے شائع کیا۔
مقبول ہوئی اور کئی بار شائع کی گئی۔ قیام پاکستان کے بعد درسی کتابوں کی کمی شدت سے محسوس کی گئی۔ قومی بے حسی کی یہ داستان بہت
درد ناک ہے کہ ہمارے پروفیسروں اور اہل علم نے اس طرف توجہ نہ کی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ناشر کوئی نئی کتاب لکھوانے کی
ہندوستان کی کسی مشہور کتاب کو چھاپنا زیادہ محفوظ سمجھتے تھے۔ معاشیات، سیاسیات اور علم تمدن کی حد تک خاص طور پر ہندوستانی
حکمرانی رہی۔
پروفیسر نواب علی قریشی کی کتاب اصول تمدن کو مکتبۂ عالیہ کراچی نے ان کے نام سے شائع کیا۔ دوسرے ایڈیشن پر نواب علی قریشی
کے نام کے ساتھ کسی ریاض انور صاحب کا اضافہ کر دیا گیا اور کتاب کے نام میں "جدید" کا دم چھلا بڑھ گیا۔ ہمارے سامنے جدید
ن کا تیسرا ایڈیشن ہے جس سے پروفیسر نواب علی قریشی مرحوم کا نام بالکل خارج کر دیا گیا۔ ادبی سرقوں کی روداد ان صفحات پر پا
ہے لیکن یہ کہانی اپنی نوعیت کی واحد کہانی ہے۔ لوگوں نے - - دوسروں کے افکار کو بغیر حوالے کے اپنایا ہے ترجموں کو تصنیف
ہے لیکن ایسی جرأت کا ثبوت کسی نے اس سے پہلے نہیں دیا تھا۔
سی عمرانی علم کی کتابوں کے موضوعات میں بڑی یکسانی ہوتی ہے لیکن مصنفین کا نقطۂ نظر اور ان کی ترتیب، طریقۂ اظہار
ب مختلف ہوتا ہے۔
جدید اصول تمدن میں ان باتوں کی تلاش سعی لاحاصل ہے کیونکہ یہ کتاب اصول تمدن کی کاربن کاپی ہے۔ ریاض انور صاحب نے
یں جماعت کے کسی طالب علم کی طرح چند لفظوں کو کہیں کہیں بدل دیا ہے ورنہ دونوں کتابوں کی ترتیب بالکل یکساں ہے

ہاں ریاض انور صاحب نے "اسلامی تمدن" کے عنوان سے ۱۲ صفحات کا اضافہ ضرور کیا ہے۔ خدا جانے یہ صفحات کس کتاب سے نقل کئے گئے ہیں۔
آیئے ذرا ان دونوں کتابوں کی ترتیب اور فہرست مضامین پر ایک نظر ڈالیں۔

اصول تمدن ۔ نواب علی قریشی	جدید اصول تمدن ۔ ریاض انور
۱۔ علم تمدن اور اس کی نوعیت	۱۔ علم تمدن اور اس کی وسعت
۲۔ علم تمدن کا ہم جنس علوم سے تعلق	۲۔ علم تمدن کا دوسرے معاشرتی علم سے تعلق
۳۔ سوسائٹی اور فرد	۳۔ انسان اور معاشرہ
۴۔ انسان اور اس کی جماعتیں	۴۔ انسان اور اس کی جماعتیں
۵۔ شہری اور شہریت	۵۔ شہری اور شہریت
۶۔ شہری کے حقوق اور فرائض	۶۔ حقوق و فرائض
۷۔ آزادی اور مساوات	۷۔ آزادی اور مساوات
۸۔ مملکت اور اس کی قسمیں	۸۔ مملکت اور اس کی اقسام
۹۔ مملکت کی ابتدا اور اس کی ترقی	۹۔ مملکت کی ابتدا اور اس کی ترقی
۱۰۔ اقتدار اعلیٰ یا فرماں روائی	۱۰۔ اقتدار اعلیٰ یا فرماں روائی
۱۱۔ قانون اور سزا	۱۱۔ قانون اور سزا
۱۲۔ دستور اساسی	۱۲۔ دستور اساسی
۱۳۔ مملکت کے مقاصد	۱۳۔ مملکت کے مقاصد
۱۴۔ جمہوریت اور رائے عامہ	۱۴۔ جمہوریت اور رائے عامہ
۱۵۔ اعضائے حکومت اور تفریق اختیارات	۱۵۔ اعضائے حکومت اور تفریق اختیارات
۱۶۔ مجلس قانون ساز	۱۶۔ مجلس قانون ساز

ان سولہ ابواب میں سے نمبر ۴ - ۵ - ۷ - ۹ - ۱۰ - ۱۱ - ۱۲ - ۱۳ - ۱۴ - ۱۵ اور ۱۶ کے ابواب کے عنوانات میں ریاض انور صاحب نے کوئی تبدیلی نہ کی۔ نمبر ۱ - ۲ - ۳ - ۶ اور ۸ میں مضحکہ خیز لفظی تبدیلیاں کی گئیں۔ نواب علی قریشی مرحوم نے جب اپنی کتاب لکھی تھی تو اس وقت علم تمدن کی بعض اردو اصطلاحات کا مفہوم متعین اور واضح نہ ہوا تھا اسی لئے انہوں نے "ساورنٹی" کے لئے اقتدار اعلیٰ یا فرماں روائی کی اصطلاحات استعمال کیں۔ اب اقتدار اعلیٰ کو علمی پایہ حاصل ہو گیا ہے اور کوئی فرمانروائی کا لفظ ان معنوں میں نہیں استعمال کرتا مگر ریاض انور صاحب نے نقل را چہ عقل کے اصول پر عمل پیرا ہو کر دونوں اصطلاحات لکھ دیں۔ اسی طرح اب STATE کے لئے ریاست کا لفظ استعمال ہوتا ہے مملکت کا نہیں۔ ریاض انور صاحب کو اس کی بھی خبر نہیں۔ باب نمبر ۲ کے عنوان میں انہوں نے معاشرتی علوم کی اصطلاح استعمال

ے حالانکہ اب SOCIAL SCIENCES کو عمرانی علوم کہتے ہیں۔ علمی اصطلاحات کے اس غلط استعمال نے ایک علمی انتشار
رکی پیدا کر دی ہے۔

اب ذرا ابواب کی اس بحث کو چھوڑیئے۔ ہم آپ کی خدمت میں دونوں کتابوں کے چند حصے پیش کرتے ہیں ان کو پڑھئے اور تقابلی
ے سے علمی افلاس اور بد دیانتی کا اندازہ کیجئے۔

اصول تمدن ـ نواب علی قریشی

(۱)

"انسانی زندگی کی کامیابی بہت کچھ حقوق کے حصول و
ی کی ادائیگی پر منحصر ہے۔ بغیر حقوق حاصل کئے کوئی شخص سوسائٹی
گی نہیں گذار سکتا۔ بغیر فرائض انجام دیئے کوئی شخص حقوق
ن نہیں ہوتا۔ علم تمدن ہم کو بتاتا ہے کہ وہ کون سے حقوق ہیں
م سوسائٹی سے مطالبہ کر سکتے ہیں۔ اور وہ کون سے فرائض
ب ان حقوق کو حاصل کرنے کے لئے انجام دینا چاہیئے۔"

(صفحہ ۹)

(۲)

انسان کے مدنی الطبع ثابت ہونے کے بعد سوسائٹی کی
پر زیادہ بحث کی گنجائش نہیں رہتی۔ وہ اپنی طبیعت اور
ونوں کی وجہ سے سوسائٹی میں رہنا پسند کرتا ہے۔ دنیا میں
ے ہی لوگ ہونگے جو تنہائی پسند ہوں۔ انسان کی ضرورتیں
یرتی ہیں کہ وہ دوسروں کے ساتھ رشتے پیدا کرے۔ اول
سائٹی کے انسان کسی حق کا مستحق نہیں ہوتا۔ دوسرے
ات زندگی بہم پہنچانے کے لئے اسے دوسروں کا محتاج
ہے۔ وہ تنہا اپنی خوراک یا لباس نہیں حاصل کر سکتا۔ یہ
تلف لوگوں کی مدد سے مہیا کر سکتا ہے۔"

(صفحہ ۲۶-۲۷)

جدید اصول تمدن ـ ریاض النور

(۱)

"انسانی زندگی کی کامیابی کا دار و مدار حقوق کے حصول
اور فرائض کی بجا آوری پر ہے۔ حقوق حاصل کئے بغیر کوئی شخص
سوسائٹی میں زندگی نہیں گذار سکتا۔ بغیر فرائض کی ادائیگی کے
انسان حقوق کا مستحق نہیں ہوتا۔ علم تمدن ہم کو بتاتا ہے کہ وہ کون سے
حقوق ہیں جن کا ہم سماج یا معاشرہ سے مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ کون سے
فرائض ہیں جو ہمیں حقوق حاصل کرنے کے لئے انجام دینے ضروری ہیں۔"

(صفحہ ۱۶-۱۷)

(۲)

"یہ ثابت ہونے کے بعد کہ انسان مدنی الطبع ہے سوسائٹی
کی ضرورت پر زیادہ بحث کی گنجائش نہیں رہی۔ انسان اپنی طبیعت
اور فطرت دونوں کی وجہ سے سوسائٹی میں رہنا پسند کرتا ہے۔
دنیا میں ایسے تھوڑے ہی لوگ ہونگے جو تنہائی پسند ہوں۔ انسان
کی ضروریات اسے مجبور کرتی ہیں کہ وہ دوسرے سے رابطہ پیدا
کرے۔ بغیر سوسائٹی کے انسان کسی حق کا مستحق نہیں ہوتا۔ علاوہ
ازیں ضروریات زندگی بہم پہنچانے کے لئے اسے دوسروں کا
محتاج ہونا پڑتا ہے۔ وہ تنہا اپنی غذا یا کپڑے فراہم نہیں کر سکتا
ہے۔ یہ چیزیں وہ دوسروں کی مدد کے بغیر حاصل نہیں کر سکتا ہے۔"

(صفحہ ۳۳)

(۳)

"حقوق انسان کے وہ اختیارات ہیں جنہیں سوسائٹی مفادِ عامہ کے لئے ضروری تسلیم کرے اس طرح حقوق کا تعلق انسان سے ہے۔ ان کا وجود صرف سوسائٹی میں ممکن ہے - - - - -
حق انسان کا وہ دعویٰ ہے جسے لوگ جماعتی زندگی میں ایک دوسرے کی سہولت کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ چونکہ انسانی تعلقات ہمہ گیر اور ضرورتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہوتی ہیں اس لئے ان تعلقات کو خوش گوار بنانے کے لئے حقوق ضروری ہوتے ہیں۔"

(صفحہ ۶۹)

(۴)

"حقوق انسان کے وہ اختیارات ہیں جنہیں سوسائٹی مفاد عامہ کے لئے ضروری تسلیم کرے۔ اس طرح حقوق کا انسان سے ہے۔ اور حقوق کا وجود صرف سوسائٹی میں ممکن ہے۔ -
حق انسان کا وہ دعویٰ ہے جسے لوگ اجتماعی زندگی میں ایک دوسرے کی آسانی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ چونکہ انسانی تعلقات گیر اور ضروریات ایک دوسرے سے وابستہ ہوتی ہیں اس وجہ ان تعلقات کو خوش گوار بنانے کے لئے حقوق ضروری اور لازمی ہیں

(صفحہ ۷۹ — ۸۰)

یہ چند اقتباسات نمونے کے لئے پیش کئے گئے تاکہ ان پھولوں سے ریاض انور صاحب کے گلستاں کا اندازہ ہو سکے جن میں ہر پھول کاغذی ہے اور رنگ و بو سے محروم ان کی کتاب کا ہر باب اور ہر صفحہ مال مسروقہ ہے۔ علمی بد دیانتی کی ایسی دوسری مثال شاید ہی نظر آسکتی ہے۔

ایک بار کسی صاحب نے دلّی کے مشہور اخبار "ریاست" کے نام کو چرا کر کسی اور شہر سے "ریاست" کا اجرا کیا۔ اس پر دیوان سنگھ مفتون نے لکھا تھا کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ بچہ تو پیدا کر لیتے ہیں لیکن اس کا نام رکھنا نہیں جانتے۔ ریاض انور صاحب کے بارے ہمارے دوست محمد رحیم دہلوی نے کہا کہ وہ ذہنی طور پر اس درجہ گر گئے ہیں کہ وہ دوسرے کی اولاد کو اپنی اولاد قرار دینے پر مُصر ہیں۔ اللہ ان سے ہمارے ادب اور طالب علموں کی نئی پود کو بچائے۔

بقیہ صفحہ ۵۶

ن خورشیدی اپنے نتھنوں میں جذب کرتے ہوئے سوچنے لگا۔

"سچ ہی تو ہے۔ آج میری زندگی ایک نئے باب میں داخل ہو رہی ہے۔ حسن چھونے کے لئے نہیں ——— صرف محسوس کرنے کے اور اسے پرستش کرنے کے لئے ہے ——— خوبصورتی ——— تو ایک تحریک ہے۔ حیات نو کا سرچشمہ ——— اور دلفریب نغمہ

BEAUTY! THOU ART EXCITEMNT

مہر نیمروز

نمبر ۴   مئی سنہ ۱۹۵۹ء   شمارہ نمبر ۲

ادارہ:-

حسن مثنیٰ ندوی
علی اکبر قاصد
ابوالخیر کشفی

قیمت:-

سالانہ:-	مبلغ چھ روپے
ششماہی:-	مبلغ تین روپے چار آنے
فی رسالہ:-	آٹھ آنے (۸)

پتہ:-

) ۲۰۲ بہار ہاؤسنگ سوسائٹی۔ ہاؤسنگ یونین ایریا، کراچی ۵

۱) دفتر رسالہ مہر نیمروز، کوری روڈ صدر ——— کراچی ۳

اس شمارے میں

غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

برائے ادب" جس زمانے میں زبانوں پر آیا، اس کو سامنے رکھئے پھر دیکھئے کہ یہ قول "ادب (لٹریچر) برائے ادب
شعور" کسی اعتبار سے غلط نہ تھا اور نہ آج اسے غلط کہا جا سکتا ہے۔ ـــــ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ غور و فکر سے کام
دب برائے ادب اور ادب برائے زندگی، دونوں ایک ہی ہیں دونوں کا حاصل شعور زندگی یا زندگی کرنے کا سلیقہ
ـــ ظاہر ہے کہ زندگی نام صرف جئے جانے کا نہیں ہے۔ ورنہ پھر تو بکریوں کا ممیانا، کتوں کا بھونکنا، اور گدھے کا رینکنا
ٹھہریگا (اگر ادب کا نام اور کام فقط یہ ہو کہ زندگی کے چند مظاہر کو جوں کا توں پیش کر دیا جائے) ـــ لیکن چھوڑیئے
ورنہ شاید کوئی یہی کہہ دے کہ ہاں ان کا ادب تو وہی ہے تو پھر ادب کی قسمیں اور شاخیں پھوٹنی شروع ہو جائیں گی اور بالآخر
ایک نہیں ہزارہا قسمیں ہم اسی طرح الگ الگ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے جس طرح نوع حیوانی کی بے شمار نسلیں اور
ـک پائی جاتی ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیں انسان کی اس تعریف سے بھی ہاتھ دھونا پڑیگا کہ انسان نام ہے
وان (SOCIAL ANIMAL) کا، اب اگر اس فطری وحدت انسانی یا اسکی نیچرل مدنی الطبعی کا
ہو گیا تو پھر لفظ SOCIAL کو اس تعریف سے حذف کرنا پڑیگا، مگر یہ سوچ لیجئے کہ یہ لفظ حذف ہوا تو پھر
کیا رہ گیا، ـــ (یہ دوسری بات ہے کہ آج کسی خطے میں کوئی گروہ انسانی SOCIAL باقی نہ رہا ہو مگر یہ طرز
ے ڈھب ـــ لیکن نہیں بے ڈھب کہاں؟ اسی نکر سے تو غالبؔ وہ شاخ پھوٹتی ہے کہ اگر انسان واقعی ـــ
SOCIAL ہے اور اسکی حیوانیت مشروط و مقید، تو پھر لازمی ہے کہ اسکی ایک سوسائٹی ہو، سوسائٹی اور
تنظیم ہی دراصل اس کی انسانیت کی دلیل و برہان ہے، ایک ایسا معاشرہ جس میں تمام افراد انسانی ایک دوسرے
ـے ہوں کیونکہ اسی ارتباط سے ان کے اندر ایک ہم آہنگی، احساس یگانگت وحدت فکر، وحدت عمل، اور اصول و شعور
پرورش پاتی ہے اور صحیح انسانیت کا ظہور ہوتا ہے اور جب یہ نہیں ہوتا تو پھر لازمی ہے کہ پراگندگی و انتشار ان پر چھا جائے
بھی اور پراگندگی افکار بھی۔ ـ یہی سبب ہے کہ ہمارے کان میں جب کبھی یہ آواز پڑتی ہے کہ "ادب میں انتشار ہے پراگندگی ہے"
لٹریچر کو چھوڑ کے فوراً معاشرے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ ہم نے بارہا ادب پر قلم اٹھانے کا ارادہ کیا مگر ہر بار یہی ہوا کہ معاشرہ سامنے
کوئی خودرو پودا نہیں ہے، کہ وہ تو بہر صورت اگ کر ہی دم لیگا، جگہ ملیگی تو سیدھا اگیگا، نہ ملیگی تو ٹیڑھا اگیگا، مگر اگیگا ضرور کہ
اگنے سے مطلب ہے سیدھے اور ٹیڑھے سے کوئی مطلب نہیں، ـ ہم لوگ سب تو بیگانہ سمجھتے ہیں معاشرہ میں اگر انتشار ہو تو لازماً ادب

میں بھی انتشار پیدا ہوگا، یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔ اس لئے جب ادب میں انتشار و پراگندگی کا شکوہ زبان پر آنے لگے سمجھنا چاہیے کہ اصل انتشار و پراگندگی معاشرے میں ہے اور اس لئے فکرِ اصلاح بھی دراصل ادب اور لٹریچر کی نہیں معاشرہ کی لازم آتی ہے، کیونکہ آدمیوں کے جنگل میں بہرحال قانون جنگل ہی کا رواج پکڑتا ہے، یہ دنیا علت و معلول ——— (CAUSES & EFFECTS) کی دنیا ہے، یہاں ہر بات کا ایک سبب ہے اور ہر سبب کا ایک نتیجہ۔ اس لئے معاشرے کی تنزل کے بھی اسباب ہیں، اور اسکی پراگندگی بھی بلا سبب نہیں، اسی طرح ادب کی ترقی و نشو و نما کے بھی اسباب ہیں اور اگر اس میں کسی قسم کا کوئی جمود، پستی یا انتشار و اختلال نظر آتا ہو تو وہ بھی کوئی اتفاقی حادثہ ہرگز نہیں کہ آپ سوچنے کی بجائے نقش حیرت بن جائیں،

ادب اگر "آئینہ" ہو جب بھی، اور "مشاطہ" ہو جب بھی ——— کام اس کا زندگی کو سنوارنا ہے، بیشک اس کی آنکھ ہر پھیکی، کاجل پھیلا، کان کا ٹیڑھا بالا ہے، پر پہلے پڑتی ہے اور پھر دور ہے ہی لمحے اس نتیجے تک پہونچنے یا پہونچانے کی کوشش بھی اسکی درست کرے ——— "جرأت ہم پہچان گئے کچھ دال میں کالا کالا ہے" ——— لیکن ان تمام باتوں کے پردے میں آئینہ یا مشاطہ کا حاصل نظر وہی ہے جب حسن اپنی مستی، کاجل، بالے، یا سرمہ، غازہ، لپ اسٹک اور آرائش جمال کے تمام ساز و سامان سے مرتب ہو کر "قیامت" بن جائے ——— کہ آئینے پر اک اچٹتی سی نگاہ ڈالے تو اس کا دل فخر و غرور کے جذبات سے بھر پڑے کہ "ہاں نا ———" آئینے کی پہلی نگاہ عیب چیں سہی لیکن آخری نگاہ افزائش حسن و آرائش جمال ہی ہے۔ گویا عیب کیا اور حسن و جمال میں کمی کس بات کی رہ گئی "ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔" اس لئے ادب اگر آئینہ ہے۔ تو اس کو اپنا ایک زاویہ نظر بہ صورت متعین کرنا پڑیگا۔ اور زاویۂ نظر متعین ہوا نہیں کہ مقصدیت در آئی ——— مقصدیت کا قدم درمیان آتے ہی ہم یہ پر مجبور رہوں گے کہ اس کا رخ خوبی کی طرف ہو یا خرابی کی طرف، عقلمندانہ ہو یا احمقانہ، انسان کی اس صفت خصوصی کی طرف ہو جو حیوان مطلق سے ممتاز کرتی ہے یا اس کے برعکس، یہ باتیں تو ہمیں سوچنی ہی پڑینگی، کیونکہ ادب فوٹو گرافر کا کیمرہ نہیں ہے بلکہ ایک فنکار اور باکمال مصور ہے جس کا موئے قلم تصویر میں رنگ بھرتا ہے، جمال پیدا کرتا ہے۔ ———

ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی طرح ایک مقولہ ادب برائے فن بھی چل پڑا ہے، مگر یہ مقولہ بھی تجزیہ کی میزان پر پہلے مقولوں سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ کیونکہ فن اگر واقعی فن ہے تو اس میں بھی عقلمندی کا وجود لازمی ہے، یہ دوسری بات ہے کہ لوگ کہتے تو ہوں "ادب برائے فن" مگر اس میں بوئی ہے اس کو اردو کی بجائے انگریزی لفظ "FUN" کا مرادف سمجھا ——— ادب برائے تفریح "کا تصور یہیں سے نکلا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ادب کا ایک پہلو تفریح بھی ہے اور ضرور ہے مگر وہ پہلو بھی سلیقہ و تمیز کی صفت اور عقلمندی کے میلانات سے عاری ہرگز نہ ہوگا رہی یہ بات کہ سارے کا سارا ادب تفریح ہو، یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتا کیونکہ ساری زندگی تفریح نہیں ہے، ہنسی مذاق تفریح دلگی کے لمحات دراصل مختصر ہوتے ہیں، آدمی زیادہ دیر تک کبھی ہنس نہیں سکتا۔ مر جائیگا۔

یاران نکتہ داں

ڈاکٹر شوکت سبزواری

نیمروز" کی کسی گزشتہ اشاعت میں بیخود جعفری صاحب نے شادانی صاحب کے مجموعۂ کلام "نشاط رفتہ" پر تنقید کی
بادوباراں" پران کا اعتراض تھا کہ اسے ذیل کے مصرعے ہیں۔

یکساں موسم، یکساں راتیں، یکساں بادوباراں ہے

مفعولاتن کے وزن پر باندھا گیا ہے۔ یہ واؤ کا اشباع ہے جو غیر فصیح اور مکروہ ہے۔ شاہ ولی الرحمٰن صاحب فرماتے
دوباراں بروزن مفعولاتن گو صحیح ہے۔ مگر بروزن فاعلاتن فصیح تر معلوم ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں کئی باتیں غور کے قابل ہیں۔ اول تو یہ کہنا صحیح نہیں کہ "بادوباراں" میں واؤ اشباع ہوا ہے۔ واؤ کے اشباع کا نتیجہ ہے۔ اس کا اشباع یعنی چہ "بادو باراں" میں واؤ کا اظہار ہے۔ اسے اشباع کہنا صحیح ہے۔ دوسرے "بادو باراں" کا وزن شادانی صاحب کے مصرعے میں فعلن، فعلن ہے۔ مفعولاتن نہیں۔ مفعولاتن وزن اس صورت میں ہوسکتا تھا جبکہ یا تو خود مصرعے کا یہ وزن ہوتا یا "بادو باراں" ایک کلمہ ہوتا۔ یہاں وزن کوئی صورت بھی نہیں۔ تیسرے "بادو باراں" کی کیا خصوصیت ہے۔ ہر ترکیب عطفی کے بارے میں یہ سوال ہے کہ اس میں واؤ، کا اظہار صحیح و فصیح یا فصیح تر ہے یا نہیں۔ "گل و بلبل" اور "سرو سینہ" وغیرہ کے بارے میں یہ حضرات کیا کہیں گے۔ "بادوباراں" کی طرح یہ بھی مرکب عطفی ہیں۔ ان کے واؤ کا اظہار بھی ہوسکتا ہے بقول فاعلاتن کی بجائے مفاعیلن کے وزن پر اگر انہیں باندھا جائے تو کیا یہ صحیح و فصیح ہوگا؟

فارسی اور اردو میں واؤ عطف کا اظہار ہوا بھی ہے، اور نہیں بھی ہوا ہے۔ دونوں صورتیں یکساں طور سے جائز صحیح فصیح اردو اور فارسی شعراء نے واؤ عطف کا بکثرت اظہار کیا ہے۔ اور اسے کسی نے بھی غیر فصیح قرار نہیں دیا۔ فردوسی کا شعر ہے۔

بریدو درید و شکست و ببست		یلاں را سر و سینہ و پاؤ دست

اس شعر کے تمام واوات کا اظہار ہوا ہے۔ اہلی شیرازی کی مثنوی سحر حلال میں یہ صنعت برتی گئی ہے کہ اس کو دو بحروں میں پڑھا جا سکتا ہے۔ اس کا دارو مدار زیادہ تر اسی اخفا و اظہار پر ہے۔ اگر واؤ کا مثلاً اظہار کریں تو

اور بحر ہو گی اور اگر اخفا کریں تو دوسری بحر ہو جائے گی۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

شد دل و جاں بندۂ روئے حسن   مظہر خلق خوش و خوئے حسن

"شد دل و جاں" کے واو کا اخفا کریں تو اس کا وزن مفتعلن ہوگا اور اگر اظہار کریں تو فاعلاتن۔ یہی حال "خلق خوش و خوئے حسن" کے واو کا ہے۔ کیا حضرات معترضین یہ سمجھتے ہیں کہ اس شعر کو بحر رمل میں پڑھیں تو یہ مکروہ اظہار غیر فصیح ہوگا۔

غالب کی مندرجہ ذیل غزل کی ردیف "در و دیوار" ہے۔ اس میں بھی واو کا اظہار ہوا ہے۔

بلا سے ہیں جو یہ پیش نظر در و دیوار
نگاہ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

حالی کے قطعہ ذیل میں "دولت و دیں" اور "لطف و کرم" دونوں میں واو کا اظہار ہے۔

اے بشیر دولت و دیں نائب شاہ دکن
اے بہ ہمت دکن کا ذات پر تیری مدار
مجھ پہ فرمایا ہے جو لطف و کرم سرکار نے
شکر اس کا کر نہیں سکتا ادا میں زینہار

نثار احمد فاروقی

میں خط لکھنے کے معاملے میں جتنا فیاض بے محابا، اور بے پناہ تھا اب اتنا ہی چور ہو گیا ہوں۔ اس کے نفسیاتی اسباب بھی ہیں۔ اور مادی بھی۔ ایک موٹی سی وجہ یہ ہے کہ فرصت نہیں ملتی، وقت گریزاں ہے، خیالات کا ہجوم ہے لکھنے بیٹھتا ہوں کہ یہ لکھوں گا وہ لکھوں گا مگر وہی معاملہ ہوتا ہے۔ کہ

جب کہا اس نے، مدعا کہئے!   سوچتے رہ گئے کہ کیا کہئے!!

"مہر نیمروز" بہت دنوں سے غیر حاضر تھا سخت انتظار تھا، بار بار خیال آتا کہ آپ کو خط لکھ کر معلوم کروں اس خاموشی کا سبب کیا ہے۔! مگر بس مگر ہی مگر میں سارا وقت گزر گیا۔ مراۃ الشعرا کی تیسری قسط کے لئے نوٹ تیار رکھے ہیں ان کا لکھنا بھی ایک درد سر ہو گیا ہے۔ دن بھر ہاتھ میں قلم چلتا ہی رہتا ہے مگر کام ختم ہونے میں نہیں آتے۔ واللہ یہ ادیب و دیب ہونا بھی خدا کی طرف سے ایک اچھا خاصا عذاب ہے کم سے کم میں تو عاجز آ گیا ہوں اس زندگی سے جس کی بے ساختگی اور برجستگی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اور گھس گھس بڑھتی جاتی ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ!!

پہلے کے شماروں میں بہت سی باتیں تھیں جن کے بارے میں آپ کو لکھنا چاہتا تھا، وہ شمارے یوں ہی پڑے رہ گئے اور میں کچھ نہ لکھ سکا۔ "نذرل" والی بات پر خصوصیت سے مجھے داد دینی تھی آپ نے بڑی ہمہ گیر برائی کی طرف سنجیدہ طریقے سے اشارا کیا ہے۔ کچھ مضامین کے سلسلے میں بھی لکھنا تھا وہ سب غت ربود ہو گیا۔ اب "نئی گلی نیا کھیل" ہوگا۔

مہر نیمروز، پہلا رسالہ ہے جس نے مرحوم آزاد سبحانی پر چند صفحے لکھے اور ان کے مرتبے کا کھلے دل سے اعتراف کیا مجھے آزاد سبحانی کے مسلک سے اختلاف تھا لیکن آپ کی اس ادا سے بہت اتفاق ہے۔ آغا خاں پر آپ کا مضمون معلومات آفریں

ی ...

...نت، خصوصاً مسلم سیاست میں ان کے رول پر اچھی طرح بحث کی گئی (اختلاف کا پہلو میرے لئے یہاں بھی محفوظ ہے
...سے مجھے کچھ بحث نہیں!)

یہ آپ کی خوش نصیبی ہے کہ قاضی صاحب کی کاوشیں مہر نیمروز کے لئے اکثر و بیشتر آپ کو مل جاتی ہیں اور لوگ اس
...کرتے ہیں۔ قاضی صاحب کے مضمون کا کسی رسالے میں شائع ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ اب اس رسالے کو تعویذ کی طرح محفوظ
...ہا جائے گا۔!

خواجہ عباداللہ اختر کا مضمون "عربی مبین" بہت بصیرت افروز تھا۔ ایسے مضامین بھی آپ کے پرچے میں شائع ہونے چاہئیں۔

ڈاکٹر اخلاق امام:-

آپ کا قیام برسلز میں مختصر رہا بحد مختصر اس لئے ملاقات بس سرسری ہی رہی جی چاہتا تھا کہ آپ تجارتی بکھیڑوں
...دہوتے اور ہم دفتری معاملات سے دور ہو جاتا پھر چائے کی پیالیاں گردش میں ہوتیں اور باوا آدم کی خطائے گندم
...سے لے کر ایٹمی دھماکوں تک کی دنیائیں احاطۂ گفتگو میں آجائیں مگر بقول حفیظ جالندھری ع

افکار معیشت کے فرصت ہی نہیں دیتے

خیر یہ کیا کم ہے کہ آپ آئے تو۔

آپ کے دوران قیام میں جناب شاہ محمد جعفر صاحب ندوی کا ذکر آیا تھا ان کے افکار عالیہ سے مستفید ہونے کی ایک
...رت ہے۔ اور وہ یہ کہ ان کی کتابوں سے آنکھیں روشن ہوں۔

مثنیٰ صاحب کس رنگ میں ہیں؟ رنگ کا لفظ اس لئے استعمال کیا کہ ان کو ہمیشہ ہی رنگین پایا۔ آندھیاں آئیں خس
...ماک کو اڑا لے گئیں مگر انکو ہمیشہ باغ و بہار ہی پایا طبیعت میں شگفتگی ایسی کہ سبحان اللہ یوں سمجھئے کہ امرؤ القیس نجد کی
...انگیز وادیوں سے گذر رہا ہے یا "الاعشیٰ" کا انگوری پیمانہ چھلک رہا ہے۔ ہاں انگوری پیمانہ فقط جس میں افشردہ
...ہو، انگور کی بیٹی کے گلابی رخساروں کا عکس نہ ہو۔

یاد کش بخیر جب باقر صاحب کراچی میں تھے تو ان کے ہاں اکثر جمگھٹ رہا کرتی تھی۔ مثنیٰ صاحب ادب پر تنقید کر رہے
...میں "محقق" بنا بیٹھا ہوں۔ شاید "محقق" سے آپ کو غلط فہمی ہو اور آپ اسے خود سرائی پر محمول کریں اس لئے اس کی
...ت بھی ضروری ہے۔ اس خشک لفظ کو ہمارے ہم سبق مجاز نے نئے معنی پہنائے تھے: مجاز حقہ پینے والے کو "محقق"
...تھے، ہاں تو کہہ یہ رہا تھا کہ میں داد تحقیق دے رہا تھا سارا کمرا دھوئیں سے بھرا ہوا تھا اور ہم لوگ اس فضا میں
...گئے تھے یہ اس زمانے کی بات ہے جبکہ طبیعت میں امنگ تھی اور شاعرانہ فضائے بسیط لالہ گلاب اور چمپا کی خوشبو
...طر تھی۔ تبدیلیٔ ماحول کے ساتھ نہ وہ حوصلے رہے اور نہ وہ فضائے بعید! اب بھی بیتے ہوئے دنوں کی یاد تازہ کر لیتا
...اس طرح کہ کمرے میں سگار کا دھواں پھیلا ہوا ہے، آراستہ کمرے میں تہذیب کے فرزندوں کا ہجوم ہے لاابالیانہ
...دھوئیں میں تحلیل ہوتے جاتے ہیں اور سامنے دیوار پر ایک رقاصہ کی تصویر آویزاں ہے نہ مرزا غالب اور نہ جوش
...فیر بلکہ مقطع میں سخن گسترانہ بات یہ آن پڑی ہے کہ مغربی یورپ کا اقتصادی مزاج عوام کے لئے صحت بخش ہے

یا یہ معاشی مسئلہ ہے بعض صفحۂ قرطاس کی زینت ہیں ——

"مہر نیمروز" کو کبھی کبھی بھیج دیا کیجئے آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ برفانی ماحول میں اسکی شعاعوں سے سینہ گرم رہیگا پھر اقبال کے سامنے آنکھیں نیچی نہیں ہونگی

سینہ میں اگر نہ ہو دلِ گرم ۔۔۔ رہ جاتی ہے زندگی میں خامی

دیکھئے اس "نیم ملاقات" کو "مگر را دراز کردن" کے اصول پر کہاں تک کھینچ لے گیا۔ مقصد یہ تھا کہ جبتک اسپر گنجائش ہو بقول غالب بہ نسخۂ دیگر لکھتے رہیں۔ جنون کی حکایات خونچکاں اور اب لکھئے لکھنے چونکہ عرش سے تحت الثریٰ تک آپہنچا ہوں اس لئے منشی صاحب کو بوحدت مضمون سلام عرض کر کے رخصت ہوتا ہوں۔

سلطان جمیل نسیم :۔

اپنے خط کے جواب میں مہر نیمروز کو پاکر از حد مسرت ہوئی۔ یہ صبر آزما خموشی تو مجھے مہر نیمروز کی طرف سے مایوس کر ہی ڈالی تھی۔ خدا کرے مہر نیمروز پھر اپنی سابقہ تابناکیوں کے ساتھ اہل قلم کے ذہنوں کو منور کر دے۔ اور کرتا رہے۔ اور درویش کی صدا کیا ہے۔۔

عبد المغنی :۔

میں یہ شاعرانہ مبالغہ تو نہیں کر سکتا کہ مہر نیمروز آسمانِ ادب پر واقعی نصف النہار پر آگیا ہے۔ اور اس طرح لفظوں میں اسم بامسمیٰ ہے،

آپ کے مستقل موضوعات میں حسب معمول "وفا یا جفا" کے بہت بصیرت خیز اور بصیرت افروز چیز ہے۔ "غلطی ہائے مضامین" معلومات افزا مضمون ہے اس بار خصوصیت سے نظم کا حصہ بہت جاندار معلوم ہوتا ہے خاص کر شاعر لکھنوی کی غزل مجھے پسند آئی ان کے دو شعر مجھے بھولتے نہیں :۔

وہی مزاجِ مشیت کا رخ بدلتے ہیں ۔۔۔ جو حادثوں کو سہارا بنا کے چلتے ہیں
جو چپ رہیں تو ہے فصلِ بہار پہ الزام ۔۔۔ جو مسکرائیں تو سینوں کے داغ جلتے ہیں

میں نہیں جانتا موصوف کون ہیں، در اصل سوا اس کے کہ رسالوں میں یہاں وہاں نظر آجاتے ہیں۔ اگر یہ نوخیز ہیں تو چاہئے کہ اردو کو ایک اچھا شاعر مل رہا ہے۔ قمر الدین اہل کا افسانہ کافی پسند آیا۔ ان کی پیش کش میں ندرت اور تازگی ہے اگر وہ اردو میں افسانے کو کچھ دے سکیں گے۔ آپ کے اداریے بڑے اہم اور پر مغز ہوتے ہیں بالخصوص غیر ادبی، سیاسی و سماجی موضوعات پر آپ کے اس سلسلے میں جو اداریہ لکھا ہے وہ اردو ماہناموں میں ایک قابلِ تقلید اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

سحر انصاری :۔ چند روز قبل بازار جانے کا اتفاق ہوا۔ الحمد للہ کہ رسالہ کی کمی محسوس ہوا کی ہے اس رسالے کی بہر کیف آپ نے ہمتوں اور استقلال سے اسے پھر سے نکالا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھ ایسے ذوق کے ہمدم دیرینہ کا ملنا بہت ہی ملاقات مسیحا و خضر۔ لیکن یہ شمارہ بس ایک تمہید ہے آئندہ کے اشاعتی پروگرام کی۔ ورنہ وہ شان اس پرچے میں نہیں جو اس سے قبل کے شماروں میں تھی "اقبال کا نظریہ فن"، "خوب ہے اور" "رازِ چمن" بہت لطیف ہے!

سید جمال اختر ہاشمی

عربی زبان کی اہمیت

زبان کیا ہے چند مفروضہ آوازیں جنکے ذریعہ ہم اظہار خیال کرتے ہیں۔ اور دوسروں کے دل و دماغ کو سمجھنے کی سعی کرتے ہیں۔ ان آوازوں کو جب چند مفروضہ لکیروں میں محفوظ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو انہیں حروف یا رسم الخط کہا جاتا ہے اس حقیقت کو سامنے رکھکر کسی زبان کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم دیکھیں کہ اس کے ذریعہ ہم کتنے دماغوں تک پہنچ سکتے ہیں، اس کے واسطے سے ہم کتنے اور کس معیار کے علوم و افکار تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں اس میں اثر و نفوذ کی کتنی قوت ہے اور خود یہ زبان ادائے خیال کیلئے اپنے اندر کتنی صلاحیت رکھتی ہے۔ صرف اسی طرح اس کی علمی، مذہبی اور بین الاقوامی اہمیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ آیئے اس اصول کو پیش نظر رکھ کر عربی زبان کی اہمیت پر غور کریں :-

عربی زبان روئے زمین پر بسنے والے کروڑوں انسانوں کی مادری زبان، درجنوں آزاد اور نیم آزاد حکومتوں کی سرکاری زبان اور دنیا کے عظیم ترین مذہب ۔۔۔ اسلام کے ماننے والوں کی مذہبی زبان ہے۔ تقریباً ۳۷ لاکھ ۲۸ ہزار ایک سو اٹھاسی (۳۷،۲۸،۱۸۸) مربع میل پر بسنے والے تقریباً ۹ کروڑ ۳ لاکھ ۷۵ ہزار تیئیس (۹،۰۳،۷۵،۰۲۳) انسان اظہار خیال کے لئے اس کے محتاج ہیں۔ یہ علاقہ جو ۲۱ خود مختار اور نیم مختار سیاسی وحدتوں پر مشتمل ہے۔ اطلس کی پہاڑیوں سے بحر اوقیانوس اور بحیرہ روم کے کناروں سے وسط افریقہ اور بحر ہند تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ علاقہ فوجی اور سیاسی نقطۂ نظر سے دنیا کا اہم ترین علاقہ ہے۔ کیونکہ باستثنائے امریکہ یہ دنیا کو تقریباً بیچ سے دو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔

اس کے علاوہ دنیا کا ہر وہ ملک جہاں مسلمان بستے ہیں۔ وہاں اس زبان کے جاننے والے کثیر تعداد میں موجود ہیں بالخصوص ہندوستان، چین، انڈونیشیا، ملایا، افغانستان، ایران، روس، ترکی اور پاکستان وغیرہ میں لاکھوں لاکھ ایسے لوگ موجود ہیں جو عربی جانتے ہیں۔ مزید برآں یورپ، امریکہ اور دنیا کے تمام متمدن ممالک کی یونیورسٹیوں میں عربی زبان کی تعلیم کسی نہ کسی نام سے ضرور دیجاتی ہے۔ اسلئے ہر جگہ عربی دانوں کا چھوٹا یا بڑا گروہ موجود ہے۔ جو اسے سمجھ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کے متعدد شہروں سے کئی کئی عربی روزنامے نکلتے ہیں۔ پیرس کے بعض روزنامے تو ہمارے عام اردو اخبارات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تعداد میں چھپتے ہیں۔

اس کا رسم الخط دنیا کا مقبول ترین رسم الخط ہے اس لئے کہ لاطینی رسم الخط میں لکھی جانے والی زبانوں کی تعداد ڈیڑھ درجن

بھی نہیں لیکن عربی رسم الخط میں لکھی جانیوالی زبانوں کی تعداد صرف پاکستان ہی میں کم و بیش دس ہے۔ اور ساری دنیا میں دو درجن سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ دنیا کی چند نہایت ہی اہم زبانیں مثلاً اردو، فارسی، عربی، سندھی، پشتو، پنجابی، بلتی، کشمیری، لا ضفواری، کھوسنا، سوڈانی، سواحلی، ملک کردی، اولغوری، قازانی، ملایو، اثیوپیائی، ہسپانی اور بربری وغیرہ اسی رسم الخط میں جاتی ہیں :-

یورپ جس زمانہ کو دور ظلمت کے نام سے پکارتا ہے۔ وہ دور اسکے لئے اندھیرے کا دور ہو تو ہو دنیا کے لئے نہ تھا اسلئے کہ جب یورپ جہالت کی تاریکیوں میں بھٹک رہا تھا ٹھیک اسی وقت علم و ہنر کا سورج مشرق سے اپنی پوری آب و تاب سے ضیاء پاری کر رہا تھا۔ یہ دور جو ساتویں صدی عیسوی سے شروع ہو کر سولہویں صدی عیسوی تک۔ تہذیب علم و فن کی تاریخ کا سب سے تابناک دور ہے۔ اس لئے کہ علم و فن کا شیر خوار بچہ اسی عہد میں عالم طفلی کی راہوں کو طے کرتا ہوا شباب کی منزل میں داخل ہوا۔ اس دوران میں نہ صرف یہ کہ ان علوم پر کافی کام کیا گیا جنکی ابتداء کو پہلے قدیم چین، ہندوستان، بابل، نینوا، ایران، یونان اور مصر نے کی بلکہ متعدد نئے علوم بھی عالم وجود میں آئے۔ یہ کہنا کسی طرح مبالغہ نہیں کہ اس دور میں علم و ہنر پر اتنی وسعت اور ان کی میں اتنا اضافہ ہوا جتنا نہ تو اس سے پہلے ہوا تھا اور نہ اسکے بعد کبھی ہونا ممکن ہے۔ گو آج طبیعیات، کیمیا، حیاتیات، ارضیات اور دیگر سائنس کی ترقی کے سامنے اس دور کی ترقی ہیچ نظر آئے لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ تمام علوم و فنون کی اس دور یعنی ازمنہ وسطی میں پڑی یا اس دور میں اتنی ترقی ہوئی کہ وہ آج کے تمدن کو لانے والے ذرائع اور وسائل عطا کرنے کی ثابت ہو سکے۔ فلسفہ ہو یا تاریخ، ہندسہ ہو یا اقلیدس، ہیئت ہو یا نجوم، معاشیات ہو یا سیاسیات، طبیعیات ہو یا کوئی علم چھٹی صدی عیسوی تک۔ اس قبل۔ تھا کہ ان ہیچ معنوں میں علم یا فن کا درجہ دیا جا سکے لیکن ساتویں صدی اور اس جتنی ترقیاں مختلف علوم و فنون میں ہوئیں اسکی بنا پر انسانی تمدن میں اتنی تیز ترقی کی صلاحیتیں پیدا ہوئیں کہ خود انسان اپنی کی وسعت پر حیران اور اپنے ذہن رسائی تیزی پر ششدر ہے آج خلاء کی لامحدود وسعتیں ہیں ہیچ نظر آتی ہیں۔ چاند اور ستاروں تک پرواز اب خواب و خیال نہ رہا۔ لیکن یہ کسکی محنت کا نتیجہ ہے بے شک یہ ان بے شمار سائنسدانوں کی ساری کا ثمرہ اور انکے تجربہ کا نچوڑ ہے جو پچھلی ۱۴ صدیوں سے برابر علم و فن میں اپنی حیثیت کے مطابق اضافہ کرتے رہے ہیں۔ اور انکی بڑی تعداد اسی دور ظلمت سے تعلق رکھتی ہے۔ جس نے اپنی کاوشوں اور عرقریزیوں سے تمدن کو مالا مال کیا۔

یہ ایک ہزار سال کا طویل دور اسلامی فتوحات اور حکومت کا دور ہے۔ اور اس سارے عرصہ میں عربی تمدن اور دنیا میں حکمراں رہی۔ اسلئے اس دوران میں جتنی کتابیں لکھی گئیں وہ عربی میں ہیں۔ علم و فن کی یہ انتہائی بدنصیبی ہے کہ چھپائی کا نہ ہونے کی بنا پر ان کتابوں کی اشاعت اسی وقت نہ ہو سکی اور ان میں سے اکثر جاہل دشمنوں کی جہالت کی نذر ہو گئیں۔ پھر بھی کتابیں ہم تک پہنچیں وہ علم کا بیش بہا خزانہ ہیں اور ان سے ہیں جو کچھ علاوہ پچھلی تمام نسلوں کا متحدہ کارنامہ ہے۔ اس عرصہ و فنون میں جو کچھ ترقی ہوئی وہ انہیں کتابوں کی بنا پر ہم تک پہنچی۔ اور اگر کوئی شخص ان سے استفادہ کرنا چاہے تو اس کے عربی زبان کا پڑھنا ایک لازمی امر ہوگا۔

مثال کے طور پر علم تاریخ کو لے لیجئے۔ ازمنہ وسطی کی تمام تاریخ یا تو عربی زبان میں ہے یا اس کے اصل ماخذ عربی

کوئی طالب علم ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ پڑھے بغیر اس علم پر عبور حاصل نہیں کرسکتا اور چونکہ اس کے تمام ماخذ عربی میں ہیں۔ اس لئے عربی کی تھوڑی ہی سہی مگر شُدبُد ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام چوٹی کے مؤرخین عربی داں ہوئے ہیں یا دوسرے عربی دانوں سے مؤرخ ہوسکے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ عربی کی اکثر اہم کتابوں کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔ یہ سلسلہ جو گیارہویں صدی سے شروع ہوا اور اب تک ہے۔ جانے کب تک جاری رہے گا۔ مگر درحقیقت ساری کتابوں کا ترجمہ ہوا ہے اور نہ صرف ترجمہ پڑھنے سے کام چلتا ہے۔ ایک ب دوسری بہت سی کتابوں کے حوالہ اور استفادہ سے لکھی جاتی ہے۔ اور یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی زبان کی ساری کتابوں کا ترجمہ یا اس سے زائد زبانوں میں ہو جائے۔ اس لئے ایک طالب علم کی تشنگی اس وقت تک باقی رہ جائیگی جب تک کہ اس علم کی اچھی کتابیں جو ہیں سب نہ پڑھ لے، اور دنیا کے کتنے ہی ایسے علوم ہیں جن کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ بہترین کتابیں عربی زبان ہی میں ہیں اور یہ علوم ان علوم کے علاوہ ہیں جو مسلمانوں کے اپنے مذہبی علوم ہیں، مثلاً حدیث، فقہ، تفسیر اور علم رجال وغیرہ۔ ایک فن معاشیات لیجئے عربی نہ جاننے والے کم ظرفی، ورننگ نظریہ کی کتنی عمدہ مثال ہے۔ عام طور پر آدم اسمتھ کو موجودہ معاشیات کا باوا آدم تسلیم ہے حالانکہ ابن خلدون کے معاشی نظریات کے مقابلہ میں آدم اسمتھ تو کجا مارشل کے اکثر و بیشتر نظریات فرسودہ مہمل اور لچر ہیں رہے نسلی و جغرافیائی تنگ نظری، حق کہنے والا چونکہ غیر قوم کا ایک شخص ہے اس لئے حق کو ہم تسلیم ہی نہ کرینگے خواہ بعد میں کتنا ہی پڑے۔ اگر معاشیات پر کام ابن خلدون کے نظریات کے بعد سے شروع ہوتا تو دنیا آج جس طبقاتی کشمکش میں مبتلا نظر آتی شاید کبھی ختم ہوچکی ہوتی اور علم معاشیات کے بعض نظریات جسقدر رذلیل اور بیہودہ نظر آتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ وہ لتنبلے وقدرت

یہی حال علم سیاسیات میں ابن خلدون کے نظریات کا ہوا۔ جغرافیہ میں مسلمانوں اور عربوں کی ترقی کو صرف اس لئے بھلا دیا کہ اپنے جغرافیہ داں عام طور پر عربی داں نہیں ہیں۔ لیکن یہ سچ ہے اگر عربی کی پرانی کتابوں کو الٹیں تو معلوم ہوگا کہ امریکہ کی کا سہرا خواہ مخواہ کولمبس کے سر باندھا جاتا ہے مسلمانوں نے امریکہ تو تیسری صدی ہجری ہی میں دریافت کرلیا تھا اور ابھی دنوں کی بات ہے کہ کچھ پرانے عربی سکے کیلیفورنیا کے مقام پر ملے تھے جس کی کوئی توجیہ نہ کی جاسکی۔ مزید یہ کہ عرب جغرافیہ نویس و گرین لینڈ کے سواحل اور بحری راستوں کے نقشے کس طرح اپنی کتابوں میں نقل کئے تھے اسکا جواب آج کا کوئی جغرافیہ کے قابل نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عربی کے بغیر بہت سے علوم و فنون میں تحقیقات کا انجام یا تو صفر رہے گا یا گمراہی۔ اسی بنا پر راجر بیکن نے عربی پڑھی اور اس حد تک پڑھی کہ ایک زمانہ نے اسے مسلمان ہونے کا طعنہ دیا۔ اس حقیقت کا ریطلر میڈ رڈ یونیورسٹی اسے یوں ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہے۔

لوگ اب محسوس کرنے لگے ہیں کہ یورپ قرون وسطیٰ میں عربی تمدن کا مرہون منت ہے جس کے سرچشموں سے یکساں مان یہودیوں اور عیسائیوں نے سیرابی حاصل کی۔ اب لوگ اس حقیقت سے آشنا ہونے لگے ہیں کہ علوم طبیعیہ اور ریاضیات کے اساسی قوانین اور علوم عمرانی کی روح دور تجدد و اصلاح اور عہد نہضت بازآتا میں اسی سرچشمۂ شیریں عرب سے سیرابی حاصل کرتی تھی۔ علماء عصر جیسے جیسے اس تمدن و تہذیب کا گہرا مطالعہ کرتے جاتے ہیں ویسے ویسے اثر موجودہ تمدن و ثقافت میں پاتے ہیں۔

یہودا نے صرف ماضی کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن ماضی کیا ہے ؟ علم و ہنر کے لئے ماضی اساس کا کام دیتا ہے جس بنیاد کے بغیر کسی مکان کی دیوار کا چننا ممکن نہیں اسی طرح ماضی کے اوراق پارینہ سے استفادہ کئے بغیر تمدن کا ارتقا نام رہا ہے دیا یوں ہی چلتا رہا ہے۔

قوت و نفوذ۔ عربی کی قوت و نفوذ کا یہ عالم ہے کہ مسلمانوں کی فتح سے نصف صدی بعد مراکو سے عراق تک یہ زبان فرنکا یا زبان عمومی کے طور پر استعمال ہونے لگی اور صرف چند سال بعد یہ کم و بیش تمام مقامی زبانوں پر غالب آگئی۔ چنانچہ عراق میں دسریانی، شام میں بدوی و سریانی، مصر میں قبطی و رومی اور شمالی افریقہ میں لاطینی کی جگہ عربی نے لے لی اور ستر سال کے اندر ان تمام علاقوں میں عربی مشترکہ زبان قرار پا گئی۔ حالانکہ ان علاقوں میں جو عرب ہجرت کر کے گئے تھے۔ انکی تعداد کسی وقت چند لاکھ سے زیادہ نہ تھی زبان کی قوت اور اسکی شیرینی و فصاحت تھی کہ اس عرصہ میں ان تمام علاقوں میں نہ صرف یہ کہ رائج ہو گئی بلکہ چند صدیوں کے اندر تمام زبانوں کو نکال باہر کیا۔ اور آج ان وسیع علاقوں میں عربی اور صرف عربی ہی واحد ذریعہ جس سے کام لے کر کوئی خیال ادا کیا جا سکتا ہے۔

دمشق کی المجمع العلمی (اکادیمی) کے سابق صدر ڈاکٹر محمد کرد علی مرحوم لکھتے ہیں۔

"اندلس کو فتح ہوئے پچاس سال سے زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ ارباب کلیسا اپنی نمازوں اور دعاؤں کو عیسائیوں کو سمجھانے کی غرض سے عربی میں ترجمہ کرنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ کیونکہ یہ لوگ لاطینی زبان سے کنارہ کش تھے اور عربی زبان سے انکو ایک طرح کا عشق پیدا ہو گیا تھا۔"

یہ تبدیلی اتنے کم عرصہ میں اور اتنے مؤثر انداز سے اپنی آپ مثال ہے اور اس میں کسی خوف کسی لالچ کو دخل نہ تھا۔ یہ زبان کی اپنی صلاحیتوں کی بنا پر ایسا ہوا۔ چنانچہ فرانس کا مشہور فلسفی رینان اس کا اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"انسانی تاریخ میں سب سے عجیب و غریب واقعہ جس کے راز کا انکشاف دشوار ہے عربی زبان کا پھیلنا ہے۔ ابتدا تو یہ زبان غیر معروف تھی، ناگہاں یہ حد کمال پر ظہور پذیر ہوئی۔ اس قدر سلیس اور شیریں ہے کہ کوئی زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس تدریجی نیا ہے کہ اس کی نظیر نہیں۔ یہ اپنے اندر اتنا کمال رکھتی ہے۔ کہ اس دور سے لیکر موجودہ عہد تک اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ نہ اس کا لڑکپن ہے نہ بوڑھاپا پہلی ہی مرتبہ یہ مکمل اور مستحکم شکل میں ظہور پذیر ہوئی مجھے نہیں معلوم کہ اس قسم کا واقعہ کرہ ارض کی زبانوں میں سے کسی زبان کے متعلق پیش آیا ہو، قبل اس کے کہ وہ گوناگوں تغیرات یا مختلف ادوار اور مراحل میں سے نہ گذرے ـــــــ عربی زبان کی فتح سے بڑھکر اور حیرت انگیز کبھی کوئی فتح نظر نہ آئی۔ کیونکہ عربی زبان بغیر جدال و نزاع کے دنیا کے بڑے بڑے حصوں میں عام ہو گئی ہے۔ اسکے ہمہ گیر اور جہانگیر زبان ہونے یا دینی، سیاسی اور فکری زبان ہونے کے شرف میں کس کو اختلاف ہو سکتا ہے؟"

یہ اعتراف ہے ایک ایسے شخص کا جس نے جمال الدین افغانی ؒ کے نظریہ "پان اسلامزم" کو مجذوب کی بڑ اور جنون قرار دیا آج اسپین سے مسلمانوں کو نکلے ہوئے کم و بیش پانچ صدیاں اور انکا اقتدار کا جھنڈا اکھڑے ہوئے کوئی سات سو

لیکن پرتگیز اور ہسپانوی زبانوں میں ہزاروں الفاظ ہیں جو یا تو خالص عربی ہیں یا عربی سے ماخوذ ہیں۔ عام اندازہ کے مطابق
ذکر میں کوئی تین ہزار الفاظ اور موخرالذکر میں ایک چوتھائی الفاظ عربی سے بلواسطہ یا بلاواسطہ متاثر ہیں دوسری یوروپی زبانیں
اثر سے اپنے آپ کو نہ بچا سکیں۔ مختلف زبانوں میں عربی ادب کے جو اثرات پائے جاتے ہیں اس کی مثال کے لئے میں یہاں
ہسپانیہ کے سب سے بڑے شاعر JUAN RAMON JUNÍNEZ، جنہیں ۱۹۵۶ء میں لٹریچر کا نوبل پرائز
اور جو اپنے نام کی تخفیف J. R. J. سے مشہور تھے، انکی نظم کا ایک ٹکڑا پیش کرتا ہوں۔ شاعر صبح صادق کا منظر پیش
ہوتے کہتا ہے۔ (یہ شاعر جون ۱۹۵۸ء میں مر گیا)

SE PARABA
LA RUEDA DE LA NOCHE.
VAGOS ÁNGELES MALVAS
APAGABAN LAS VERDES ESTRELLAS.
UNA CINTA TRANQUILA
DE SUAVES VIOLETAS
ABRAZABA AMOROSA
A LA PÁLIDA TIERRA

(یعنی) رات کا پہیہ اپنے چکر پورے کر چکا تھا۔ سایوں کے فرشتے ستاروں کی قندیل بجھا رہے تھے۔ خوش نما بنفشی
ملگجی زمین سے گلے مل رہا تھا۔

ان چند سطور میں اسلوب بیان پر عربی اثرات صاف نمایاں ہیں۔ جاہلی۔ مخضرمی اور اسلامی دور کے عربی شعراء میں دن اور
کی رفتار کو پہیے کے دوران سے یا چکی کے دوران سے تشبیہ دینا عام چیز ہے۔ چنانچہ عربی میں رحی الایام۔ رحی اللیالی اور
الحرب کی ترکیبیں بہت عام ہیں۔ دوسری چیز جو نمایاں طور پر عربی ادب سے تاثر کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ افق پر سفیدۂ سحر
ظاہر ہونے کو شاعر کا بنفشی فیتہ اور معانقہ سے تعبیر کرنا ہے۔ حتیٰ کہ جو لفظ معانقہ کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے وہ خود
عربی مادہ برش سے مشتق ہے۔

کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اثر ہسپانیہ اور دیگر زبانوں کے ادیب کے دماغوں پر عربوں نے زبردستی ٹھونسا تھا۔ اگر یہ زبردستی
ہوتا تو آتنی صدیوں کے بعد اس ہسپانوی شاعر کی زبان سے عربی کے محاورات کہاں سے نکلتے۔ یہ اثر تو خود عربی زبان کا
صدیوں کی کوشش کے بعد بھی اس کا اثر یورپ سے نہ نکل سکا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ عربی زبان کا لغت دنیا کا وسیع ترین لغت ہے۔ بھلا اس زبان کی وسعت کا کیا اندازہ لگایا
جا سکتا ہے۔ جس میں صرف اونٹ کی مختلف کیفیات کو ظاہر کرنے کے لئے چار سو سے زائد الفاظ ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ ابن
درید افریقی کے مشہور لغت میں کوئی تین لاکھ مادے ہیں۔ اگر ان کے تمام اشتقاقات کو جوڑا جائے تو شاید بے شمار الفاظ بن جائینگے

اس زبان کے صرف و نحو کا مقابلہ دنیا کی کوئی زبان نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اس کے تمام قواعد و ضوابط انتہائی مکمل اور بہت کم استثناء اس میں ملتے ہیں۔

اوپر بیان کا بیان آچکا ہے۔ اس کی روشنی میں عربی زبان کی مختلف علمی و فنی صلاحیتوں کا اندازہ مشکل کام نہیں۔ یہ زبان کی اپنی صلاحیت ہے کہ جسکی بنا پر وہ اتنی جلد اور اتنے مؤثر انداز میں پھیل گئی۔

آج جبکہ آمد و رفت کی آسانی نے اقوام عالم کو ایکدوسرے سے بے حد قریب کر دیا ہے۔ اور مختلف ممالک کے ثقافتی، تجارتی، فوجی، اور معاشی تعلقات کی بنا پر یہ ضروری ہوگیا ہے۔ کہ ہر قوم دوسری تمام اقوام کے ادب، تاریخ، فلسفہ دیگر علوم و فنون کا گہری نظروں سے مطالعہ کرے۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ ہر ملک میں دنیا کی تمام متمدن اقوام کی زبان جاننے والے باختیار موجود ہوں۔ اسی ضرورت کے پیش نظر اکثر و بیشتر یونیورسیٹیاں ہر بڑی زبان کا ایک شعبہ اپنے یہاں رکھنے پر مجبور ہیں۔ چونکہ مسلمان بحیثیت مجموعی دنیا کے اہم ترین خطوں پر آباد ہیں۔ اور انکے درمیان کچھ عرب فتوحات اور حکمرانی کی بنا پر اور کچھ ثقافتی مذہبی اثرات کی وجہ عربی زبان علمی، فنی اور مذہبی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے دنیا کی دوسری تمام اقوام خواہ انہیں عرب اور مسلمانوں سے کتنا ہی بغض و عداوت کیوں نہ ہو عربی پڑھنے اور پڑھانے پر مجبور ہیں۔ نہ صرف اس لئے کہ مسلمانوں کو نظر انداز کر کے انکا دنیا میں زندہ رہ جانا امر محال ہے۔ بلکہ اس لئے بھی کہ اگر وہ تمدن کے ارتقاء اور اسکی کوششوں میں کوئی عملی سرگرمی دکھانا چاہتے ہیں۔ تو علوم و فنون کی تحقیقات کیلئے عربی کا علم بھی ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت جیسا متعصب ملک بھی اپنی یونیورسیٹیوں میں عربی و فارسی کے شعبہ جات رکھنے پر مجبور ہے۔ ورنہ ان شعبہ جات کا وجود نہ تو مسلمانوں کی محبت کی بنا پر ہے اور نہ عربوں کی دوستی کی وجہ سے۔

عربی کی اہمیت قرون وسطیٰ میں جو کچھ تھی وہ پوشیدہ نہیں۔ لیکن تمدن کے موجودہ دور میں بھی جبکہ اقوام مغرب آندھی طوفان کی طرح ساری دنیا پر چھا گئی ہیں۔ اور زبان، فلسفہ، سائنس اور دیگر علوم کے کبھی نہ مٹنے والے اثرات مشرق میں قائم ہیں، عربی کی اہمیت ویسی ہی ہے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔ اس لئے کہ قرون وسطیٰ میں اگر کوئی انگریز عربی نہ جانتا تو اس کے لئے کسی وقت، اور مصیبت کا سامنا ہوتا تھا۔ لیکن آج دنیا کے دور دراز کونوں میں بسنے والوں کو بھی اگر ان خطوں سے معاشی اور ثقافتی تعلقات رکھنے ہیں تو عربی پڑھنی لازمی ہے۔ اس طرح بدلے ہوئے حالات میں بظاہر تو یہ نظر آتا ہے کہ عربی نے اپنی اہمیت کھو دی ہے لیکن حقیقت اسکے بالکل برعکس ہے یعنی عربی کی اہمیت میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہوگیا ہے۔ یہ اضافہ کچھ تو عربی کی ہیئت ترکیبی ——— اس کے نفوذ کی قوت، اسکے لغت کی وسعت اسکے فصاحت و بلاغت کے ناقابل معیار کی بنا پر ہوا ہے۔ اور کچھ حالات یعنی پچھلے تمام علمی خزانوں کا عربی میں ہونا اس زبان کی علاقائی وسعت اور اسکے بولنے والوں کی عددی طاقت اور جغرافیائی موقف و اہمیت کو دخل ہے۔ اور کسی طرح یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ مستقبل میں ان وجوہ و اسباب میں کوئی کمی ہوگی لہٰذا یہ سمجھنا چاہئے کہ عربی زبان کی اہمیت مستقبل میں وہی باقی رہے گی جو آج ہے۔

حسن مثنیٰ ندوی، اڈیٹر پرنٹر و پبلشر نے ایس اے ای پریس میں چھپوا کر ۲۴۲ بہار ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی سے شائع کیا۔

ریحان صدیقی

"نقد"

ستمبر کا شمارہ زیر مطالعہ ہے۔ اس میں تین افسانے ہیں اور ایک ڈرامہ۔ "سائے" (فخرالدین اپل)۔ "احمق، منافق) "پیچھے" (آغا عادل ندیم) اور "سناٹا" (محمد عمر میمن)

یہ چاروں تخلیقات اردو مختصر افسانہ کی روایات تکنیک اور معیار پر پوری اترتی ہیں۔ یعنی وہی۔۔ TH HACKNEYED۔ وہی CONVENTIONAL کردار اور فضا، وہی IMITATED اسلوب اور PERVERTED MORAL۔ ان چاروں تخلیقات کے بنیادی عناصر ہیں۔

آج کل افسانہ لکھنا بہت آسان ہے۔ ایک TRIANGLE لے لیجئے۔ "لڑکی" اور "لڑکا" اور دونوں کے درمیان ج سماج کے اجزائے مرکب ہیں خود لڑکی اور لڑکے کے والدین، وہیں EMPLOYMENT EXCHANGE یہ دار۔ افسانے کے سارے بنیادی ELEMENTS موجود ہیں بس کسی جدید اردو افسانہ کا مطالعہ باقی ہے م بدل دیجئے ایک نیا جدید افسانہ تیار ہے۔

متذکرہ بالا افسانے کچھ اسی قسم کے ہیں۔ چاروں تخلیقات کی ہیروئن مشترک ہیں۔ حسب عادت سب مغرور حسب معمول سب انتہائی خوبصورت ہیں۔ سب یا تو بہت غریب ہیں یا بہت امیر ہیں۔ سب ظالم زمانے کی ستائی ہوئی قلاش، مجبور اور بیکس ہیں یا بہت متکبر مغرور اور کسی سرمایہ دار کی لڑکی ہیں۔ ان سب کے ہیرو حسب افسانہ نگار خود ہیں معمول اور عین مطابق فیشن سوشلسٹ، نظام کے علمبردار ہیں اور سارے جہاں کا درد ان ہی کے جگر میں ہے۔ تضاتی سماج کو فراٹے کے ساتھ گالیاں دیتے ہیں مگر کرتے دھرتے کچھ نہیں۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہتے ہیں ں ہیں۔ مجبور ہیں منہ چھپاتے ہیں۔ کمزور ہیں۔ بیمار ہیں اور مدقوق ہیں اس لئے صرف اداس اور غمزدہ رہتے ہیں مغۂ زندگی پر کبھی کبھی ہاتھ ضرور چھاڑ دیتے ہیں۔ ورنہ عموماً خلا میں گھورتے رہتے ہیں کہ شاید تاریکی سے کوئی روشنی ابھر بالا ہو جائے۔ زیادہ تاؤ آتا ہے تو محاذ جنگ پر چلے جاتے ہیں۔ خواہ کہیں جنگ ہو رہی ہو یا نہیں اور بیچاری ہیروئن دمیں روتی رہتی ہے۔ وضاحت کے لئے چند اقتباسات ان چاروں تخلیقات سے پیش کرتا ہوں۔

ہیروئن کی خوبصورتی:۔

"وہ بڑے حسین قد کی مالک تھی۔ اس کی ناک ستواں اور نکیلی تھی اتنی خوبصورت اور نازک سے" ("سائے")

"وہ اِن سب میں (گویا WORLD BEAUTY CONTEST PARADE ہو رہی ہے!) حسین تھی۔ وہ پاکٹ سائز حسینہ سچ مچ حور معلوم ہوتی تھی" ("احمق")

"کتنی خوبصورت اور معصوم لڑکی ہے یہ" ("پیپے")

"— مگر وہ بڑی مغرور لڑکی تھی" ("احمق")

"اور یہ ہیں میری ایک بیحد شرمیلی سی ساتھی۔ طلعت جن کی خاموشی نگاہوں میں آنسوں کھڑاتے ہیں (ز

۲۔ سرمایہ داری اور عشق:-

"اس کی (ہیروئن) شادی بڑے امیر گھرانے میں ہوتی ہے" ("سلمے")

"وہ (ہیروئن) ایک موٹر نشین کی بیٹی تھی" ("احمق")

"لڑکے کا باپ حاجی تھا اور کافی سرمایہ دار"۔ ("سلمے")

۳۔ مدقوق چہرے:-

"رضیہ کے اکلوتے اور دق کے مریض بی۔ اے سے حاجی صاحب کی لڑکی کی شادی ہو رہی ہے" (ز

"میری غریب بہن کا شوہر شرابی اور عیاش ہے" ("پیپے")

"وہ اکثر بیمار رہتی ہے۔ میری بیمار بہن —" (سلمے)

۴۔ مریض، بے بس اور مجہول ہیرو:-

"میں بزدل تھا۔ میں پچھلے پورے برس سے اس سے (ہیروئن سے۔ ر۔س) منہ چھپاتا پھر رہا ہوں" (ز

"مگر میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ دور کا تماشائی جو دیوار کو پھاند نہیں سکتا تاکہ بیش قیمت زندگی کی ٹیڑھی شاخ سلجھ جاتی اور سنگین ہاتھ (کس کا ہاتھ؟ ر۔س) ٹوٹ جاتے۔ مگر میرے بازو کمزور تھے" ("سلمے")

"اس لئے کہ میں احمق ہوں" (ہیرو کا اپنے متعلق ارشاد) ("احمق")

"اُس کے (ہیروئن) دل میں اپنی محبت کا مدھم چراغ جلا کر وہ (ہیرو) محاذ جنگ پر چلا گیا — جواب کسی اجنبی خاک تلے مدفون ہے" ("سناٹا")

"میں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اٹھ نہ سکا" (ہیرو کی معذرت!) ("سائے")

"شاید تاریکی سے روشنی کی ایک لہر ابھرے" ("سلمے")

۵۔ فلسفۂ زندگی پر افسانہ نگاروں کے اقوال زریں:-

"مجھے یقین ہے کہ اگر کسی لڑکی کو لفٹ نہ دی جائے تو وہ اپنے آپ ہی جھکنے لگتی ہے —" ("احمق")

"مسکراہٹ صرف امیروں کا ہی حصہ تو نہیں۔ اس پر تو امیر و غریب سب ہی کا یکساں حق ہے" ("سنا

"زندگی کے تار ٹوٹتے نہیں زنگ آلود ہو جاتے ہیں" ("پیپے")

"اس کی زندگی کی دوسری حرکت زمانہ کی ضدوں اور بے انصافیوں کو پارہ پارہ کر دے گی" ("سائے")

"زندگی چمنی کے نکلے ہوئے دھوئیں کی طرح تاریک بھی اور بے مقصد ہے۔" ("پہیے")

"مجھے مِس ہوّر کے غرور کا سر کچلنے کے لئے اس سے نفرت کرنا ہوگی۔" ("احمق")

"ٹوٹے تاروں سے جذبات کے نغمے نہیں پھوٹ سکتے۔" ("پہیے")

اردو مختصر افسانہ کا تازہ ترین حادثہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے آپ کو بیک وقت افسانہ نگار اور فلسفی دونوں لگتا ہے۔ اس قبیل کے افسانہ نگار خود اپنے ہی افسانوں میں اپنی افسانہ نگاری کا بڑے دھوم دھڑکے سے ذکر کرتے خوش ہو لیتے ہیں۔ اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

"کہانی کار ہونے سے پہلے میں انسان ہوں۔" ("پہیے")

(کیا، کہانی کار انسان نہیں ہوتا۔ یہ پہلے اور بعد کی شرط آخر کیسی؟ ۔ ر۔ص)

"میں نے تمہارے افسانے پڑھے ہیں۔ ان میں تو تم قوس قزح کے حسن، تاروں کی چھاؤں اور کلیوں کے نقوش روشن کے ہو۔" ("پہیے")

"میں مشرقی ادیب ہوں۔ ساٹھ روپیہ کا معمولی کلرک۔" ("پہیے")

"یہ آدمی (ٹیلیفون آپریٹر) رائٹر ہے ——" ("احمق")

ان چاروں "تخلیقات" کے سارے کردار بے جان اور UNREPRESENTATIVE ہیں۔ روائتی ہیں۔ اور یہ افسانہ نگار کے اپنے تخلیق کردہ کردار نہیں ہیں۔ یہ HIRE کئے ہوئے ہیں، افسانہ نگار کا فلسفۂ زندگی بیان کرنے کے لئے۔ اور یہی وجہ ہے کہ سارے کردار مجبور بے بس، جذبات سے عاری، محسوسات سے خالی اور خیالات سے تہی ہیں۔ اس قسم کے سرد کردار اردو کے ہیجان افسانے میں بڑی آسانی سے مل جائیں گے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ افسانے دوسرے، خراب افسانے پڑھ کر تحریر کئے گئے ہیں۔ تخلیق نہیں کئے گئے ہیں۔ افسانہ نگار کا اپنا مطالعہ اور مشاہدہ کچھ نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو ناقص ہے۔ کچا ہے۔ ادھورا ہے۔ فنِ مختصر افسانہ نگاری بڑا اہم فن ہے۔ اور ایک حقیقی افسانہ نگار کو پورا احساس رہتا ہے کہ وہ اوّل و آخر افسانہ نگار ہے۔ لیڈر نہیں ہے۔ واعظ ہے خطیب نہیں ہے۔ ریفارمر نہیں ہے۔ علم معاشیات کی اچھی واقفیت رکھتا ہو جب بھی۔ وہ ماہرِ معاشیات نہیں ہے۔

لیکن اک ذرا آپ متذکرہ چاروں تخلیقات کو سامنے رکھیں۔ معلوم ہوگا جیسے کہیں پلاننگ بورڈ کا چیرمین بول رہا ہے کوئی لیڈر عوام سے مخاطب ہے۔ اور دھواں دھار تقریر کر رہا ہے۔ کہیں ہیڈ ماسٹر صاحب اپنا فلسفہ بگھار رہے ہیں۔ کہیں کوئی مولانائے مکرم ہیں کہ وعظ فرما رہے ہیں۔ اور یہ سارے فرائض خود افسانہ نگار ادا کر رہا ہے۔ دم بخود ہے تو بے چارا افسانے کا کردار —— حالانکہ بولنا اسے چاہئے تھا۔ مگر افسانہ نگار کردار کو کبھی گونگا کبھی لنگڑا کر دیتا ہے۔ اور اس سے کٹھ پتلی کا کام لیتا ہے۔ اپنی مرضی کے مطابق اسے نچاتا ہے۔ اور اگر کبھی کچھ کہتا ہی ہے۔ تو اس کی اہمیت ہز ماسٹرس وائس کے ریکارڈ سے زیادہ نظر نہیں آتی۔ گویا کردار یہ

"ابوالہول" ہے۔ سالہا سال سے ایک جگہ پر ساکت، جامد، بے حس، بے حرکت اور خاموش کھڑا ہے جس پر کا کوئی اثر نہیں ہوتا کسی اہم واقعے یا عزائم چھوٹنے یا بڑے واقعہ یا حادثہ کا کوئی رد عمل نہیں ہوتا۔

اور اسلوب بیجملے کے جملے EXTRACTED ہیں۔ مثلاً جیسے کسی نے کباب کر دیا ہو" منٹو کا جملہ۔ "اپنی شرٹ کے بٹن بند کرو۔ وہ میرے سینے کے بال دیکھکر کہتی" ("احمق") ۔۔ منٹو کا جملہ اور "دراز پوکلپٹس کی چکی اور مخروطی پتیوں پر شام کی الیلی مہک اور زیادہ گہری ہو گئی اور ساتھ والی جھیل کے شفاف پانی میں ان درختوں کے سائے اور زیادہ گہرے ہو گئے" ("سناٹا") ۔۔۔ اے۔ حمید کے جملے ۔۔۔ اور ایسے ہی بے شمار جملے ملیں گے۔

اب ذرا ان افسانوں کو ایک ایک کرکے لیجئے پہلا افسانہ ہے "سلسلے"۔ افسانہ کی آٹھویں سطر یہ ہے "ماضی کے ان معصوم دنوں کا ذکر آپ سے کس طرح کروں اور قصے کا آغاز کیسے کروں؟"۔
گویا اس کے اوپر جو سات سطریں ہیں وہ بے کار محض ہیں۔ غیر ضروری ہیں۔ مختصر افسانہ کا فن غیر ضروری کو کہاں برداشت کر سکتا ہے؟۔

دوسری بات جو اس افسانہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ افسانہ نگار کے ذہن میں کوئی واضح، نکھری ہوئی صاف اور مربوط بات نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو MIXED UP ہے یعنی افسانہ نگار نے PREMATURE بات کہنے کی کوشش کی ہے۔ وہ بات ابھی احساسات میں حل نہیں ہوئی۔ جذبات نہیں بنی۔ جو ذہن میں رچ بس نہیں گئی جو تجربے کے ابند ہن کے بغیر مشاہدہ اور مطالعے کے چولہے سے کچی یا ادھ پکی!
مزید یہ کہ اس افسانے میں الفاظ بڑے دردناک استعمال کئے گئے ہیں۔ تاکہ قاری پر رقت طاری ہو۔ رقت طاری نہیں ہوتی جھنجلاہٹ طاری ہوتی ہے۔ قاری غیر ضروری تفصیلات سے اکتاہٹ محسوس کرتا ہے۔ اس طرح افسانہ UNREADABLE بن جاتا ہے جو مختصر افسانہ کا سب سے بڑا نقص ہے۔ الفاظ، جذبات کے غلام ہوتے ہیں۔ جب تک لفظ کے پیچھے جذبات، تجربات یا محسوسات نہ ہوں، لفظ بے معنی ہوتا ہے۔ غیر متعلق ہوتا ہے۔ لفظ کے پیچھے SPIRIT لازمی ہے۔ پھر اس افسانہ میں رضیہ کا کردار ابھرتا ہے اور نہ "میں" کا۔ کردار حادثات زمانہ سے زیادہ حادثات قلم کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔

دوسرا افسانہ "احمق" ہے۔ جس کو افسانہ نگار نے اپنے اس "فلسفہ" پر BASE کیا ہے کہ "مجھے یقین ہے کہ اگر کسی لڑکی کو لفٹ نہ دی جائے تو وہ اپنے آپ ہی جھکنے لگتی ہے ۔۔۔ اس کی تمنائیں اور آرزوئیں مچلنے لگتی ہیں کہ اسے چاہا جائے ۔۔۔ میں نے ۔۔۔ اسی یقین پر فیصلہ کر لیا کہ مجھے مس ہیتھر کے غرور کا۔ سر کچلنے کے لئے اس سے نفرت کرنا ہوگی ۔۔۔"
اگر یہ بات افسانہ نگار نے لکھ ہی دی تو پھر افسانہ لکھنے کی ضرورت کیا باقی رہ گئی۔ اگر افسانہ کا تو کم از کم یہ جملے نہیں لکھنے چاہئے تھے۔ اس افسانہ کا سب سے بڑا نقص یہی جملے ہیں جو پورے تاثر کو ختم کر

اس قول بالیقین کے مطابق ہیرو یعنی خود افسانہ نگار آتشِ عشق میں کود پڑتا ہے اور PRE-PLANNED
روع کر دیتا ہے۔ ہیروئن سے اس لئے کہ اپنے ہی قول کے مطابق اسے معلوم ہے۔ وہ نفرت کیسے یا محبت
لو بہر حال اس کے سامنے سپر ڈالتی ہے۔ چنانچہ مس ہوّر کا کردار نہ صرف یہ کہ UNCONVINCING
رفطری۔ اور غیر حقیقی بھی ہے۔ خود ہیرو کا کردار عجیب و غریب ہے۔ وہ عشق (بظاہر نفرت) تو مس ہوّر سے کرتا
ہر لیقین مسز ریمبیڈلیس کی سڈول پنڈلیوں کے ننھے ننھے بھورے بالوں کی کرتا ہے۔ اور مس ہوّر کے بارے
ہے کہ وہ بدچلن ہے آوارہ ہے۔ پھر یہ ہیرو احساس کمتری کا بھی شکار ہے کیونکہ جس قسم کی نفرت اس
میں بتائی گئی ہے وہ عموماً احساس کمتری کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ہیرو یعنی افسانہ نگار کا یہ کہنا کہ ۔
میں ایسی مغرور لڑکیوں سے نفرت کرتا ہوں "
اصل احساس کمتری کی دلیل ہے۔ اور پھر ہیرو بیوقوف بھی ہے۔ خود کو احمق کہہ کر مسرت محسوس کرنا کسی احمق ہی
۔ اور مسز ریمبیڈلیس کا کردار اردو کی اصلاحی سماجی ناولوں کی کسی نائکہ یا دلاّلہ سے کم نہیں ہے۔ بہر حال اعتراض
کہ مس ہوّر خوبصورت اور مغرور کیوں ہے؟ ہیرو یعنی افسانہ نگار خواہ مخواہ احساس کمتری کا کیوں شکار ہے؟ اور
یوں سے نفرت کرتا ہے؟ یا مسز ریمبیڈلیس کسی دلاّلہ سے مطابقت کیوں رکھتی ہے؟ سارا اعتراض یہ ہے کہ یہ ساری
ی جواز کے ہیں۔ بغیر کسی وجہ کے ہیں۔ ہیرو کا خواہ مخواہ نفرت کرنا۔ ہیروئن کا خواہ مخواہ غرور کرنا اور مسز ریمبیڈلیس
ا بلکہ زبردستی دونوں کا ملاپ کرانا۔ ہر چیز فرضی اور غیر حقیقی ہے۔ اس افسانہ کا عنوان اگر "خواہ مخواہ" ہوتا تو
ا ہوتا۔

ہرا افسانہ ہے "سناٹا" شروع یوں ہوتا ہے۔
وہ ایک بے حد دلکش صبح تھی۔ ۔ ۔ ۔ اور تب رضیہ کو ناگاہ خیال آیا ——
بے اختیار طلسم ہوشربا اور فسانۂ عجائب وغیرہ کی زبانیں یاد آ گئیں ۔
پر ارشاد ہوتا ہے ۔
" اتوار کا سہانا اور خوشگوار دن تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ موسم سرما کا خوشگوار دن تھا "
سم اور دن معین کرنے میں افسانہ نگار نے بڑی کاوش سے کام لیا ہے۔ باقاعدہ دو پیراگراف میں جا کر کہیں دن
تا اور اس کے باوجود یہ مختصر کہانی ہے!
گے فرماتے ہیں ۔
" میس کی عمارت جگمگا اٹھی۔ پھر شام کے سائے ڈھلنے لگے " ۔ غالباً میس کی بلڈنگ کا الیکٹرک کنکشن
ہوگا۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ شام بعد میں ڈھلنا شروع ہو اور میس پہلے ہی روشنی سے جگمگا اٹھے! ۔
پر ارشاد فرماتے ہیں
" ورائے یوکلپٹس کی چکنی اور مخروطی ——"

یہ یوکلپٹس کے دراز درخت بھی بڑے حسن پرست ہوتے ہیں جہاں معلوم ہوا کہ اس بلڈنگ عمارت یا جس میں چھ خوبصورت "العمر" لڑکیاں رہتی ہیں، یہ حضرت موسم کا خیال کرتے ہیں نہ آب و ہوا کا اور نہ زمین کی ساخت و زرخیزی کا - فوراً لڑکیوں کے مکان میں اُگ جاتے ہیں اور چھوٹے مکان کے پاس ایک خوبصورت جھیل نمودار ہو جاتی ہے "جس کا پانی پُر اسرار ہوتا ہے" اور "جس میں یوکلپٹس کے درختوں کے سائے اور گہرے ہو جاتے ہیں" اور شام بھی فوراً ہو جاتی ہے "تاکہ الم کی مہک اور گہری ہو جائے" ——— یہ ساری کاروائی محض اس لئے کی گئی کہ افسانہ نگار کو لے دے کے ایک جملہ مل گیا تھا جسے کہیں نہ کہیں بہرحال استعمال کرنا تھا ——— ——— پیتس میں دعوت ہوتی ہے - ایک لڑکی طلعت - جس کا عاشق نامراد لام پر جاکر مر جاتا ہے۔ افسانہ نگار کا مقصد ٹریجڈی پیدا کرنا تھا - اس لئے ہیرو کو فوراً محاذ پہ لے جاکر مار ڈالا "تاکہ ہیروئن اپنی ہی آگ میں سلگتی رہے"۔ ایک دوسری صاحبہ ہیں - فلسفہ میں ایم - اے کر رہی ہیں - نسیمہ صاحبہ بھی ایم اے سے کم نہیں ہیں مگر جب ان سے گانے کی درخواست کی جاتی ہے - تو "اپنے کسی تازہ ترین رومان کا دلچسپ قصہ مزے لے لے کر سنانے لگتی ہیں"۔ ——— گویا پیشہ ہی رومان لڑانا تھا - پھر جب فرمائش ہوتی ہے تو یہ درد ناک گیت سناتی ہیں ———

"میرا دل یہ پکارے آجا - بھیگا بھیگا ہے سماں - ایسے میں ہے تو کہاں"

یہ حیرت انگیز انکشاف ہے کہ بی - اے اور ایم - اے کی طالبات جن کا پسندیدہ موضوع فلسفہ بھی ہوتا ہے - اتنا گھٹیا اور گھٹیا مذاقِ شعری رکھتی ہیں - اور اتنی غیر مہذب اور غیر تعلیم یافتہ ہوتی ہیں جتنا افسانہ نگار نے بتلایا ہے - غور سے دیکھا جائے تو اس میں ان بیچاری لڑکیوں کا بھی کوئی قصور نہیں - دراصل افسانہ نگار نے ان کی پسند اور انتخاب کی آزادی سلب کر لی ہے۔ لڑکیاں وہ نغمہ نہیں سنا سکتیں جو وہ خود سنانا چاہتی ہیں - صرف وہ نغمہ سناتی ہیں جو افسانہ نگار سنوانا چاہتا ہے - یہ افسانہ نگار کا انتخاب ہے لڑکیوں کا نہیں -

اور اسی پر بس نہیں - ابھی افسانہ نگار اس "دردیلے نغمے" سے مطمئن نہیں ہوا - وہ باقاعدہ "فرمائشی پروگرام" کرانا چاہتا ہے - لہٰذا یہ جملہ تحریر کرتا ہے کہ -

"ایک بار پھر ماحول پر حزن ناک دھندلاہٹیں چھا گئیں" تاکہ ایک اور کربناک نغمہ درد ناک لہجہ میں سنا کر قارئین کو غمزدہ کیا جا سکے - لیکن قارئین اس "ماتم" میں شریک نہیں ہوتے - افسانہ نگار سارا سوگ خود مناتا ہے - اور وہ زبان کا بھی خاص خیال رکھتا ہے - چنانچہ مادری زبان فوراً تبدیل کر دیتا ہے - اور

"اور کوئی بہت دور سے مدھم سروں میں دھیرے دھیرے گانے لگتا ہے -

I CARE NOT- - - - - - - - - - - - - - -

I ONLY KNOW, I LOVE YOU

LOVE ME, AND THE WORLD IS MINE"

اور قارئین حیرت زدہ اور ششدر ہو کر یہ سمجھتے ہیں کہ شاید پال رابسن اچانک المغز نوجوان دوشیزاؤں کے جھرمٹ

یگانے لگا ہے۔ مگر قارئین آخر قارئین ٹھہرے۔ وہ مفہوم غلط ہے۔ چنانچہ افسانہ نگار ترجمہ کر کے سناتا ہے۔ اور
نسے اضافے کرتا جاتا ہے تاکہ تاثر میں شدت پیدا ہو سکے۔ اور اردو کے بھولے بھولے معصوم قارئین یہ انگریزی
سکیں۔ قارئین حسب منشا یہ سمجھ جاتے ہیں کہ اذیت ناک انگریزی لفظ صرف انہیں مرعوب کرنے کے لئے گوایا گیا ہے
سانہ میں اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

اور پھر اچانک ایک حیرت انگیز بات ہوتی ہے۔ افسانہ کی ہیروئن طلعت ایک جانگلوش بچے کو چوم لیتی ہے۔
یرت انگیز انجام ہے۔ افسانے کا۔ اور کتنا چونکا دینے والا!

حالانکہ کسی اچھے افسانے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ انجام چونکا دینے والا ہو۔ گو یہ حقیقت ہے کہ مختصر کہانی
نجام میں چونکا دینے والا عنصر آرٹ ضرور ہے۔ مگر یہ کوئی بڑا آرٹ نہیں ہے۔ او۔ ہنری اپنے مختصر افسانوں میں
ینے والے اختتامیہ کے لئے مشہور ہے۔ حد درجہ ذہین بھی ہے۔ مختصر افسانہ کی CRAFTSMANSNIP
COMMA بھی رکھتا ہے لیکن دنیا کے اچھے اور بڑے افسانہ نگاروں کی پریڈ میں وہ دوسری اور تیسری ہی قطار
ہوا نظر آتا ہے۔

اخیر میں ہے ایک ڈراما "پہیئے"۔ اس کی خامی یہ ہے کہ اس میں کوئی "کہانی" نہیں ہے۔ یعنی کوئی تضاد، ٹکراؤ
DRAMATIC ELEM — CONFLICT، ACTION یا INCIDENCE نہیں ہے۔ جو ڈراما
تعمیر ارتقاء اور CLIMAX میں مدد دے سکے۔ سارے کے سارے کردار ایک جیسے ہیں منفرد نہیں ہیں سب
PESSIMI، PASSIVE، اور NEGATIVE ہیں۔ چنانچہ ان کے خیالات، جذبات، افکار اور افعال ایک
نچے میں میکانکی انداز میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ سب STATIONARY ہیں اور پورا ڈراما STAND
ہے۔ اپنی جگہ سے ذرا بھی آگے نہیں رینگتا۔ اس کے مکالمے بے جان، سپاٹ، نامانوس اور فلسفیانہ ہیں۔ دراصل
دع پر لکھی ہوئی ایک تقریر ہے جسے ڈراما نگار نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے بغیر کسی تخصیص کے مختلف کرداروں میں
تقسیم کر دیا ہے۔ حالانکہ اتنے کرداروں کی ضرورت نہ تھی۔ یہ تقریر کوئی ایک کردار بخوبی ادا کر سکتا تھا۔ دوسرے
PU کردار بھی محض بھرتی کے اور غیر ضروری ہیں۔ اس میں چار کلرکوں کے کردار ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے
چار مختلف انسان ہونے کے باوجود ایک ہی مزاج، ایک ہی ذہن، اور ایک ہی نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ ان کے افعال
رمسائل ایک ہی نوعیت کے ہیں۔ اور پھر ان میں سے کوئی بھی کلرک طبقہ کا نمائندہ کردار نہیں ہے۔ ڈراما نگار نے غلام
کہانی "کتبہ" ضرور پڑھی ہوگی۔ اس کہانی کا MAIN CHARACTER کلرک طبقہ کا نمائندہ اور بھرپور کردار
ری اس کو اپنی آنکھوں سے چلتا ہوا دیکھتا ہے۔ اس کے قدموں کی آہٹ اپنے کانوں سے سنتا اور محسوس کرتا
مانکہ وہ افسانہ ہے۔ جس میں کردار کا عملی طور پر دکھانا ضروری نہیں۔ لیکن ڈراما میں کردار کو متحرک اور ACTIVE
وری ہے۔ دراصل یہ ڈراما STAGE کے لئے نہیں لکھا گیا ہے۔ قاری کے پڑھنے کے لئے لکھا گیا ہے۔ اس لئے
کے خیال میں کسی کردار کے ذریعہ کسی واقعہ کا عملی طور پر ظہور پذیر ہونا ضروری نہیں۔ واقعہ کو NARRATE کر دینا

(باقی صفحہ ۲۴ پر)

حضرت مجنوں گورکھپوری

مجھے نسبت کہاں سے ہے؟

اس سے کچھ عرصہ قبل تک جن ادیبوں کے دم قدم سے محفل علم وادب میں خاصی چہل پہل اور گرما گرمی سی تھی، وہ یکایک خاموش ہو گئے۔ اور بڑی سادگی سے خاموش ہو کر ہمارا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ لوگ بار بار جھنجھوڑنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ ہیں کہ بس دیکھے جاتے ہیں اور منہ سے کچھ نہیں بولتے ——

انھیں ادیبوں میں ایک حضرت مجنوں گورکھپوری بھی ہیں —— لیکن صاحب منچلوں کی بھی دنیا میں کمی نہیں، نہ جانے کون منچلا تھا کہ اس کی چال اپنا کام کر ہی گئی اور حضرت مجنوں کو مہر سکوت توڑنی ہی پڑتی۔ ایک چپ میں سینکڑوں بلائیں ٹل جاتی ہیں، چپ وہ بری بلا ہے لیکن یہ منچلا قیامت کا جانے بے درماں ثابت ہوا۔ اور وہ یقیناً ہم سب کی طرف سے مستحق مبارکباد ہے جس نے قفل ابجدی کو کھول لیا ——

ہماری زبان میں گرد میں حضرت مجنوں نے مولانائے روم کی بانسری سنائی ہے، اس بانسری کی لے میں بہت سی وہ باتیں ہیں جنھیں ٹانک رکھنے کی ضرورت ہے —— بلکہ آپ خود ہی دیکھئے کہ اس میں کیا کیا چھپا ہے۔ ہم یہ مضمون انجمن ترقی اردو ہند کے اخبار "ہماری زبان" علی گڑھ سے شکریہ کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔ (ادارہ)

بشنو از نے چوں حکایت می کند ۔ از جدائیہا شکایت می کند

آج ایک لطیف اور نازک تحریک کے ساتھ فارورڈ سے مجھے روزو کا یہ شعر یاد آ رہا ہے کسی زمانے میں مجھے اس مثنوی کے بیں کو پہلوی زبان کا کہا گیا ہے بیشتر حصے پورے کے پورے یاد تھے اس وقت بھی جی چاہتا ہے کہ آگے کے اشعار پڑھتا چلا جاؤں لیکن فی الحال میرا مطلب اتنی شعر سے پورا ہے اس تحریک کے پشت دیے کہیں گے کہ یہ زبردستی کی کھینچ تان کیسی؟ رومی کی مثنوی جس کو "بانسری کا المناک"[1] کہا گیا ہے محض تمثیلی کلام ہے جس کا موضوع حقیقت اور عرفانِ حقیقت ہے۔ روحانیت کے رموز و نکات کو مادی دنیا کے عارضی اور کثیف معاملات و مسائل سے تعبیر کرنا اور عالم لقا کے معارف کو اس دارِ فنا کے حالات و حوادث پر منطبق کرنا کیا معنی رکھتا ہے! یہ اعتراض ایک خاص مقام اور ایک خاص زاویۂ نگاہ سے درست ہو گا۔ لیکن ایسا وہ بات ہی قبول کرتا ہے۔ شاعری کی رمزیت کو جیسے ... اور ہمہ گیر ہونا چاہیے اور عظیم المرتبت اور جلیل القدر شاعری میں ہی ہوتا ہے بلاغت دراصل اسی کا نام ہے

عام طور سے متقدمین کے اسرار مجاز کے پردے میں تلاش کئے جاتے ہیں۔ مادی اور جسمانی زندگی کے استعارات میں روحانی تجربات و واردات بیان کرنے کا دستور بہت پرانا ہے۔ خسرو، جامی، سعدی اور حافظ وغیرہ کے سادہ سے سادہ اور معمولی سے معمولی اشعار کی جب تک عارفانہ تاویل ان میں تصوف کا مفہوم نہ پیدا کر لیا جائے ہماری تسکین نہیں ہوتی۔ چاہے خود شاعر نے شعر کہتے وقت شعوری طور پر اس کا کوئی لحاظ نہ رکھا ہو۔ میرا طریقہ اور میری عادت فکر اس کے برعکس رہی ہے۔ عالم صور کی رنگینیوں میں ایک جلوۂ بے رنگ دیکھنا ایک بہت پرانی رسم ہے۔ میں ہمیشہ عالم حقیقت کی

(1) "THE TRAGEDY OF THE REED"

زندگی میں عالم مجاز کی جلوہ بخشیاں تلاش کرتا رہا۔ بڑے سے بڑے عارفانہ بصیرت رکھنے والے شاعر کے تذکرے نازک شعر بھی اس وقت تک لذت انگیز نہیں ہوتے جب تک کہ وہ ہمارے مادی وجود کے عادات اور روز مرہ تجربات پر بھی محیط نہ ہو اور ان پر بھی صادق نہ آتا ہو۔ شعر کی زبان سادہ سے سادہ ہوتے ہوئے بھی استعاری ہوتی ہے یعنی اس میں صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ سطح تک ایک ہی انداز کے متعدد تجربات و مواقع پر صادق آسکے اور میں اپنے مطالعہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ دنیا کی تمام شائستہ زبانوں میں بہترین اشعار ایسے ہی ہوتے ہیں۔ شعر کی اصلی عظمت یہی ہے۔ مثال کے طور پر رومی کا یہی شعر ہے جس کو میں لاکھ چاہوں اس وقت اپنے ذہن سے نکال نہیں سکتا۔ حالانکہ اس وقت مجھے یہ سوچنا اور بتانا ہے کہ میرا اصلی وطن کہاں ہے۔

گزشتہ تیس سال کے اندر مجھ سے نہ جانے کتنی بار پوچھا جا چکا ہے کہ میں اپنے قلمی نام کے آگے گورکھپوری کیوں لکھتا ہوں۔ پوچھنے والوں میں زیادہ تر گورکھپور سے باہر کی بستی کے لوگوں کی ہے۔ میں نے اس کا جواب دینے سے ہمیشہ پہلو بچایا۔ جن دنوں میں رسالہ "ایوان" نکالتا تھا اور فرصت اور ذہنی اطمینان کی فراوانی تھی اس وقت بھی میں تفصیل کے ساتھ لکھ سکتا تھا۔ اس وقت بھی اس سوال کو ٹالتا ہی رہا۔ لیکن ابھی دو چار روز ہوئے میرے دیرینہ مہربان جناب تارا شنکر ناشاد نے جو گورکھپور میں رہا انٹر کالج بستی میں معلم ہیں مجھ سے کچھ اس طرح دریافت کیا ہے کہ آج میں اس سوال کا جواب دے کر سبکدوش ہو جانا چاہتا ہوں جس سے آج تک گریز کرتا رہا۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اصل سوال کی طرف رجوع کروں ایک اور بات قابل ذکر ہے جو اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

ذرا زمانے میں اپنے پاؤں چلئے اور اب سے کم و بیش چالیس سال پہلے کے ایک نہایت اہم اور فیصلہ کن واقعہ کی روداد سنئے۔ ابھی "جوانی کی راتیں مرادوں کے دن" بھی اچھی طرح نہیں آئے تھے یعنی پندرہ یا سولہ برس کا بھی سن نہ تھا۔ لیکن شعر و سخن کا ذوق نشہ کی طرح عروج پر تھا اور ساری ہستی پر چھایا ہوا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں اساتذہ کے فارسی اور اردو اشعار اس طرح یاد تھے کہ انہیں کی سانس لیتا تھا خود بھی شعر کہنے کی دھن میں رات دن رہتا تھا۔ فارسی یا اردو کا شاید ہی کوئی بڑا شاعر ایسا ہو جس کی شہرت سے مشہور اور مشکل سے مشکل غزل پر میں نے دو چار شعر نہ کہے ہوں۔ اکثر اساتذہ کے مضمون کو اپنے معشوق رنگ میں ڈھال لیتا تھا۔ خود اپنے مطالب ادا کرنے کے لئے تخلیق الفاظ کی گرہ بھی مجھ پہ بہت رکھی گئی اور میں اس بے چینی میں عجیب لذت محسوس کرتا تھا۔ غرضکہ عجیب سرشاری اور مدہوشی کا زمانہ تھا۔

شعر کہنے کے لئے ایک عام اور دیرینہ رسم تخلص رکھنا بھی ہے۔ میں اپنے کو اس رسم کی پابندی سے آزاد رکھنا چاہتا تھا لیکن پھر سوچا اور دوسروں نے بھی سمجھایا کہ جب سر سید جیسے نثری مزاج رکھنے والے نے اپنے لئے "آہی" کا تخلص ضروری سمجھا اور جب سید جالب دہلوی جیسے غیر شاعر نے بھی اپنے لئے ایک نرالا تخلص اس طرح رکھ لیا کہ آج ان کا اصلی نام کسی کو یاد نہیں اور جب شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کا ایک شعر بھی حافظہ میں رہ جانے کی قابلیت نہیں رکھتا لیکن تخلص کے نباہ نہ سکنے تو پھر میں کس شمار قطار میں ہوں؟ میرے لئے بھی کوئی نہ کوئی تخلص ضروری ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ کیا تخلص ہو۔ میرا مطالعہ اس وقت بھی زیادہ وسیع تھا جو تخلص ذہن میں آتا تھا۔ اس تخلص کے کم سے کم نصف درجن شاعر گزر چکے تھے۔ آخر کار ایک دن میں نے جھنجھلا کر کہا کہ میں ایسا تخلص رکھوں گا جو مجھ سے پہلے نہ رکھا ہو اور جس کو آئندہ بھی رکھتے ہوئے ہر شخص ہچکچائے۔ یعنی مجنوں۔ یہ غالباً ۱۹۱۹ء کا ذکر ہے جبکہ میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ میں نے تو جھنجھلاہٹ میں یہ کہا تھا اور شاید یہ بات رفت و گزشت ہو جاتی اور میں کوئی تخلص نہ رکھتا۔ لیکن میرے ایک بچپن کے عزیز اور دوست تھے جو میرے ساتھ پڑھتے تھے اور جو ابھی حال ہی میں کلکٹری سے پنشن لے کر گھر بیٹھے ہیں ان کا نام احمد حسن ہے اور وہ مشہور انشاپرداز مہدی حسن افادی الاقتصادی کے بھتیجے ہیں۔ وہ یہ تخلص لے اڑے اور مجھے اس شہر میں احباب کے حلقہ میں اس نام سے پکارنا شروع کیا۔ آخر کار میں نے سنجیدگی کے ساتھ یہ قلمی نام اختیار کر لیا۔ اور اسی نام سے شعر کہنے لگا۔ کوئی آٹھ دس سال بعد معلوم ہوا کہ مجھ سے سینکڑوں برس پہلے فارسی میں ایک مجنوں مشہدی گزر چکے ہیں جو غالباً جامی کے ہم عصر تھے۔ وہ برگزیدہ اور قابل احترام تھے کہ تذکرہ نگاروں کے نام کے ساتھ "مولانا" کا اضافہ کرنا آداب کی رو سے ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا ایک شعر مجھے بھی یاد آ رہا ہے۔ خوب ہے۔

بہ وادیٔ پروم دزار زار می گریم	بہ بہانۂ ناقہ ہجران یار می گریم

[redacted]

اسی زمانے میں یہ بھی پتہ چلا کہ اردو میں بھی ایک مجنوں گزرے ہیں جو میر تقی میر کے شاگردوں میں تھے اور اتنے اچھے شعر کہتے تھے کہ میر بے دماغ نے ان کو اپنی شاگردی میں لے لینا مناسب سمجھا۔ یہ مجنوں عظیم آبادی تھے۔ میر حسن ان کو میر ضیا کا شاگرد بتاتے ہیں۔ ان کا بھی ایک شعر سنئے لائق ہے ۔

دن میں سو سو بار اس کے در پہ جانا مجھے　　اس میں سودائی کہے یا کوئی دیوانہ مجھے

میرے پندار کو ان انکشافات سے جو صدمہ پہنچا اس کا اندازہ ہر شخص نہیں کر سکتا۔ بس یہی چاہتا تھا کہ ڈوب مروں۔ مشکل یہ تھی کہ بات قابو سے باہر ہو چکی تھی اور میں کاغذ اور سیاہی کی دنیا میں مجنوں مشہور ہو چکا تھا۔ ایک تسکین یہ تھی کہ چلو میرے سوا بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ اس تخلص کا کوئی اور شخص گزر چکا ہے مگر یہ تسکین بھی نہ رہی۔ میرے بعد ایک لکھنؤی حضرت کو بھی شوق ہوا کہ وہ اپنے کو اس تخلص سے رسوا کریں۔ میں ان کی ہمت اور توفیق کی داد دیتا ہوں۔

مجنوں تو میں ضرور ہوا لیکن یقین مانئے کسی مقامی نسبت کا خیال دور تک میرے ذہن میں نہیں تھا اور اس کا الزام میرے سر نہیں آتا۔ میں اپنے کو اس زمانہ میں کسی مخصوص جگہ سے منسوب کر ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ زمانہ ایسا تھا جبکہ انسان کی نظر بلند ہوتی ہے اور اس کے فکر و احساس میں کائنات ہوتی ہے۔ میری تخیل بے حد وسیع اور ہمہ گیر تھی اور میں اپنے تخیل کے نشہ میں چور تھا۔ مصلحت اندیشی اور مصالحت کوشی کی منزلوں زندگی میں پتہ نہ تھا زمانہ میں واقعی

"اپنی جولاں گاہ زیر آسماں سمجھا تھا میں"

اور فضا کے پیچ و خم میں تھک کر رہ جانے کا دھندلے سے دھندلا اندیشہ نہیں تھا۔ بڑے حوصلہ اور بڑے نشاط کے ساتھ محو پرواز اور بڑے زعم کے ساتھ دعویٰ تھا کہ

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی　　گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

جب پہلے پہل میں نے اقبال کا یہ شعر پڑھا تو میں اپنی تخیل کو جیا تھا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کہیں سے وہ پھر مجھے پکڑ کر اپنا سراغ دے۔ پھر ایسا آدمی جو صدق دل سے اپنے کو ایک "مرد آفاقی" سمجھ رہا ہو اپنے نام کے آگے گورکھپوری کیسے لگا سکتا تھا؟ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اردو و رسائل نے میرے نام کے آگے اول اول گورکھپوری کا اضافہ کیا۔ اس لئے کہ میرے مراسلات گورکھپور ہی کی ڈاک سے روانہ ہوتے تھے۔ یہ ۱۹۲۰ء ہے۔ پھر مدت تک یہ ہوتا رہا کہ میں اپنے کو صرف "مجنوں" لکھتا رہا اور رسالے برابر "مجنوں گورکھپوری" چھاپتے رہے۔ یہاں تک کہ مجنوں گورکھپوری اور مجھے بھی اس کو قبول ہی کر لینا پڑا۔

اب سوال یہ ہے کہ میں گورکھپوری ہوں یا نہیں۔ جواب یہ کہ اگر اصرار کے ساتھ کہوں کہ میں گورکھپوری ہوں تو کوئی منطقی یا قانونی غلطی لیکن جو لوگ مجھ سے یہ سوال کرتے رہے ہیں اور جن کو مجھے گورکھپوری ماننے میں تامل ہے وہ بھی بہت بڑی حد تک حق بجانب ہیں۔ میرا خمیر یقیناً خاک سے ہوا۔ ایک دور افتادہ اور سیلاب زدہ گاؤں میں جو گھاگھرا اور کوانو کے کنارے تحصیل خلیل آباد ضلع بستی میں واقع ہے اور پلدہ مرد کہلاتا ہے پیدا ہوا جہاں تمدن اور تعلیم یافتہ لوگوں کا بہت کم گزر ہوتا تھا۔ میری ددھیال بھی سرزمین ہے جہاں بدویت اور بربریت کے جو عا آثار اب تک اسی طرح پائے جاتے ہیں جس طرح اب سے سو سال پہلے پائے جاتے تھے۔

مگر میری تربیت اور میرے مزاج و کردار کی تعمیر بستی ہی کے دوسرے موضع میں ہوئی جو خلیل آباد اور مگہر کے درمیان لکھنؤ جانے وا کے کنارے واقع ہے اور سنجھریا کہلاتا ہے۔ یہاں سے ایک میل کے فاصلہ پر آمی ندی کے کنارے گورکھپور اور بستی کی سرحدیں ملتی ہیں۔ یہ میری تربیت گاہ ہے۔ جہاں میں اپنی والدہ کے ہاتھوں وہ بنا جو آج تک ہوں۔ عرصہ سے یہاں آنا جانا چھوٹا ہوا ہے لیکن میری روح اس جا

ہے ساختہ کھینچتی رہتی ہے اس کے ساتھ میرے بڑے نازک جذبات اور میری بلند ترین تخیلوں کی یادیں وابستہ ہیں ۲۳ ۱۹ء یا ۲۴ ۱۹ء میں
ںکی یاد میں کہی گئی تھی جس کے دو اشعار یہ ہیں۔

وطن تیری جھاڑیوں میں میری دنیا کا راز ہے   تیری ہر موج ہوا میں میری ہی آواز ہے

ترا ہر گوشہ کہ منزل گاہ الہامات ہے   مکتب عرفاں ہے یا گہوارہ جذبات ہے

لے چودہ سال کی عمر تک بہترین تعلیم پائی یہیں میرا شعور بالغ ہوا اور یہیں میرے اندر وہ ذوق جمال پیدا ہوا جو تمام مخالف حادثات و واقعات
ابھی کار رنگ بنا ہوا ہے۔ یہی علاقہ میرے افسانوں کا جغرافیہ ہے اور اسی جگہ میرے بہترین افسانے لکھے گئے۔ جب میں انگریزی تعلیم کے لئے
ا طرح کہیں زیادہ تر گورکھپور رہنے لگا تو بھی ایک مدت تک کوئی چھوٹی یا بڑی تعطیل ایسی نہیں ہوتی تھی جو میں یہاں آ کر نہ گزارتا رہا ہوں
ح " (THE SOIL AND THE SOUL) کے درمیان اندرونی نسبت اور باطنی اخلاقات سے جو انکار کرے اس کو قائل کرنے کے لئے
الیے پیش کی جاسکتی ہیں وہاں ایک زبردست مثال میں بھی ہوں طرح طرح کے حالات و موانع زمانے سے مجھے اس کی اجازت نہیں دیتے کہ میں
بین تربیت گاہ کی طرف پھر رجوع کروں اور میں اپنی عملی اور ظاہری زندگی میں عرصہ سے کہنے کے لئے اس کو بالکل فراموش کئے ہوئے ہوں مگر میری
ں اس کی یاد بسی ہوئی ہے اور ایک دن بھی ایسا نہیں گزرتا کہ میں اس یاد سے بے چین نہ رہتا ہوں۔

بتدائی پرورش اور تعلیم بستی میں ہوئی تو میری تعلیم کی تکمیل گورکھپور میں ہوئی اور پھر نہ صرف میں بلکہ میرے خاندان کے تمام قریبی رشتہ دار معاش
لہ میں گورکھپور میں رہے اگر میں صرف اتنا کہ دوں کہ بستی میرا اصلی وطن ہے گورکھپور میرا وطن مالوف ہے تو بات ختم ہو جاتی ہے لیکن اتنا ہی نہیں
ہت زیادہ ہے اور جو نسبت مجھے گورکھپور سے ہے ان کی جڑیں زیادہ گہری اور مضبوط ہیں میری ددھیال ضلع بستی ہے اور ننہال شہر گورکھپور
ن سے مجھے بستی سے تعلق ہے اور دادی اور ماں کی طرف سے میں گورکھپور کا ہوں۔ اس سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ یہ جو بیک وقت مجھے بستی
سے نسبت ہے وہ تنہا میری ذات سے نہیں ہے بلکہ دو پشت پرانی ہے۔ میری دادی جن کا ذکر میں ایک سے زائد بار کر چکا ہوں گورکھپور
ں کی تھیں جو علم و فضل اور نقد و دانشی میں اپنا ایک ممتاز مرتبہ رکھتا تھا۔ خود میری دادی بڑی فاضل اور بڑی درک و بصیرت رکھنے والی
ز ایک طرز، مردوں میں بھی بہت کم لوگ نکلیں گے جو ایسی ہمہ ادبی شخصیت کے مالک ہوں میری تربیت انھیں نے کی اور عربی فارسی اور
ستھرا دب وہ انھیں کی دین ہے۔

گورکھپوری یا غیر گورکھپوری ہونے کے بارے میں جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ اب لوگ جو جی چاہے سمجھیں اور مجھے جہاں سے چاہیں منسوب
شعور عمر کا وہ حصہ جس کے لئے سعدی نے "عمر عزیز" کے چالیس سال کی اصطلاح استعمال کی ہے گورکھپور ہی میں بسر کیا۔ لیکن جس سرزمین
کی برکت یا نحوست حاصل ہے اس سے اصلی اور اندرونی طور پر میں کبھی بھی اپنا دل ہٹا نہ سکا۔ اس کا خیال اور اس کی یاد اب تک میرے
ہے اور آج جبکہ میں انتہائی ضبط سے کام لے کر یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔ میرے قلب و روح کی جو کیفیت ہے اس کو رومی بانسری
کیا جاسکتا ہے۔

- ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش
باز جوید روزگار وصل خویش

کہ کچھ لوگ اس کو رجعتی میلان یا ماضی پرستی کی علامت سمجھیں لیکن بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کو صرف واقعات سمجھنا چاہئے
ناویل میں وقت ضائع نہ کرنا چاہئے۔

وحید نسیم

"انتظار"

ہر طرف اک سکوت طاری ہے
چاندنی دل پہ بوجھ بھاری ہے
دل بھر آیا ہے دیکھ کر بادل
آئینے سے نظر بچاتے ہیں
ہاسئے کیوں دل کو ہے کئے بوجھل
بیل بوٹے ستم ہیں دامن کے
کامدانی کو مت کھوتا رے
گتھیاں خاک پہ سلجھتی ہیں
پھول چوٹی کے داغ ہیں تازہ
سو گئی ہے فلک پہ کاہکشاں
جھنجھنانے لگے ہیں غم کے تار
دیکھنا آنکھ بھر نہ آئے کہیں
اشک دسرمہ میں پھر لڑائی ہے
زیبا دل کو رنگ دکھلا کے
کوئی گذرے گا اب نہ گلیوں سے

دل کو پھر اذن آہ وزاری ہے
چاند سے غم کی پردہ داری ہے
پھیل کر بہہ گیا ہے سب کاجل
خود کو دھوکے میں گویا لاتے ہیں
دلکش پہ یہ مہین سا آنچل
پھول چبھتے ہیں خار بن بن کے
تن پہ بکھرے ہوئے ہیں انگارے
بالیاں زلف سے الجھتی ہیں
رنگ اڑتا ہے دیکھ کر غازہ
درد سر بن رہی ہے اب افشاں
چوڑیوں میں یہ کیوں ہوئی جھنکار
دل کی رنگت نکھر نہ جائے کہیں
ضبط گریہ تری دہائی ہے
ہاتھ جوڑوں حنا ترے آگے
نہ کھلیں کوئی کہدے کلیوں سے

دل پہ یہ غم کا بار کس کا ہے
کیا کہوں انتظار کس کا ہے

جانِ محفل

یہ تیری بزم سہی ہم بھی جانِ محفل ہیں
ہمارے خون سے چھلکے ہیں تیرے پیمانے
ہمارے سوزِ نفس نے جلائے تیرے چراغ
ہمیں نے آکے اجالے تیرے سیہ خانے

یہ تیری بزم سہی۔۔۔
گلوں کے رنگ میں شبنم کے موتیوں میں ڈھلے
روش روش سے خرامِ بہار ہو کے چلے!
ہمارے خون کی سرخی شفق پہ لہرائی
ہمارے غم میں ستاروں کی آنکھ بھر آئی

ہمارے دم سے چمن میں ہے رنگ و بوئے وفا
اٹھے جو ہم تو تیری بزم میں رہے گا کیا؟
یہ تیری بزم سہی۔۔۔

شفقت تنویر مرزا

تہی دستی

بارہا جلوت گہہِ دل میں خیالوں کا ہجوم
یوں امنڈتا ہے کہ جیسے آئے ساون کی گھٹا
یوں برستا ہے کہ جیسے گریۂ غربت نصیب
گل کئے دیتا ہو امیدوں کی شمعوں کی ضیا

دھیان کے صحرا میں چلتی ہے ہوائے گرد باد
قافلے چہرے چھپائے ریت میں ہوتے ہیں گُم
بے نیازِ راہ و منزل، بے خبر ہر سانس سے
لب ہلا سکتے ہیں اس طوفاں میں ہرگز ہم نہ تم

جاگ اٹھتے ہیں گئے ایام کے ملبے تمام
جن سے وابستہ تھا خوابوں کی بہاروں کا شباب
حال کی آندھی اڑائے خاکِ آوارہ چلی
اڑ گئے مکروہ چہروں کے سبھی رنگیں نقاب

اس قدر واقف ہیں لیکن لب بستہ بیٹھے ہیں ہم
تم ادھر خاموش ہو دل میں لئے حرمان و یاس
ہم بہ صد کوشش اگر کھولیں کبھی اپنے لب تو کیا
آج کہنے کیلئے رکھا ہی کیا ہے اپنے پاس

میاں محمد وارث

اُونچی دُوکانیں

"میں کبھی نہ مرتی !"۔

روح کی تقریر :— خاوند نے آسمان کی طرف دیکھ کر ایک ٹھنڈا سانس لیا اور کہا بات یہ ہے کہ میں مر گیا۔ میری محبت کرنے والی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی تصور نے مرحوم بیوی کا مجسمہ سا سامنے لا کھڑا کیا وہ غور سے ہر خوبصورت مجسمے کو دیکھنے لگا۔ یکایک اس میں حرکت ہوئی۔ اس نے خاوند کی طرف مایوسانہ نگاہوں سے دیکھا اور کہا۔ میرے سرتاج ! اب کیا ہوتا ہے۔ خدا کے لئے نہ روئیے آپ کے رونے سے میری روح بے چین ہو جاتی ہے۔ اگر آپ کو پہلے ان نہائی اوصاف کسی کا احساس ہوتا۔ تو میں کبھی نہ مرتی۔" یہ کہہ کر روح چلنے لگی خاوند نے لپک کر روح کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ لیکن یہ اس کی نظری غلطی تھی۔ دالان کا سفید اور چمکدار ستون اس کی آغوش میں آگیا۔ حیرت و استعجاب کے عالم میں چاروں طرف دیکھا تو قریب ہی اس کو ایک پرچہ پڑا ہوا ملا جس پر حسب ذیل عبارت کسی عجیب روشنائی سے لکھی ہوئی تھی۔

روح کا پیغام —— اگر خدانخواستہ آپ بھی موت کے دروازے پر دستک دے رہی ہیں۔ تو فوراً ڈاکٹر . . . صاحب کی فیس و تجویز کو لکھئے . . تندرستی کے بعد میرے لئے دعائے خیر کرنا (تمہاری ایک مرحوم بہن)"

ڈریئے مت ۔ روح تو اپنا پیغام چھوڑ کر چلی گئی۔ اب آپ اپنا دل مت چھوڑیئے۔ یہ نہ افسانہ ہے اور نہ حقیقت۔ یہ ایک صاحب کے تجربے کا اشتہار ہے، جو انہوں نے ایک ادبی رسالہ میں شائع کرایا تھا۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْت مرنا کسے نہیں۔ لیکن ان صاحب نے تو موت سے پہلے ہی لوگوں کو مارنا شروع کر دیا ہے۔ میں اس موضوع کو کبھی نہ چھیڑتا۔ قصہ یوں ہوا کہ چند دن قبل میں لاہور کے تنگ و تاریک بازار سے گزر رہا تھا کہ ایک حلوائی اور ایک قصائی کی دکان کے درمیان کی ٹوٹی پھوٹی دیوار پر نہایت جلی حروف میں لکھا تھا "لاہور میں خدا" میں چلتے چلتے ٹھٹھک کر رہ گیا۔ لاہور میں خدا ؟ خدا تو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے —— شاید ؟ —— نگاہ ذرا آگے بڑھی "لاہور میں خدا کے فضل و کرم سے اس اسکیم کے تحت — — — — — — " لاحول ولا۔ سامنے کی دیوار پر ایک پوسٹر لگا تھا "مسلمانو ! اسٹیشن چلو"۔ کیوں ؟ کوئی گاڑی الٹ گئی ؟ یا پلیٹ فارم نے گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگنا شروع کر دیا ؟ ۔

"مسلمانو ! اسٹیشن چلو ! تمہارے محبوب رہنما، قائد بزرگ محترم المقام جناب . . . . . . صاحب آج بذریعہ ریل گاڑی یہاں قدم رنجہ فرما رہے ہیں" میرے پیچھے پیچھے ایک اور دوست تشریف لا رہے تھے۔ وہ بلند آواز سے چیخے۔ "واہ ! الٹے پاؤں پہ

عورت ! " ـــــــ پاؤں پہ عورت اگیا بکتا ہے۔ ! خدا کی قسم وہ دیکھو دائیں طرف ـــــــ کتنا توی ہیکل مرد ہے۔ جبار مشفا او الملک حکیم ڈاکٹر ۔ ۔ ۔ صاحب کا نام تک پڑ کر اپنے پاؤں کی انگلیوں پر ایک سالم عورت کو اٹھائے ہوئے ہے "ـــــــ سبحان اللہ ـــــــ اور میری آنکھوں کے سامنے پیرس کا الہڑ کا جغرافیہ پھرنے لگا۔ کاغذ کے بنے ہوئے صفحات پر نہیں ـــــــ دیوار پر ـــــــ سرخ و سفید اینٹوں کی بنی ہوئی بوسیدہ سی دیوار پر ۔ ۱۰ اوپر بوٹ پالش کا اشتہار ہے۔ دائیں طرف تازہ مکھن ملنے کا پتہ مندرج ہے ۔ بائیں طرف حافظ کی گولیوں کا بیان ہے۔ اس کھڑکی کے اوپر انجمن خدام ملت کے جلسے کا پروگرام چسپاں ہے۔ اس کھڑکی کی مسٹ ہورلیڈ سے کی خانگی حالات بالوضاحت بیان کر دیئے گئے ہیں جیتی دیوار پر سرکس کے تمام جانوروں کی فہرست ہے اور اصطبل کے دروازے پر مس نغمہ جان کی تصویر اور ان کے تلم کے محاسن گنوائے گئے ہیں تا ابھی نیا صفحہ الٹنے کا موقع نہیں آیا تھا۔ کہ ایک طلسمی گولہ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا طلسمی گولہ کے ذریعہ ماضی، حال اور مستقبل کے حالات معلوم کیجئے پروفیسر ۔ ۔ ۔ بنگالی اے ۔ بی ۔ پی ۔ سی ۔ ڈی ۔ پامسٹ اس سلسلے میں آپ کی رہنمائی کرینگے "۔ بائیں طرف ان تمام شیروں، امیروں، مشیروں، وزیروں اور فقیروں کے ناموں کی فہرست تھی۔ جن کے آج تک ہاتھ دیکھے جا چکے تھے۔ میں نے نظر اٹھا کر اس چک کی طرف دیکھا جس کی تیلیوں کے پیچھے روزگار کا ستایا ہوا پروفیسر لوگوں کی قسمت کے ساتھ ساتھ اپنی قسمت بھی بنا رہا تھا۔ دل کو مضبوط کیا اور چک اٹھا کر اندر داخل ہو گئے۔ پروفیسر صاحب میری فراخ پیشانی کی طرف دیکھتے ہی پکار اٹھے "قسمت ـ قسمت بدلنے دیر نہیں لگتی مسٹر ـــــــ لیکن پھر بھی میں پیشین گوئی کر سکتا ہوں۔ کہ تم ایک دن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" میرا دوست میری ہونے والی تعریف کو شاید سننا نہیں چاہتا تھا اس نے فقرہ پورا ہونے سے پہلے ہی اپنا دایاں ہاتھ اس ننھی سی پروفیسر کے سامنے کر دیا۔ اور میں سوچنے لگا کہ دوست کی ناکامی پر غم محسوس کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا اس کی کامیابی پر مسرت محسوس کرنا۔ اپنی عادت کے مطابق میں نے اس کمرے کی چھت اور دیواروں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ دائیں بائیں، آگے پیچھے، نہایت دلچسپ قسم کے اشتہار لگے ہوئے تھے۔ ہاتھ کا نقشہ اور اس پر مختلف ابھاروں کی خصوصیات ۔ ۔ ۔ آٹھوں خانوں کا نقشہ جس میں جناتی زبان کے حروف لکھے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی جدول استخراج احکام جو پڑھنے والے کو دیکھتے ہی شروع ہوتا تھا ـــ "یوں پہ جا کے دل مبتلا نہیں آتا ـــــــ پکارتا ہوں تو کہتا ہے "جا نہیں آتا " ۔ (۱) محبت میں سرفرازی حاصل ہوگی (۲) میری قسمت کا ستارہ کب چمکیگا (۳) مالی حالت کب درست ہوگی (۴) مفرور کب گرفتار ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ نظریات کو اکٹھا اور مختلف پیش گوئیاں ـــــــ اس ہفتے سونا چاندی امرسوں، السی، گھی، بنولہ مورخہ ۲۵ اور ۲۶ دسمبر کو تیز ہونگے۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۵۰ء کی شب نظرات علا ماہ تو پیشین گوئی کرتا ہے کہ اس ہفتہ کوئی بھاری لیڈر مر جائے گا۔ مرض کھانسی نزلہ، زکام اور پیچش عام پھیلنے کا اندیشہ ہے۔ برج یا منگل راس سم بی۔ مو سے۔ مو ۔ ٹ۔ ی۔ ٹے۔ ما عزیزوں سے ملاقات ہو۔ محبوب کی بے وفائی کسی آفت ناگہانی میں پھنس جانے کا امکان ہے۔ ہر اشتہار کے اختتام پر حفاظ الملک منجم ملت کی مہر تصدیق ثبت تھی۔ نظام شمسی چونکہ ایک محور پر چکر کاٹ رہا ہے۔ اس لئے میرا دماغ بھی مطالعہ سے چکرانے لگا۔ میں گھبرا کر باہر نکل آیا۔ اور میرے دوست نے میرے تعجب پر تعجب کرتے ہوئے، وہ اشتہار پڑھنا شروع کیا جو میں ابتدائے تحریر میں پیش کر چکا ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ آج کے زمانے میں زندگی بذات خود ایک اشتہار بن کر رہ گئی ہے۔ آج کی دنیا میں ہمارے ذہن سوچ کی

ت دور جا پڑے ہیں زندگی کی بنیادی حقیقتیں سطحی قسم کے تفریحی تیز قہقہوں میں دب کر رہ گئی ہیں اور کی ٹھوکروں میں ہم ہنستا ایک اور بگڑ
ین لڑھکتے چلے جا رہے ہیں ـ میرے دوست نے مجھ سے اظہار اختلاف کرتے ہوئے کہا تھا ـ کہ نہیں زندگی کے متعلق آج کے انسان
ا زیادہ صحت مند ہے ـ وہ زندگی کی سنجیدگی کا ناگوار بوجھ بننے کی بجائے اسے ایک خوشگوار مزاح میں ڈھال رہا ہے ـ لیکن میرا خیال
ندگی صرف مزاح نہیں ـ بلکہ مزاح تو بذات خود زندگی سے فرار کا دوسرا نام ہے اور آج کل کا مزاح تو درکنار ـــ خود حسن جو کہ ایک جیتی
حقیقت ہے ـــ اور جو زندگی کی اصل ہے ـــ مصنوعی سہاروں پر جی رہا ہے ـ خوشبویات کے ایک نامور ادارے
بنڑ کے نمائندے نے کہا ہے کہ آج کی امریکی عورت لپ اسٹک کے بغیر اپنے آپ کو اسطرح محسوس کرتی ہے ـ جیسے کہ وہ کسی منظر عام
ن کھڑی ہوئی ہو ـ گویا عورت کا وجود بھی ایک سراپا اشتہار ہے ـ عورت اور جنس ـــ اشتہار بازی کا سب سے بڑا حربہ بن کر رہ
لیسے تو آج کل رومالوں، تاش کے پتوں اور سائیکلوں پر بھی عورت کو "اشتہاری" بنا دیا گیا ہے لیکن مطبوعات کی پبلسٹی کے سلسلہ
زیزی رسالوں نے عورت کے اتنے پرفریب زاویوں سے روشناس کرایا ہے ـ کہ یہ فن ایک جدید جیومیٹری کا درجہ حاصل کر گیا ہے ـ عورت
ـ ایک ایڑی پر گھومتی ہوئی عورت ـــ ایک ٹانگ کے بل پر اچھلتی کودتی عورت ـــ سحروں کی طرح گردن موڑ کر
ہ رکھے مسکراتی عورت ـ جسم کے حشر انگیز نشیب و فراز اپنا تمسخر آپ اڑا رہے ہوتے ہیں ـ بعض اشتہارات بڑے ہی افسانوی قسم
تے ہیں ـ ان اشاروں کا تعلق محض تصوراتی ہوتا ہے ـ مثلاً ایک بڑا سا اشتہار ہے جس سے ایک اونی رسی لٹک کر سیدھی آسمان کی
تی ہے ٹھکے پر لکھا ہے ـ "سو فیصدی خالص اون" اور اس مضبوط رسی کو پکڑے ایک خوبصورت نوجوان اوپر کی طرف جا رہا ہے اور
لڑکی اسکو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے ـ کیونکہ لڑکے نے "سو فیصدی خالص اون" کے کپڑے پہن رکھے ہیں ـ اسی طرح
سکے اشتہار میں ایک نوجوان لڑکی کا سایہ اس امر کا انکشاف کرتا ہے کہ اسطرح معاشی عظمت و برتری کے ساتھ عیش و نشاط کی لذات
کو کسقدر خوشگوار بنا سکتی ہے ـ ایک سگرٹ ساز کمپنی تو اتنی دور کی کوڑی لائی ہے کہ دوریوں کا تصور مسخ ہو کر رہ گیا ہے عنوان
"A NEW IDEA IN SMOKING" اور نیچے سبز رنگ کی بڑی صاف شفاف ندی بہہ رہی ہے ـ اسکے ارد گرد
رہیں رنگ برنگ کے مہکتے پھول لہکتے پودے اور جھومتے ہوئے درخت ہیں ـ ندی میں ایک سفید بطخ تیر رہی ہے ـ ندی کے کنارے
دوشیزہ اپنے "سامان حرب" یعنی "میک اپ" سے لیس ہو کر بیٹھی ہے ـ اور سگریٹ کے کش لگا رہی ہے ـ سگریٹ کا نام ہے "سالم"
ہ نوشی کی تاریخ میں شاید یہ ایک اچھوتا خیال نہ ہو لیکن تاریخ اشتہار بازی میں اسکے اچھوتے پن پر کون انگلی رکھ سکتا ہے ـ کہ اگر آپ
یٹ پینا ہو تو پہلے غازہ اور لپ اسٹک سے غسل کرو ـ آبادی سے باہر کسی سبز پوش ندی کے کنارے چلے جاؤ لباس سے آزاد
ـ پانی میں ایک سفید بطخ چھوڑ دو اور پھر سگریٹ پینا شروع کر دو "سالم سگریٹ" ـــ مشرقی رسالوں کو ایسے موقعوں پر بڑی مشکل
تی ہے مشرقی اقدار کا تقدس بھی تو آخر کوئی چیز ہے! وہ بیچارے کپڑوں کے نام ہی گنوانے شروع کر دیتے ہیں ـ کریپ، ڈلین اور
ـ نائیلون ـ ٹیفٹاس، شیفون ـ ساڑھیاں اور میچنگ سیٹ وغیرہ ہوا تو اس فہرست کے ساتھ شرطیہ لکھتے، ساڑھیں
ہ لباس آپ کے چند خوبصورت جسم بنا دینگے اور اوپر "عمدہ لباس اعلیٰ شخصیت کی نشانی ہے" عمدہ لباس پہن کر دوسروں کو مرعوب

[redacted]

نیڑھی والی بھنویں شکنوں سے ٹپکا پڑتا ہے۔ پلیٹ فارم پر بیوی سامان سفر سے لدی پھندی شوہر سے پوچھ رہی ہے۔ ٹکٹ خرید لیا؟ ادھر کی چٹوری زبان نے جواب دیا۔ ٹکٹ وکٹ چھوڑو۔ یہ بتاؤ کیا تم نے سپنگلز خرید لیں۔ کیونکہ سپنگلز کے بغیر زندگی میٹھی نہیں رہ سکتی۔ یہ سپنگلز اسپنسر کا فلسفہ نہیں۔ بلکہ چوسنے والی ٹکیاں ہیں۔ اور زندگی کی مٹھاس میں اضافہ کرنے کے لئے رس ٹپکے بھی تو ضروری ہیں۔ ان کی شیرینیاں تو آنجہانی گاہکوں کو بھی تقسیم ہو رہی ہیں۔ غالب نے بہت پہلے یہ شعر کہا تھا ؎

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب ٭ گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

بیچارے غالب کو یہ علم کہاں تھا۔ ایسا زمانہ بھی آئیگا جب شاہدانِ شوخ و شنگ و خوش رنگ کو اپنے حسن کو دوبالا کرنے کے لئے ابٹن اور غازہ کوڑیوں کے داموں مل سکیگا۔ غالب بیچارے پر محبوب کے ہونٹوں کی شیرینی کا بھید بھی نہ کھل سکا۔ آج یہ تو "ملک فوڈ بسکٹ" کے روپ میں سرِ عام بکتی ہے۔ کیا شیریں دہن اور شیریں مقال کیا رقیب اور کیا معشوق خوش سبھی اسکو پسند کرتے ہیں۔ پس منظروں میں ڈوبتے ابھرتے ہنستے بگڑتے یہ چار پانچ چہرے، جو کہ بالترتیب حسین سے حسین تر نظر آتے ہیں۔ دراصل شیونگ کریم کے مرہونِ منت ہیں۔ ان چہروں کی آنکھیں بند ہیں۔ لب لعلیں پر مسکراہٹ GREAT کہنے کے لئے بیتاب سے گئے ہیں اور ایک انگلی کے سہارے یہ چہرے بادلوں میں اڑ رہے ہیں۔ یہ دراصل "روئے زمین" پر سب سے زیادہ "آسمانی شیو" ہے۔ مجھے معلوم ہے۔ یہاں آپ کو اپنے محبوب فلمی ستاروں کے دن بدن حسین ہوتے چہرے اور دانت بڑی شدت سے یاد آ رہے ہیں جو ہر روز لکس ٹائیلٹ صابن اور ہیوٹرین کریم سے "دھلتے" اور میکلینس ٹوتھ پیسٹ سے "منجھتے" ہیں۔ لیکن میں آپ کے لئے سوا دعا کے اور کیا کر سکتا ہوں۔ کہ خدا آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ کیونکہ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ آہ! نامرادِ عشق! یہ وہ آتش غالب۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ آگ سے مت کھیلو امرت دھارا فارمیسی کے ٹانک استعمال کرو۔ اس سے آپ کی قوتِ صبر جمیل بھی طاقت حاصل کریگی! آپ کے ڈاکٹر بھی آپ کو یہی مشورہ دینگے کہ بغیر سوچے سمجھے طاقت کی ادویات استعمال کرنا آگ سے کھیلنا۔ طاقت ——— اسپرو کی دو گولیوں سے بھی تو بے پناہ طاقت آ جاتی ہے۔ گولیوں کے درمیان میں سے ایک خوبصورت، تازہ اور گٹھے جسم کا نوجوان برآمد ہو رہا ہے۔ یہ دراصل درد اور بخار پر اسپرو کی طاقت سے غالب آ چکا ہے۔ وہ سامنے بناسپتی گھی کھا کر ایک شخص پہلوانی کے ڈپلومے کی بجائے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کر رہا ہے۔ اس سے نیچے ایک ڈاکٹر دانتوں کے ایک نوعم کا دانت کھینچ نکالنے کے لئے دو مزدوروں کی مدد لے رہا ہے۔ اور پاس کھڑی ایک بوڑھی عورت اپنے "لوہے جیسے" دانتوں کو شیشے میں گنگنا رہی ہے۔ اس کا بس چلے تو ایسے بد بہرہ نوجوانوں کو کچا ہی چبا جائے ہضم ہو یا نہ ہو۔ ہیں تو دانتوں کی مضبوطی چاہئے۔

خواتین و حضرات! اوہ! اوہ! اوہ! ایسے موقعوں پر بار بار کھانسنا آپ کی تقریر کو مضحکہ خیز بنا دیتا ہے۔ اس کا علاج ایٹم نہیں۔ بلکہ بنفشہ، عناب، گاؤ زبان، تخم خطمی اور تخم خبازی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ یہ جہان فانی نسبتی توازن کے بل پر کھڑا ہے۔ یورپ کے توانائی طاقت کا یہاں کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ آپ کو تھوڑی دیر کے لئے پہاڑوں کو گھونسا لگانے والی حس کو بیدار کرنا پڑے گا۔ یعنی: تا! آٹھ۔ دو پر تقسیم ہوتا ہے۔ چار نمبر کے ساتھ تیرہ من کا جسم صحت کو برباد کر دیتا ہے لیکن چیونٹی کے مقابلے میں ہاتھی کو دیکھنا پڑتا ہے

ہ "کو طرزِ منون کرکے آپ کو مرعوب کرنے کی کمزور سی کوشش کرینگے۔ اور اگر زبان تیر مارینگے تو ایک ہونے والی دلہن گھر ملائینگے۔ جو
ن سے ریسیور لگائے اپنی پیاری امی جان کو ٹیلیفون کر رہی ہوگی ممی مجھے جہیز میں زیورات اور ملبوسات پہلے کلاتھ ہاؤس سے
یدکر دینا۔ ورنہ میں ناراض ہو جاؤنگی "چست لباس زیبِ تن کئے دو خواتین کھڑی ہیں۔ اور سر جوڑے آپس میں مسکراہٹوں کے
یہ میں میٹھی میٹھی گفتگو کر رہی ہیں۔ ساڑھی۔ دل کی پیاس، آنکھ کا نشہ، جارجٹ، لیڈی ہملٹن، یہ سب کچھ میری پسند کے مطابق صرف
ں سے مہیا ہوتا ہے "اور نیچے لکھا ہوگا "کچھ خواتین وہی لے لیتی ہیں۔ جو انہیں پیش کیا جائے۔ کچھ خواتین اپنی پسند کی چیزیں چاہتی ہیں
یہ سب خواتین ہمیشہ ہی ہمارے بنائے ہوئے کپڑے طلب کرتی ہیں "اس تصویر کا دلچسپ ترین خاص پہلو تو یہ ہے کہ جہاں
شیۓ کے تاریخی ارتقاء پر بحث کی جاتی ہے "جب حوا نے تن ڈھانپنے کے لئے انجیر کے پتوں کو منتخب کیا۔ تو گویا ملبوسات
فیشن کی بنیاد رکھدی۔ اس وقت سے انسان مسلسل اس کوشش میں ہے کہ - - - - - - - - - - " مقبرہ جہانگیر کے صحن
یں حجروں کی تصویر دکھائی دے رہی ہے۔ انسانوں کا ایک جوڑا چہل قدمی کر رہا ہے۔ کھجور کے درخت کی جڑوں کے قریب لکھا ہے
۳۰۰ برس پہلے مغلوں کا فنِ تعمیر عروج پر تھا لیکن نور جہاں کا مزار آج زبانِ حال سے پکار رہا ہے کہ ۔

بر مزارِ ما غریباں نے چراغے نے گلے

پائیدار اور مضبوط ترین عمارات میپل لیف سیمنٹ سے بنائی جاتی ہیں "یہ سب کیا ہے ! ــــــ استعمال بالجبر؟
انی نفسیات کا استعمال ہے ـــــ یہ لوگ انسانی نفسیات کی کمزوریوں سے جلبِ زر کرتے ہیں ہے ـــــ ہر شخص
ف جذبات و حسیات سے مرکب ہے۔ اور اسی لئے اشتہار بازی کے "کیموفلاژ" بھی الگ الگ ہیں تاکہ ہر قسم کی نفسیات کے
" اسکی ضرورت کے مطابق خوف جمع کئے جا سکیں خوف ــــــ بیماری کا خوف ــــــ جنس کا خوف ـــ فیشن کا خوف
ہر دلعزیزی کا خوف ـــــ غلط بیوی کا خوف ـــــ بدصورتی کا خوف ـــــ مستقبل کا خوف ـــ خوف ہی خوف جو
اشتہاروں کے سیاہ حروف کے نیچے ناچ رہا ہوتا ہے ـــــ دیار مغرب ـــــ۔ جہاں صنفی اشیاء کی فروخت بڑھانے
لئے آپ کی مرحومہ تجربہ کاری، بالغ نظری اور عقلمندی پیروں کی باڑ سے ڈاکہ ڈالا جاتا ہے۔ جہاں لڑکیوں کے تمام صنفی بہ لیس لیس
معاہدے کئے جاتے ہیں۔ اور منجمد دلہنوں "کی سرخ اور نازک پتلیوں کو خریدا جاتا ہے۔ خواہش، حیرت، انگیز، ناگزیر اسحوکن ناقابل
موش۔ ان چند تند و تیز خصوصیات کے تحت وہ آپ کی خواہش خرید کو بھی تند و تیز کر دیتے ہیں جواہر لال نہرو کا کہنا ہے۔ کہ اسے ہر اس
سے نفرت ہو جاتی ہے جس کی بذریعہ اشتہارات تبلیغ کی جائے۔ لیکن جواہر لال اس دنیا میں صرف ایک عدد ہے۔ ہر کوئی جواہر
نہیں بن سکتا۔ مگر کیا پتہ، خود جواہر لال کا طریقۂ اشتہار کس کو معلوم)
"ہماری دکان میں تشریف لایئے۔ ہم ایک روپے کے عوض ساڑھے سولہ آنے پیش کرتے ہیں۔ اور یہ پھولے پھولے گال،
یہ پھولے نہیں۔ بی پی کی ٹافیاں ہیں۔ ننھے میاں سے دادا ابا کی پسند تک۔ ننھے میاں کا دایاں گال ابھرا ہوا ہے۔ اور دادا ابا کا بایاں
بائیں "اور بائیں" بازو کی تخصیص کرنی ہی پڑتی ہے)۔ دونوں بی پی ٹافی کو مزا لے لے کر کھا رہے ہیں۔ اور یہ مزا چہروں کی

مورے کوشاہوں سے لوٹا پڑتا ہے۔ ایک دوا فروش کمپنی کے تو پھر ہی شیر کے مقابلے میں ڈنٹر پیل رہے ہیں "شیر کے منہ میں! ملیریا ایک شیر ہی تو ہے" دوسرے الفاظ میں مچھر شیر ہی تو ہوتے ہیں۔ لیکن موبل آئل والوں کے پاس تو ببر شیر بھی ہیں "ببر شیرنی! ایک دفعہ جنگل کے جانوروں میں یہ بحث چھڑ گئی کہ کون زیادہ بچے پیدا کرتا ہے۔ اور آخر میں سب جانور ببر شیرنی کے پاس گئے۔ اور اس سے پوچھا "تم کتنے بچے پیدا کرتی ہو" ؟ ببر شیرنی نے فخریہ لہجے میں جواب دیا۔" ایک ——— صرف ایک ——— لیکن وہ شیر ببر ہوتا ہے"۔ موبل آئل صرف ایک ہے اور وہ نہایت اعلیٰ قسم کا ہوتا ہے۔

بیسویں صدی کے اخبار پڑھیں تو آپ کو رسالے پڑھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اور رسالے آپ کو کتابوں سے بے نیاز کر دیں گے۔ آزمائش شرط ہے۔ آپ کو غالب یا اقبال پر کوئی مقالہ لکھنا ہے۔ تو موٹی موٹی کتابیں چاٹنے کی بجائے اخبارات کے اشتہارات پر لوٹ پڑیئے۔ پبلشرز نے غالب، اقبال اور نذر الاسلام کی پوری سوانح عمری اور ان کی تصانیف کی پوری تفصیل کے بعد لکھا ہوگا : "یہی زندہ جاوید کتابوں میں سے چند کرنا فلی کاغذ پر چھپ کر آپ تک پہنچی ہیں" اور اس طرح آپ بہت سی مفروری سے بچ جائیں گے۔ اور ہو سکتا ہے۔ کہ مقالے کی اشاعت کے لئے آپ کو کرنا فلی کاغذ کے حصول میں بھی سہولتیں میسر آجائیں ساتھ ہی اس نوجوان پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجئے جس کے چہرے پر بشاشتیں بکھری پڑی ہیں۔ اسکے سر پر "ماڈرن دستار فضیلت" رکھی ہے جس کے آگے ایک "پین" لٹک رہا ہے۔ نوجوان کا ایک ہاتھ اشتیاق سے بیتاب ہو کر سامنے پڑے فونٹن پین تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اور ذرا اوپر تو پڑھئے ؟ "آپ نے ہائی اسکول کا امتحان پاس کر لیا۔ آپ نے کالج میں اپنا قدم رکھا آپ نے ڈگری بھی حاصل کر لی۔ اور آپ وکیل، ڈاکٹر یا انجنیئر بھی ہو گئے" یہ سب کچھ قلم ہی کے تو کرشمے ہیں۔ تحریریں قوموں کی تقدیر بناتی ہیں۔ اور قلم تحریروں کو جنم دیتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ایک دھمکی بھی ملاحظہ ہو "خبردار اچھے فونٹن پین کے لئے گھٹیا روشنائی خطرناک ہے۔ وقت کی بہترین ضرورت "سوان انک" ہے ——— بہترین ضرورت ——— میری رائے میں وقت کی بہترین ضرورت "سوان انک" ہی نہیں ہے۔ بیوی بھی ہے ——— ایک اچھی اور سگھڑ بیوی ——— مکمل اور پر سکون زندگی کے لئے بیوی کی ضرورت سب سے زیادہ اشد ہے۔ اس کی تائید میں اگر ہر قسم کے اشتہاروں کا سہارا لوں۔ تو شاید میں فحش نگاری کے الزام سے نہ بچ سکوں۔ ہمارے رسالوں میں تو اکثر اپنی حقیقی اور اندرونی پسند کا گلا گھونٹ کر اشتہار دیا جاتا ہے۔ عمر خواہ دگنی بزرگ ہو۔ بیوی گھر گرہستی کے کام اچھی، سینا، سلائی، کڑھائی، روٹیاں پکانا اور بستر بچھانا اچھی طرح جانتی ہو۔ تو کافی ہے "تعلیمی سرٹیفکیٹ کے لئے" "متعلقہ فرشتے" ہونے کے ساتھ ساتھ "مزاج من" خط کے شروع میں اور "آپ کی باندی" خط کے آخر میں لکھنے کی عادت "بہر حال ضروری ہے۔ مشرق میں یہ معیار کم و بیش مشترک ہے لیکن مغربی معیار میں آزادیٔ رائے کو پیش از حقوق انسانی تصور کرتے ہوئے کافی گنجائش دی گئی ہے۔ مثلاً ایک جرمن خاتون کو ایک خاوند کی ضرورت ہے تو اشتہار کچھ یوں ہوگا "ضرورت ہے ایک نوجوان خاوند کی جو میری تنہائی کی شام زندگی کو صبح ہمیشہ [illegible] کر دے۔ میری آنکھیں سمندر کے پانی کی طرح نیلگوں، بال سنہری، ہونٹ یاقوتی، قد ساڑھے چار فٹ [illegible] ہو تو کیا کہنے بے کار ہو تو کوئی بات نہیں۔ میری آمدنی معقول ہے"۔

چارلس ٹیک (ناروے)
ترجمہ ظفر مانگروولی

دو بھائی

بارڈ اور اینڈرسن دو حقیقی بھائی تھے بارڈ ایک اسکول میں مدرس تھا دونوں بھائیوں میں باہم گہری محبت تھی جنگ میں شریک
ہونے کے لئے دونوں بھائی ایک ساتھ ہی بھرتی ہوئے شہر میں دونوں ایک ساتھ ہی رہتے سہتے اور جنگ میں بھی ایک دوسرے
کے قریب ہی رہے ایک ہی کمپنی میں دونوں لئے گئے اور "کارپاسل" کا تمغہ بھی دونوں نے حاصل کیا جنگ ختم ہونے پر دونوں گھر واپس
آئے اور لوگوں نے محبت و خلوص کے اس جوڑے کو دیکھکر خوشی کا اظہار کیا۔
کچھ عرصہ گذرنے پر انکے باپ کا انتقال ہوگیا وہ اپنے پیچھے کافی دولت و املاک چھوڑ مرا تھا جسکی تقسیم کا کام بہت دشوار
تھا دونوں بھائیوں نے طے کیا کہ املاک کے بٹوارے میں آپس میں کوئی جھگڑے کی بات پیدا نہ ہو اسلئے نیلام کرایا جائے اس نیلام
میں دونوں بھائیوں کو اپنی پسند کی چیز پر بولی بولنے کا مجاز تھا اسطرح جملہ اشیا کی جو قیمت ہو وہ نصف نصف دونوں میں تقسیم کرلی
جائے۔۔۔۔۔
مگر انکے والد کی ایک سونے کی جیبی گھڑی تھی جسکی قرب و جوار کے لوگوں میں بڑی شہرت تھی ایسی گھڑی ابتک انکی نظر سے
نہ گذری تھی نیلام میں جب اس گھڑی کی باری آئی اس وقت بہت سے دولتمندوں نے اس کی خرید پر آمادگی ظاہر کی لیکن
جب دونوں بھائیوں نے اسکے خریدنے کی خواہش ظاہر کی تو دولتمند بولی بولنے سے رک گئے بارڈ کو یقین تھا کہ اینڈرسن اسکو یہ
گھڑی خریدنے دیگا اور اینڈرسن یہ خیال کررہا تھا کہ بارڈ اس گھڑی کو حاصل کرنے کے لئے بڑھ چڑھ کر بولی نہ بولے گا۔ باری باری سے
دونوں بھائی بولیاں بولنے لگے دونوں یہ سوچ رہے تھے کہ میری بولی سے زیادہ بولی نہ بولے گا اور اسطرح بولی بولتے وقت انکے
چہروں پر سختی و درشتی کے آثار رونما ہونے لگے گھڑی کی قیمت جب بیس ڈالر تک پہونچی اسوقت بارڈ کو محسوس ہوا کہ اینڈرسن کو ایسا
نہ کرنا چاہیئے تھا اسنے اس سے بڑھکر بولی بولدی اور رفتہ رفتہ تیس ڈالر تک نوبت پہونچی پھر بھی اینڈرسن باز نہ آیا اب بارڈ
کو خیال گذرا کہ اینڈرسن میرے آجتک کے تمام احسانات فراموش کررہا ہے میں بڑا بھائی ہوں اسکا بھی اسکو پاس نہیں ہے
گھڑی کی قیمت اب تیس ڈالر سے بھی آگے بڑھی اینڈرسن ہمت ہارنے والا نہ تھا بارڈ چالیس تک پہونچا اب وہ اینڈرسن کی طرف
نظر اٹھا کر بھی دیکھتا نہ تھا نیلام والے گھر میں سناٹا چھا گیا صرف نیلام پکارنے والے کی آواز ہی اس خاموشی کو توڑتی تھی اینڈرسن

[redacted]

دل ہی دل میں خیال کرنے لگا کہ بارڈ اتنی رقم دے سکتا ہے تو خود بھی چالیس ڈالر دے سکتا ہے گھڑی میں نہ پا سکوں ایسا اگر بارڈ کے دل میں ہے تو اس حال میں تو میں گھڑی لیکر ہی چھوڑونگا اسنے چالیس سے زائد رقم لگائی بارڈ کو ایسا لگا کہ اب یہ چیز لئے ایک آن کی بات ہو گئی ہے اسنے آہستگی سے پچاس ڈالر کہہ دیا

کمرے میں بہت سے لوگ جمع تھے اینڈرسن نے محسوس کیا کہ اگر میں بارڈ سے بڑھکر بولی نہیں بولتا تو اس بھرے مجمع میں کرکری ہوتی ہے وہ پچاس سے کچھ آگے بڑھا اور بارڈ نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔

ستّر ڈالر اور محبت برادرانہ اتنے دام دینے کے لئے میں تیار ہوں اسقدر کہا اور اٹھکر کمرے سے باہر نکل آیا۔

باہر نکلکر وہ گھوڑے پر بیٹھنا چاہتا تھا۔ یہ گھوڑا بھی نیلام کے لیے لایا گیا تھا۔ اتنے میں ایک شخص نے آکر اسکو مطلع کیا کہ اینڈرسن اب آگے بڑھنے سے انکار کرتا ہے گھڑی تمہارے حصے میں آئی ہے۔

یہ خبر سنکر اسکو ندامت ہوئی گھڑی کے لئے نہیں مگر اب وہ اینڈرسن کے متعلق سوچنے لگا۔

گھوڑا تیار کھڑا تھا اسپر سوار ہو یا نہ ہو یہ طے نہ کر سکا لوگ اب باہر نکلنے لگے تھے اینڈرسن بھی ان میں تھا۔ اسنے جب کو گھوڑے کے قریب کھڑا ہوا اور جانے کے لئے پا بہ رکاب دیکھا اسوقت بارڈ کے دل میں کن خیالات کا ہجوم ہے اسکے سمجھنے وہ قاصر تھا۔:-

"گھڑی تمہیں مبارک ہو بارڈ! اسنے چلا کر کہا اب میں کبھی تمہارا سایہ تک نہ چھوؤنگا"

"میں بھی کبھی تمہارے دروازے پر نہ آؤنگا، بارڈ نے جواب دیا مگر اس کا چہرہ اترا ہوا تھا پھر گھوڑے پر سوار ہو کر چلا اس روز کے بعد دونوں میں سے کسی نے بھی اپنے آبائی مکان میں قدم نہ رکھا۔

کچھ عرصے کے بعد اینڈرسن نے شادی کی مگر اسنے بارڈ کو مدعو نہ کیا اور بارڈ نے بھی شرکت نہ کی جس سال شادی ہوئی اس سال اسکی ایک ہی گھنے تھی وہ مرگئی مکان کے شمالی حصے میں جہاں وہ باندھی جاتی تھی صبح سویرے مردہ پائی گئی وہ کیسے مرگئی یہ نہ ہو سکا اور بھی کئی مصیبتیں آئیں اور اینڈرسن کی حالت بہت بدتر ہونے لگی ان میں سب سے بڑا نقصان پہنچانے والا واقعہ یہ ہوا کہ میں اسکے کھیت کی تمام گھاس جو اکٹھا کرکے گودام میں رکھی ہوئی تھی اچانک رات کو آگ لگ گئی کس طرح آگ لگی کس نے لگائی پتہ نہ چل سکا۔۔

"میرا برا چاہنے والے کسی انسان ہی کا یہ فعل ہے" اینڈرسن نے خیال کیا۔ اس رات وہ صبح تک سوتا رہا اب وہ بیمار ہو گیا تھا کسی کام میں دل بھی نہ لگتا تھا۔

آگ لگنے کے دوسرے روز بارڈ اینڈرسن کے گھر آیا اس وقت اینڈرسن نڈھال ہو کر بستر پر لیٹا ہوا تھا بارڈ کو دیکھا یہاں کس لئے آئے ہو، اسنے دریافت کیا پھر رک گیا اور بارڈ کو گھور گھور کر دیکھنے لگا تھوڑے تامل کے بعد بارڈ نے جواب

"اینڈرسن! میں جانتا ہوں کہ تم مصیبت میں گھرے ہوئے ہو میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں،

"میں مصیبت ہی میں مبتلا رہوں اسکو تم پسند کرتے ہو یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں خدا کے لئے اس گھر سے چلے جاؤ مجھے اپنی بھی اعتماد نہیں رہا،

"اینڈرسن! تم غلطی پر ہو میں سچ مچ سخت پشیمان - - - - - ،

"بارڈ! بس کرو بہت ہوا اب خدا کے لئے یہاں سے چلے جاؤ، بارڈ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"اگر تمہیں گھڑی درکار ہو، اسنے کانپتی ہوئی آواز سے کہا تو وہ میں تمہیں دینے کے لئے تیار ہوں"

"بارڈ! اب جاؤ" اینڈرسن قریب قریب چلا کر بولا اب بارڈ کو یہاں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ معلوم ہوا اسلئے چلا گیا۔

علیحدگی کے بعد بھی بارڈ اینڈرسن کی حالت پر متاسف و ملول رہتا اور جب سے اسکی زبوں حالی کی اطلاع ہوئی تھی اسکے ...یت درجہ پریشان رہتا تھا مگر انانیت و خودسری کی وجہ سے وہ اپنے ارادوں پر غالب نہ آسکتا تھا اگرچہ گرجا میں جاکر ترک ...کا عزم بھی کرتا تھا مگر اس پر عمل پیرا ہونے کی وہ اپنے میں طاقت نہ پاتا تھا وہ کئی مرتبہ اینڈرسن کے مکان تک بھی گیا مگر اس وقت ...شخص گھر سے باہر نکلتا ہوتا یا کوئی انجان آدمی راہ میں کھڑا ہوا پاتا یا اینڈرسن خود لکڑیاں چیرتا ہوا دکھائی دیتا اس قسم کی کوئی نہ کوئی ...در پیش ہو جاتی۔

ایک صبح وہ گرجا میں گیا وہاں اینڈرسن کو بھی دیکھا اسکا جسم لاغر اور چہرہ زرد ہو گیا تھا اور جسم پر پہنے ہوئے کپڑے بوسیدہ پیوند لگے ہوئے تھے دونوں بھائی نیب ساتھ رہتے سمجھتے تھے۔ اس وقت اینڈرسن یہی سوٹ پہنا کرتا مگر اس وقت اور لباس میں اور خود اینڈرسن میں کسقدر تغیر واقع ہو گیا تھا! اینڈرسن کا لڑکپن بارڈ کی نظروں میں پھرنے لگا اسوقت وہ کیسا پیارا ...!

بارڈ نے اپنے دل میں طے کر لیا کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو وہ کسی نہ کسی طرح اینڈرسن سے سمجھوتا کرے گا اسکا جی چاہا کہ اٹھکر ...سکے پاس کے پاس جا بیٹھے لیکن درمیان میں ایک شخص کھڑا ہوا تھا اور اینڈرسن کی نظر بھی اسپر پڑی نہ تھی دعا ختم ہونے کے ...ڈ کا دل کوشش کرنے کو چاہا مگر ایسا کرنے میں پھر موانع پیش آئے اطراف میں بہت سے لوگ تھے۔ اینڈرسن کی بیوی بھی اگرچہ وہ اسکو پہچانتا نہ تھا اسنے سوچا کہ یہاں ملنے سے بہتر ہے کہ اسکے گھر ہی جاکر اطمینان سے ملوں

شام ہوئی اور وہ اپنے مکان سے نکلا اینڈرسن کے مکان ہی کی جانب قدم اٹھائے دروازے کے پاس جاکر وہ تھوڑی ...! اندر اسکی نسبت ہی گفتگو ہو رہی تھی اینڈرسن کی بیوی کہہ رہی تھی۔

"آج وہ گرجا میں آئے تھے ایسا لگتا تھا کہ وہ وہاں سارا وقت تمہارے ہی خیال میں محو رہے،

میرا خیال ہے ... کریں! یہ میں ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں" اینڈرسن نے جواب دیا، میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں وہ سب ...اپنی ذات کا خیال کرتے ہیں"

پھر ایک طویل خاموشی رہی سرما کا موسم تھا پھر بھی وہاں کھڑے ہوئے بارڈ کو پسینہ آنے لگا۔۔۔۔۔ اندر سے
کی آواز سنائی دی پھر انگیٹھی کی آگ بجھا دی گئی ہو ایسا معلوم ہوا بچے کے رونے کی آواز بار بار آیا کرتی تھی اور اینڈرسن پنگوڑے
سے رہا تھا آخر اسکی بیوی پھر بولی۔

مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم دونوں بھائی ایک دوسرے کی نسبت سوچا کرتے ہو اگرچہ میں جانتی ہوں کہ تم میں سے
بھی اس بات کا اقرار نہ کرے گا ،

اب ہم کوئی اور ذکر کریں، یہ کہکر اینڈرسن نے بیوی کی بات ٹالدی تھوڑی دیر کے بعد وہ باہر جانے کے لئے اٹھا
کو چھپ جانے کی ضرورت تھی باہر آکر اینڈرسن نے چند لکڑیاں لیں پوشیدہ طور پر کھڑا ہوا بارڈ اب اینڈرسن کو صاف طور
سکتا تھا۔ گرجا میں جو لباس پہنکر آیا تھا وہ اسنے بدل ڈالا تھا اور بارڈ کے پاس جیسا سوٹ تھا ویسا ہی سوٹ پہنے ہوئے تھا او
تو دونوں بھائیوں نے نہ پہننے کا اور اپنے غریب رشتہ داروں میں سے کسی کو دیدینے کا پہلے ہی طے کرلیا گیا تھا۔ مگر اینڈرسن کا
بھی پھٹ گیا تھا۔ اور جا بجا پیوند لگے ہوئے تھے۔ اس کے برعکس بارڈ اپنی جیب میں سونے کی گھڑی لئے پھرتا تھا۔ لکڑیاں ا
اینڈرسن نے یکبارگی تاروں بھرے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر ایک آہ سرد کے ساتھ کہا اے خدا! یہ میری کیا حالت ہے" تاذگی بار
نہ بھول سکا اس کے جی میں آیا کہ بڑھکر بھائی سے چمٹ جائے اور پیار بھری باتیں کرے اتنے میں اینڈرسن کھنکھارا اور بارڈ آگے بڑھ
گیا اب زیادہ دیر ٹھہرنے کی وجہ نہ تھی اس لئے لکڑیاں اٹھا کر مکان میں جانے لگا ایکبار تو اسنے قریب سے گذرا کہ اسکے ہاتھ کی لکڑیوں
کو ذرا دھکا بھی لگ گیا۔ ؛۔

دس منٹ تک بارڈ جیسے جم کر رہ گیا ہو وہیں ٹھہرا رہا اور اس حالت میں اور کب تک ٹھہرا رہتا یہ کہنا مشکل ہے مگر اسکو ا
کیفیت سے چونکا دینے والی سردی کا ایک سخت خنک جھونکا آیا اور اس کا تمام جسم کانپ گیا اب وہ وہاں سے باہر نکلا دل میں سو
میں حقیقتاً بزدل ہوں اینڈرسن کے پاس جانے کی بھی مجھ میں جرات نہیں ہے وہ جہاں کھڑا وہاں راکھ کی ایک ڈھیری تھی یہیں سے اس
کو سنلے لئے اور گھاس رکھنے کے گودام میں جاکر دروازہ اندر سے بند کر دیا اور کوئلے سے دیا روشن کیا صبح اینڈرسن اس گودام
لالٹین لٹکایا کرتا تھا اس کھونٹی کی تلاش کرنے لگا کھونٹی نظر آگئی اور کوئلہ بجھا دیا۔ جیب سے سونے کی گھڑی نکالکر کھونٹی پر لٹکا دی اور اب
گھر واپس لوٹ گیا۔۔

دوسرے روز اسنے سنا کہ رات تمام گھاس جلکر خاک ہوگئی بارڈ نے خیال کیا کہ گھڑی لٹکاتے وقت اسنے کوئلہ روشن کیا تھا
ایک آدھ پتنگا تنکوں پر گرا ہوگا اور ساری گھاس میں آگ لگ گئی ہوگی۔ ؛۔

اس واقعہ سے اسکو اس قدر صدمہ ہوا کہ تمام دن گھر میں ایک بیمار کی طرح پڑا رہا اور انجیل کے مطالعہ میں مصروف رہا لوگ
بارڈ کو مزید کچھ ہوگیا ہے۔ لیکن شام ہوتے ہی وہ گھر سے باہر نکلا چاندنی کھیت سے کئے ہوئے تھی اینڈرسن کے گھر کی طرف روانہ ہوا
میں آگ لگی تھی اسمیں گیا اور جلی ہوئی گھاس میں کھونٹی کے نیچے کچھ ڈھونڈھنے لگا آخر وہ اسمیں کامیاب ہوا اور سونے کی ایک پھوٹی ا

تہ لٹکائی ہوئی گھڑی کا وہ جزو تھا۔

گھڑی کو لیکر وہ کن کن امیدوں سے یہاں آیا تھا اینڈرسن سے مصالحت کرنے کی اسنے کیسی کیسی آرزوئیں اور توقعات رکھی
۔ ۔ ۔ مگر آج اس کا کس قدر افسوسناک انجام ہوا!

چھوٹی سی لڑکی بارڈ کو خاک میں کسی چیز کی تلاش کرتے دیکھ گئی تھی بہت رات گئے گشت کرنے والے چند نوجوانوں نے
اینڈرسن کے مکان کی جانب جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ دوسرے روز اس کا برتاؤ لوگوں کو سخت تعجب میں ڈال دینے والا تھا
اسکی عداوت سب پر ظاہر تھی اس واقعہ کے ساتھ اور بھی کئی باتوں کا اضافہ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بارڈ کے خلاف تحقیقات ہونے
بت نہ مل سکا تاہم لوگ بارڈ سے بدظن ہوگئے اس کو مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگے اس صورت میں اینڈرسن سے ملاقات
لئے دشوار ہوگیا جب گھاس جل گئی اس وقت اینڈرسن کے دل میں بارڈ کا خیال آیا تھا مگر زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالا تھا
ن کو جب اس نے بارڈ کو اپنے مکان میں داخل ہوتے دیکھا اس وقت اس کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا تھا۔ اور چہرے سے
ب اثرات ظاہر ہو رہے تھے اینڈرسن سمجھا تھا کہ اب اسکو اپنے کئے پر ندامت ہو رہی ہے مگر اس نے اس پر جو مصیبتیں
کے عوض وہ اس کو معاف کرنے کیلئے قطعی تیار نہ تھا جس رات آگ لگی تھی اسی روز شام کو لوگوں نے بارڈ کو اسکے مکان
وتے دیکھے جانے کی باتیں اینڈرسن کے کان میں پڑی تھیں اگرچہ بارڈ کے خلاف تحقیقات میں کسی قسم کا کوئی ثبوت بہم نہیں
م اینڈرسن کو یقین تھا کہ اسمیں بارڈ کا ضرور ہاتھ ہے۔

مقدمہ کی سماعت کا وقت آیا تو کمرہ عدالت میں بارڈ اور اینڈرسن دونوں حاضر تھے بارڈ کا سوٹ ٹھاٹ دار اندر
نا تھا عدالت میں جس وقت اینڈرسن داخل ہوا تھا اسوقت بارڈ کی نظر اینڈرسن کی طرف تھی اینڈرسن نے محسوس کیا
س پر شبہ نہ کرنے کی منکسرانہ التجا ہے چنانچہ جب عدالت کی طرف سے دریافت کیا گیا کہ تمہیں بارڈ پر شبہ ہے؟
پورے استحکام کے ساتھ صاف کہدیا "نہیں"

روز سے اینڈرسن زیادہ شراب پینے لگا اس کی حالت روز بروز خراب ہوتی چلی بارڈ کی حالت اس سے بھی بدتر تھی وہ اب
گیا تھا کہ لوگ مشکل ہی سے اس کو پہچانتے تھے۔

دا اس شام کو ایک غریب عورت بارڈ کے کرایہ والے مکان پر آئی اسنے بارڈ کو اپنے ہمراہ چلنے کو کہا وہ اسکو پہچان گیا وہ
تھی کس لئے وہ ساتھ لئے جا رہی ہے یہ بارڈ فوراً سمجھ گیا اسکے چہرے پر مردنی چھا گئی ایک لفظ بھی کہے بغیر وہ کپڑے
ہو لیا باہر برف باری ہو رہی تھی دونوں اینڈرسن کے مکان کی طرف روانہ ہوئے دور سے نظر آنے والے اس مکان کی
روشنی کبھی تیز اور کبھی مدھم ہو رہی تھی بارڈ جب دروازے کے قریب جا کر کھڑا ہوگیا اس وقت اندر سے تنفس کا زیر و
بم محسوس کر رہا تھا لمحہ بھر اس پر سکتے کا عالم طاری رہا پھر دونوں اندر داخل ہوئے انگیٹھی کے قریب ایک بچہ کھڑا تھا

اس کا چہرہ زرد تھا مگر ان دونوں کو دیکھ کر وہ مسکرایا یہ اس کے بھائی کا بچہ تھا۔

بستر پر کئی رضائیاں اوڑھے اینڈرسن لیٹا ہوا تھا چہرہ فق گال جھریوں میں اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور پیشانی کا حصہ ابھر آیا تھا بارڈ کی طرف [illegible] سے دیکھ رہا تھا بھائی کی یہ حالت دیکھ کر بارڈ کے پاؤں کانپنے لگے۔ اینڈرسن کی چارپائی کی پٹی پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اینڈرسن پلکیں جھپکائے بغیر ایک نظر سے دیکھتا رہا مگر کچھ زبان سے نہ بولا تھوڑی دیر کے بعد اپنی بیوی کو باہر جانے کا اشارہ کیا مگر بارڈ نے اسکو روک لیا ایک گھڑی کے لئے دونوں نے جھگڑا کر کے ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتے اس وقت سے آج تک کی تمام باتیں ان دونوں نے کیں آخر میں بارڈ نے گھڑی کا پگھلا ہوا جزو ——— سونے کا ٹکڑا جیب سے نکالا ہر وقت وہ اس کو اپنے ساتھ ہی رکھتا تھا اس پر نادم گفتگو سے دونوں کے دلوں کی صفائی ہو گئی اور اس امر کا گہرا احساس ہوا کہ علیحدہ ہو جانے کے بعد سے تا ایندم دونوں میں سے کسی کو بھی حقیقی مسرت اور دلی اطمینان لمحہ بھر کے لئے نصیب نہیں ہو سکا تھا

اینڈرسن نہایت نحیف ہو گیا تھا اس سے زیادہ نہ بولا جا سکتا تھا۔ بارڈ اب اس کے علاج اور تیمارداری کی خدمت نہایت تن دہی سے انجام دینے لگا۔

"اب مجھے بہت اچھا معلوم ہوتا ہے" ایک روز اینڈرسن نے کہا پہلے کی طرح اب ہم ہمیشہ ساتھ ہی رہیں گے اب ہم کبھی جدا نہ ہوں گے۔

مگر اگلے روز اینڈرسن مر گیا۔

اینڈرسن کی بیوی اور بچہ کو بیکس پا کر بارڈ اپنے گھر لایا اور انکی پرورش کرنے لگا۔ اینڈرسن کی حالت نزع میں دونوں بھائیوں کے درمیان جو بات چیت ہوئی تھی اس سے اب سب لوگ واقف ہو گئے تھے اس لئے بارڈ کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگے سخت مصیبتوں میں جس نے سکون و اطمینان قلب حاصل کیا تھا اسی باوقار ہستیوں میں اس کا شمار ہونے لگا لوگوں کے ایسے مستحسن خیالات سے بارڈ کی قوت مادی اور اخلاقی جرأت و نیک خیالات میں بہت زیادہ اضافہ ہوا اور لوگوں کی نظروں میں درویش سمجھا جانے لگا بنی نوع انسان کے کچھ کام آسکے اس جذبہ کے ماتحت اس نے مدرسی کی خدمت پھر منظور کر لی کلاس میں بچوں کو ایک ہی چیز خصوصیت سے زور دیکر سمجھاتا اور وہ چیز محبت تھی نہایت اعلے خیالات وہ ان بچوں کے ذہن نشین کراتا اور بچے بھی اس کو نہ صرف مدرس بلکہ سچا رہنما اور باپ کی جگہ سمجھتے۔

بقیہ:- نقد

ہی کافی ہے۔ اور یہ بات خود فن ڈرامانگاری کے منافی ہے۔

یہ ساری خامیاں اور نقائص پھر بھی کسی نہ کسی طرح ADJUSTABLE تھیں۔ اس ڈرامہ کی بنیاد دراصل یہ ہے کہ یہ ڈرامانہیں ہے۔ کوئی اور چیز ہے۔ جس کا نام ابھی ایجاد نہیں ہوا۔

محمد بشیر (پی ایچ ڈی لندن)

....اور ستلج بہتا رہا

احمد اور کلثوم ـــ بے نظیر اور بدر منیر۔ بدر منیر کی جوانی اور بے نظیر کی محبت ایک ساتھ پروان چڑھیں۔ ستلج کے کنارے کا کھیل اندر دیو کو ایک آنکھ نہ بھاتا۔ مانسرودر کے ساحل پر اندر کا اکھاڑا تھا۔ ستلج، اندر دیو اور کام دیو کی راجوں کی درمیان حد "احمد" اندر کے راج کا باسی تھا مگر "چھومی" کام دیو کی ہو جاتی۔ اپنی پرجا کے کسی مانس کا کام دیو کے راج کی گوری کے لئے جیون دے دینا، اندر اپنی ہتک سمجھتے تھے۔ کام دیو کے استھان پر بیٹھے، اپنی ہزیمت اور دشمن کی فتح۔ پر کام دیو بہتر سیاسی حد بندیاں نہ کر سکتے تھے۔ اندر نے نیں سکھ، مرگ چھال، گل صنوبر، گل بکاؤلی پریوں کو اشارہ کیا۔ چھومی کا روپ دھار کر انہوں نے کتنے کے دل پر اسی کے حصول کی آگ نہ بھڑکا دی۔ ہنگامے کھڑے ہو گئے۔ پر ایک شبھ رات آئی جب احمد اور چھومی نے دواہ کا معولیا۔ صندل چنا کٹی کی سوندھ، مہندی کی سرخی، موتیا کے ہار اور گجرے، بنارس کے اطلس کی دمک، انجن، ساز بین چنبیلی کی طرح نبد۔ پریاں اکھاڑے کو واپس لوٹ گئیں۔

اندر کے غیظ و غضب کا ٹھکانہ نہ تھا۔ برچھی کھایا ہوا رن باگھ، تخت پر بیٹھے بل کھاتے ہوئے میان سے خنجر نکال کر پھینکا۔ سیاہ دیو، سفید دیو، نیلے دیو کے سامنے جا گرا۔ تینوں دیوؤں نے پر کھولتے ہوئے جست بھری اور رنگین گرگرا نے لگا۔ مار بارش صبح شام۔ رات سویرے۔ دنوں ہفتوں ستلج میں طوفان۔ قصور اور فیروز پور دونوں ڈوبتے گئے۔ احمد اور چھومی کو نہ تھے۔

لیکن احمد اور کلثوم، اندر اور کام دیو دونوں کے راج سے نکل گئے۔ کشمیر کو جا رہے تھے۔ اتوی پار کر گئے تو خوفناک خطرناک رستے، ہزاروں فٹ کی چڑھائی پر منوں وزن کے گول اور بھونڈی پتھر مٹی میں چھنے تھے۔ یہ چٹانوں کے ٹکڑے کے منجدھار میں تھے۔ ایک دوسرے سے ٹکراتے ٹکراتے پہلو گھس گئے۔ مٹی میں چھپے کھڑے، آسمان سے باتیں کرتے تھے رستہ نکال کر مٹی کی گرفت ڈھیلی کر دیتے تو آسمان سے زمین کی طرف لڑھکتے۔ اور جو بھی سامنے آ جاتا پتیال میں فنا ہو جاتا۔ انسان اور حیوان۔ انسانوں سے بھری بھرائی گاڑیاں، اور سڑک کی سڑک۔ لیکن یہ تباہ کار مٹی ہی ان پہاڑوں کی زینت تھی۔ سرسبز و شاداب۔ کئی جگہ گاڑی رکی۔ سڑک کے کنارے ایک نانبائی کی دکان تھی، ہم دونوں کھانا کھانے بیٹھے کوئی بھی مل گیا، بہت مزے کا معلوم ہوا۔ کھانا کھا چکے تو دیکھا، دور ایک طرف پہاڑ کے پہلو سے پانی کا دھارا نکل رہا ہے۔ دوسری طرف پان والے کی دکان تھی۔ کیسے ہرے ہو گئے ہیں کیسا رس بھیجے۔ فطرت کے کھیلنے تمدن کے

کلیسا سے شکست کھائی۔ کلثوم پان والے کی دوکان کی طرف بڑھی۔ پان منہ میں ڈال ہم چشمے کی طرف دوڑے۔ سرد دھارے میں ہاتھ ڈالے۔ اور پھر دوڑے۔ واپس۔ اس لئے کہ بس والا ہارن دے رہا تھا۔ آؤ، ورنہ ہم چلے۔

چڑھائی ختم نہ ہوتی تھی۔ اوپر اوپر، اوپر ہی اوپر۔ نیچے دیکھتے تو پتہ چلتا کہ کس بلندی پر جا رہے ہیں۔ اتھاہ گہرائیں، چناب میلوں ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ شور غل مچاتا بل کھاتا۔ کسی کو خاطر میں نہ لاتا۔ چڑھتی جوانی کا منہ توڑ زور۔ اس میں نہ اترا تھا کہ رانجھے کی بانسری کی تانوں پر مست محبت کے گیت گنگناتا نرم خرام چلا جاتا۔ یہ بلندی، یہ پستی یہ ناگ، کچھ ایسا دلفریب نظارہ تھا کہ اس سے نظریں نہ ہٹتی تھیں۔ شام ہونے کو تھی کہ بانیہال پہونچے۔ عجب پر فضا۔ چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ۔ ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ کھانا چنا گیا۔ نوالہ منہ میں ڈالا تو حلق سے نیچے نہ اتارا گیا۔ کالا، ہم بیرے پر برس پڑے۔ سالے اس قدر نمک۔ کڑوا زہر۔ وہ حیرانی سے منہ تکنے لگا۔ ہمیں کیا خبر کہ اس بے نمک میٹھے دلیں سالن کی نفاست یہی تھی۔ تھوڑا بہت کھا لیا۔ زندگی کی سب لذتیں کھانوں ہی میں محدود نہیں۔ بستر بچھایا اور سو گئے

صبح آنکھ کھلی تو بستر خالی تھا۔ ہنوز جگہ گرم تھی۔ ملتے میں آواز آئی " اٹھئے " اٹھئے، باہر آیئے۔ آپ کو ایک چیز دکھ

"کیا چیز ہے؟"

"آپ باہر تو آیئے"

"آخر ہے کیا؟"

"اٹھئے تو سہی"

میں باہر نکلا۔ کمرے کے دروازے کے سامنے۔ اک سرسبز درخت۔ سرخ و سپید۔ سیبوں سے لدا ہوا اور کا حیرت و استعجاب سے اس کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ میں سمجھا۔ سیب کا درخت ہم نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ ایسا ثمر بہار "سیب اور ناسپاتی اور آلو بخارا کے درخت دیکھنے والوں نے بھی تو بیروں جامنوں اور آموں سے ہوے درخت کبھی نہیں دیکھے، جان من!"

سری نگر پہونچ گئے۔ میرا کدل پیلیس ہوٹل میں ٹھہرے۔ دوسرے دن صبح شکارے میں سیر کو نکلے۔ دریا کے دونوں طرف مکان۔ کنارے پر ایک چبوترہ بنا تھا۔ دریا کی طرف کے رخ پر سیاہ دیو کی تصویر تھی۔ سرخ آنکھیں۔ سفید سیندوری زبان باہر نکلی ہوئی۔ شکارے والے نے بتایا " یہ اس دیو کی تصویر ہے۔ جو سری نگر اور کشمیر پر حکمراں لوگوں کو ستاتا تھا۔ شاہ ہمدان کا اس سے مقابلہ ہوا۔ شاہ ہمدان نے اسے قتل کر دیا۔ اس طرح لوگوں نے اس سے نجات پائی۔ ساتھ والی گلی کے اندر شاہ ہمدان کا مزار ہے۔ آپ زیارت کو جائیں گے؟"

"ضرور!"

شکارا گلی سے باہر سکتے دیو کے پاس ٹھہرا۔ ہم کنارے پر اترے۔ شاہ ہمدان نے خطۂ کشمیر میں واقعی کفر و ضلا دیو کو شکست دی تھی۔ توحید اور رسالت کی شمع روشن کی تھی۔ مسلمان فرماں رواؤں نے ظلم و ستم کی جگہ امن و انصا کیا۔ ان کی بدولت ترقی و خوشحالی نے کشمیر کو سچ مچ جنت نظیر بنا دیا۔ ورنہ تب سے اب تک سیاہ دیوؤں کی حکو

ـچا، ہریالا سوُرگ نرک کی آگ میں جلتا ہے۔

ـبھان کے مزار پر فاتحہ پڑھا۔ دیوار میں نقشِ چین۔ عمارت کی طرزِ تعمیر بھی چینی۔ پگوڈا سے عاریت۔ یہاں قرآن
ـی نسخہ دیکھا بہت بڑی تقطیع۔ تقریباً ڈھائی فٹ لمبی۔ ڈیڑھ فٹ چوڑی۔ کہا گیا کہ عالمگیر بادشاہ کے ہاتھ کا
ـاس امر کا کوئی ثبوت نہ تھا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ واقعی قابلِ دید تھا۔

ـے والے نے بتایا تھا کہ اس گلی میں سے ہوتے ہوئے آگے نکل جائیں تو اورنگ زیب بادشاہ کی مسجد ہے،
ـرش شاید کل ہی ... بھی کیچڑ ہے اندازہ۔ لیکن ہم تو سیاحت پر نکلے تھے۔ دیکھتے دیکھتے کیچڑ لتاڑتے آگے بڑھے
ـے۔ نہایت تنگ۔ کیچڑ سے لت پت۔ جگہ جگہ پھل بک رہے تھے۔ سیب، ناسپاتی۔ گوگوشے۔ آلوچے۔ آلو بخارے
ـہم نے باداموں سے رومال بھر والیا۔ دانتوں سے بادام توڑتے، گریاں نکالتے، کھاتے اور رستہ پوچھتے گلیوں
ـہوئے آخر ہم مسجد تک پہنچ گئے۔ اورنگ زیب کی مسجد۔ ذہن میں دلی اور لاہور کی شاہی مسجدوں کا نقشہ
ـں بلند و بالا چینی پگوڈوں نے وسعت پاکر مسجد کا نقشہ مرتب کیا تھا۔ مسجد کے مینار جیسے پگوڈوں کی چوٹیاں،
ـالانوں کی وسعت، اسلامی کارفرمائی کا پتہ دیتی تھی۔ قبلے کے رخ کے دالان میں پہنچے تو سنگِ موسیٰ کی بلند
ـمغلیہ طرزِ تعمیر کی آئینہ دار۔ گول کٹاؤ دار نہیں۔ بیضوی نوکدار۔ قبلہ رخ اور دائیں بائیں کے دالانوں کے بے شمار
ـلے تھے۔ نہایت بلند۔ نیچے سے اوپر تک کہیں جوڑ نام کو نہیں، کسی مغلیہ عمارت میں پُرپچ یا پتھر کے بھی اس
ـنہیں، فلک سا، پہاڑی درختوں کی وادی میں یہی زیب دیتے تھے۔ ہر ستون ایک درخت کا پورا تنہ،
ـم قامت کتنے درخت کام آئے ہوں گے اگر خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا، اور کشمیری مغلیہ تعمیر
ـلفریبی سے کیسے انکار ہو سکتا تھا۔ ہم خوش خوش یہاں گھومتے رہے۔ آخر باہر نکلے کیچڑ پھاندتے، گلیوں
ـتے واپس چلے، پھر سیاہ دیو اور ہمارا شکارہ ہم بیٹھے تو شکارہ حرکت میں آیا۔ رواں رواں، رواں رواں،
ـوم کر ایک پُر فضا میدان کے کنارے کنارے چلتے گئے جس طرف کہ ڈل میں داخل ہونے کا دروازہ ہے۔
ـے کو رکوایا۔ اتر کر میدان میں گھومتے پھرے، دریا کے کنارے، بند کے اوپر، درختوں کی گھنی چھاؤں میں،
ـریا کے کنارے کنارے کیا دیکھتے ہیں۔ یہاں، وہاں، اس شاخ پر، اس شاخ پر، ایک پرندہ، چڑیا کے برابر
ـور فیروزی، یہ اڑا، وہ پانی میں ڈبکی لگائی۔ چونچ میں ذرا سی مچھلی کسی شاخ پر بیٹھا کھا رہا ہے۔
ـنگ فشر، کنگ فشر، کلثوم، کنگ فشر!"

ـ کئی دفعہ دیکھا تھا۔ مچھلی چونچ میں دبائے بیٹھا ہوا۔ مگر یہ کبھی خیال نہ گذرا تھا کہ یہ مچھلی ذرا سی ہے۔ انچ ڈیڑھ
ـں شکاری نصف بالشت کے، بے شک علم وہ جو بلا واسطہ اور تجربے سے حاصل ہو، وہی معقولات ہو رہے
ـڈبکی مار مچھلی پکڑی، ایک کنگ فشر اوپر کو اٹھا تو ہمارے شکارے پر آ بیٹھا، پھر سے اڑا، اب سامنے بیٹھا
ـا رہا تھا۔ اچھا میاں شکاری ماہی گیر، تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ اب رخصت چاہتے ہیں۔ ہمیں بھی
ـہے۔ کیوں کلثوم؟ ۔

دوسرے دن شکارہ ہم اور ڈل کا نظارہ۔ کلثوم کی جھولی میں وہی کچے بادام۔ اگرچہ اس کے پاس سیب آڑو اور آلوبخارے بھی تھے کشتی میں ہم بادام کھاتے چلے۔ شاہی چشمہ کہتے ہیں اکبر بادشاہ کو اس چشمے کا پانی بہت پسند تھا۔ اس کے پینے کے لئے پانی یہیں سے جایا کرتا تھا۔ اسی لئے تو اسے شاہی چشمہ کہنے لگے۔ خدا جانے اکبر کو اس چشمے کا پانی پینا نصیب بھی ہوتا تھا یا نہیں لیکن ہم تو جتنے اوک بھر بھر کے پی رہے سکتے۔ وہ سامنے بلندی پر پہاڑ کے پہلو میں "پری محل" درختوں کی اوٹ میں محل کے کھنڈرات "پری محل" — جانِ عالم اور انجمن آرا کے عشق و محبت کی شرارت کھڑی کرنے والی، اندر کے اکھاڑے کی یہ کہ مغلیہ حرم کی حوریں — وہ دالانوں کے دروازوں پر منقش قناتیں۔ فرش پر قالین۔ طاقچوں پر ریشم کے پردے۔ وہ پیرا تھرکا۔ وہ انگلیاں۔ وہ نور جھانکا۔ نورجہاں کہ عالم پناہ ابھی تشریف نہیں لائے "ارجمند بانو کہ خرم کو گئے بہت دیر ہو گئی" چھپکی۔ درختوں کی اوٹ میں محل کے کھنڈرات میں نے کلثوم کا ہاتھ پکڑا اور دوڑے۔ شکارے والا آوازیں دے رہا تھا کہ پر آ شکارے میں کود پڑے۔ سب سے اچھا سیب میں نے کلثوم سے چھینا۔ میں کھاتا رہا۔ وہ تلملا رہی تھی۔

"نشاط"۔ نشاط کیسی وسیع سرسبز متعدد تختے۔ درمیان میں نہر۔ نہر میں فوارے۔ پہاڑ کے دامن میں واقع۔ بلندی سے گرگر چشمے نہر میں بہتے تو فوارے اچھلتے۔ سبزہ اور پھول اور پھل۔ سیبوں کی رنگینی اور چناروں کی بہار۔ اشجار۔ اور اشجار کے بیچ بہتی ہوئی انہار۔ اور لبِ انہار کبھی بادۂ ناب اور سیاہ آنکھوں والی حورا میر امن سے نقش بند تیسرے توہمات کا۔

بادۂ ناب نہ سہی کلثوم کے پاس اور بہت سی کھانے پینے کی چیزیں تھیں، ہاں آنکھیں اسکی سیاہ نہیں۔ خدا معلوم سیب میں لنوار کس نے ملا دی کہ ستم ڈھا دیا۔ چناروں کے نیچے ہم بیٹھ گئے۔ جی بھر کے کھایا۔ جی بھر کے پیا۔ لیٹ گئے۔ آنکھیں بند سوتے نہ جاگتے۔ ہوا کے جھونکے خالص سکون۔ پھر اٹھ کر سارے باغ کے چپے چپے پر گھومے لپکے ہوئے لٹکتے ہوئے سیبوں کو دیکھ دیکھ کر منہ میں پانی بھر رہا تھا۔ قیمت دے کر دو چار توڑنے چاہے تو توڑنے نہ دیئے۔ جو توڑ کر کھانے میں مزا ہے وہ ہوئے کھانے میں نہیں۔ خاص کر چوری سے توڑ کر۔ میں نے ہزار منع کیا کلثوم نے ایک نہ مانی۔ شجرِ ممنوعہ۔ ایک چھوڑ دو سیب توڑ لئے۔ ایک میری طرف پھینکا میں بھی گناہ میں شریک۔ واہ ری حوا۔ وائے رے آدم۔ اور آخر اسی گناہ نے ریاضِ جنت سے نکلوایا۔ سیب کھاتی، تیز تیز قدم اٹھاتی، کلثوم دروازے کی طرف بڑھی اگرچہ آئندہ کے لئے مجھ سے یہ وعدے وعید ہو رہے تھے کہ ہر تیسرے چوتھے یہاں ضرور آیا کریں گے۔

ڈل کے بیچوں بیچ چند چنار کھڑے تھے۔ ایک ذرا سے جزیرے پر۔ شکارے والے نے کہا، وہ ہے "چار چناری" میں نے کہا "اس طرف چلو۔ کنارے سے ہٹ کر شکارا ڈل کی وسعتوں میں جا رہا تھا۔ پیچھے پانی میں ایک لمبی لکیر چلی آ رہی کلثوم نے ہاتھ پانی میں ڈبو رکھا تھا۔ جزیرے پر پہنچے چند چنار درمیان میں اینٹ پتھروں کی بشکل ایک ڈیڑھ گز اونچی سی ماندر کھوہ۔ ہم ایک جگہ بیٹھ گئے۔ چاروں طرف پانی ہی پانی۔ سنسان۔ ہو کا عالم۔ آدم نہ آدم زاد۔ میں نے کہا۔ چل اے کلثوم، یہاں سے بھاگیں، اس کھوہ سے کہیں شش انگشتے دیو کی صدا آ گئی۔ "یا اخی!" تو پھر ہم پھنسے اور یہیں مر رہے۔ یہیں بچانے کوئی حاتم طائی نہیں آنے کا۔

"شالامار" سرخ پتھر کی عمارت نورجہاں کا باغ کبھی نشاط سے بڑھ کر اس پر حسن ہوگا۔ مگر آج سونا پڑا تھا۔

ـنبو، چنار، سرو، ماتم کناں۔ عمارت کھنڈر نہ تھی۔ پر کھنڈر کی صورت۔ سرخ پتھر ہوا اور دھوپ اور وقت کے ہاتھوں
ق۔ ویران جیسے نور جہاں کا مزار۔ چنار کے ایک درخت کے نیچے ہم بیٹھے۔ سامنے اجڑی ہوئی بارہ دری۔ جی نہ لگا
پلے دلی سے پھرنے لگے۔ وہی پھول لانے والے اور بخشش مانگنے والے، آموجود ہوئے۔ بھوک اور انگریز کی روش
دیا تھا قوم کی قوم کو بھک منگا بنا دیا تھا۔ باغ میں جگہ جگہ آلو بخارے کے درخت تھے۔ اور پھل اتر رہا تھا۔ ایک بارہ دری
ی بیٹھا تھا۔ سامنے ٹوکری۔ ٹوکری پر پیلے سبز ملگجے سے معمولی سائز کے آلو بخارے رکھے تھے۔ کہنے لگا "صاحب آپ
بخارے کبھی نہ کھائے ہوں گے۔ یہ بازار میں نہیں بکتے۔ یہاں چند درخت ہیں۔ صرف یہیں ملتے ہیں۔" اس کے اصرار پر
تھوڑے سے خرید لیے۔ منہ میں ڈالا تو اچھل پڑی۔ واقعی بہت لذیذ۔ گٹھلی گودے سے علیحدہ۔ اور بہت میٹھے۔ اور بہت
ہیں نے بھی ایک لیکر منہ میں ڈالا۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ کچھ اور لئے۔ وہ بھی کھا گئے۔ اور لئے۔ وہ بھی ختم۔
ے۔ مٹھاس اور خوشبو اور لذت۔ واہ ری نور جہاں۔ تیرا جواب نہ تھا۔ اور نہ تیرے باغ کے آلو بخاروں کا جواب۔
کے کنارے ایک گاؤں "حضرت بل"۔ ہیں ان سے گلیوں سے گذرے کچے مکان۔ مکینوں کی صورت مسکین کچے رستے،
، تو مٹی میں دھنسیں۔ بچوں کی فوج ساتھ۔ پاؤں سے ننگے۔ تن پر چیتھڑے۔ مفلسی کی زندہ تصویریں۔ حضرت بل میں ایک حضرت
۔ ہم مزار پر گئے۔ آرزوئیں سینوں میں متلاطم آرزوؤں کی تکمیل کے اسباب پر بس نہیں۔ حضرت جی کی مدد کے سہارے
بیٹھے تھے۔ یہ جھوٹے سہارے امیدوں کی لیلا۔ وہابی چاہتے ہیں غریبوں سے یہ آب حیات بھی چھین لے۔ پاگل ہے۔
شا کھیلنے والے جمہوریت کے پشت پناہ وائی کرنل لیڈر تالیف لینڈ لارڈ لیڈر۔ دولت میں کھیلنے والے لاسنسیے
وا اور بلیک تاجر و مولوی کو کھلا پلا کر غریب کے سینے میں ایمان چپکائے رہے۔ ہم مفلس، خدا کی رضا۔ ورنہ مفلس
کی رضا کا فتنہ جاگ اٹھا تو منصب ہو جائے گا۔ تہذیب و تمدن فنا ہو جائیں گے۔ مارکس و لینن کے سے انسانیت
پیدا ہو جائیں گے۔ دوستو وسکی، ترگنیف، چیخوف، گورکی جیسے ادب و فنکاری کے غارتگر جنم لیں گے۔ اور بیلے جیسی
زیں وجود میں آجائیں گی۔ لیتا کہ جا رہا ہے تابوت دل ہمارا۔ دل می رود زدستم صاحبدلاں خدا را!
ارا چلا ڈل کے کنارے کنارے۔ اب کھیتوں کے درمیان چلا جا رہا تھا۔ یہ کھیت پانی کی سطح پر تیر رہے تھے گھاس
چھپروں پر سبزیاں کاشت کی گئی تھیں۔ سرسبز شاداب۔ شکارا ان کی بہار سے بھی نکل گیا۔ ڈل کے دروازے پر پہنچا
لئے کر پھاٹک بند تھا۔ پھاٹک کی ایک طرف ڈل ہے، دوسری طرف جہلم۔ لیکن دونوں کی سطح ہموار نہیں۔ پھاٹک بند کر دیا
ی طرف کی سطح اوپر اٹھتی ہے۔ دونوں طرف سطح برابر ہو جاتی ہے تو پھاٹک کھول دیتے ہیں اور شکارے ایک طرف
طرف نکل جاتے ہیں۔ شکارا کھڑا تھا۔ ہم باتوں میں مشغول تھے۔ معاً پھاٹک کھلا۔ پانی کا دھارا۔ دھارے پر شکارا۔
۔ اب ہم جہلم میں تھے۔ شکارا جا رہا تھا۔ ہمارے ہوٹل کی طرف۔ میں کلثوم کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔
ج کی سیر ختم ہوئی۔ شام کو پکچر دیکھیں گے "پہلی نظر"۔
چھا۔
لثوم تمہیں اپنی پہلی نظر یاد ہے؟"

(باقی صفحہ پر)

ضیاء الرشید

بیداری کے خواب

"تو یہی فریدہ یہ رہا میرا پسندیدہ باغ"

اس نے سرکاری پارک کے احاطے میں کار روک لی۔

"اترو"

"اُف کس قدر اندھیری رات ہے"

فریدہ محبت آمیز خوف سے اس کے پہلو سے لگ گئی۔

اُس نے سانسوں کی جھنکار سنی وہ نازلی سے کہہ رہا تھا:۔

"جان ——— محبت اندھیروں میں شبو کی کلیوں کی طرح مہکتی ہے۔ آؤ ——— اس کنج میں چل کر بیٹھیں ——— وہاں جہاں بہت سے جگنو چمک رہے ہیں"

"ہائے کس قدر پیارے لگ رہے ہیں یہ جگنو ——— ہم اپنی شادی پر کوٹھی کے سب درختوں اور پودوں میں جلتے بجھتے بلب لگوائیں گے ——— وہ دور سے بالکل ان جگنوؤں کی طرح معلوم ہوں گے ——— ہے نہ ؟"

"ہاں ——— نازلی ——— ایسے ہی معلوم ہونگے۔ بالکل"

"کہاں ہیں آپ ؟"

"یہیں تمہارے پاس فریدہ"

"آپ اس شہر میں کتنے سال رہے"

"یہی کوئی دس بیس سال"

"اونہونہہ"

"یعنی آخر اس وقت کیا ضرورت تھی اس سوال کی"

"میرا مطلب ہے ۔۔۔۔۔۔"

"۔۔۔ کہیں یہ مطلب تو نہیں تمہارا کہ میں اس باغ میں پہلے کتنی مرتبہ آچکا ہوں؟"

"چلئے ــــ یونہی سہی"

"میں ۔ آج یہاں صرف دوسری مرتبہ آیا ہوں"۔

"بس؟" فریدہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی کوشش کی۔

"بس" مگر ایسا محسوس ہوا جیسے فریدہ اس کے سچ کو جھٹلانے میں کامیاب ہوگئی ہو۔

"چلئے ذرا دیر اس کنج میں چل کر بیٹھیں" فریدہ نے جیسے کسی تلخ احساس کو بھلاتے ہوئے کہا۔

"کونسے کنج میں" وہ قصداً ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

"وہ جہاں بہت سے جگنو چمک رہے ہیں۔ ہائے کسقدر پیارے لگ رہے ہیں۔۔۔۔ یاد ہے ہماری شادی کی رات تم نے کوٹھی کے ایک ایک درخت اور پودے میں جلتے بجھتے بلب لگوائے تھے ــــ وہ بالکل ایسے ہی دکھائی دے رہے تھے ــــ ہے نا!"

"کہاں فریدہ ــــ وہ ایسے کہاں ہو سکتے تھے" وہ بڑبڑایا۔

اسنے بادل کی گرج سنی ــــ اور اسکی نگاہوں کے سامنے بجلی سی کوند گئی۔

"نازلی بیٹھو ــــ میں تمہارے لئے جگنو پکڑ کے لاتا ہوں"

نازلی اس کی جانب والہانہ نظروں سے دیکھ کر آہستہ سے ہنس دی۔

وہ جگنو پکڑتا رہا اور نازلی اسکے سگریٹ لائیٹر کو جلاتی بجھاتی رہی۔

اسنے گھوم کر کہا "دیکھو میں نے ــــ" اور وہ کہتے کہتے رک گیا۔

رومال کا کونہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ جگنو گھاس پر ذرا سی دیر تڑپ کر پھر فضا میں چمکنے بجھنے چمکنے لگے۔ نازلی کے چہرے پر لائیٹر کی لو کا عکس جھلملا رہا تھا۔ نازلی پلکیں جھکائے بیٹھی تھی اور لائیٹر کا شعلہ اسکے لبوں کے اسقدر قریب محسوس ہوتا جیسے وہ ابھی ابھی اس لرزتی کانپتی لو کو چوم لے گی۔

وہ آہستہ آہستہ اس محو خیال جنتفہ کے قریب آیا۔

اور نیند میں ڈوبی ہوئی سرگوشی کی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

نازلی نے پلکیں اٹھا کر اسکی جانب دیکھا ــــ اور لو بجھ گئی۔

اسنے لانٹر کو پھر جلایا تو نازلی کی پلکوں پر آنسو تھے۔

"ارے ؟" اسے اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

اسکی بے تابی دیکھکر نازلی کے لب نیم وا ہوئے اور ان پر تبسم کی کرنیں جھلملانے لگیں۔

"آخر ——— تمہارے ماں باپ تمہاری طرح کیوں نہیں سوچتے ——— یا پھر تم بھی انہیں کی طرح کیوں نہیں سوچنے لگتے" نازلی یہ کہتے کہتے یکبارگی یاس کے دھارے پر بہنے لگی۔

پھر اسکی ہچکیاں سن کر جیسے نسیم دم بخود ہو گئی اور ستاروں کی مسکراہٹیں ڈوب گئیں انہوں نے اپنی سیاہ پلکیں جھکا لیں۔ اور چاندنی نے اپنی زلفیں بکھیر دیں۔ اب افق تا افق اندھیرا تھا۔ اور جیسے جگنوؤں کی چمک بھی معدوم ہو گئی تھی اسنے فرطِ محبت سے نازلی کو اپنی باہنوں میں سمیٹ لیا۔

"نازلی تم دیکھنا ——— میں اپنی کوٹھی کے ایک ایک درخت اور پودے میں چھوٹے چھوٹے جلتے بجھتے بلب لگواؤں گا اور جب آدھی رات کو ہم اپنے کمرے سے نکل کر باغ کی سیر کریں گے تو تم ——— اس رات کو یاد کرکے جانتی ہو کیا کرو گی ؟"

۔ نازلی نے اسکی جانب مسلسل دیکھتے ہوئے چہرے کے لطیف جھکاؤ سے اثبات کا اشارہ کیا۔ پھر اسنے اپنی ہتھیلیاں اسکے رخساروں پر رکھ کر اسکے ہونٹوں کو کسی مقدس کتاب کی طرح آہستہ سے چوم لیا۔

اور پھر بادل کئی بار گرجے ——— بجلی بار بار چمکی۔ آخر بوندا باندی بھی ہونے لگی مگر وہ آنے والے سنہری دنوں کے تصور میں کھوئے رہے۔

نازلی کہنے لگی ۔:

"میں تو چاہتی ہوں ——— ہمارے اوپر تلے تین چار بچے ہوں"

"واہ یہ کیوں" ؟

"اجی ——— میں تو وہ منظر دیکھنے کے لئے زندہ رہنا چاہتی ہوں کہ جب تم دفتر سے شام کو گھر آؤ تو بچے تمہارے جوتوں کے فیتے کھولنے کے لئے آپس میں لڑیں اور پھر میں کہوں ۔:

"اچھا بچو ——— میرا فیصلہ یہ ہے کہ تم میں سے کوئی بھی جوتے نہ اتارے ——— تمہارے پاپا کے جوتے میں اتاروں گی"

وہ آہستہ سے ہنس دیا اور پیار سے نازلی کا گال تھپک دیا۔

ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔

وہ گھاس پر لیٹ گیا۔ اسکے اوپر ٹھنڈی ٹھنڈی کیف آور پھوار پڑ رہی تھی اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ کسی جلتے ہوئے صحرا میں بے ہوش پڑا تھا کہ بارش آ گئی۔

نازلی نے جھک کر اسکے دم بدم بھیگتے ہوئے سینے پر ٹھوڑی رکھتے ہوئے کہا ۔:

"مگر زندگی یونہی نہیں گزارنا چاہتی ۔ ۔ تو پھر ۔۔۔۔ تو پھر یہ اسی پل گزر جائے"
اور نازلی کی مضطرب انگلیاں اسکے تپتے ہوئے رخساروں پر پھرتی ہوئی اسکے بھیگے بھیگے بالوں میں پہنچ گئیں۔
اور جب بارش تھمی تو انہیں احساس ہوا کہ وہ بالکل بھیگ گئے ہیں۔ وہ نازلی کا ہاتھ پکڑ کے کار کی طرف لپکا۔

"آپ یہاں بیٹھ کر سگریٹ پیجئے ۔۔ میں جگنو پکڑوں گی"
"فریدہ ۔۔۔ پکڑے ہوئے جگنو نہیں جگمگاتے ۔۔۔ مر جاتے ہیں"
"واہ ہم تو بچپن میں انہیں پکڑ کر شیشیوں میں بند کر لیا کرتے تھے۔"
وہ بہت دیر تک سگریٹ لائٹر جلاتا اور بجھاتا رہا ۔۔۔ جلاتا رہا پھر اسنے سگریٹ نکال کر لبوں سے لگایا۔ وہ آہستہ آہستہ جلتا ہوا لائٹر سگریٹ کے قریب لے گیا قریب اور قریب ہوتے ہوئے ۔۔ آہستہ آہستہ۔
دفعتاً اسکا ہاتھ رک گیا۔ اسکی نظریں شعلے پر مرکوز تھیں۔ شعلہ سانپ کے پھن کی طرح لہرا رہا تھا ۔۔۔ جیسے ابھی سگریٹ کو ڈس لے گا۔
فریدہ گھوم کر بولی "دیکھئے ۔۔۔ میں نے ۔۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔
دونوں کا جگنو فریدہ کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ جگنو کچھ دیر گھاس پر تڑپ کر پھر فضا میں چمکنے لگے۔ بجھنے لگے چمکنے لگے۔ وہ اسکے قریب آئی۔
"کیا بات ہے؟ اسطرح کیوں بیٹھے ہیں آپ؟" فریدہ کے لہجے میں وفا شعار بیویوں کی سی بے چینی تھی۔
فریدہ نے پھونک مار کر لائٹر بجھا دیا۔ پھر لپ اسٹک، فاؤنڈیشن کریم اور پاؤڈر کی مخلوط مہک اسکے نتھنوں میں بس گئی۔
اسکے کانوں میں بادل گرجے ۔۔ اسکی نگاہوں کے سامنے بجلی کوندی۔ اور اسکے ذہن میں جلترنگ ۔۔
فریدہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "عجیب موسم ہے آپکے اس چہیتے شہر کا ۔۔۔ ابھی تارے تھے ابھی بادل آگئے ۔۔۔ ہائے چاروں طرف کیسا گھپ اندھیرا چھا گیا ہے مجھے تو ڈر لگ رہا ہے ۔۔۔ گھر چلیں"
"ڈرنے کی کیا بات ہے ۔۔۔ میں جو ہوں ۔۔۔" اور وہ گھاس پر لیٹ گیا۔
"کیا میں نہیں ہوں ۔۔۔" وہ جیسے نیند میں بڑبڑایا۔ فریدہ اسکی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے ہنس دی جیسے خیالوں میں کھو گئی۔
ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی تھی۔
"اللہ جانتا ۔۔۔ میں بالکل بھیگ گئی ہوں اور آپ بھی بھیگ رہے ہیں"

وہ گھاس پر بیٹھے بیٹھے ہنسنے لگا۔ "بھئی مجھے تو بارش میں بھیگ کر بڑا لطف آ رہا ہے۔ جی چاہتا ہے — یونہی پڑا رہوں۔"

"توبہ — آپ تو عجیب آدمی ہیں — خدا کے لئے اٹھئے موسم خراب ہے کچھ ہو جائے گا — مجھے تو پہلے ہی زکام ہو رہا۔"

فریدہ ایک ہاتھ سر پر رکھ کر دوسرے سے ساڑھی سنبھالے کار کی طرف بھاگتی ہوئی بولی۔

"فریدہ تم کہاں بھاگی جا رہی ہو — دیکھو — پتہ پتہ دھل کر نئی کار کے روغن کیطرح چمکنے لگا ہے! ہوئے ہیں۔ مٹی کی خوشبو جیسے بارش میں نہا کر اور مہک اٹھی ہے۔ جگنو تک بارش کا لطف اٹھا رہے ہیں — مگر — تم تو جگنو پکڑ کر شیشیوں میں بند کر لیتی تھیں۔ تتلیوں اور پھولوں کو کتابوں میں رکھ کر بھلا دیا کرتی تھیں — تم کوئی "!! سینٹ پر مرتی ہو — تمہیں کیا — تمہیں ان باتوں سے کیا —!!"

کار کے مسلسل ہارن کی آواز بارش میں بھیگ رہی تھی اور وہ اسی طرح اطمینان سے گھاس پر پیٹ کے بل لیٹا مہندی کی باڑ کے قریب نازلی کو دیکھ رہا تھا — نازلی — جسے حسبِ معمول اسکی موجودگی کا احساس تک نہ تھا — نظروں کے سامنے آنے کے باوجود کبھی اس پر ایک نظر بھی نہ ڈالی تھی — نازلی نے تو جیسے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ تنہا ہے۔ یا اسکے سوا اس بھری دنیا میں کوئی ذی روح نہیں۔ کوئی نہیں — اور اس تنہائی کے احساس نے جیسے اسکے ہونٹ اس کی نگاہوں میں کھوئی ہوئی ہرنی کی سی بے خودی لپس گئی تھی۔

اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کہیں کچھ رکھ کر بھول گئی ہو — اور "کہیں" کے ساتھ ساتھ کچھ سے مفقود ہو چکا ہو!

اور ہمیشہ کیطرح اسے ابھی تک — یقین تھا کہ نازلی کبھی نہ کبھی دفعتاً — پلکیں اٹھا کر اسکی طرف اور پھر — جیسے نازلی کو سب کچھ یاد آ جائے گا اور وہ والہانہ بھاگتی ہوئی آ کر اسکی باہوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد کار کے ہارن کی آواز بارش میں بھیگنے لگتی اور اسکے ذہن میں جلترنگ کا تیز ہو چکا تھا!!! —:—

بقیہ: اور ستلج بہتا رہا

"نہیں —"

"مجھے یاد ہے — — — کی شادی تھی — تم — — — —"

کلثوم نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا — مسکرا کر —

مبارکؔ عظیم آبادی

عشق کی چوسر کس نے کھیلی یہ تو کھیل ہمارے ہیں
دل کی بازی مات ہوئی تو جان کی بازی ہارے ہیں

صدقے تیری محبت کے کیا داغ محبت ہاتھ آئے
باغ میں ایسے گل بوٹے نہ فلک پر ایسے ستارے ہیں

اس کی چپک پر چین تصدق اس کی کسک پر دل صدقے
درد محبت کی تکلیفیں راحت کے گہوارے ہیں

چھلنی چھلنی دل بھی جگر بھی روزن روزن سینہ بھی
ایک نگاہ ناز نے تیری تیر ہزاروں مارے ہیں

پھونک رہا ہے سوز نہانی کون اس آگ پہ ڈالے پانی
دل کی لگی نے آگ لگا دی داغ نہیں انگارے ہیں

اس کو مارا اس کو مارا یہ بسمل وہ لوٹ گیا
نوک پلک قاتلوں سے ڈریئے قاتل ان کے اشارے ہیں

لالہ رخوں میں عمر گذاری اور بہاریں بھی لوٹیں
آج بھی گل سے گالوں والے مجھ کو مبارکؔ پیارے ہیں

صبا اکبرآبادی

قدغن جنوں پہ عقل کے وہ چند ہو گئے
اچھی رہائی پائی کہ پابند ہو گئے

اربابِ عشق جب سے غرضمند ہو گئے
دل کے جو کاروبار تھے سب بند ہو گئے

اے دل یہ پھول انہیں کے ستارے نہ ہوں کہیں
جو آسماں زمین کے پیوند ہو گئے

پہونچی دعائے شوق مگر اتنی دیر میں
جب منزلِ قبول کے در بند ہو گئے

پہلے تو اپنی سعی میں کوئی کمی نہ کی
آخر تری رضا پہ رضامند ہو گئے

کچھ بھی کہا نہ جا سکا لیکے تمہارا نام
دم بھر کو لب کھلے تھے کہ پھر بند ہو گئے

ہم غمزدوں کے غم کا بھی کوئی بھرم نہیں
ہنس کے جو تم نے بات کی خورسند ہو گئے

اب اُس نظر سے بچ کے کہاں جاسکینگے ہم
اظہارِ شوق کر کے نظر بند ہو گئے

ٹکڑے ہوئے تھے دامنِ ہستی کے جسقدر
دلقِ گدائے عشق کے پیوند ہو گئے

رکھ لی ہے بندگانِ محبت کی آبرو
اچھا کیا کہ آپ خداوند ہو گئے

شاید صبا کا نام بھی وہ بھول جائینگے !
پیغام اور سلام تو سب بند ہو گئے

نادر رقی میاں آبق امیر دہلوی

ئیراں ہوں کہ سنبل و ریحاں کو کیا کہوں — گیسو کہوں تو حالِ پریشاں کو کیا کہوں

ئینہ ٹوٹ جاتا ہے ان کی نگاہ سے — کوئی بتائے دیدۂ حیراں کو کیا کہوں

لوؤں کے خون سے جو اُگا دے چمن کے پھول — اُس دردمند خارِ بیاباں کو کیا کہوں

نادابیاں شباب کی مستی کی لغزشیں — سب تجھ سے آملیں تیرے درباں کو کیا کہوں

ں تو فروغِ رخ کے تصور میں جل مرا — روشن نہ ہو تو شامِ غریباں کو کیا کہوں

ت و منات کعبے میں سینا پہ برقِ طور — اِن مہوشانِ حسن فروشاں کو کیا کہوں

ے اُڑی ہے روشنی داغہائے دل — اے چرخ تیری بزمِ چراغاں کو کیا کہوں

ا کے لبوں سے کرہی دی پیدا صدائے کن — یں ایسے اضطرابِ رگِ جاں کو کیا کہوں

اک مہرِ نیم روز ہے، اک ماہِ نیم ماہ

صادقؔ جبین و عارضِ جاناں کو کیا کہوں

ارشد کاکوی

دو تین دنوں سے پھر وہ اِدھر خوابوں میں ہمارے آتے ہیں
پھر راہ گذارِ دل پر کچھ قدموں کے نشاں ہم پاتے ہیں
کچھ رات گئے، کچھ رات رہے، اب پھر ہم اشک بہاتے ہیں
پھر بزم میں ان تاروں کی، ہم مہتاب کو اپنے لاتے ہیں
پھر دنیا سے اس درجہ ہم بیزار ہوئے کہ غیر تو کیا
جب خود سے گریزاں ہیں اور اپنے سائے سے گھبراتے ہیں
اے میری مسرت کے مدفن! اے میرے غموں کے تاج محل
اب تیری زیارت کو اے دل! احساس کے مارے آتے ہیں
مانوس ہوئے غم سے اتنا کہ نیند میں بھی اب اے ارشد
آپ کو ہنستے دیکھ لیا تو دیکھتے ہی ڈر جاتے ہیں

نظیر محسن ایم۔ اے

جب غمِ زیست کے عنوان بدل جاتے ہیں
دل میں کچھ شعلۂ بے نام سے جل جاتے ہیں

چارہ گر فکر ہے کیا چارہ گری کی تجھ کو
تیرے بیمار تو وعدوں میں بہل جاتے ہیں

دیکھ کر تیری نگاہوں کا یہ اندازِ کرم
کتنے شکوے مرے ہونٹوں پہ مچل جاتے ہیں

جب کبھی ان کی وفاؤں کا خیال آتا ہے
کچھ امیدوں کے دیئے آج بھی جل جاتے ہیں

اب کہاں عشقِ جنوں خیز کی ہنگامہ گری
وقت کے ساتھ یہ طوفان بھی ٹل جاتے ہیں

دھڑکنیں کتنی بسی ہیں مرے افسانوں میں
کتنے آنسو مرے اشعار میں ڈھل جاتے ہیں

اخترِ صبح کے پہلو سے وہ آنچ آتی ہے
چاندنی رات میں تارے بھی پگھل جاتے ہیں

قمر مرادآبادی

درد خود وجہِ سکوں ہے دلِ سوزاں کیلئے — آپ زحمت نہ کریں پرسشِ پنہاں کے لئے
اور کیا چاہیئے اب ذوقِ پشیماں کیلئے — اشکِ خوں ہیں تو سہی زینتِ داماں کیلئے
نگہِ ناز کو اللہ سلامت رکھے — ایک نشتر کی ضرورت تھی رگِ جاں کیلئے
زندگی دل کی لطافت پہ گراں تھی ہمدم — ورنہ ہم اور بھی جیتے غمِ جاناں کے لئے
شمعِ امید زمانے کو گوارا نہ ہوئی — آندھیاں آئیں چراغِ تہہ داماں کیلئے
دلِ مایوس سنبھلنا تھا نہ آخر سنبھلا — ہم نے ہر چند سہارے ترے داماں کیلئے
جائزہ لینا ہے امواجِ بلا کا ہم کو — ڈوب جائیں گے ہم اندازۂ طوفاں کیلئے
بیخودی بن گئی خود کاشفِ اسرارِ جمال — کوئی پردہ نہ رہا دیدۂ حیراں کے لئے

لذتِ دردِ محبت بھی عجب شے ہے قمر
نعمتیں یوں تو بہت سی ہیں ہر انساں کیلئے

سحرؔ انصاری:۔

چمن میں جلوہ و نکہت کا شاہکار تو ہو
یہ کم نہیں ہے کہ تم خالقِ بہار تو ہو

حوادثِ دلِ ویراں کبھی بیاں نہ کریں
سخن وروں کو مگر دل پہ اختیار تو ہو

سکونِ دل نہ سہی، اختصارِ غم نہ سہی
کسی کی یاد سے تکمیلِ انتظار تو ہو

ہم آشنائے غمِ دل بھی ہو کے کچھ نہ ہوئے
تم اہلِ دل کے لئے حاصلِ قرار تو ہو

بجا، کہ ہستیٔ فانی ہے اعتبارِ خرد
خرد کو ہستیٔ فانی کا اعتبار تو ہو

اب ایک وہ نہ سہی اور مہرباں ہیں بہت
ستمگروں کا کسی دن ذرا شمار تو ہو

وفا شعار ہزاروں سہی، مگر اے دوست!
کوئی ہماری طرح تیرا جاں نثار تو ہو

بس اک فریب پہ ہے اے سحرؔ! مدارِ حیات
جو بزمِ یار نہیں ہے تو کوئے یار تو ہو

سید ضمیر بخاری

غیر کا رنگ ہے جدا طرزِ کلام اور ہے
میرے غزالِ شہر کا لطفِ خرام اور ہے

کیوں ہو اسیرِ دلبراں کیوں ہو مریضِ ہوشیار
دیدۂ خود شناس میں دل کا مقام اور ہے

یوں تو امامِ مسجد و مندر و دیں بہت
عزم و عمل کا درس دے جو، وہ امام اور ہے

شیخِ حرم کو ربط کیا گلشنِ حیات سے
کارگہِ حیات تو بزمِ خواص و عام اور ہے

گر مٹے جورِ کشادِ غم یہ وہ نظام تو نہیں
جس کا زمانہ منتظر ہے وہ نظام اور ہے

صیدِ کمندِ روزگار آج بھی ہے نفس نفس
جیسے زمین تشنۂ خونِ عوام اور ہے

زیست کی تلخیاں ہی کیا کم تھیں بخاری حزیں
گردشِ روزگار کا نیشِ دوام اور ہے

افسر ماہ پوری

کتابوں میں

بنگال میں اردو ——— از وفا راشدی

بنگال سے اردو کا تعلق بہت پرانا اور گہرا ہے ہر دور میں اس سرزمین سے بھی ایسے شعرا اور ادیب اٹھے ہیں جن کے فن پاروں نے اردو کے خزانہ کو مالا مال کیا۔ کلکتہ، مرشد آباد، اور ڈھاکہ ہمیشہ اردو کے اہم مرکز رہے ہیں، اور ان کی اہمیت آئندہ بھی باقی رہے گی۔ بنگال کے چھوٹے چھوٹے شہروں، قصبوں میں بھی ایسے خاندان و افراد کی کمی نہیں جو صدیوں سے اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے اور شعر و ادب کے شہ پارے جا بجا بکھرے پڑے ہیں گمنامی کی تاریکی سے منظر عام پر لانے کی خاطر خواہ کوشش اب تک نہیں کی گئی۔ یہ کام انتہائی مشکل ہے ان کو بھی نہ تو ماضی کے اندھیرے میں اردو فن کاروں فن پاروں کی تلاش میں کافی دولت، محنت اور یکسوئی کی ضرورت ہے لیکن قیام پاکستان نے اس مشکل کو بھی آسان اور دلچسپ بنا دیا ہے، چنانچہ کے بعض ادیب سرگرمی اور تندہی سے اس کام میں مصروف ہیں۔ بنگال میں اردو اس سلسلہ کی ایک قابل لحاظ کڑی ہے۔

بنگال میں اردو، جناب وفا راشدی کی محنتوں کا نتیجہ ہے اور مکتبہ اشاعت اردو حیدرآباد (سندھ) سے حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب تین سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور ... کے مشرقی و مغربی دونوں حصوں پر حاوی ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں مشرقی و مغربی بنگال میں اردو کی ... سے دور حاضر تک کی تاریخ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ تاریخ اردو بارہ عنوانوں کے ماتحت کی گئی ہے (۱) بنگال میں اردو کی ابتدا اور اس کی ترقی (۲) فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور اس عہد کے دیگر مصنفین ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۰ء تک (۳) بنگال میں اردو شاعری کا عروج ۱۸۲۵ء سے ۱۸۵۷ء تک (۴) شمس الرحمٰن خالد کا زمانہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۰ء تک (۵) آزاد، وحشت، ناطق، اور ... کا زمانہ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۵۷ء تک (۶) بنگال میں واجد علی شاہ کا زمانہ اور ان کے ہم عصر شعراء (۷) بنگال میں آرزو لکھنوی اور ان کے تلامذہ (۸) ... کے ہندو ادیب (۹) بنگال میں اہل قلم خواتین (۱۰) بنگال میں اردو صحافت (۱۱) ادبی انجمنیں اور (۱۲) بنگال میں اردو تصانیف و مطبوعات ... بست۔

پہلے باب میں مصنف نے بنگال میں اردو کی ابتدا، اس کی تدریجی نشو و نما اور مقبولیت و وسعت سے بحث کی ہے پھر سہولت کے خیال سے مصنفین کے چار دور قائم کئے ہیں، پہلے دور میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور اس عہد کے بیس مصنفوں کے حالات زندگی اور ان کی ادبی ... کا ذکر ہے، دوسرا دور بنگال میں اردو شاعری کے عروج سے ... ہے اس دور میں ستترہ شعراء و ادبا کے تذکرے ہیں تیسرا دور شمس الرحمٰن کا زمانہ ہے یہ دور ... شاعر و ادیب کے حالات زندگی اور ان کی ادبی ... پر پھیلا ہوا ہے، چوتھا دور ابوالکلام آزاد، رضا علی وحشت لکھنوی اور آرزو لکھنوی کے سوانح حیات اور ان کے شعری و ادبی کارناموں پر ... ہے یہ دور مزید چار گروپوں میں تقسیم کر دیا ہے، پہلے گروپ ... دوسرے گروپ میں ۲۹، تیسرے گروپ میں ۲۶ اور چوتھے گروپ میں ... شاعر و ادیب کے حالات زندگی اور ان کے فن پاروں کا ذکر ہے اس کے بعد باقی عنوانات اور آتے ہیں (۱) بنگال میں واجد علی شاہ کا زمانہ اور ان کے ہم عصر شعراء۔ اس عنوان کے تحت سات شاعروں کے

تذکرے قلم بند کئے گئے ہیں (۲) بنگال میں آرزو لکھنوی اور ان کے گیارہ تلامذہ کے حالات زندگی اور ان کے کلام کے نمونے پیش کئے گئے ہ
کے ہندو ادیب اس عنوان کے ماتحت پرانے اور نئے ۲۲ ہندو ادیب و شاعر متعارف کرائے گئے ہیں اور ان کے شعری و ادبی کارنامو
کیا ہے (۴) بنگال کی اہل قلم خواتین اس حصہ میں ۱۹ اہل قلم خواتین کے سوانح اور ان کے فن پارے درج ہیں (۵) بنگال میں اردو
کافی محنت سے مدون کی گئی ہے (۶) ادبی انجمنیں، بہ عنوان بنگال کی اردو ادبی انجمنوں کے قیام ان کے بانیوں اور عہدیداروں کے نا
گذاریوں سے متعلق ہے (۷) بنگال میں تصانیف و مطبوعات کی فہرست تقریباً ڈھائی سو قدیم و جدید مطبوعات پر مشتمل ہے اس فہر
میں مصنف نے دیدہ ریزی سے کام لیا ہے۔

"بنگال میں اردو" میں جن کے باب قائم کئے گئے ہیں ان سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ شعر و ادب کا کوئی ایسا پہلو نہ
نے روشنی نہ ڈالی ہو۔ اس لحاظ سے "بنگال میں اردو" ایک اہم تصنیفی کوشش ہے اس سے پہلے شاید کوئی کتاب اس موضوع
ہوئی ہے، جس میں بنگال کے دونوں حصوں کے شعری و ادبی کارناموں کو اتنی وسعت کے ساتھ مدون کرنے کی کوشش کی گئی ہ
کتاب کے مواد کا تعلق ہے یہ بات پہلے کہی جا چکی ہے کہ ماضی کی تاریکیوں میں بنگال کے شعراء و ادبا اور ان کی شعری و ادبی تخلیا
رکھا نا آسان کام نہیں، وفا راشدی صاحب نے اس کتاب کی تدوین و ترتیب پر مسلسل بارہ سال محنت کی ہے اور اسے ہر ا
جامع بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے، یہ کہنے میں تامل نہیں کہ "بنگال میں اردو" وقت کی ایک اہم ضرورت کو قابل
پورا کرتی ہے، پاکستان کے مغربی و مشرقی حصوں میں تمدنی و تہذیبی رشتوں کی استواری میں یہ کتاب نہایت مفید ثابت
سے ان لوگوں کو بھی کافی روشنی ملے گی جو مشرقی و مغربی بنگال کے تمام پرانے اور نئے ادبی شہپاروں کو ایک دھاگے میں
وفا راشدی صاحب اپنی اس پیشکش پر قابل مبارکباد ہیں اور ان کی کتاب توجہ و دلچسپی سے پڑھے جانے کی مستحق ہے۔ (رشکم

رسالوں میں

صحیفہ لاہور: سید عابد علی عابد اور سید قاسم محمود کا مرتب کردہ سہ ماہی رسالہ ادبی معلومات کا اچھا مجموعہ ہے "اردو غزل کے علائم و رموز" کے عنوان سے سید عابد علی عابد کے مفید مضامین کی قسطیں اس سے پہلے ماہنامہ تخلیق اور مہرِ نیمروز میں چھپ چکی ہیں۔ صحیفہ میں نئے سلسلے کی یہ دوسری قسط ہے۔ جس میں ایجاز و اطناب حشو قبیح اور حشو ملیح رمز و ایما اور صنائع کی دلنشیں بحث اور اس کی مثالیں درج ہیں، اس مضمون کی سرخی میں لفظ "علائم" قابل غور ہے۔ یہ علامت کی جمع کے طور پر استعمال ہوا ہے، اس سے پہلے تخلیق اور مہرِ نیمروز میں بھی اسی طرح یہ سرخی چھپی تھی، لیکن علامت کی جمع علائم نہیں، علامات اور عَلام (بغیر ہمزہ) ہے، علائم جمع عالَم کی ہے۔ اگر سید صاحب نے رموز کا لفظ ساتھ ہی درج نہ کیا ہوتا تو اردو غزل کے علائم، کا مفہوم "اردو غزل کی دنیا اور کائنات" موزوں طور پر سمجھا جا سکتا تھا۔ سید صاحب کے مضامین کا یہ سلسلہ اردو زبان اور اس کے علم بیان و معانی کی نزاکت و لطافت کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری اور مفید ہے۔ خادم محی الدین کا مضمون "ڈراما اسٹیج پر" ایک فنی بحث ہے، جس میں ڈرامے کی تعلیمی اہمیت، تمثیلی اظہار اور تمثیل کے انتخاب کو سمجھایا گیا ہے۔ اور مدارس کے لئے مجوزہ ڈرامے اور کتابوں کی ایک فہرست بطور نمونہ پیش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی، کا مضمون "خضر کیوں کر بتائے کیا بتائے" لفظ "رباعی [illegible] دوبیتی" کی بحث پر مشتمل ہے "اور فرمان فتحپوری کے مضمون" ترانہ دوبیتی اور رباعی" کے جواب میں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے [illegible] ہے کہ تینوں ایک ہیں، اور باباطاہر اور علامہ اقبال کی بعض رباعیاں رباعی کی مخصوص اوزان میں نہیں ہیں، پھر بھی ان کو "رباعیاں" کہا گیا ہے، ڈاکٹر صاحب کا یہ مضمون تحقیقی اور معلومات افزا ہے۔ یوسف جمال انصاری کا مضمون جمالیات اور فنون لطیفہ بھی اس شمارے میں شامل ہے، ــــ یوسف جمال کے نام کو جمالیات سے یوں بھی گہرا ربط ہے۔ اس لئے اردو زبان میں اس عنوان پر بحث کرنے میں ان کو پہل کرنی چاہئے تھی، اس مضمون میں انہوں نے فنون لطیفہ کا مقصد، اس کی قسمیں، اس کی قدامت مختلف مذاہب و اقوام میں اس کی حیثیت و قبول حسن اور تخلیق حسن کا مفہوم، آرٹ کی بنیاد، فنون لطیفہ کی خصوصیات پر دلنشیں بحث کی ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ اردو زبان میں جمالیات پر سیر حاصل بحث نہیں ملتی تنقید شعر و ادب اور تنقید نقاشی و تعمیر میں فنکاروں کے تصور حسن کے متعلق صرف اشارات ہی ملتے ہیں، قیوم نظر کا مضمون "واجد علی شاہ اندرسبھا" ایک تحقیقی مقالہ ہے، انہوں نے بتایا ہے کہ واجد علی شاہی رہس اور یورپین بیلے (BALLET) کی فضا اگرچہ مختلف ہے لیکن بنیاد اور مقصد ایک ہے اسی لئے فیلن نے اپنی مشہور انگلش ہندوستانی ڈکشنری میں بیلے کا اردو مترادف رہس

مدرج کیا ہے اور وضاحت کے لئے مفہوم "پریوں کا ناچ" بتایا ہے۔ منظر حسن ملک کا مضمون "اصلاحی مرثیے کی قدر
فنی مرثیہ کی مدلل بحث ہے اور محبوب صدیقی کا مضمون "متعصبانہ تنقید کی افادیت" اپنے مفہوم کا آپ ترجمان ہے
نے متعصب انداز کی تنقید کی کئی قسمیں بتائی ہیں اور کہا ہے کہ اس کی خرابیاں تو سب پر ظاہر ہیں لیکن متعصب تذکر
کے افادی پہلو پر کسی کی نظر نہیں جاتی۔ اور یہ کہہ کر انہوں نے گلستان بے خزاں معروف بہ نغمۂ عندلیب تالیف حکیم
باطن پر تبصرہ کیا ہے۔ یہ تذکرہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے تذکرہ گلشن بے خار کے جواب میں لکھا ہے۔ اور شیفتہ
پر کڑی "تنقید" کی ہے۔ محبوب صدیقی صاحب لکھتے ہیں کہ صاحب گلستان بے خار نے تعصب کی بنا پر جو تذکرہ مرتب کیا
بڑا فائدہ یہ ہوا کہ بہت سی دلچسپ باتیں جو پردے میں رہ جاتیں اور کبھی منظر عام پر نہ آتیں وہ سامنے آگئیں اور
شیفتہ، حالی اور غالب کے نجی تعلقات و روابط کی کیفیت کو اور ان کی زندگی کے بہت سے اور پہلوؤں کو
لا مضمون نگار نے لکھا ہے کہ حالی کی غزل بتاتی ہے کہ وہ اس جذبے سے آشنا ہیں جس سے توبہ کرتے ہیں، لہٰذا
لگانے کی ضرورت ہے۔ اچھی اچھی نظموں غزلوں اور افسانوں کے علاوہ ڈاکٹر محمد باقر کا مختصر مضمون "کچھ "پہیلے" ایرا
اور فرحت شاہجہاں پوری کا مضمون "حضرت سخن دہلوی" بھی درج ہے۔ سخن نے رجب علی بیگ سرور کی کتاب فسـ
کے جواب میں ایک کتاب تہذیب النفوس بھی لکھی تھی (اس کتاب پر نظرثانی صفیر بلگرامی نے کی تھی صفیر غالب کے
اور خطوط صفیر بنام غالب میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔

سوغات بنگلور ——— سہ ماہی رسالہ ہے محمود ایاز کی ادارت میں تازہ نکلا ہے۔ جنوبی ہند میں ا
بڑے مرکز حیدرآباد دکن اور بنگلور ہیں، بنگلور نے اردو کی بہت خدمت کی ہے۔ اس شمارے میں ادیب کا
پی پرسٹلے (امریکی ادیب جو مر چکا) رہبری طرح (فطری آدمی اور سیاسی آدمی (رالیڈن میوں) محمود ایاز، محمد اسمٰعیل
اور محمود سعید کے قلم سے اردو میں منتقل ہوئے ہیں، ادب پرور اقلیت، حسن عسکری کا ایک مضمونچہ شامل ہے
نے کہا ہے کہ ادب کا احیا اور انسانی زندگی کی تشکیل تو دونوں چیزیں ساتھ ہی [illegible] گی۔ مخلص سے مخلص ا
اپنے خلوص کے سہارے ادب کو زندہ نہیں رکھ سکتی، یہ کام تو پورا معاشرہ ہی کرتا ہے [illegible] مطلب ہے یا
میر ضیاء اللہ نے فراق، ایک مطالعہ پیش کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ فراق ہی کی اصطلاح ہیں (جو انہوں نے ریاض خیر
استعمال کی تھی) فراق ادب کا کرشن کنھیا ہے۔ فراق نے اردو شاعری کو لب و لہجے کی ایک خاص نرمی د
سے نئے الفاظ اور تشبیہات کے علاوہ اردو رباعی کا ایک خاص ڈھنگ پیش کیا ہے۔ انہوں نے رباعی میں
روح پھونکی ہے۔ اس شمارے میں غزلوں نظموں کے علاوہ طبعزاد اور مترجمہ افسانے بھی شامل ہیں۔

فاران کراچی ——— اپریل کے شمارے میں "نبی صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت مدبر اور
مولانا امین احسن اصلاحی کا مختصر مضمون ہے جس میں چند بنیادی نکات کی طرف اشارے کئے گئے ہیں، دوسرا
اور اخلاق حسنہ" ملا واحدی صاحب کا ہے۔ "اسلام میں علم الاخلاق جتنا وسیع اور ہمہ گیر عنوان ہے اتنا ہی
یہ مضمون ہے۔ اسے ایجاز کا نمونہ کہنا چاہئے۔ شاید ہی کوئی اہم پہلو اس سے چھوٹا ہو اس لئے سب سے اہم اور

مارے میں یہ ہی ہے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مضمون "خلیفۂ راشد امیر المومنین سیدنا علی ابن ابی طالب" بھی اس
ے میں درج ہے۔ انہوں نے بحث کی ہے کہ خلافت راشدہ چار مختلف سیاستوں اور رجحانات کی نمائندگی کا نام نہیں ہے
بلکہ مزاج اور طرز زندگی میں نیابت کا رنگ ہے یعنی ایمان بالغیب کی قوت، اطاعت الٰہی کا جذبۂ صادق و کامل غیب
نبوت، احکام پر مصالح و فوائد کو قربان کرنا، دنیا پر آخرت اور غنا پر فقر کو ترجیح دینا، اسباب دنیا سے کم سے کم متمتع
اور دوسروں کو زیادہ سے زیادہ متمتع کرنے کی کوشش کرنا۔ وہ لکھتے ہیں کہ عثمانؓ و علیؓ کا دور نہ ہوتا تو دور فتن میں مسلمانوں
رہنمائی کا کوئی ذخیرہ تاریخ اسلامی میں نہ ملتا۔ صرف خلافت صدیقی اور خلافت فاروقی کا نمونہ ہوتا تو یہ رہنمائی نا تمام ہوتی۔

ساغر لاہور ———— نیا رسالہ ہے پہلا شمارہ سامنے ہے۔ نصرت ریحانہ بخاری اور زیب بلیغ آبادی اس
مرتب ہیں۔ زیب بلیغ آبادی نے "آج کے افسانے" کے عنوان سے ادب و زندگی کے گہرے تعلق کا تذکرہ کر کے افسانہ
ی کے ارتقا پر ایک مختصر تبصرہ کیا ہے۔ غزلوں، نظموں اور افسانوں کے بعد اخیر میں "تاریخ قتل محمد ابن قاسم" (تاریخی) اور "ہما
ہمیت" (بہ سلسلہ علم البدن) اور "ذہنی الجھنیں" (نفسیاتی مضامین) اس شمارے میں شامل ہیں۔ بلکہ "کا سعباری کردار" ترجمانی ہی

خاتون پاکستان کراچی ———— تازہ شمارے میں "حجاب امتیاز علی" کا تعارف پہلا مضمون ہے اس کے
ے ان کے نقطۂ نظر اور تخلیقات پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے۔ "مشرق اور مغرب" ایک مختصر ترین مضمون "پاس بل ارشد" کا ہ
بن شراد خاتون ہیں مشرق و مغرب یا مختلف ممالک اور مختلف مذاہب کے ازدواجی تعلقات پر ذاتی تاثر پیش کیا گیا ہے
ت اور عبد دار (شفیق بریلوی) "مایوسی ایک خطرناک بیماری" (از سعیدہ انجم) اور طبعزاد و مترجم افسانوں کے علاوہ "اردو کی
ترویج میں عورتوں کا حصہ" بیگم سلمیٰ حقی کا مضمون بھی شامل ہے۔ اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ محاورات و ضرب الامثال
و ترویج کرنے میں بہت بڑا دخل عورتوں کا رہا ہے۔ انہوں نے بہت سی نرم و نازک خوبصورت اور بامعنی اصطلاحوں سے زبان
مال کیا ہے۔ شعر و شاعری، تنقید، تبصرہ اور تصنیف و تالیف کی خدمات الگ ہیں۔ "خاتون پاکستان" نے اپنے نام کی مناسبت سے
ور پرنسائی ادب کا نعرہ لگایا ہے جس پر رفیق خاور اور کرار نوری نے تائیدی مضامین لکھے ہیں۔ بیگم سلمیٰ حقی کا مضمون بھی
یقت اسی نعرے کی مدلل تائید ہے اور بہت خوب ہے۔

اس رسالے میں کثرت اولاد کی روک تھام ایک مستقل عنوان ہے جس میں مخالفت و حمایت کے مضامین درج ہوتے
اس مرتبہ شوکت تھانوی کا چٹخارے دار مضمون (ان کی نظم کے ساتھ) شامل ہوا ہے۔

اشارہ پٹنہ ———— یہ ماہنامہ پٹنہ سے نکلتا ہے اور یہ اس کا چھٹا شمارہ ہے۔ عبد القیوم انصاری عزیز
آبادی اور قیوم خضر اراکین ادارہ ہیں۔ پروینہ انجم نے "بہاری لوک گیت" کے عنوان سے، شادی بیاہ میلے تہوار رسم و رواج
رسم کی رنگا رنگ کیفیات و جذبات کی ترجمانی کرنے والے گیتوں پر مشتمل اچھا مضمون پیش کیا ہے۔ ———— "چکبست
ی شاعر" ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مضمون اگرچہ مختصر ہے لیکن عنوان کا پورا حق ادا کرتا ہے۔ چکبست کا حب وطن اور
وطن پرستی ان کے اشعار سے واضح کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نارنگ لکھتے ہیں کہ حالی یا اقبال کے ہاں مذہب قدر اعلیٰ ہے
ت اور عرصے کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے وطن دوستی کو عظیم ترین قدر کی حیثیت سے اختیار کیا وہ کہتے ہیں کہ چکبست

نے وطن کا راگ الاپا اور وطن کے بُت کو بے نقاب کرتے ہوئے اس عشق کی ایسی تعبیر پیش کی کہ اس کے سامنے
کا رنگ بھی پھیکا نظر آنے لگا اور اس بیان سے معلوم ہوا کہ چکبست سے پہلے کسی ہندو اور مسلمان اردو شاعر
بت کو پیش نہیں کیا نہ اسے عظیم ترین قدر کی حیثیت دی، ــــــ اور اقبال کہتے ہیں کہ "دیکھنا مغرب طرح طرح کے
رہا ہے اور ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے" وہ مصر ہے کہ وطن کو بت مان کے پوجنے ــــــ اقبال نے
انکار کیا اور انکا یہ انکار ایک مکتبۂ فکر کی ترجمانی ہے۔ اور مغرب کے تراشیدہ صنموں نے اور سب سے بڑے صنم
(یہ شکل نظریہ) نے جیسا جیسا زہر لویا، اور آج تک ساری دنیا میں برتا چلا جاتا ہے، وہ کچھ پوشیدہ نہیں ــــــ حالی یا ا
نزدیک حب وطن اور وطن پرستی۔ دو الگ چیزیں یہی ہیں جیسے عصبیتِ قومی اور تعصب دو علیحدہ چیزیں ہیں،
ایک پسندیدہ ہے اور دوسری سخت ناپسندیدہ۔ ڈاکٹر مہر نامری نے "قدیم ہندی لٹریچر میں مسلمانوں کا حصہ" پیش

تحریک دہلی ــــــ عابد رضا بیدار نے اپنے مضمون "کچھ مولانا آزاد کی تصانیف کے بارے میں"
کے نام سے کتنی کتابیں روز وجود میں آتی ہیں، جن میں کچھ تو مولانا کے اصلی مضامین و مقالات کی نئی ضرب و تقسیم ہیں اور کچھ جعلی ہیں۔ نثار احمد فاروقی کا مضمون نغمات الاسرار بھی اس شمارے میں شامل ہے۔ "سانت رس" یہ نغمات الاسرار حضرت شاہ محمد کاظم قلندر کے ہندی کلام کا مجموعہ ہے جسے اردو شرح کے ساتھ حافظ شاہ مجتبیٰ نے شائع کیا ہے، شاہ محمد کاظم محمد شاہی دور میں پیدا ہوئے۔ صوفی ہیں اور وحدت الوجودی فلسفہ کے قائل
مصطفیٰ رضوی صاحب کا مفید مضمون "امریکہ میں اسلامیات سے دلچسپی" بھی اس شمارے میں درج ہے۔

مہر نیم روز

جون ۱۹۵۹ء

جلد نمبر ۴ | شمارہ نمبر ۳

ادارہ:-

حسن مثنیٰ ندوی

علی اکبر قاصد

ابوالخیر کشفی

قیمت:-

سالانہ:-	مبلغ چھ روپے
ششماہی:-	مبلغ تین روپے چار آنے
فی رسالہ	آٹھ آنے (۸/)

پتہ:-

(۱) ۲۰۴ بہار ہاؤسنگ سوسائٹی۔ ہاؤسنگ یونین ایریا، کراچی ۵

(۲) دفتر رسالہ مہر نیم روز، کوئی روڈ ــــــــ کراچی ۳

اس شمارے میں

پہلی کرن

اسے کیا لکھئے

"شعراء، نامعلوم اَن بوجھے الہاماتِ غیبی کا مرجع، کاشفِ اسرارِ فطرت، اور مقدس کاہن ہوتے ہیں۔——
وہ آئینۂ قدرت، جس میں مستقبل کے عظیم الشان سائے منعکس ہو کر حال پر لہراتے ہیں——
وہ الفاظ قدرت، جو اپنے مفہوم و معنے سے خود آگاہ نہیں،——
وہ طبل جنگ، جس پر ترانوں کی گونج پیدا ہوتی ہے مگر انہیں خود نہیں معلوم کہ وہ کیسی روح پھونک رہے ہیں——
وہ تاثیر، جو خود جنبش میں نہیں آتی مگر دلوں کو ہلا چھوڑتی ہے،——
یہ شعراء دراصل قانون ساز ہیں نظم و نظام عالم کے، اگو تسلیم شدہ نہیں"——

مغرب کے مشہور شاعر شیلی نے آرٹسٹ کی شان میں گویا ایک قصیدہ کہا ہے۔ قصیدے کے مفہوم سے آپ آگاہ ہیں، ماحصل یہ ہے کہ فنکار ایک مافوق الفطرت اور مافوق البشر ہستی ہوتا ہے۔

یہ تصور زمانۂ قدیم کا ورثہ ہے۔ جب شاعر، جادوگر اور کاہن وغیرہ مافوق الفطرت قوتوں کے حامل اور انسانوں سے بلند تر سمجھے جاتے تھے۔ اور اسی بنا پر پوجے بھی جاتے تھے۔ شیلی کو پورا حق تھا کہ یونان و روما کے علم الاصنام کی اس وراثت پر شاندار لب و لہجے میں اسی طرح بیان کرتا۔

ہندو دیومالا بھی یونان و روما کے علم الاصنام سے کچھ پیچھے نہیں ہے، وہاں بھی عظمت کے اظہار کے لئے اسی قسم کی اصطلاحیں رائج رہی ہیں——مثلاً انسان کے روپ میں بھگوان، مہاتما اور اوتار وغیرہ۔

ہم پر انگریزوں کے توسط سے یونان و روما کے علم الاصنام کا، اور ہندوؤں کے میل جول سے ہندو دیومالا کا اثر کچھ نہ کچھ ناہی چاہئے۔ ارتباط ہمیں دونوں ہی سے رہا ہے۔ اور ایک مدت دراز تک رہا ہے۔ جادوگروں اور کاہنوں کا تو خیر سے خاتمہ ہو چکا تھا لیکن شاعر موجود تھا اور ہم نے شاعر کو بڑا درجہ عطا کیا، ویسے بھی درجہ تو دے ہی دیا تھا، جو پہلے سے بڑا ہو پہلے "ناخدائے سخن" تھا کہ کہیں خدائی ناراض نہ ہو جائے لیکن فضا ہموار ہوتے دیر بھی نہیں لگتی، ہم نے اس "نا" کے ٹھیکے کو بھی ہٹا کر براہ راست بنا لیا——"خدائے سخن میر"—— اللہ اللہ

اب چاہے ان اصطلاحوں نے وجود اس تصور کی بنا پر پایا ہو، چاہے خود ان اصطلاحوں کے بغیر احتیاط استعمال نے اس کی پرورش کی ہو، کچھ بھی ہو آج تو صورت حال یہی ہے کہ ہم شاعر و ادیب و فنکار کے بارے میں قریب قریب یہ باور

کرنے لگے ہیں کہ اٹھ دپ میں تو آدمی ہی کے ہوتا ہے۔ مگر آدمی ہوتا نہیں، وہ آدمی سے الگ کوئی چیز ہے۔ اسی لئے منطق طور پر یہ بھی کوئی تعجب خیز بات نہیں کہ وہ معاشرہ انسانی کے اصول اور حدود و قیود سے بے نیاز ہو ــــــ یہ بات شاعروں ادیبوں اور فنکاروں پر قلم اٹھانے والوں کے تحت الشعور میں جاگزیں نظر آتی ہے۔ ورنہ یہ کبھی نہ لکھا جاتا کہ

فنکار نہ بورژوا ہوتا ہے۔ نہ کمیونسٹ، نہ جمہوریت پسند ہوتا ہے۔ نہ غیر جانبدار، نہ مسلمان ہوتا ہے نہ ہندو، وہ تو بنیادی طور پر ایک فنکار ہوتا ہے۔ جس کے اپنے احساسات اور تجربے اس کی دنیا ہوتے ہیں، اور انسانیت اس کا دین و ایمان، وہ معاشرے کا ایک حصہ بھی ہوتا ہے۔ اور اس سے الگ بھی، وہ اسے دیکھتا بھی ہے۔ اور اس سے بھاگتا بھی ہے۔ وہ تخلیق کے وقت نہ افادیت کا تصور رکھتا ہے نہ غیر افادیت کا ــــــ

کیا شعراء ادیب اور فنکار بھی اپنے متعلق اسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں؟ ــــــ اس لئے کہ فنکار کی تعریف ــــــ اگر یہی ہے تو اس سے تو نظریۂ حیات، اصول معاشرہ، فلسفۂ دین و ایمان، اور تعریف انسان، بلکہ خود شاعر ادیب فنکار بھی سب کے سب یک قلم پامال ہو جاتے ہیں۔ اور پھر یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے شخص کو جس کا لقب فنکار بتایا ہم قرار کیا دیں، کیونکہ اس تعریف سے وہ "سوشیل انیمل" تو بہر صورت باقی نہیں رہتا۔

سوشیل انیمل کے لئے یہ لازمی ہے کہ جس دنیا میں اس نے آنکھ کھولی ہے۔ اور اپنے گرد و پیش بے شمار چیزوں کا ایک عظیم کارخانۂ ہست و بود دیکھ رہا ہے۔ اس کی نسبت غور کرے کہ آخر یہ کیا ہے؟ کیسے وجود میں آیا؟ خود میں کیا ہوں؟ اور اس کارخانے میں میری حیثیت کیا ہے؟ یا اس کارخانے کو چلنا کس طرح چاہئے؟ ــــــ ظاہر ہے کہ سوچنے والوں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور سوچنے کے جتنے پہلو بھی ممکن تھے سب ہمارے سامنے آچکے ہیں۔ فنکار بھی اگر سوچتا ہے۔ تو بہت اچھا کرتا ہے۔ اسے ضرور سوچنا چاہئے۔ غور و فکر کے بعد اس کارخانے کی نسبت وہ انسان کی کچھ رہنمائی کرنی چاہتا ہے۔ تو اسے بتانا چاہئے کہ وہ کس نظر اور کس زاویئے سے کارخانے کو دیکھتا ہے؟ کیا اس کی نظر میں یہ کائنات کسی اتفاقی حادثے کا نتیجہ ہے، جو مادے کے الٹ پھیر سے اتفاقاً وجود میں آئی اور ایک دن یونہی علی الحساب ختم ہو جائیگی، یا اتفاقی حادثے کا نتیجہ نہیں بلکہ کسی خالق کی تخلیق ہے، اور یہ تخلیق بے معنی بھی نہیں، اس کا مقصد بھی ہے۔ اور پھر اس کا ایک انجام بھی ہے؟ فنکار اگر واقعتہً صاحب فکر ہے۔ تو کیا اس کے نزدیک یہ دنیا دار العذاب ہے؟ مایا کا جال ہے؟ یا دار العمل اور دار الامتحان ہے؟ کیا ہے؟ یہ بات ہمیں معلوم ہونی چاہئے۔ کہ وہ ان میں سے آخر کس فکر کا حامل ہے۔ یا پھر یہی کہ ہم ان میں سے کسی فکر کے بھی قائل نہیں، ہم کچھ نہیں جانتے کہ اس کی اصل مادہ ہے۔ یا خدا، یہ دنیا دار العذاب ہے یا امتحان گاہ، یہ گروہ بھی نامانوس نہیں ہے دیمقراطیس نے ایک خیال ظاہر کیا تو اس خیال کا ایک سلسلۂ نسب بھی ہم نے تیار کر لیا اور کارل مارکس تک اس کی ترتیب موجود ہے۔ افلاطون نے ایک فکر پیش کی تو اس کا شجرۂ ارادت بھی برکلے، نیوٹن اور بیکن تک ہمارے سامنے ہے۔ اسی طرح ارسطو سے لیکر دیکارٹ تک پوری قطار صف بہ صف کھڑی ہے، بلکہ متشککین کا قبیلہ بھی اسپنسر، ہیگل اور کانٹ کے ذریعے سے صاف پہچان لیا جاتا ہے، اور ہاں ان سلسلوں کے علاوہ ایک سلسلہ ان کا بھی ہے جو انبیاء کہلاتے ہیں اور ہم ان کے پیغام سے پوری طرح آگاہ ہیں، یہی تو چند سلسلے ہیں اور ان کی پوری منطقی ترتیب ہمارے سامنے ہے آخر ان میں فنکار کا سلسلہ کون سا ہے؟ ہٹ کر اس کا کوئی اور سلسلہ کوئی اور فکر کوئی اور تلقین ہو تو واقعی بڑی بدقسمتی ہوگی کہ ہم اس سے واقف نہ ہوں۔

شعراء کے مجموعے تو آپ نے بھی دیکھے ہوں گے۔ ہم نے بھی دیکھے ہیں، مگر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ وہ بیک وقت اس دنیا کو
العذاب بھی قرار دیتے ہیں، آواگون سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور اسے دارالامتحان بھی مانتے ہیں۔ کہیں مادے کے پرستار ہیں کہیں
لکے، اور کہیں روح اور مادہ کی ثنویت اور یزدان و اہرمن کے ترجمان نظر آتے ہیں۔ کبھی اس کائنات کا خالق ایک "دادہ گل" کو بتاتے
، اور کبھی یہ کہہ اٹھتے ہیں کہ کائنات کا وجود حقیقی کہاں ہے۔ وہ تو صرف ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہے ـــــ ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے
ـــ کبھی فرار کو پسند کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اپنے آپ کو مصائب کے حوالے کر دو اور کبھی کہتے ہیں کہ نہیں اس کا علاج تو صرف یہ ہے کہ
ت میں ڈوب جاؤ۔ حالانکہ یہ ساری باتیں الگ الگ اور مستقل افکار کا حامل ہیں اور اسی لحاظ سے ان کی منطقی ترتیب ہے جو ہمیں
نچ تک پہونچاتی ہے۔ اب اگر ہم کسی شاعر کو رہنما بنائیں اور اسکی کلیات سے استصواب کریں تو اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ہم نے کسی میوزیم
عجائب خانے کے سپرد اپنے آپ کو کر دیا بلکہ زیادہ بہتر ہو اگر ہم یوں کہیں کہ "بھول بھلیوں" میں جا پڑے۔

مغربی شعراء کے مجموعوں کو چھوڑیئے اک ذرا اپنی زبان کے فنکاروں کو دیکھئے قلی قطب شاہ سے لیکر میر تک اور میر سے غالب
شاد تک مستند سے مستند شعراء کے دیوان و کلیات کا مطالعہ کیجئے اور ان کے انداز فکر کا سراغ لگانے کی زحمت کیجئے پھر دیکھئے کہ
لس بری طرح وادی وادی بھٹکتے پھر رہے ہیں ـــــ ظاہر ہے کہ جو شخص خود گم ہو وہ اوروں کی رہبری نہیں کر سکتا! یہ دوسری بات
کہ ان فنکاروں کے خوشنما جملے، خوبصورت ترکیبیں، دلآویز بندشیں اپنے اندر کیف و سرور اور رمز یا رمزیاں اس قدر رکھتی ہیں کہ۔

پڑھتے کسو کو سنیئے گا تو دیر تلک سر دھنئے گا

مگر یہی ان کا فن ہے اور بس

یارانِ نکتہ داں

یونس رمزی

"ماہ نیمروز" کا حالیہ شمارہ ملا - شکریہ !

افسانوی حصہ کمزور ہے۔ اس طرف توجہ دیجئے۔ - ویسے تو اس صنف ادب میں ان دنوں "سانا لانا" ہے۔ لیکن کوشش کیجئے
"ماہ نیمروز" عمدہ افسانوی ادب پیش کر سکے۔ نئے لکھنے والے اچھے افسانے بھی لکھتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کے یہاں موضوعاتی تنو
نہیں ہوتا۔ میں ریحان صدیقی کے حالیہ مضمون سے قطعی متفق ہوں۔ ان کے یہاں بیشتر SET - PATTERN ہوتا ہے۔ جیسا کہ فلمی کہانیاں
ہوتی ہیں۔ نئے لکھنے والے موضوع کے DEVELOPMENT اور TREATMENT پر زور نہیں دیتے۔ افسانوی تکنیک کی نصابی کتابوں
ہو سکتا ہے آگاہ ہوں لیکن ان کے ADAPTATION سے افسانہ نہیں بنتا بلکہ کچھ اور بھی لوازمات کی ضرورت ہوتی ہے۔ آجکل بیشتر افسانے
خوبصورت جملوں کا مرقعہ ہوتے ہیں اور کہانی آہ واہ پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس POETIC SENSIBILITY رومانی اظہار خیال کے شکار
اچھے افسانہ نگار بھی ہیں۔ میں ان کے نام لینا نہیں چاہتا اس لئے کہ چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔ لیکن صاحب۔ حقیقت کچھ ایسی ہی ہے۔

منظور ممتاز

ستمبر ۵۸ کا "ماہ نیمروز" سعودی عرب میں جنوری ۵۹ء میں پہنچا ہوگا۔ کہ فروری کی ایک محفل میں ضیاء الرشید
نے اپنے شائع شدہ مکتوب کا ذکر کیا۔ میں نے شمارہ ذرا مانگا۔ مگر مجھے ٹال دیا گیا۔ مارچ میں میں نے پھر تقاضا کیا۔ مگر پھر مجھے ٹال دیا
اور میں اپریل میں چھٹی پر چلا آیا۔ ایک طویل ترین تلاش کے بعد مجھے یہ شمارہ دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ اور میں اپنے صحرائی ساتھی ضیاء الرشید
صاحب کے ارشادات اور تجزیئے کا جواب لکھ رہا ہوں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ میں بقول انکے "PERVERTED GENIUS" ہوں۔ یہ حیرت انگیز انکشاف میری ذات پر ایک بہتان
سے کم نہیں۔ اگر یہ بات اس پر منحصر ہے کہ میرے ہر دو افسانوں میں ایک بھوک ــــ دوسری جنس کے موضوع پر ہوتا ہے۔ تو میں
اضافہ کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں، کہ تیسرا پیار ہوتا ہے۔ مگر میرے افسانوں کے موضوع سے مجھ پر 'PERVERTED GENIUS' کا لیبل
چسپاں کر دینا نازیبا سی بات ہے۔

اس موقعے پر یہ واضح کر دینا غیر ضروری نہیں کہ 'PERVERTED GENIUS' کوئی اصطلاح نہیں۔ بلکہ مندرجہ ذیل دو
اصطلاحیں ہیں ـــ (۱) CONSTRUCTIVE GENIUS اور (۲) EVIL GENIUS اب ضیاء الرشید صاحب فیصلہ کریں

باقی صفحہ ۳۰ پر

کلیم الدین احمد

غزل

اردو شاعری نے فارسی کے سائے میں پرورش پائی اور یہ کچھ تعجب کی بات نہیں اور کوئی بری بات بھی نہیں "چراغ
غ جلتے ہیں"۔ ملکہ الزبتھ کے عہد میں انگریزی ڈرامے کی ابتدا یونانی اور لاطینی ڈراموں کے سائے میں ہوئی۔ اور لیرک
ں نے اطالوی اور فرانسیسی شاعری کی پیروی کی۔ لیکن انگریزی ڈرامہ بہت جلد بیرونی اثر سے آزاد ہو گیا۔ اور
، بالکل نئی راہ نکالی۔ اسی طرح لیرک شاعری نے بھی کچھ دیر سے لیکن برابر کے لئے اطالوی اور فرانسیسی شاعری
وڑ لیا۔

اگر اردو شاعری اپنی ترقی کے اول مدارج طے کرنے کے بعد فارسی شاعری کے اثر سے آزاد ہو جاتی اور آزاد ہو
نیا الگ بناتی تو پھر کچھ شکوہ شکایت کی گنجائش نہ ہوتی۔ لیکن یہ آزادی اس کی قسمت میں نہ تھی۔ اسے کورانہ تقلید
مد ہوئی کہ یہ گویا ہمیشہ کے لئے لکیر کی فقیر بن گئی فارسی۔ بحور اور قواعد عروض کی تقلید تو لازمی تھی۔ تعجب یہ ہے کہ ان بحور
ر میں کبھی کسی کو تغیر یا اضافہ کا خیال بھی نہ ہوا۔ اسی انقلاط طبیعت کا نتیجہ تھا کہ مختلف بندشیں اور سارے مضامین
ی سے اخذ کر لئے گئے۔ اور رفتہ رفتہ فرسودہ خیالات اور پرانے نقوش اردو شاعری کا سنگ بنیاد بن گئے۔ لیلیٰ
شق، فرہاد کی کوہ کنی، گل و بلبل کی رنگین حکایت، شمع و پروانہ کا ناز و نیاز، حسن یار کی تجلی، جفا کا شکوہ، عاشق
ں تعریف یہ مضامین کچھ ایسے اچھے معلوم ہوئے کہ ابھی تک ان سے جدائی گوارا نہیں۔ زلف مشکیں، خال سیاہ، نرگس
ب مژگاں، لب لعلیں، در دنداں، چاہ زنخداں کا کہاں ذکر نہیں!

ملکہ الزبتھ کے عہد میں انگریزی شعرا بھی کچھ اسی قسم کی مصنوعی شاعری کیا کرتے تھے۔ سنہری زلفیں، ستارہ جیسی
آنکھیں، گلابی گال، لب لعلیں، در دنداں مرمریں ہاتھ اور اسی قسم کے خوبصورت لیکن نقلی سکوں کی اتنی ریل پیل ہو
ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ تنگ آکر شیکسپیر نے اپنی ایک سونٹ میں اس قسم کی شاعری کا مذاق اڑایا۔

میرے معشوق کی آنکھیں سورج جیسی بالکل نہیں۔ مونگا اس کے لال ہونٹھوں سے بہت زیادہ لال۔۔۔ اس کے سینے
فیدی کو نہیں پاتے۔ اگر بالوں کو تار سے تشبیہ دی جائے تو اس کی زلفیں سیاہ تار ہیں۔ میں نے سرخ و سفید گلاب
ہے۔ لیکن اس کے گالوں میں میں ایسے گلاب نہیں پاتا۔ اور بعض عطر ہمارے معشوق کی سانس سے زیادہ خوش گوار ہیں
س کی گفتگو پر شیدا ہوں لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ موسیقی زیادہ خوش آہنگ ہے۔ میں نے کسی دیوی کو چلتے پھرتے

ں دیکھا ہے۔لیکن میرا معشوق چلتا ہے تو زمین چلتی ہے۔ پھر بھی، بہ خدا میرا معشوق لاجواب ہے۔ اور کسی ایسے حسین سے کم نہیں
ں میں چھوٹی تشبیہوں نے چار چاند لگائے ہیں۔"

لیکن اردو میں کسی نے تقلید کو برا نہ سمجھا۔ فارسی شاعری نے کچھ ایسا سبز باغ دکھایا کہ شعرا اپنی فطری ذہانت اور طباعی اپنی ترقی
یلہ اور جدت طرازی سے دست بردار ہو کر فارسی شاعری کی تقلید میں منہمک ہو گئے۔ اگر وہ شاعری کے صحیح مفہوم سے واقف
تے تو اس قسم کی حرکت نہ کرتے۔ ان کی مشکل آسان ہو جاتی۔ اور وہ ترقی کی ساری منزلیں طے کر لیتے۔

یں نے اوپر کی سطروں میں جو باتیں کہی ہیں وہ کچھ نئی نہیں۔ عبدالسلام صاحب کہتے ہیں "اردو شاعری اپنی قدرتی پیداوار کو
وڑ کر ایران کی طرف قدم بڑھاتی ہے اور اپنے تمام اساسی مضامین کا مواد ایران سے لیتی ہے۔ مثلاً جیحون، سیحون، جوئے شیر، کوہ
لہ کوہ بے ستون، رستم، اسفندیار، سام، مانی، بہزاد، مجنوں، فرہاد، شمشاد، نرگس، سنبل، بنفشہ، سرو و قمری، بلبل اور پروانہ وغیرہ
اردو شاعری کے ہزاروں مضامین کی بنیاد ہے۔ اور یہ تمام چیزیں ایران کے ساتھ مخصوص ہیں۔ فارسی الفاظ۔ فارسی محاوروں
کے ترجمے اور فارسی ترکیبیں تو اس کثرت سے ہیں۔ کہ ان کا استقصا نہیں کیا جا سکتا۔ . . . کمند۔ خنجر، تیر وغیرہ اگرچہ ایران کے ساتھ مخصوص
نہیں ہیں تاہم اردو شاعری نے زلف، ابرو و مژہ کی یہ تمام تشبیہیں ایران ہی سے لی ہیں۔ رندی و سرمستی کے مضامین بھی اگرچہ
ان کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتے تاہم یہ مضامین اردو شاعری میں جس ساز و سامان کے ساتھ آتے ہیں۔ وہ ایران ہی کے
ساتھ مخصوص ہیں۔ ورنہ ہندوستان میں جام جم کہاں مل سکتا ہے۔؟ غرض بحر، ردیف، قافیہ، استعارہ و تشبیہ ہر حیثیت سے
اردو شاعری فارسی شاعری کا وجود ظلی ہے۔"

محمد حسین آزاد نے تعجب ظاہر کیا تھا:-

"تعجب ہے اس نے (فارسی شاعری نے) اس قدر خوش ادائی اور خوش نمائی پیدا کی، کہ ہندی بھاشا کے خیالات جو
خاص اس ملک کے حالات کے بموجب تھے انہیں بھی مٹا دیا چنانچہ خاص و عام ایسے پیچھے اور کوئل کی آواز اور چنپا اور چنبیلی کی خوشبو
بھول گئے۔ ہزار و بلبل اور نسرین و سنبل جو کبھی دیکھی بھی نہ تھی ان کی تعریف کرنے لگے۔ رستم اور اسفندیار کی بہادری، کوہ الوند
اور بے ستون کی بلندی، جیحون و سیحون کی روانی نے یہ طوفان اٹھایا کہ ارجن کی بہادری، ہمالہ کی ہری ہری پہاڑیاں، برف
سے بھری چوٹیاں اور گنگا جمنا کی روانی کو بالکل روک دیا۔"

ظاہر ہے کہ میں نے جو باتیں کہی ہیں وہی عبدالسلام صاحب اور آزاد بھی کہہ چکے ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ نہ تو آزاد کو
اور عبدالسلام صاحب کو ان باتوں کے جو منطقی نتائج ہیں ان کا احساس ہے۔ اور اردو شاعری کی صورت حال سے انہیں وہ
بے اطمینانی نہیں جو ایک نقاد کو ہونی چاہئے۔

بہرکیف اردو شاعری کی مختلف صنفیں ہیں۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ اور مسدس خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ غزل اردو
شاعری کی جان ہے۔ اس صنف کی خصوصیتوں کا اندازہ کرنے کے لئے کسی ایک غزل کا تجزیہ کافی ہوگا۔ مثلاً غالب کی ایک
مشہور غزل ہے اور یہ غزل بلا تخصیص پیش کی گئی:-

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے ٭ ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ ✣ ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے
خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ✣ ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے
رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم ✣ دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے
دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر ✣ یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے
شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر ✣ دیکھیے کب دن پھریں حمام کے

عشق نے غالبؔ نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

[...]ل پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شعروں میں کچھ مشابہت اور مناسبت ہے۔ سب ہم وزن ہم قافیہ [...]یں۔ ایک شعر کے سوا سب شعر عشق اور عشق کے لوازمات سے وابستہ ہیں۔ اس ظاہری مطابقت کی وجہ [...]ہے کہ باطنی مطابقت بھی ہوگی اور ان شعروں میں معنی کے لحاظ سے ربط و تسلسل اور ارتقائے خیال بھی ہوگا۔ لیکن [...] مختلف شعروں میں "شعوری یا غیر شعوری" کوئی ربط نہیں، پڑھنے والے کے ذہن میں مکمل تجربے کی تصویر ابھر نہیں [...]اگندہ خیالات اور نقوش بکھر جاتے ہیں۔ رقیبوں کی کامیاب قسمت، شاعر کی خستگی، خط لکھنے کا ارادہ، زمزم پر [...]نکھوں میں جا پھنسنا، شاہ کے غسل صحت کی خبر، شاعر کا نکما ہونا۔ ان باتوں میں کوئی معقول مناسبت نہیں [...] و تسلسل، وہ ارتقائے خیال نہیں جو نسلی بردودم کی نظم کے مختلف بندوں میں ہے۔

[...]ن ظاہر ہے کہ یہ منتشر خیالات وہی ہیں جو عام طور سے غزلوں میں پائے جاتے ہیں۔ یعنی غزل کا "دامانِ تنگ تنگ [...]ل حسن" محدود ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ معشوق کا حسن جس سے مہ و خورشید شرمندہ، اس کی بے مہری [...]شق کا ظلم، عاشق کی وفا کیشی اور جانکنی، وصل کی آرزو، فلک کا شکوہ، مے گلفام کی ہوس، محتسب اور واعظ سے [...]ل ہیں جو بار بار ایک ہی رنگ و بو کے ساتھ چمن شعر میں کھلتے ہیں۔ اگر تخیل نے پر پرواز پھیلائے تو ان پھولوں [...]ف دیکھے مایوس کیا۔

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا ✣ برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا
مرا غنچۂ دل ہے وہ دل گرفتہ ✣ کہ جس کو کسو نے کبھو وا نہ دیکھا
یگانہ ہے تو آہ بیگانگی میں ✣ کوئی دوسرا اور ایسا نہ دیکھا
اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں ✣ ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا
کیا مجھ کو داغوں نے سروِ چراغاں ✣ کبھو تو نے آ کر تماشا نہ دیکھا
تغافل نے تیرے یہ کچھ دن دکھائے ✣ ادھر تو نے لیکن نہ دیکھا نہ دیکھا
حجابِ رخِ یار تھے آپ ہی ہم ✣ کھلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا
شب و روز اے درد درپے ہوں اس کے ✣ کسو نے جسے یاں نہ سمجھا نہ دیکھا

خالق کا جلوہ ہر مخلوق میں موجود ہے۔ اس کا نور ہر چیز میں مستور ہے۔ دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر۔ منصور کا دعوٰی
حق حقیقت پر مبنی تھا۔ ہر ذرہ دل کو وصال مہر کی آرزو ہے۔ لیکن اپنی پابندیوں سے مجبور۔ جسم کا پردہ مثل حجاب حائل
۔ اگر انسان نواہائے راز کا محرم ہو تو ہر پردہ پردۂ ساز بن کر حقیقت کا نغمہ سنائے گا۔ وہ خورشید یکتائی اپنی چمک ہر
ے میں دکھلاتا ہے۔ لیکن آنکھیں شرط ہیں۔ اگر اسی کو جلوہ - فرمانہ دیکھا۔ تو اس کے مظاہر کو دیکھنا نہ دیکھنا برابر ہے۔ وہ
دیگانہ ہے، اس کا کوئی ثانی نہیں۔ دل کو ہوس ہے۔ تو اس کے دیدار کی تمنا ہے۔ تو اس کے وصل کی۔ لیکن حجاب جسم
مجبور۔ اذیت، مصیبت، ملامت، بلائیں۔ غرض دل پر کیا کیا نہ گزری۔ داغ ہائے جدائی سے دل سرو چراغاں ہو گیا
ن اس نے اپنے جلوے سے آنکھوں کو نور اور دل کو سرور نہ بخشا۔ غنچۂ دل ہمیشہ دل گرفتہ ہی رہا۔ اسے کبھی شگفتہ و شاداب
ہنے نہ دیکھا۔ جب آنکھ کھلی تو یہ عقدہ حل ہوا کہ اپنی زندگی ہی گویا ایک حجاب تھی۔ آنکھیں کھلیں تو اسے دیکھ سکیں، فہم و ادراک
یہ طاقت کہاں کہ اسے سمجھ سکیں، پھر بھی جستجو ہو تو اسی کی، اگر خواہش دیدار ہو تو اسی کی — درد کی غزل میں انہیں خیالات
مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے لیکن جو ربط نثر میں ہے وہ غزل میں نہیں۔ غزل میں بعض خیالات محذوف ہیں۔
عار کی ترتیب بے ترتیب۔ دماغ کو ایک شعر سے دوسرے شعر تک گزرنے میں رکاوٹ محسوس ہوتی ہے۔
ل ایک مکمل تجربہ نہیں البتہ مختلف تجربوں کے ٹکڑے ہیں جن سے تخیل کو لغزش ہوتی ہے۔

جس طرح عشق مجازی کے فیض سے دل طرح طرح کے جذبات سے مالا مال ہوتا ہے اسی طرح عشق حقیقی
ی دل کو بلند اور نفیس جذبات عطا کرتا ہے۔ شاعران انمول کو الف کا مربوط و مکمل نقشہ پیش کرسکتا ہے۔ صنف غزل
خامیوں سے یہاں محسوسات کے ٹکڑے نظر آتے ہیں۔ اس پراگندگی کا الزام شاعر پر بھی عائد ہوتا ہے۔ اس کی قوت
سہ میں یہ طاقت نہیں کہ اپنے احساسات کو ایک سانچے میں ڈھال سکے۔ اس کے تخیل میں یہ زور نہیں کہ وہ سارے
سورات د کو الف کو مربوط و مسلسل کر کے مکمل تجربے کی شکل میں پیش کرسکے۔ یہ نہیں کے جذبات موجود نہیں،
ذبات ہیں اور شخصی ہیں مصنوعی نہیں اور شاعر نے انہیں جوش کے ساتھ محسوس بھی کیا ہے۔ لیکن کثرت جذبات میں
مدت تخیل کا وجود نہیں۔ اس لئے وہی انتشار اس غزل میں بھی ہے۔ جو غالب کی غزل میں تھا۔

اور عشق مجازی کی طرح عشق حقیقی کی قلمرو بھی محدود ہے، بہت محدود ہے۔ تقدس، ریاضت نفس، کثرت میں
مدت کا جلوہ، ترک دنیا۔ فقر و قناعت۔ بس انہیں مضامین کی تکرار ہوتی ہے۔ یہاں بھی فارسی کا اثر نمایاں ہے
ام خیالات و مظاہرات فارسی سے اخذ کئے گئے ہیں اس لئے اصلیت عموماً مفقود ہے۔ اور اصلیت تھی بھی تو وہ تقلید
ے بار گراں کی متحمل نہ ہو سکی۔

بہر کیف، یہ بات تو صاف ہو گئی کہ غزل کے شعروں میں۔ اور یہ شعر کسی رنگ کے کیوں نہ ہوں۔ کوئی ربط نہیں
وتا اور یہ بات بھی کوئی نئی بات نہیں۔ لیکن اکثر پرانی، جانی ہوئی باتوں کو بھی دہرانا پڑتا ہے۔ ہاں تو یہ کوئی نئی بات
ہیں۔ حالی نے کہا تھا:

غزل میں جیسا کہ معلوم ہے کوئی خاص مضمون مسلسل بیان نہیں کیا جاتا۔ الا ماشاء اللہ۔ بلکہ جدا جدا خیالات الگ

یں اولسکے جاسکتے ہیں :

ظم طبا طبائی کی غزل کے متعلق یہ رائے ہے :-

ں اگر ایسی ہو کہ مطلع سے مقطع تک ایک مضمون ہو تو بھی غنیمت ہے۔ ستم کی بات تو یہ ہے کہ شاعر غزل گو کسی مضمون
ندھ ہی نہیں کرتا۔ جس قافیے میں جو مضمون اچھی طرح بندھتے دیکھا اسی کو باندھ لیا۔ ایک شعر میں بت پرستی ہے،
، توحید و عرفان، ابھی ناقوس پھونک رہے تھے، اس کے بعد ہی نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ یا تو مے خانے میں مست و سرشار
پند کرنے لگے۔ ابھی شب وصل کے مزے لوٹ رہے تھے، ابھی شب ہجر میں مرنے لگے۔ ایک شعر میں معشوق
و شرم و حیا کا دعویٰ کیا، دوسرے میں اس کے ہرجائی پن کا شکوہ کیا۔ ابھی جوش شباب و شوق شراب تھا
ئی اور خضاب لگا رہے ہیں۔ یا تو حشر و نشر کا انکار تھا۔ یا محشر میں کھڑے فریاد بھی کر رہے ہیں۔ - - - میں مسلمان
ندقہ بھرا ہوا ہے - - - - انکار رویت عقیدے میں داخل ہے، مگر حشر میں دیدار ہونے کا مضمون باندھ لیا
- - - - میں خود بھی غزل کہتا ہوں۔ اور رسم زمانہ کے مطابق۔ ایسے ہی بے سر و پا مضامین باندھ لیا کرتا ہوں
ہے کہ جس کلام میں ایسا تناقض و تہافت ہو اس میں کیا اثر ہوگا۔ دوسری قباحت یہ ہے کہ شاعر غزل گو
کی مشق نہیں ہوتی، بلکہ قافیہ و ردیف سے مضمون پیدا کرنے کی مشق کیا کرتا ہے - - - غزل گو کی الٹی چال
ین طرح کرتے ہیں۔ اور قصیدہ و مثنوی و مرثیہ کہنے والے مضمون طرح کرتے ہیں "

ست اللہ خاں نے بھی اسی قسم کی بات کہی ہے :-

ل دنیا میں تو تسلسل ایک طرح کا جرم ہے۔ ردیف اور قافیہ کی یکسانیت کے سوا بہ لحاظ معنی ایک شعر کو دوسرے
یں ہوتا اور اس پر فخر کیا جاتا کہ ہر شعر اپنے رنگ میں نرالا ہے۔ اور دوسرے شعروں سے جداگانہ ہے - - - -
عقول پڑھے لکھے آدمی کی غزل کو لیجئے۔ پنسل ہاتھ میں لے کر ہر شعر کے محاذی یہ نوٹ کرتے جایئے کہ مضمون
سے جو غزل کے لئے معین کرائی گئی ہیں کون سی نوع کا ہے۔ ایک عاشقانہ شعر ہوگا تو ایک تصوف میں
یں تعلی ہوگی تو ایک میں صوفیانہ پن۔ ایک بھرتی کا ہوگا تو ایک حکیمانہ۔ ایک میں معشوق مسکراتا ہے تو ایک
ساتھ چہلے کرتا ہے، غرض اس غزل کا ہر شعر ایک دوسرے سے بے ربط ہوگا۔ فرض کیجئے ایک آپ کے
لیم یافتہ دوست آپ سے اس گوناگونی سے گفتگو کریں۔ ایک جملے میں اپنی معشوقہ کے لب لعلیں کا ذکر کریں
و قصود کا بیان ہو، ایک میں زاہد پر بھونڈا فقرہ کسیں، دوسرے میں تصوف کی ترنگ میں کوہ طور پہ
، غرض اسی طرح بے ربط خیالات کا طومار باندھ دیں۔ ہر جملہ جداگانہ ہو۔ کبھی زمین کی کہیں، کبھی آسمان کی
، کبھی سہری کی لذتیں تو کیا آپ ان صاحب کو یہ سمجھیں گے کہ وہ اپنے آپے میں ہیں ؟"

یہ بے ربطی مسلم ہے اور اسی بے ربطی کی وجہ سے غزل مغربی ادب میں مقبول نہ ہو سکی گوئٹے پر فارسی
ا اثر پڑا تھا۔ خصوصاً وہ حافظ سے کافی متاثر ہوا تھا۔ اپنی زبان میں وہ فارسی استعارات بے تکلف استعمال
ساتھ وہ غزل بھی ردیف و قافیہ کی قید سے لکھی ہے۔ اس کی تقلید میں دوسرے جرمن شعراء نے بھی غزلیں

لکھیں لیکن غزل جرمن شاعری میں مقبول نہ ہو سکی۔ اسی طرح بعض انگریزی شعرا بھی مشرقی ادب سے متاثر ہوئے۔ ایک ایلنٹ ٹیگور کو لیجئے اس کی بہت سی نظمیں مشرقی ماحول، مشرقی فضا، مشرقی خیالات سے بھری پڑی ہیں۔ اس نے ایک غزل بھی لکھی ہے اور وہ غزل یہ ہے:۔

یاسمن

سمجھ سوسن کی شاندار چمک ہے۔ گلاب سے اس کی التجا کیسی پُر ادا ہے۔ کیا گلاب اپنے سر کو جنبش دیتے ہیں۔ یاسمن!

لیکن جب سیمیں قمری اترتی ہے۔ تو میں دوستوں کے نغمے سے پھول کو پالیتا ہوں جس کا شیریں نام میرے ہونٹوں پر ہوتا ہے جب میں کہتا ہوں۔ یاسمن!

صبح کی روشنی صاف اور سرد ہے۔ اس روشنی میں میں ایک زیادہ تیز روشنی ایک زیادہ گہری زرینی ایک دور پھیلی پھیلی ہوئی تجلی کو دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ یاسمن!

لیکن جب دن کی گہری سرخ آنکھ سنسان شاہراہ کے باہر ہوتی ہے اور کچھ لوگ قبلہ رخ ہو کر نماز پڑھتے ہیں اور میں تیرے کوچے کی طرف رخ کرتا ہوں۔ یاسمن!

یا جب شب مہتاب میں ہوا ایک بے ہوش کی طرح بھٹکتی پھرتی ہے۔ اور بربط نواز تاروں سے اپنے دودھ جیسے سفید زد پھیلائے ہوئے محبت کا گیت گاتے ہیں۔ یاسمن!

ایسے وقت میں شعلہ شعلہ جوالہ! اپنی محبت کے پھول برسا۔ کیونکہ وہ آج کی رات ہو یا کل۔ سفید پوش باغبان آپہنچے گا اور ٹوٹے ہوئے پھول تو بے جان ہوتے ہیں۔ یاسمن!

یہ غزل تو خیر جیسی بھی ہو، یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اس میں پراگندگی نہیں اس کے شعروں میں بے ربطی نہیں۔ آخری تین شعر تو ایک جملے یا ایک طویل جملے میں منسلک ہیں۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ شاعر کچھ کہنا چاہتا ہے۔ وہ فرسودہ ہی سی بات کیوں نہ ہو۔ اور سب شعر مل جل کر خیالات کا ایک ڈھانچا تیار کرتے ہیں جس کی تکمیل آخری شعر میں ہوتی ہے۔

غزل مغربی ادب میں پھل پھول نہ سکی اس کی خاص وجہ وہی بے ربطی اور پراگندگی ہے جسے غزل کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ نکلسن کا کہنا ہے کہ غزل کی صورت تو وہی ہے جو قصیدہ کی ہے۔ لیکن غزل میں قصیدے اور قطعے کی بہ نسبت تسلسل کی کمی ہے۔ اور خیالات میں لگاؤ بھی کم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نکلسن قطعے کو زیادہ شاعرانہ صنف سخن خیال کرتا ہے۔ قصیدے اور قطعے کی بحث آئندہ آئے گی۔ غزل میں ربط، اتفاق اور تکمیل کی کمی ہے۔ یہی ربط، اتفاق اور تکمیل تہذیب کا سنگ بنیاد ہیں اور انہیں۔ چیزوں کی وجہ سے میں نے کہا تھا کہ غزل نیم وحشی صنف شاعری ہے۔ اس اجمال کی تفصیل بھی میں نے اپنے مضمون "بزم نگار" (نگار، جنوری و فروری ۱۹۳۶ء) میں کر دی تھی۔ اور وہ تفصیل یہ ہے:۔

انسان ہمیشہ انسان نہ تھا۔ اسے ارتقا کی کتنی منزلیں طے کر کے مہذب انسان کا درجہ حاصل کیا ہے۔ ان منزلوں میں سے ایک منزل بربریت ہے۔ اس منزل سے انسان گزرتا ہے۔ لیکن گزر نہیں جاتا یعنی تہذیب کے نقطے پر پہنچ کر بھی وہ بربریت سے نجات نہیں پاتا۔ کم از کم اس وقت تک اس نے بربریت سے نجات نہیں پائی ہے۔ موجود

ـ اس کی کوشش مشکل ہے۔ بہرکیف بربریت اور تہذیب میں مشرقین کا فرق ہے اور اس فرق کی سمجھ ہی تہذیب
ئی ہے۔ وحشی اپنے جذبات کے وجود کو ان کے وجود کی کافی وجہ سمجھتا ہے۔ وہ اپنے جذبات کی ماہیت اور
باب کو نہیں سمجھتا۔ اور نہ ان کی غرض وغایت کو پہچانتا ہے۔ احساسات واعمال کو وہ غور وفکر پر ترجیح دیتا ہے
نوں کی تکمیل اس کی نظروں میں اصل زندگی ہے۔ زندگی کے زور اور بھراؤ کی وہ قدر کرتا ہے۔ جوش کی شدت اور
ہیجان میں اسے مسرت ملتی ہے۔ لیکن زندگی کے مقصد کا وہ سراغ نہیں لگاتا اور نہ زندگی کی "صورت" پر غور
۔ کمزوری اور کمی کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور جو چیزیں "رفعتوں کی حامل" ہیں انہیں نہیں پہنچانتا۔
ن محض اپنے جذبات کے وجود کو کافی نہیں سمجھتا۔ وہ جذبات واحساسات کی تہذیب وتربیت کرتا ہے۔ ان
دران کی غرض وغایت کو سمجھتا ہے۔ حیات واعمال پر ترجیح دیتا ہے۔ اپنی انفرادی زندگی اور حیات انسانی
سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور دونوں کے تصور میں "صورت" کا حسن اسے جزئی حسن سے زیادہ محظوظ کرتا
انی اور دماغی توازن کو اپنی زندگی کا مدعا قرار دیتا ہے۔ یہ بربریت اور تہذیب کا فرق آرٹ میں بھی نظر
اپنے آرٹ میں مواد کی زیادتی اور شوکت پر زور دیتا ہے۔ جزئیات کے حسن کو تو وہ سمجھ سکتا ہے لیکن "صورت"
ہے بے اعتنائی برتتا ہے۔ مہذب آرٹ کی بنیاد فہم وادراک پر ہے۔ جو قدر وقیمت میں پرجوش تجربات سے
نب آرٹسٹ اپنے تجربات سے الگ تھلگ رہ کر دیکھتا ہے اور ان پر غور وفکر کرتا ہے اور وقتی طور پر قارئین کو
لے جاتا ہے۔ اور انہیں حیات سے نجات دلا کر غور وفکر سے شناسا کرتا ہے۔"
ب انسانی میں بربریت اس وقت تک کارفرما ہے۔ اور ذرا سی تحریک پر تہذیب کے حلقوں کو توڑ کر باہر نکل
جن اصناف ادب میں بھی بربریت کا عنصر موجود ہے۔ وحشی ونیم وحشی صنفیں مغربی ومشرقی ادبوں میں پائی جاتی
ایک نیم وحشی صنف ادب ہے۔ یہ حقیقت اس قدر یقینی ہے کہ مزید تشریح کی ضرورت نہ ہوتی اگر اردو
میں فکر کی عادت عام ہوتی۔ غزل کی "صورت" ناقص ہے۔ وحشی اپنے آرٹ میں "صورت" اور اس کی تکمیل
نہیں کرتا۔ وہ نہ تو اپنے جذبات وخیالات کی تربیت کرتا ہے اور نہ انہیں ترکیب دے کر ایک مناسب و
ت کی تخلیق کرتا ہے۔ "صورت" کے حسن کا تصور محظوظ نہیں کرتا اور وہ اسے دوسرے عناصر سے الگ تصور
جزئیات یا مختلف عناصر کے حسن کو وہ الگ الگ دیکھتا ہے۔ اور اسی جزئی حسن کے مشاہدے میں وہ اس
ہو جاتا ہے کہ پھر اور کسی شے کی طرف اس کی توجہ منعطف نہیں ہوتی۔ جزئیات کے حسن اور اس حسن کے
ہ کافی سمجھتا ہے۔ اسے اس بات کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی کہ مختلف اجزا آپس میں مل کر ایک
ر مکمل نقش پیش کریں۔ غزل میں مختلف عناصر ترکیب پا کر مکمل صورت کی تخلیق نہیں کرتے۔ ہر شعر کی تاثیر
غور سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت صاف نظر آئے گی کہ غزل کا صوری حسن ہمارے دماغ کو جمالیاتی تسکین نہیں
مکمل اور ایک مختصر نظم تسلیم کر لیا جائے تب بھی غزل میں صوری حسن کا فقدان ہوگا۔ اور غزل کی صورت ایک
وگی جس میں مختلف نظمیں اکٹھا کی گئی ہوں۔ "نگار" (جنوری وفروری ۱۹۴۱ء) کے صفحہ ۳۳ پر یہ پانچ شعر

تکیۂ کلام ہی سہی وہ کہتے مرے ہاں ہیں   کیوں کہو بات بات پر دیکھو بھلا نام ہے"

او بہلا کہ تھا پھر بھی اس کی طرف   نظر میری اکثر بھٹکتی رہی

قاصد پیام ان کا نہ کچھ دیر ابھی سنا   رہنے دے محو لذت ذوق خبر مجھے

جب کہا اس نے مدعا کہئے   سوچتے رہ گئے کہ کیا کہئے

جانتا ہوں کہ نشیمن نہیں باقی صیاد   پھر بھی اک لطف خلش حسرت پرواز میں ہے

یہ اشعار مختلف غزلوں سے چنے گئے ہیں۔ اور ہم قافیہ اور ہم ردیف نہیں لیکن ہر شعر کا مطلب صاف ہے اور سے سمجھنے کے لئے غزل کے دوسرے شعروں سے واقفیت ضروری نہیں۔ ہر شعر کا مفہوم اور اس کے حسن کا احساس زل کی "صورت" پر مبنی نہیں۔ غزل میں صوری حسن کا لعدم ہے۔ اور صورت کا احساس ایک دھوکا ہے۔ اگر غزل میں یہ سن موجود ہوتا تو پھر یہ اشعار اس طرح غزل سے الگ نہیں کئے جا سکتے تھے۔ اور الگ ہونے پر ان کے حسن کا زیادہ نصہ مفقود ہو جاتا۔ زیادہ تفصیل کی نہ ضرورت ہے۔ نہ گنجائش۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ وہ "حسن صورت" جو نظم فسانے، ڈرامے وغیرہ کی لازمی صنفی خصوصیت ہے۔ غزل میں موجود نہیں۔ غزل کے ہر شعر میں کسی مخصوص جذبے یا خیال کا اظہا منظر ہوتا ہے۔ سارے احساسات و تصورات مرتب و مرکب ہو کر ایک نقش کامل کی طرح جلوہ گر نہیں ہوتے۔ فنی نقص کی وجہ سے ہر احساس یا خیال اور اس کا وجود، اس کا اظہار کافی سمجھا جاتا ہے۔ یہی اس صنف کے نیم وحشی ہونے کی دلیل ہے۔ یہاں ایک غلط فہمی کا احتمال ہے جسے رفع کر دینا مناسب ہے۔ یہ بات تو ثابت ہو چکی کہ غزل نیم وحشی صنف شاعری ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ہر غزل گو شاعر بھی نیم وحشی ہے۔ ممکن ہے۔ کہ غزل گو شاعر نے اپنے جذبات کی تہذیب و تربیت کی ہو، اور وہ جذباتی و دماغی توازن کا حامل ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے اپنی انفرادی زندگی اور حیات انسانی کا مقصد اور ان کی انتہا سمجھنے کی کوشش کی ہو یعنی بہت ممکن ہے کہ وہ مہذب ہو لیکن جب وہ صنف غزل میں اس کے مخصوص اوصاف کو قائم رکھتے ہوئے طبع آزما ہوگا تو نتیجہ ایک نیم وحشی کارنامہ ہوگا۔ غزل اس الزام سے اسی وقت بری ہوگی جب غزل باقی نہ رہے اور نظم کی صورت اختیار کر لے۔

غزل سے قطع نظر اگر ہر شعر کو ایک مکمل نظم تصور کیا جائے تو شعر پر بھی نیم وحشی صنف شاعری ہونے کا الزام عائد ہوگا۔ شاعر کی قوت حاسہ مختلف اثرات قبول کرتی اور انہیں ترتیب و ترکیب دیتی رہتی ہے۔ لیکن شعر معرض کے مختصر ہونے میں کسی پیچیدہ جذباتی یا تخیلی تجربے کے سمانے کی گنجائش نہیں۔ شعر میں کسی ایک جذبے یا خیال یا جزوی مشاہدے کی ترجمانی البتہ ممکن ہے لیکن ان کی ابتدا، ان کی غرض و غایت، ان کا دوسرے جذبات، خیالات و مشاہدات سے تعلق یہ سب چیزیں ایک شعر میں نہیں سما سکتیں۔ وحشی اپنے وقتی جذبات کے وجود اس کے احساس اور اس کی تسکین کو کافی تصور کرتا ہے لے

کی اس وقت مطلق فکر نہیں رہتی۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ یہ وقتی جذبہ اس کی انفرادی زندگی کی تکمیل میں مدد یا مخل
کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کرتا اور یہ بھی نہیں دیکھتا کہ اس کی تسکین سے دوسروں کو نفع یا نقصان پہنچے
وہ اپنی زندگی میں ہر خواہش کو عملی شکل دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے شعر میں کسی وقتی احساس کی ترجمانی
س ترجمانی سے اس کے جمالیاتی ذوق کی تسکین ہو جاتی ہے۔ یہی وقتی تسکین اس کی جمالیاتی کاوشوں کا مقصد ہوتی ہے
رتا ہے اور نہ غور و فکر اس کے بس کی بات ہوتی ہے۔ وہ محض اضطراری کیفیت سے مجبور ہو کر اس سے فوری نجات
یہ نجات وہ شعر کی صورت میں حاصل کرتا ہے۔ انسان جب ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہے۔ اور بربریت کی قلمرو
ب کی سرحد میں قدم رکھتا ہے۔ تو وہ وحشیانہ عناصر سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ یا انہیں عناصر میں تغیر و تبدل
۔ زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ وہ نئی زندگی کی نئی ضرورتوں کے لئے نئے ساز و سامان کی تخلیق بھی کرتا
۔ عناصر یک قلم ناپید نہیں ہو جاتے۔ اور وہ تہذیب کے زینے پر پہنچ کر بھی ان سے کام لے سکتا اور لیتا
، محدود قسم کا لطف اٹھا سکتا ہے ـــ ایسا لطف جو اس کی دماغی و جذباتی ہستی کو کامل تشفی نہیں بخشتا۔
سے حاصل ہوتی ہے۔ نظم میں فوری اضطراری کیفیت یا جزئی مشاہدہ کی ترجمانی نہیں ہوتی جس تجربے کا
وہ اہم، قیمتی اور پیچیدہ ہوتا ہے۔ اور اس کی ترجمانی میں غور و فکر سے کام لیا جاتا ہے۔

اگر شعر مفرد کو نظم کی طرح مکمل سمجھا جائے اور اس کو اپنے جمالیاتی ذوق کی تسکین کا آلہ بنا جائے تب بھی
نف شاعری ہوگا اور کسی تہذیب یافتہ دماغ کو اس سے پوری تسکین نہیں مل سکے گی مثلاً :-

ادب لاکھ تھا پھر بھی ان کی طرف ٭ نظر میری اکثر بہکتی رہی

ریں محض ایک واقعے کا بیان ہے۔ ادب کے باوجود، شاعر اس کو دیکھتا رہا اگر یہ کسی ایسے شخص کے
جس کے ذہن میں دنیائے تغزل کا پہلے سے کوئی نقشہ موجود نہیں تو مفہوم اس شعر کا اس کی سمجھ میں نہ آئے گا
غا۔ اور کس شخص کا تھا۔؟ اگر ادب لاکھ تھا۔ تو پھر نظر کیوں بہکتی رہی؟ اگر نظر بہکتی رہی تو اس کا کیا نتیجہ ہوا؟
اہر غیر متعلق واقعے کے بیان سے شاعر کا کیا مدعا ہے۔؟ اس قسم کے سوالات اس کے دماغ میں آ سکتے
طلب سمجھنے کے لئے دنیائے تغزل سے واقفیت ضروری ہے۔ اردو غزلیں اور جو خیالات ان میں ملتے
ور میں اس شعر یا کسی شعر کی عقبی زمین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر یہ عقبی زمین موجود ہے تو پھر شعر کا مفہوم
مجھ میں آ جائے گا۔ شاعر کسی پر عاشق تھا۔ وہ معشوق کا ادب کرتا تھا۔ ایک روز کسی جگہ، کسی محفل میں وہ
سے شاد کام ہوا۔ اسے پاس ادب تو بہت تھا لیکن عشق کے ہاتھوں مجبور! وہ بار بار اسے دیکھا کیا۔
مقصود تھی۔ نظر کا بہکنا عشق کے زور اور حسن کی کشش کا نتیجہ تھا۔ اس تشریح سے یہ مطلب نہیں کہ کسی
میں دیر ہوتی ہے۔ یا اس کے لئے غیر معمولی ادراک یا بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ نہیں عقبی زمین ہمارے
ہے اس لئے مطلب فوراً ذہن نشین ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی پوری تسکین نہیں ہوتی۔ اس شعر میں گویا ایک
رجمانی کی گئی ہے۔ شعر کی "صورت" ناقص اور تکمیل کی محتاج ہے۔ صورت کے ساتھ ساتھ نفس واقعہ یا تجربہ
ہے اسے دوسرے تجربوں کے ساتھ ترکیب دے کر کسی حسین، قیمتی اور پیچیدہ نقش کی تخلیق نہیں کی گئی ہے۔

اس شعر میں یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس کی شاعری کی جذباتی دنیا میں کیا اہمیت ہے اور اس نئے تجربے نے موجودہ تجربوں کی ترکیب وترکیب میں کیا تغیر وتبدل کیا۔ یہاں صرف ایک اضطراری کیفیت کا بیان ہے جس کی غرض وغایت سے شاعر کو کوئی بحث نہیں۔ اس لئے شعر مغز دیکھی نیم وحشی صنف شاعری ہے۔"

یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے۔ کہ اس سے انکار کی گنجائش نہیں لیکن اس سے ہمارے احساس کو کچھ ایسا صدمہ پہنچتا ہے کہ اسے قبول کرنے پر دل آمادہ نہیں ہوتا۔ عقل بہانے تراشتی ہے۔ نمائشی منطق اور تاویل سے اس روشن حقیقت پر پردہ ڈالا جاتا ہے۔ فراق صاحب لکھتے ہیں:-

"آپ غزل کو نیم وحشیانہ صنف بتاتے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو اہل عرب بھی فارسی غزل کی طرح غزلیں کہتے۔ بلکہ اہل عرب میں بھی سب سے اچھی غزل عرب کے بدو اور لٹیرے اور ان پڑھ لوگ کہتے۔ اور ہندوستان یا دوسرے ملکوں کے نیم مہذب گنوار بھی غزل کہہ لیتے بلکہ نیم مہذب اور نیم وحشی قومیں تو بہت مربوط ومسلسل نظمیں کہتی ہیں۔ ان کا تخیل وتصور تو خارجی تسلسل یا واقعاتی تسلسل کا سہارا لئے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ غزل کی کامیاب شاعری غزل کی جامعیت تو کلچر وتہذیب کی انتہائی پختگی و لطافت کی منزلوں میں ممکن ہے۔۔۔۔ مست کریں نظمیں تو اجزائے تغزل ہوگئیں۔"

لطف زبان، اور جوش بیان سے قطع نظر اس ذہن کی سادگی پر حیرت ہوتی ہے۔ شاید ایک مثال سے یہ حقیقت واضح ہوجائے گی۔ غزل کو اکثر براؤننگ کے ڈرامیٹک مونولوگ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ تشبیہ غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ اس قسم کی انگریزی نظموں میں ایک واقعے کا مسلسل بیان ہوتا ہے۔ جو غزل میں نہیں ہوتا۔ اور لطف یہ ہے کہ ڈرامیٹک مونولوگ کو جورج سنیا مانے نیم وحشی صنف شاعری قرار دیا ہے:-

"۔۔۔اس کی مختصر نظموں میں تکمیل نہیں، وضاحت نہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے دھڑ ہیں جو ٹوٹے ہوئے بنائے گئے ہیں اس لئے کہ پڑھنے والے بازوؤں اور ٹانگوں کی کمی کو پورا کریں ان نظموں میں ستائش کے لائق جو چیزیں ہیں وہ یہ ہیں۔ فقروں کی معنی خیزی جوش واحساس کی تیز چمک، مشاہدوں کے ٹکڑوں کا انبار، کبھی کبھار نور کی جھلک اور شعریت کا حسن۔ یہ سب سہی، لیکن ایسی کوئی چیز نہیں جو خالص حسن کی روح میں جذب ہو کر لکھی گئی ہو، جو خلوص کے ساتھ تکمیل کو پہنچائی گئی ہو، جو سادہ اور قطعی طور پر درست ہو۔"

یہی باتیں غزل پر بھی چسپاں ہوتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ براؤننگ کے ڈرامیٹک مونولوگ کی تاریخ "یہی کچھ غزل جیسی" شیکسپیر اور اس کے عہد کے ڈراموں میں سولو کی ہوتی ہے جس میں ڈرامے کا کوئی فرد اپنے خیال سے باتیں کرتا ہے اس میں جو خیالات وجذبات اس کے دل ودماغ میں گزرتے ہیں ان کی عکاسی ہوتی ہے۔ اسی چیز کو براؤننگ نے ڈرامے سے الگ کر کے ایک علیحدہ صنف بنائی اور وہ اس لئے کہ براؤننگ میں قوت تعمیر کی کمی تھی۔ ڈرامہ جیسی پیچیدہ چیز اس کے بس کی بات نہ تھی واقعات وجذبات کے پیچیدہ نظام کے بجائے اس نے ایک واقعہ کو لے کر بیان کیا جاتا ہے جس کی کوئی ابتداء یا انتہا نہیں ہے اس صنف سخن میں تکمیل کی نمایاں کمی ہے۔ ڈرامہ کا پیچیدہ اور مکمل نظام تو خیر ممکن ہی نہیں، اس میں وہ تکمیل بھی نہیں جو لیرک میں ہوتی ہے۔

نی سا ہے۔ بہرکیف اس کے پہلے حصے ہیں عاشقانہ اشعار بھی جائز تھے شاید اس لئے کہ وہ موثرات طرانگیز ہوتے
ن کو سن کر جو انبساط و انشراح پیدا ہوتا ہے اسکے بعد مدحیہ اشعار کا اثر قلب پر زیادہ پڑتا ہے۔ ہاں تو حاتمی کا قول ہے کہ جب
شاعر اپنے قصیدے کا افتتاح کرتا ہے اس کو اپنے بعد کی مدح یا ذم کے ساتھ مربوط و متصل ہونا چاہئے، اس سے الگ
چاہئے کیونکہ قصیدے کی مثال اعضا کے ارتباط و اتصال میں انسانی جسم کی سی ہے۔ اس لئے جب ایک عضو دوسرے
یا صحتِ ترکیب میں اس سے مختلف ہوگا تو جسم میں ایک ایسا عیب پیدا کر دے گا جو اس کے تمام حسن و جمال کو
ے گا۔

س غزل سے قصیدے کا افتتاح ہوتا ہے۔ اس کے اشعار مسلسل و مربوط ہوتے ہیں۔ اور عربی و فارسی کی پہلی غزلوں
و مربوط و مسلسل ہوتے تھے لیکن بعد میں یہ خیال فراموش ہوگیا کہ اشعار غزل کی مثال اعضا کے ارتباط و اتصال میں انسانی جسم
۔ اس لئے جب ایک عضو دوسرے عضو سے الگ یا صحت ترکیب میں اس سے مختلف ہوگا تو جسم میں ایک ایسا عیب
گا جو اس کے تمام حسن و جمال کو برباد کر دے گا۔

لہ وکٹوریا کا عہد ۔ ۔ ۔ ملکہ الیزبتھ کے عہد سے شاید مہذب تھا اس لئے فراق صاحب کے خیال کے مطابق اگر ڈرامیٹک
وحشی صنف شاعری ہے تو اس کا رواج ملکہ الزبتھ کے عہد میں یا اس سے اور پہلے ہونا چاہئے تھا شاید ڈرامیٹک مونولوگ
شاعری اس کی جامعیت بھی کلچر و تہذیب کی انتہائی پختگی و لطافت کی منزلوں میں ممکن ہے۔ شاید ڈرامے مرے
ٹیک مونولوگ کے اجزا بن گئے!

ل کی حمایت میں جہاں براؤننگ کے ڈرامیٹک مونولوگ کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ وہاں اکثر تحت الشعور کی بھی بات
ہے۔ میں اس وقت آرٹ اور تحت الشعور کی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ صرف یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ آرٹسٹ
شعوری طور پر کرتا ہے اور فنی کارنامہ ایک شعوری عمل ہے ممکن ہے کہ خیالات و نقوش آرٹسٹ کے تحت الشعور سے ابھریں
ٹ ان سے جان بوجھ کر کام لیتا ہے:۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں ۔۔ غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

امین غیب سے خیال میں آئیں یا تحت الشعور سے وہ خیال یعنی شعوری زد میں آتے ہیں اور شاعر انہیں شعر کے سانچے
ا ہے۔ وہ نہ تو نوائے سروش ہیں نہ نوائے تحت الشعور ممکن ہے کہ غزل کے مختلف اشعار میں غیر شعوری ربط ہو
ا جو فرائیڈ کے مدد کے بغیر سمجھ میں نہ آئے اسے میں ربط نہیں کہتا۔ اگر آپ فرائیڈ کے کسی پیرو کے پاس اپنا مرض لے
ہت ممکن ہے کہ وہ کچھ الفاظ کی فہرست سامنے رکھ کر آپ سے کہے کہ میں یکے بعد دیگرے یہ الفاظ بولتا ہوں اور ہر لفظ
بغیر سوچے ہوئے جو لفظ آپ کے ذہن میں آئے آپ بے تکلف کہیں۔ مثلاً اس نے کہا۔ "پھول" آپ نے کہا "گلاب
ون" آپ نے کہا "جگر" اس نے کہا "پتھر" آپ نے کہا "سر" اس نے کہا "زنجیر" آپ نے کہا "پاؤں" اس نے کہا "لات" اور
زلف" وغیرہ وغیرہ تو وہ یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ آپ مرض عشق میں مبتلا ہیں۔ خون جگر پیتے ہیں۔ پتھر سے سر توڑتے ہیں
ں میں زنجیر ہے ورنہ یہ ظاہر پتھر اور سر پاؤں اور زنجیر میں کوئی شعوری ربط نہیں۔ اسی طرح بہت ممکن ہے کہ غالب
۔

دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر ✤ یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

اور اس کے بعد والے شعر؛-

شاہ کے ہے غسل صحت کی خبر ✤ دیکھئے کب دن پھریں حمام کے

ان دونوں شعروں میں غیر شعوری ربط ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ آنکھوں کو بیمار کہا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے غالب کا خیال غسل صحت کی طرف گیا۔

بات یہ ہے کہ غزل کے اشعار میں ربط ہوتا ہے۔ اور نہیں بھی ہوتا ہے۔ جہاں شعر کہنے کا یہ طریقہ ہو۔ "غزل کہنے کا طریقہ میں نے یہ دیکھا کہ جب کچھ کہنا ہوتا ہے تو پہلے اس زمین کو اپنے دماغ میں پھراتے ..... جب طبیعت اس طرف متوجہ ہو جاتی تو..... فرماتے..... ہاں غزل کہلوا لو۔ کوئی قافیہ بتایا جاتا آپ اس میں شعر لکھنا شروع کرتے۔ ایک کے بعد دوسرا دوسرے کے بعد تیسرا بس یہ معلوم ہوتا کہ شعر کہے ہوئے یاد ہیں۔ جب تک یہ نہ کہا جاتا کہ حضرت اب تو اس قافیہ میں بہت اچھے اچھے شعر ہو گئے تب تک اسی قافیہ میں کہتے چلے جاتے"

جہاں اس قسم کی قافیہ پیمائی کا نام شاعری ہو وہاں شعور اور تحت الشعور کی بحث بیکار سی معلوم ہوتی ہے۔ ہاں تو غزل کے اشعار میں ربط ہوتا ہے۔ اکثر شعرا ایسی غزلیں بھی لکھتے ہیں جن میں اشعار سلسلہ وار ہوتے ہیں ہر شعر ایک ہی مضمون سے وابستہ ہوتا ہے۔ یا کسی خاص موضوع کے بیان میں امداد کرتا ہے۔ اور صورت حال نظم کی سی ہوتی ہے۔ غالب کی مشہور غزل جس کا مطلع ہے۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے ✤ جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

اسی قسم کی ہے۔ اشعار میں مطابقت ہے۔ لیکن اس غزل میں اور کسی نظم میں فرق مشترقین ہے۔ یہاں چند خیالات و جذبات منسلک نظر نہیں آتے۔ وہ مربوط ہو کر یگانگی اختیار نہیں کرتے اس کے برعکس ایک ہی مدعا کو بار بار مختلف پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ نفس مضمون واحد ہے جس کا پہلے مصرع میں مکمل اظہار ہے؛

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے

دل کو پھر ہوس ہے کہ عشق کی کاہشوں اور دلفریبیوں سے لطف اٹھائیے۔ اسی کا مختلف طور پر اظہار ہے۔ غالب نے اپنی ساری قوت متخیلہ محض الفاظ پر صرف کر دی ہے۔ اس جدت طرازی کا ماحصل یہی ہے کہ سیدھی سادی بات کی بوقلموں پیرائے اور رنگین بندشوں میں تکرار ہو جس ہے تو محض لفظی اور ساری تحسین و قعت جدت طرازی ہے۔ یہ سوال بھی پیدا نہیں ہوتا کہ شاعر کو اس "نظم" میں کسی تجربے کا اظہار مقصود بھی ہے یا نہیں۔ اور اگر تجربہ تھا تو اسے اس تجربے نے پس پشت ڈال دیا اور یہ تجربہ لفظوں کی الٹ پھیر نئے نئے نقوش کی تراش خراش، خیال آفرینی کے زور شور سے وابستہ ہے۔

درد کی ایک غزل ہے۔

کاش تا شمع نہ ہوتا گذر پروانہ۔ ✤ تم نے کیا قہر کیا بال و پر پروانہ

شمع کے مرنے تو بہتیرے دیکھتا تھا ✤ پھر جو دیکھا تو نہ پایا اثر پروانہ

[illegible]

ایک ہی جست میں کی منزل مقصود اس نے ۔۔۔ راہ پر دور شک کی جلے ہے سفر پروانہ
شمع تو جل بجھی اور صبح نمودار ہوئی
پوچھوں اسے دیتے ہیں کس سے خبر پروانہ

ان ایک ہی خیال کی بار بار تکرار نہیں۔ پروانہ، شمع کا عاشق، اپنی تعمیر میں تخریب کی صورت پنہاں رکھتا ہے۔ یا عجز ہے اک صورت خرابی کی، اس کی زندگی کا سبب اس کی موت کا باعث ہے۔ ظاہر میں آنکھ اس راز کو نہیں پروانے کی فنا میں اس کی زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ اس لئے افسوس ہوتا ہے کہ اگر پروانہ شمع کے حسن کا شیدا شمع تک اس کی رسائی نہ ہوتی تو بے چارہ ناحق اپنی جان کیوں دیتا۔ اس کی موت کا الزام ہے پروانے کی طاقت یہی طاقت پرواز جو اسے معشوق کا قرب نصیب کرتی ہے اس کی ہلاکت کا ذریعہ بھی ہوتی ہے۔ ابھی پروانہ سن کا مزہ لوٹ رہا تھا اور ابھی نیست و نابود ہو گیا۔ قصور صرف بال و پر کا نہیں، پروانے کی نظر بھی اس کی ہلا ہے۔ جو اسے جان بوجھ کر آتش سوزاں کے پاس لے جاتی ہے۔ پروانے کا جل مرنا باعث حسرت ہی سہی، اس کی تقدیر ہی ہے جو اپنی ہمت پر تازیانے کا کام کرتی ہے۔ پروانہ اپنی منزل سے باخبر ہے۔ اور منزل مقصود تک پہنچ بھی جاتا ہی جست میں، اس کی مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ شب اسی مشاہدے میں گزری صبح کو نہ شمع تھی نہ پروانہ۔ شمع تو جل لنے کی خبر کسے معلوم!

دانے کا عشق، بال و پر پروانہ کی ہلاکت نشان طاقت پرواز، نظر پروانہ کی کم نظری، پروانے کا چشم زدن میں جل بجھنا۔ ت وغیرہ کی سبق آموزی، حسن شمع اور عشق پروانہ کی ناپائیداری۔ غرض کتنے خیالات کا اجتماع ہے اور یہ خیالات دل ضے گئے ہیں لیکن مکمل طمانیت و سکون دماغ کو میسر نہیں۔ شمع و پروانہ کا راز و نیاز عام موضوع غزل ہے۔ لیکن اصل وجہ ہمیت نہیں۔ اس غزل کی مثال پچکاری کی ہے۔ الگ الگ ٹکڑے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں اور ایک قسم کا تناسب ا ہو گیا ہے لیکن وہ مطابقت کہاں جو کسی حسین گلاب کے مختلف اجزا میں ہوتی ہے، وہ ربط کہاں جو اس کے ں ہوتا ہے۔ یہی چیز ہے جو نظم میں ملتی ہے۔ مگر مربوط غزل میں بہت ملتی ہے۔ فراق کی ایک غزل ہے:۔

شام غم کچھ اس نگاہ ناز کی باتیں کرو ✦ بیخودی بڑھتی چلی ہے راز کی باتیں کرو
یہ سکوت یاس، یہ دل کی رگوں کا ٹوٹنا ✦ خامشی میں کچھ شکست ساز کی باتیں کرو
نکہت زلف پریشاں داستان شام غم ✦ صبح ہونے تک اسی انداز کی باتیں کرو
نام بھی لیتا ہے جس کا اک جہان رنگ و بو ✦ آج کچھ اس نوبہار ناز کی باتیں کرو
کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا ✦ کچھ فضا کچھ حسرت پرواز کی باتیں کرو
جس کی فرقت نے پلٹ دی عشق کی کایا فراق ✦ آج اس عیسیٰ نفس دمساز کی باتیں کرو

پھر اس کی تشریح یوں کرتے ہیں:۔

سی اور غم کی شام ہے۔ آؤ کچھ اس کی نگاہوں کا ذکر چھیڑ دیں۔ کیونکہ بیخودی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اور اس وقت راز جاسکتے۔ یہ سکوت یاس، یہ دل کی رگوں کا ٹوٹنا۔ اس خامشی میں تو شکست ساز کا ذکر چھیڑنا مناسب معلوم ہوتا ہے

اس کے بالوں کی خوشبو یا شام غم کی داستان، رات بھر اسی انداز کی باتیں ہوں۔ اس کا تو نام لینا بھی ایک جہانِ رنگ و بو ہے ہاں آج تو اسی نوبہار ناز کی داستان کہو۔ ہم اسیروں کی بھی کیا زندگی ہے، ہمارے قفس کی تیلیوں سے نور سا چھن رہا ہے۔ اس مجبوری اور دلِ تنگی کو بھولنے کے لئے کچھ کھلی ہوئی فضا اور کچھ اڑنے کی حسرت کا ذکر کرو فراق جس کی فرقت نے عشق کی کایا پلٹ دی اسی عیسیٰ نفس دم ساز کا ذکر آج چھیڑ دو۔

ظاہر ہے کہ غزل و نثر میں وہ بے ربطی اور انتشار تو نہیں جو غزل میں عام طور سے پایا جاتا ہے۔ لیکن وہ ربط، وہ خیال کا ارتقار بھی نہیں جو درد کی غزل میں ہے۔ ممکن ہے کہ ہر اچھی غزل ایک ازلی و ابدی و عالمگیر غزل کی کچھ آوازوں کی آواز بازگشت یا اس کے بے شمار پردہ ہائے ساز کے نغموں کی نمو سے وہ ازلی و ابدی غزل جسے ہم وجود یا زندگی کہتے ہیں، حیات و کائنات کہتے ہیں۔ لیکن یہ بات صرف غزل کے لئے مخصوص نہیں۔ پھر یہ بھی نہیں سمجھ میں آتا کہ اس غزل کا ہر شعر زندگی کے کس قانون یا مستقل طور پر کس دلکش مسئلہ یا منظر پر حکم لگاتا ہے۔ تھیوفیل گوتی ایر کی ایک چھوٹی سی نظم ہے:۔

اس بیچے کھچے، لنڈورے جنگل میں
رکھا ہی کیا ہے۔ بس ایک شاخ سے
ایک بھولا بھٹکا پتہ لٹک رہا ہے
ہاں کچھ بھی نہیں۔ بس ایک پتہ اور ایک چڑیا

میری روح میں رکھا ہی کیا ہے
بس محبت اور محبت کا ترانہ
لیکن خزاں، کی ہوا کی سنسناہٹ
اس ترانہ کو سننے نہیں دیتی
چڑیا اڑ گئی اور پتہ جھڑ گیا
محبت بجھ گئی۔ اب جاڑا آپہنچا
اے ننھی چڑیا! مری قبر پر گانا
جب درخت پھر ہرے بھرے ہو جائیں

نظم خصوصاً فرانسیسی نظم کا ترجمہ ناممکن ہے پھر بھی اس کا اندازہ ممکن ہے کہ جو بات جو ربط جو تسلسل، جو تکمیل، ازلی و ابدی و عالمگیر غزل کی بازگشت اس نظم میں ہے وہ فراق کی غزل میں نہیں۔ فراق ایک ہی سانس میں راز کی باتیں نکہت ساز کی باتیں، نوبہار ناز کی باتیں، حسرت پرواز کی باتیں، عیسیٰ نفس دم ساز کی باتیں کرتے ہیں، غرض باتیں ہی باتیں کرتے ہیں ان باتوں کو طول دے سکتے ہیں یا ان کو مختصر کر سکتے ہیں۔ لیکن ان کی غزل میں وہ تکمیل، وہ صورت کا حسن، وہ اجمال بیان اور وہ اثر بھی نہیں جو اس نظم میں ہے۔ فراق کہتے ہیں۔

جن سکوت یاس جن جن ل کی رگوں کے ٹوٹنے کا فراق ذکر کرتے ہیں۔ اسی کی اس نظم میں مکمل عکاسی ہے۔ اور وہی چیز اس عر میں نہیں کیونکہ "فراق" "رگوں کا ٹوٹنا" اور "شکست ساز" "خامشی" اور باتیں کرو، کے لفظی ٹوٹکے دھندے میں پھنس جاتے یں۔ لیکن اس نظم کے تین بند امل ہیں پہلے بند میں سکوت یاس کی خارجی عکاسی ہے۔ اور بہت مؤثر عکاسی ہے۔ پوری تصویر ماف نظر آجاتی ہے۔ اور صرف چند لفظوں، چند اجزا سے یہ تصویر بنائی گئی ہے۔ لنڈ ورا جنگل تنہا پتہ اور ایک چڑیا بس یہی جزا ہیں۔ زیادہ لفظوں میں بھی اس سے زیادہ صاف اور مؤثر تصویر ممکن نہیں۔ یہ تصویر یں خارجی دنیا میں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کو شاعر کی بے سروسامانی، سکوت یاس سے ہمدردی ہے۔ یہ خارجی تصویر خارجی بھی ہے اور داخلی بھی۔ گویا خارجی نیا شاعر کے احساس میں جذب ہو گئی ہے۔ خارجی دنیا سے نظروں کی دنیا کی طرف جاتی ہے۔ یہاں بھی وہی بے سروسامانی ہے۔ ایک تصویر دوسری تصویر کی تکمیل کرتی ہے۔ اسے مستحکم بناتی ہے۔ اور آخری بند میں اس تصویر کی تکمیل ہوتی ہے۔ خارجی داخلی تصویریں ایک دوسرے میں جذب ہو جاتی ہیں اور دونوں میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اگر غزل میں اثمل اور بے جوڑ یں نہیں ہوتیں تو نظم میں تو اثمل اور بے جوڑ باتیں ممکن ہی نہیں۔ اور جو تشفی، جو کامل سکون اس نظم کے پڑھنے سے ملتا ہے ا کسی غزل میں نہیں ملتا ہے۔

اگر ہم سمجھ سوچ کر اطمینان کے ساتھ پوری پوری باتیں کر سکتے ہیں تو پھر اکھڑی اکھڑی باتیں کیوں کریں!۔

سرور صاحب کہتے ہیں:۔

"غزل گو شاعر انسان دوستی کے جذبات رکھتا ہے۔ مگر ان سے کوئی بڑا کام نہیں لیتا یہی وجہ ہے کہ وہ بکھری ہوئی پھیلی پھیلی ہوئی بجلیوں کا قائل ہے۔ غزل کے نشتروں سے ایک لطیف خلش پیدا ہوتی ہے۔ اور اس سے کام لیا جاتا رہا ہے۔ ابھی بھی لیا جا سکتا ہے۔ مگر یہ نشتر تلوار نہیں بن سکتے۔ غزل کی زبان بڑی دھلی منجھی چیز ہے۔ مگر اس میں انفرادیت کو پھیلنے پھولنے موقع مشکل سے ملتا ہے۔ اس کی رمزیت خاصی جامع اور گہری ہے مگر پھاوڑے کو پھاوڑا کہنے کے دور میں زیادہ عرصے تک ہم نہیں دے سکتی۔ اس لئے شاعری کا مستقبل زیادہ تر غزل سے نہیں نظم سے وابستہ ہے"۔

ظاہر ہے کہ سرور صاحب بھی وہی کہتے ہیں جو میں نے کہا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پھاوڑے کو پھاوڑا کہنے کے دور ں بھی وہ پھاوڑے کو پھاوڑا کہنا نہیں چاہتے:

ندوی

آزاد

مولانا آزاد سبحانی نے جب انتقال کیا تو مولانا عبدالماجد دریا بادی نے ان پر ایک نوٹ لکھا تھا جیسے وہ ہر مرنے والے پر اپنے خاص انداز میں لکھتے ہیں، لیکن اس کا ایک جملہ ہمیں بہت کھٹکا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ مولانا ابوالکلام کے تخلص "آزاد" نے وہ شہرت اور مقبولیت حاصل کی کہ اور لوگ بھی آزاد ہو گئے ــــ

مولانا آزاد سبحانی اگر عمر میں مولانا ابوالکلام سے کچھ بڑے نہ تھے تو چھوٹے بھی نہ تھے، وہ خود بھی بے انتہا ذہین فطین اور صاحب علم تھے، پھر انہوں نے اپنا تخلص آزاد ہی نہیں رکھا بلکہ آزاد سبحانی اپنے کو لکھا اور کہا اور اسی نام سے ہندوستان بھر میں مشہور بھی ہوئے۔ اپنے وقت کے غیر معمولی خطیب وہ بھی تھے ــــ اور صرف آزاد نہیں تھے۔

پھر آزاد تخلص مولانا آزاد اور مولانا آزاد سبحانی سے پہلے بھی رکھے گئے ہیں اور ان لوگوں کو بھی خاصی شہرت و مقبولیت حاصل رہی ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد، اور مولانا غلام علی آزاد بلگرامی کی شہرت تو آج بھی تازہ ہے۔ تذکروں میں دیکھئے ان سے بھی پہلے متعدد آزاد گذر چکے ہیں، مثلاً

محمد فاضل آزاد ــــــــ گل گلستان دکن و از شعرائے کہن است، در زمان ولی کسوت حیات بہ بر می داشت و خود را یکے از شاگردان او می پنداشت، چنانچہ ولی می گوید ؎

آزاد سے سنا ہوں یہ مصرعہ مناسب ٭ جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ پایا

آزاد کا شعر ہے ؎

آئین جہاں کی ساری آزاد ہنعتیں پر ٭ جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ پایا

فقیر اللہ آزاد ــــــــ از متقدمین، وار حیدر آباد ہمراہ فراقی دکھنی در شاہجہان آباد آمدہ بود ــــ

تلاش و جستجو سے کام لیا جائے اور اردو و فارسی کے تذکرے دیکھے جائیں تو نہ جانے کتنے آزاد ہمارے سامنے آجائیں ڈیڑھ درجن کی فہرست تو میں ابھی حاضر کئے دیتا ہوں، ان میں متقدمین بھی ہیں متوسطین بھی اور متاخرین بھی۔ مولانا آزاد سبحانی اور مولانا ابوالکلام آزاد دونوں سے پہلے کے بھی اور بعد کے بھی ــ ملاحظہ کیجئے

(۱) محمد فاضل آزاد دکھنی، قدیم (۲) فقیر اللہ آزاد دکھنی، قدیم، (۳) خواجہ زین العابدین آزاد، جوان محمد شاہی (۴) حافظ غلام محمد خان آزاد وزیر آبادی بہ عہد نواب فیروز جنگ غازی الدین خان (۵) غلام علی آزاد بلگرامی، صاحب

نی حسین فاضل لکھنوی

آتش اور ان کا کلام

ں کے غالب و مومن اور لکھنؤ کے آتش و ناسخ کا نام کس نے نہ سنا ہوگا۔ چاروں معاصر اپنے زمانے کے نامور شاعر اور تاریخ ادب کے
سے تھے اتفاق یہ ہے کہ غالب و ناسخ، مومن و آتش میں بعض مشابہتیں بھی پائی جاتی ہیں۔
ں لکھنؤ اسکول کے پہلے فن کار اور ادب کے ایسے تاریخی موڑ کا بڑا منارہ ہیں جن کا فن جاذب نگاہ اور کردار بہت حسین ہے "آب حیات"
نے انکے سوانحی حالات اور بعض مضمون نگاروں نے ان کے فن کا جائزہ بھی لیا ہے۔
نظر سطور میں مذکورہ مآخذ کو اسی حد تک استعمال کیا گیا ہے کہ جس حد تک ان سے نتائج حاصل کی جا سکیں فقط انکی باتوں کو دہرانا
بعض نئے مآخذ اور مفید باتیں جو ان کتابوں کے وقت ناپید تھے ان کی روشنی میں مضمون کو تیار کیا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے
لام آتش کے انتخاب ان کے فن کا صحیح تعارف ہو سکے اسی طرح ان کی بلند شخصیت پر روشنی پڑ سکے

خاندان اور ماحول

مصحفی نے ریاض الفصحا میں لکھا ہے: سلسلہ نسبش بخواجہ عبید اللہ احرار منتہی می شود۔ بزرگانش در بغداد
توطن داشتند۔ بعد از جلائے وطن قدیم در شاہجہاں آباد کہ بہ قلعہ کہنہ "شہرت دارد استقامت گرفتند"
جہ علی بخش شکیل و وجیہہ، صوفی منش تھے پرانے قلعے کے خواجہ زادوں میں پیری مریدی تو تھی ہی یہی اپنے خاندانی مسلک پر
ں آباد کی کشش نے خواجہ صاحب کو کھینچ بلایا، اور یہیں محلہ "مغل پورہ" میں آ بسے مگر ان کی زندگی میں وہی کم مائی رہی جو پہلے
انھوں نے کسی امیر کبیر سے وابستگی یا ہنگامہ آفریں زندگی کو پسند نہ کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شجاع الدولہ نے شمالی ہند اور اسکی
طاقتوں کا مقابلہ شروع کر رکھا تھا۔ فیض آباد میں ہر طرف فوجی سپاہی، دلی کے بانکے اور عوام کی شورہ پشتی کے ساتھ ساتھ
کے ہنگامے بھی گرم تھے۔ علم دوست امیروں کے یہاں مباحثے اور مشاعرے ہوتے تھے۔ مسجدوں میں وعظ اور مدرسوں
ں کا بازار گرم تھا

ولادت و تربیت

اسی زمانہ میں خواجہ حیدر علی آتش کی ولادت ہوئی۔ تاریخ ولادت تو کسی تذکرے میں نہیں ملتی البتہ "مذاب لقا"

اب عالی (شجاع الدولہ بہادر) نے اپنے فرزند نواب آصف الدولہ بہادر کی شادی نواب خان خانان کی پوتی سے کی جس میں
روپیہ صرف کیا یہ واقعہ ۱۱۸۳ھ کا ہے (۱) ابھی یہ چہل پہل ہو رہی تھی کہ خواجہ علی بخش کے گھر میں خواجہ حیدر علی
ہوئے " صفحہ ۳
رت ہی نے لکھا ہے کہ خواجہ میر صاحب کے انتقال کے وقت اکتالیس برس کے تھے، اور تسلیم نے جب انھیں دیکھا تو ستر
جہ رکن الدین نے جب دیکھا تو اسی کے قریب کا اندازہ لگایا تھا مصحفی کہتے ہیں: حالانکہ سن عمرش بہ بست و نہ سالگی رسیدہ"

تذکرہ ریاض الفصحا چونکہ ۱۲۲۱ھ میں شروع ہوا اور آتش کا ذکر آغاز ہی میں ہے اس لئے ۱۱۹۳ھ سال ولادت ہوتا ہے۔ اور تسلیم کے اندازے سے بھی یہی ٹھیک ہے اور خواجہ رکن الدین کے انداز سے بھی اسی کے لگ بھگ ہے اس اعتبار سے تین سنہ معین ہوئے ۱۱۸۱ھ اور بقول مصحفی و تسلیم ۱۱۹۲ھ اور بقول احسان دانش ۱۱۸۵ھ (۱۷۷۱ء د ۲) تو بترتیب مذکور ۱۲۶۳ھ میں تراسی، اکہتر یا اکیاسی یا بچاسی برس بنتے ہیں۔

چونکہ دیکھنے والوں نے اسّی سے زیادہ کا اندازہ نہیں لگایا اسلئے ۸۰ اور ۱۱۸۶ یعنی ۱۷۷۴ اور (۱۸۴۶ء) والی روایت تو قابل بحث نہیں البتہ مصحفی اور عشرت کا بیان (۱۱۹۲ اور ۱۱۸۶ھ) توجہ طلب ہے۔ مصحفی کہتے ہیں کہ "جوان وجیہہ" ہے اور "ابتدائے موزونی طبع سے مجھے کلام دکھاتے ہیں۔"

عشرت کہتے ہیں کہ "وہ میر کے انتقال کے وقت اکتالیس برس کے تھے" اور یہ دونوں باتیں جوڑ نہیں کھاتیں کیونکہ اگر پہلی بات مانی جائے تو ۱۲۲۵ھ (سنہ وفات میر) میں تینتیس برس کے ہوتے ہیں۔ اور یہ ماننا پڑیگا کہ تسلیم نے وقت وفات دیکھا تھا۔

اور اگر عشرت کی بات ٹھیک ہے کہ وہ ۱۱۸۴ھ میں پیدا ہوئے تو سال ابتدائے تالیف ریاض الفصحا کے وقت انکی عمر سینتیس سال، اور وفات میر ۱۲۲۵ھ میں اکتالیس اور ۱۲۶۳ھ میں اناسی برس کے تھے جیسا کہ خواجہ رکن الدین کا اندازہ ہے۔

اس لئے میرا خیال یہ ہے کہ ۱۱۸۵ھ اور ۱۱۹۲ھ کے درمیان ولادت ماننا چاہئے اور دو تین سال کا فرق یوں نکل جائیگا کہ مصحفی نے ۱۲۲۰ھ سے اور تسلیم نے آتش کے مرنے سے دو چار سال پہلے دیکھا اور عمر کا اندازہ لگایا۔ کیونکہ خواجہ رکن الدین تو کہتے ہیں کہ انکے دیکھنے کے آٹھ دن بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ رہا مصحفی کا قول تو اس میں ایک تو یہ ہے کہ ان لوگوں کے یہاں "حالا" سے مراد وقت تحریر حال ہوتا ہے جو ہمیں معلوم نہیں ہوسکتا، دوسرے یہ کہ انھوں آتش کے کئی ایسے شاگرد بتائے ہیں جن کی عمر خواجہ سے بڑی تھی جیسے شائق جو تیس سال کے اور افضل جو تیس سے زیادہ اور واہب جو سینتیس برس کے تھے۔

بہر حال بچپنے میں تکمیل تعلیم و جوانی سے پہلے باپ نے انتقال کیا مزاج میں آوارہ گردی تھی اور سر پر کوئی مربی موجود نہ تھا، فوج کے لڑکوں اور سپاہی زادوں کی صحبت میں بانکپن اور شورہ پشتی پیدا ہوگئی بانکوں اور سپاہیوں کی قدر ہوتی تھی اسلئے سنقل بچوں کی صحبت سے شمشیر زنی کا شوق ہوا، ہاتھ ہلکا اور طبیعت نڈر تھی، ہاتھ صاف کرنے لگے بے شمار چوٹیں کھائیں، ہزاروں ٹانکے لگوائے اور تلوریئے مشہور ہوگئے۔

اس زمانے میں نواب مرزا (۱) محمد تقی ترقی فیض آباد کے نامور رئیس اور اس جوہر کے قدرداں تھے، انھوں نے ناسخ کی طرح آتش کو بھی نوکر رکھ لیا (۲) ان کے یہاں علم و ادب کا چرچا تھا، آئے دن مشاعرے اور مباحثے ہوتے تھے، خود بھی بڑے اچھے شاعر تھے۔ استادوں کی قدر کرتے تھے، قاسم نے مجموعہ نغز میں لکھا ہے کہ "منش درد او و درد رنگین، الغرض بنایت خوب فعل شیں گویند کہ در فیض آباد طرح مراختہ می انداخت و بہ ہر کس بزرگانہ می ساخت" (صفحہ ۱۲۵)

اسی لئے ان مشاعروں میں میر و جرأت وغیرہ بھی آتے تھے، قاسم اسی تذکرے کے صفحہ ۱۵۵ (جلد اول) پر جرأت کے حال میں ایک مشاعرے کا ذکر یوں کیا ہے۔

(۱) اس حساب سے خواجہ کی عمر میر کے انتقال (۱۲۲۵) کے وقت ۴۴ برس ہوتی ہے اور ریاض الفصحا کی ابتدائے تصنیف (۱۲۲۰ھ) کے وقت چالیس سال کی۔ جو آگے لکھے جانے والے بیانات کے خلاف ہے۔ م۔ح

(۲) بہار سخن صفحہ ۴۱

سعد انہیں کے مشاعرے میں تمام اکابر جمع تھے جرأت نے غزل پڑھی اور اتنی کامیاب ہوئی کہ کان پڑے آواز نہیں سنائی دیتی
ب بیٹھے تھے۔ غزل ختم کر کے جرأت نے جرأت کی اور میر کے پاس پہنچ کر داد چاہی میر صاحب نے دو تین مرتبہ ٹالا مگر ان کا اصرار
رکہنے لگے کر (۱) دو بھی اس کی ضد ہے کہ میں اپنی رائے ضرور دوں تو سنو یہ کیفیت اس کی یہ ہے کہ تم شعر تو کہنا نہیں
رکھتا۔ کہانی آب حیات) کہہ لیا کرو "کیا بعید ہے کہ آتش نے بس یہ کر کچھ کہنا سیکھ لیا ہو، لکھنؤ پہنچ تو آغاز شباب تھا
جوال الا تلواریوں کا ماحول اس نمود و نمود کے اکھاڑے کہاں، اب دو ہی صورتیں تھیں یا تو علمی چرچے پسند کرتے یا پھر
ہیں کہ شریف آوارہ گرد بنتے پھر فیض آباد کے محسن نے کچھ علمی ذوق دیدیا تھا ساتھ ہی شاعر مزاج تھا بقول مصحفی
مصحفی اپنے شاگردوں کو ادب پڑھایا کرتے تھے (۲) آتش نے بھی ضرور پڑھا اور مطالعہ بھی کیا، لیکن وارفتہ مزاجی نے
بڑھانے دی۔ مصحفی نے لکھا ہے کہ:۔

ے موزونی طبع کم کم خیال شعر فارسی و ہندی بر دومی کرد اما میلان طبعش بطرف فارسی بیشتر بود، واں سعد با کلام منظوم
ری گذارید، وبہ رافت طبعش ازاں جلوہ ظہوری داد " اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی سے کافی واقفیت تھی، آزاد
کافیہ کو کافی سمجھا " اور کافیہ تک کا نصاب تعلیم متوسط عربی دان کے لئے تھا اس کے ساتھ صرف منطق و ادب و عربی (۴)
تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ متوسط درجے میں اچھی خاصی تعلیم تھی مگر کمال ناسخ ہی کو تھا۔ چنانچہ لغت وغیرہ عروض میں انہیں
(۴)

ادادو شاگردوں کی زیادتی اور طبیعت کی بے باکی نے استاد سے چشمک ہی مولانا آزاد کہتے ہیں کہ:۔
نے بنیاد اختلاف کن کن جزئیات پر قائم ہوئی ہوگی مگر جہاں سے کھل کھلا بگڑی اس کی حکایت یہ سنی ہے کہ کسی مشاعرے
ہا بگڑا، یا "دامن بگڑا" سب کے ساتھ خواجہ نے بھی غزل کہی اور "کفن" "دہن" کے قافیے استاد کو سنا کر کہا۔
یں کوئی یہ شعر نکالے تو کلیجہ نکل پڑے۔ استاد کو یہ بات ناگوار گذری ہوگی کہ ایک نو مشق لڑکے کی غزل کو توجہ سے
نے یوں کہے

لکھا ہے خاک کوئے یار سے اے دیدۂ گریاں   قیامت میں کروں گا گر کوئی حرف کفن بگڑا

نہ ہو محسوس جو شے کس طرح نقشے میں ٹھیک اترے
شبیہ یار کھنچوائی، کمر بگڑی دہن بگڑا

ادہ کامیاب ہوئے اور تاڑنے والے تاڑ گئے کہ استاد کی استادی ہے۔ خواجہ صاحب اسی وقت اٹھ کر مصحفی
غزل ہاتھ سے پھینک کر کہا کہ یہ آپ ہمارے کلیجے میں چھریاں مارتے ہیں (۵) نہیں تو اس لونڈے کا کیا منہ تھا جو ان
شعر نکال لیتا۔ اس کے بعد سے کشیدگی پیدا ہو گئی۔
دیکھنے والوں نے دو تصویریں بتائی ہیں۔ خوبصورت و خوش رو، کشیدہ قامت چہرہ بیضاوی سپاہیانہ اور
وضع قائم رکھنے کے لئے کچھ فقیری بھی لئے ہوئے تھے چار ابرو صاف سر پر ایک زلف اور کبھی کبھی شاہی بال
آب بقا میں نقل سے میر لکھا گیا ہے۔ مجموعہ نغز و آب حیات دغیرہ خانہ جاوید میں مرزا ہی ہے۔
ے کل رعنا ص۔

یشان بدیں جود کندمی پیر شد تا چار می گوید وایں الفاظ ہندی بر زبان تخت زاماں وے گذشت "

کی طرح حیدری چغہ جس میں سبزی کا طرہ لگا - کمر میں تلوار - (آبِ حیات)

۱ :- آدھا سر منڈا آدھے پر پٹے کبھی قالب دار، کبھی سیدھے دار ٹوپی سر پر کھانڈا باندھے ایک پیٹھے جوانوں کی طرح کبھو بھنگیڑوں کی دوکان پر چرس کا بھی ایک دم لگا لیتے اور اگر راستے میں کسی نے مونچھ اونچی کر لی، تو بس آگ ہی کھانڈا نکال "آؤ سپاہی پھر ہو جائیں" "دو دو ہاتھ" (۲)۔ آخری عمر میں بڑھاپے کی وجہ ہاتھ میں ڈنڈا ہوتا جس میں ایک سونے کا چھا ضرورت کے وقت فاقہ شکنی کے کام لاتے - کبھی بالشت بھر کی داڑھی رکھ لی، کبھی مونچھیں بڑھا لیں - مگر وضع وہی آزادانہ سپاہیانہ - شاعروں میں بانکے اور شاگرد ساتھ ہوتے تھے - کبھی کبھی مستی میں میدانوں اور جنگلوں کی راہ لیتے تھے - صفدر مرزا پوری نے لکھا ہے کہ: "کہیں جا رہے تھے، کسی نے پوچھا خواجہ صاحب کدھر کا قصد ہے؟

فرمایا: "آج مرغ لڑیں گے وہاں جا رہا ہوں" اس نے کہا "مُرغ لڑیں گے یا مُرَغ؟" فرمایا لکھنے کی پابندی تھی تو مرغ ہی ہو ہیں، زبانوں پر مُرَغ ہی ہے -" (حسن خیال ص ۱۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مُرغ بازی سے بھی دلچسپی تھی

مزاج میں سادگی، طبیعت میں استغنا، بے حسد، صاف دل، سیدھے سادھے اور بے پروا آدمی تھے، جو ملتا خرچ کر ملاقات میں سب کو ایک نظر سے دیکھتے ہاں امیروں سے ذرا شان کی لیتے تھے -

بود و باش | نوازگنج کے قریب چونیوں سے آگے مادھولال کی چڑھائی کے اتار میں ایک کچا مکان جس میں باغ بھی تھا، خرید لیا اسی میں بیٹھک کے لئے دیواریں کھنچوا کر ایک چھپر ڈال لیا تھا (جو لکھنؤ کے متوسط الحال سادہ مزاج شریفوں کا طریقہ تھا) اسی میں نرکل کی چٹائیوں کے فرش پر شاگردوں اور دوستوں سے ملاقات ہوتی تھی - آخر میں ضعف و بیماری مرض کی وجہ سے ایک پلنگ آگیا تھا اس پر بیٹھے لیٹے اور وارث علی ان کے رفیق خاص بھنگ گھونٹتے تھے، ایک حقہ بھی ساتھ تھا جو بھی پیتے تھے اور آنے والوں کی خدمت میں بھی پیش کرتے تھے - تنخواہ اسّی روپے دربار سے یا ولی عہد (واجد علی شاہ) سے ملتے پچیس روپے جوش ملیح آبادی کے دادا فقیر محمد خاں رسالدار، دیتے تھے، رند (۳) اور خلیل کی طرح دوسرے شاگرد بھی کچھ نہ کچھ ہدیتہً پیش کرتے رہتے تھے - مگر سب ضیافت میں اڑا دیتے کیونکہ تنہا خوری کے عادی اور فاقوں سے گھبراتے نہ تھے - ان کا شعر ہے ؎

نعمت تقدیر بھی خو نہیں تنہا خوری کی — بانٹ کھاتا ہوں جو ہوتے ہیں میسر ٹکڑے
آتش جو چاہے پالے توکل کو ـــ مکھی — جو صبح کو ملے نہ رہے شام کے لئے

ایک شریف خاندان میں شادی کر لی تھی آمدنی میں سے پندرہ روپے گھر میں دیتے تھے جس سے بیگم نے گھر سنبھال رکھا دروازے پر ایک گھوڑا بھی بندھا تھا -

<u>شاگرد تو بہت تھے مثلاً پنڈت دیا شنکر نسیم</u> - ۲- میر وزیر علی صبا (گلستان بے خزاں) - ۳- لالہ شیورام شائق -

(۱) مولوی عبد القادر رامپوری نے لکھا ہے: "یک روز ملاقات تفصیلی میسر شد، دیدم کہ از دکان بنگالی ... بیشتر مردم ... در کل گشتی ... میر نجات دادے - و اصلاح اشعار اکثرے ہم می کرد" (حاشیہ دستور الفصاحت از مولانا عرشی)
(۲) تاریخ ادب عسکری ص ۲۲۱
(۳) دیوان ثانی رند ص ۱۰

ین صمند - ۵ - حسن یار خاں افضل - ۶ - جیا لال گلشن - ۷ - میر ناصر مقتول ۱۲۳۰ھ - ۸ - شیخ ہدایت حیدر راہب در ریاض الفصحا
ت علی خلیل - ۱۰ - سید محمد اکبر قدسی - ۱۱ - جنوں داماد روشن الدولہ - ۱۲ - محمد علی خاں حزیں - ۱۳ - سید محمد خاں رند - ۱۴ -
سین - ۱۵ - حسین صاحب زادہ - غلام حسین رامپوری - ۱۶ - منشی سید محمد عبد البصیر - ۱۷ - مرزا عنایت علی ماہ برادر
۱۸ - الف شاہ جولان (م ۱۲۹۴ھ) - ۱۹ - نواب مرزا شوق (م ۱۸۷۱ء) ۲۰ - آغا حجو شرف -
ان سب سے کمال اور فن کے لحاظ سے محبت کرتے تھے - حسن خیال میں یہ بھی قصہ ہے کہ - ایک مشاعرے میں نسیم نے غزل
ہے

معتقد جو آتش ہندی کا اے نسیم — کہتے ہیں پارسی کہ یہ آتش پرست ہے

نے آوازہ کسا " آتش کو کہتے ہیں کہ برہمن پرست ہے "
استاد و شاگرد کے تعلقات سے واقف تھے منہ پھیر پھیر کر ہنسنے لگے (۱) لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ نسیم سا بھی جت
ی مثنوی " گلزار نسیم " آتش کے لئے بھی " فخریہ " ہے
یر علی صبا (م ۱۲۷۱ھ) (جنہیں آتش کا جانشین بنایا گیا (۲) - ایک غریب آدمی تھے مگر فن میں بڑے اچھے درجے کے
ند نے ایک مشاعرہ کے لئے غزل کہی اور اسکا لازمی قافیہ فخریہ لہجے میں سنا کر عرض کیا کہ اسے اب کوئی کیا کہے کا شعر تھا

کا ہے گماں شک ہے ملاگیری کا — رنگ لایا ہے دوپٹہ ترا میلا ہو کر

کر کہا ٹھہرو صبا بھی آتے ہوں گے ، کچھ دیر کے بعد صبا آئے تو کہا :- " میر صاحب مشاعرے کے لئے غزل کہی ہو تو سناؤ
تو کہا : اچھا لازمی قافیہ تو سنا دو ! صبا نے تعمیل ارشاد کی اور عرض کیا :-

باغباں بلبل کشتہ کو کفن کیا دیتا
پیرہن گل کا نہ اترا کبھی میلا ہو کر

کر داد دی - اور نواب صاحب سے کہا دیکھئے یوں کہتے ہیں -
رج کیف کی ایک غزل سن کر کہا " بھئی اتنی اچھی غزل کے بعد میں تو مشاعرے میں اپنی غزل نہ پڑھوں گا -
شاگرد بہت محبت کرتے - اور خیال رکھتے تھے -
ت احباب محبت سے وہ خوب سمجھتے تھے - توکل و بے پروائی کا یہ حال کہ اپنے حریف کی شان و شوکت سے متاثر نہ تھے
تے تھے ، سیدھے بھی اتنے تھے جتنے بانکے
نے میر انیس کی زبانی لکھا ہے کہ !
ں نماز کا خیال آگیا کسی شاگرد سے کہا بھئی نماز تو سکھا دو ، وہ اتفاقاً سنی تھے اپنے طریقے کی نماز سکھا دی یہ
ھنے لگے ، ایک دن خلیل (جنہوں نے غالب کی مثنوی " کلمات طیبات " کا جواب لکھا تھا) نے دیکھ لیا عرض
مذہب کیا ہے ؟ ، کہنے لگے شیعہ ، انھوں نے کہا ، مگر نماز سنیوں کی ؟ فرمایا بھئی میں کیا جانوں ، فلاں نے سکھائی
تھا ! اس دن سے شیعوں کی طرح نماز پڑھنے لگے - کیونکہ اپنے مذہب کے لئے خود کہا ہے :-

کے حب علی مشرب ہے — مرد مومن ہوں میں اثنا عشری مذہب ہے .

ا ایک بات کہنا نے بھی کہی تھی جسے مصنف نے ریاض الفصحا میں لکھا ہے - م - ح

ایک شاگرد مصائب سے پریشان ہو کر باہر جانے کا ارادہ کر رہے تھے خواجہ کہتے "ارے کہاں جاؤ گے، دو گھڑی مل بیٹھنے کو غنیمت سمجھو، جو خدا دیتا ہے اس پر صبر کرو"۔ ایک دن وہ آئے، اور بنارس جانے کا ارادہ ظاہر کیا جب اٹھنے لگے تو پوچھا، کوئی پیغام سلام، کام کاج ہو، تو فرمائیے۔ ہنس کر فرمایا: اتنا کام کرنا کہ وہاں کے خدا کو ذرا ہمارا سلام کہہ دینا! وہ حیران ہو کر کہنے لگے، کیا یہاں اور وہاں کے خدا الگ الگ ہیں؟ فرمانے لگے شاید یہاں کا بخیل اور وہاں کا کچھ سخی ہو۔ مشاعروں اور ناسخ والوں سے نوک جھونک تو ہوتی ہی رہتی (آب حیات دیکھئے)، مگر مشاعروں میں اکثر آتش ہی کی جیت ہوتی ایک مرتبہ بادشاہ نے درباری مشاعرہ کیا۔ آغا میر مہتمم تھے۔ سب کو مصرع بھیجا مگر خواجہ کو دو ایک دن پہلے چوبدار شاہی کے ہاتھ دعوت نامہ بھیجا۔

خواجہ یہ دیکھتے ہی بگڑ گئے، گھر میں کہلا بھیجا "کچھ شگون کی روٹی پکا دو، ہم کچھ دنوں کے لئے لکھنؤ چھوڑ دیں گے" دوسرے روز علی الصباح پیدل چل کھڑے ہوئے راستے میں مرزا محمد تقی حیدر اپنی کوٹھی سنہرے برج میں بیٹھے سیر کر رہے تھے استاد کی وضع قطع اور انداز و رفتار دیکھ کر آدمی بھیجا۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ "نواب صاحب سے کہنا کہ سلام کہا ہے اور کہا ہے کہ باہر جا رہے ہیں" یہ سننا تھا کہ نواب بوچے پر سوار ہو اور فوراً راستہ روک کھڑے ہو گئے۔ قصہ پوچھا اور کہا استاد آپ کو اس کی کیا پروا ہے آپ نہیں جانتے کہ میرے پاس پانچسو بانکا پچاس پچاس روپیہ ماہوار کا ملازم ہے۔ یہ کس کام آئیگا آپ دیکھ رہیے گا اگر معتمد الدولہ نے ہٹ دھرمی کی تو بارہ دری میں خون کی ندیاں بہہ جائینگی۔ مرزا صاحب دس ہزار روپیہ ماہوار کے وثیقہ دار تھے ان کے سمجھانے سے آتش وہیں بیٹھ رہے اور شام تک غزل کہا کیے

اتنی دیر میں مرزا صاحب نے آتش کی طرف سے ایک درخواست لکھی۔ حضور میں ایک فقیر گوشہ نشین ہوں اگر حضور نے یاد فرمایا ہے تو اتنی اجازت چاہتا ہوں کہ سب سے پیشتر غزل پڑھوں اور دوسری گذارش یہ ہے کہ خاص گزرگاہی مرحمت ہو۔ یہ عرض داشت محل کے اندر پیش ہوئی اگرچہ دربار میں سوائے بادشاہ کے یہ حق کسی کو نہ تھا مگر منظوری دی گئی

شام تک مشاعرے کی دھوم مچ چکی تھی، نواب غضنفر الدولہ، نواب مہدی علی خاں نواب نصرت یار خاں، رند، خلیل اور دوسرے شاگردان آتش مرزا تقی صاحب کے یہاں جمع ہوئے۔ جب یہ خبر معلوم ہوئی کہ ناسخ اپنے شاگردوں سمیت مشاعرے میں پہنچ گئے تو آتش نے بھی ٹوٹی تلوار کمر سے لگائی ایک تہمد باندھے آزادانہ وضع سے نکلے خادم نواب کا رسالہ جلو میں لئے مرنے کٹنے پر تیار ہو مشاعرہ گاہ میں پہنچے۔

بادشاہ صدر محفل میں، ارکین سلطنت باادب ایستادہ آگے چلمن پڑی ہوئی بارہ دری کی بغل میں داہنی طرف ناسخ اور شاگرد فروکش اور بایاں رخ خواجہ کے شاگردوں کے لئے خالی۔ درمیانی حصے میں اعلیٰ حضرت کے سامنے کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہیں۔

خواجہ اسی انداز سے آئے اور حضور کے سامنے والے حصے میں چوبدار کو ڈانٹ بتا کر کورنش بجا لائے اور بیٹھتے ہی عرض کی

"حضور عہد پورا ہوا"

بادشاہ نے گرزبرداری آگے بڑھانے کا حکم دیا۔

عرض کیا اجازت ہو تو غزل عرض کروں، جب اجازت مل گئی تو دھوئیں پار کر دیئے، ہر مشاعرہ کی طرح یہاں بھی

---

(۱) مسٹر د ۔ ۔ لکھنؤ میں نواب حضور عالم صاحب کے یہاں میں نے انکی ایک قدیم قلمی تصویر دیکھی تھی کہ دبلا بدن [illegible] قابل کچھ دار مونچھیں داڑھی صاف ہاتھ میں کتا کوئی چالیس کی عمر ---- مہر [illegible]۔

ی دے گئے ۔ ختم مشاعرہ پر دہرا خلعت ملا ۔ جو باادب واپس کر دیا ۔ کہ حقہ شاہی خادم کے لئے بڑا انعام تھا ۔
عام طور سے مشاعروں میں یہی رنگ رہتا تھا ، مگر ہمیشہ غزل کی کامیابی ناسخ کے مقابلے میں رنگ لاتی تھی ۔
مفدر مرزاپوری نے لکھا ہے کہ :
یک دفعہ الہ آباد میں ایک معرکۃ الآرا مشاعرہ تھا شیخ ناسخ اور خواجہ کے شاگردوں کا ہجوم ، ناسخ نے جب یہ شعر پڑھا :

دم خفا زیر زمیں ہے صدائے جوش جنوں
آشنا چاک گریبان کفن بھول گئے

ں نے مشاعرہ سر پر اٹھالیا ، کہ قافیہ تو استاد کا ہو گیا ۔
د امیر مشاعرہ اعظم علی اعظم کو ایک شعر دیا ۔

د انجام کے عالم اسباب تک ہے
جامہ زیبی پہ اکڑتے تھے کفن بھول گئے

شمع اعظم کے سامنے آئی تو انھوں نے محفل الٹ دی (۱)

س ناسخ کی موت کا بہت اثر ہوا چیخیں مار مار کر رو دیئے اور شعر کہنا چھوڑ دیا ۔ منشی قمر کہتے تھے کہ "جب ہم نے دیکھا ہے تو
ات آتش کی بینائی جاتی رہی تھی ، گورے دبلے پتلے آدمی تھے سر پر لمبے لمبے بال ، جنھیں سمیٹ کر جوڑا باندھ لیا تھا ۔ بڑی بڑی
بھی منڈی ہوئی ، ایک تہمد آدھی باندھے آدھی اوڑھے بیٹھے تھے "

جہ محمد بشیر کہتے ہیں : "ہم بہت کم سن تھے صفر (جنوری ۱۸۴۷ء (۱۲۶۳) کا مہینا تھا کہ آتش کی بیماری کا شہرہ ہوا خواجہ
کے ساتھ دیکھنے گئے ۔ کچا مکان جس میں ایک چھپر کے نیچے چارپائی پر تقریباً اسی بیاسی برس کا ایک آدمی چادروں ابرو کا
لنگ پڑا تھا ۔ شاگرد نزل کی چٹائیوں پر بیٹھے تھے ۔ کمزوری اور مرض کی شدت یہ تھی کہ بولنا چاہتے تھے مگر آواز نہ نکلتی تھی
ء رہنے کے بعد چلے آئے ۔ آٹھ دن بعد سنا کہ مرحوم نے انتقال کیا میرے دوست علی خلیل نے بڑے اہتمام سے تجہیز
بعد گھر ہی میں دفن کیا ۔

ستوں اور شاگردوں نے تاریخیں کہیں جن میں اشرف کا مادہ تاریخ تھا "بمرد شاہ سخن" ۱۲۶۴ھ (آب بقا)
زاد نے لکھا ہے کہ ان کے بعد "بی بی اور ایک لڑکا لڑکی خرد سال تھے " اور خلیل ان کے خبر گیر رہے ، لیکن گل رعنا اور
رف ایک لڑکے کا ذکر ہے ۔ عشرت نے لکھا اس لڑکے کا نام محمد علی تھا

مرتبہ شاگردوں کو معلوم ہوا کہ خواجہ آج کل خالی ہاتھ ہیں ۔ فقیر محمد خاں گویا یہ سن کر دو ہزار کی دو تھیلیاں لئے حاضر
زہ بند تھا ۔ آواز دی ، اندر سے آواز آئی ـــ "کون ؟" بولے فقیرا ۔ آتش نے کہا ۔ فقیرا میرے یہاں کام نہیں
ہے ۔ ! وہ دوسرے دن پھر حاضر ہوئے ، مشکل سے دروازہ کھولا ، اتفاقاً لڑکا بہت کم سن تھا ۔ اسے ٹکڑا اٹھاتے دیکھ لیا
دیکھ کر کہا ۔ "یہ ٹکڑا تو اچھا نہیں ، کنی لیتا ہو گا فقیر بھی اچھی نہیں " یہ کہہ کر دو تھیلیاں سامنے کھولدیں ـــ "کبھی
لیا کرتا تھا "

کہنے لگے "خانصاحب ! آپ کو چاہئے تھا اس کو تادیب دیتے کہ ایسے مشغلوں سے باز رہتا نہ کہ آپ خود اس فعل
دیتے ہیں " یہ کہہ کر بائیں روپے نکال کر محمد علی کو دیئے اور کہا ، "خاں صاحب کو سلام کرو ـ اس کی تھیلیاں
واپس کر دیئے ۔

ذا میں نئی نئی مرچیں کھایا کرتے تھے۔ کچھ دنوں بعد بیگم نے انتقال کیا، اور خود نابینا ہو گئے محمد علی نے پڑھ لکھ کر شعر کہنا شروع کئے جوش
میں رکھا مشاعروں میں جانے اور عزت پانے لگے

جے دیال نے عرض کی استاد بھائی کی شادی کر دیں، خواجہ نے عذر کیا کہ اتنا روپیہ کہاں سے لاؤں ہاتھ باندھ کر عرض کی نسبت
پ ٹھہرائیں انتظام ہم کریں گے۔ جب مجبور ہو گئے تو شادی ٹھہرائی اور خلیل سے دیال وغیرہ نے دلا رام کی بارہ دری میں شایان شان
نتظام کیا۔

جوش دولہا بنے تو خواجہ نے رونا شروع کیا، لوگوں نے کہا استاد، یہ تو خوشی کا محل ہے آپ روتے ہیں؟ فرمایا: "ہاں ماں ہے
میں جو خوش ہوتی، آنکھیں ہیں نہیں کہ میں سہرا دیکھتا۔ روؤں نہ تو کیا کروں۔

جوش، باپ کے بعد ہی ۱۲۶۳ھ کے ہیضے میں جاں بحق ہو گئے۔

بقیہ:- یارانِ نکتہ داں

ہیں کہ میں کیا ہوں۔ گو میری ذات اس اہمیت کی مالک نہیں کہ میں خود اس پر قلمکاری کروں۔ مگر میں یہ بات ضرور واضح کر دینا چاہتا ہوں
لہ میں دکھائیاں، صرف ان لوگوں کو عطا کرتا ہوں جنکو میں اپنی ذات سے انتہائی مخلص پاتا ہوں۔ ضیاء الرشید صاحب کا میرے متعلق ایک
فقرہ ہے کہ "یہ حضرت بھی خوب ہیں۔ اور غیر ارادی طور پر منفی BEHAVIOUR کا مظاہرہ کرتے ہیں"۔۔۔ اور دوکے اس ادیب کو اگر یہ
علوم ہو جائے کہ کوئی مظاہرہ کبھی غیر ارادی طور پر نہیں ہوتا بلکہ مظاہرہ ہمیشہ ارادے سے کیا جاتا ہے۔ تو بڑی بات نہ ہو گی۔ ہاں ایسی اور
باتوں کا جواب یہ ہے۔ کہ میں ضیاء الرشید صاحب کی طرح دیکھنے والے کی نگاہ پر گراں نہیں گزرتا۔ اور محمود صاحب کی طرح میری شکل
بوکسنگ کھیلنے والوں کی سی نہیں۔ اور نہ قمر الدین ایل کی طرح میرے سر کے بال اڑ چکے ہیں۔ اس لئے میں ان لوگوں میں اگر خوبصورت
نہ کہلاؤں تو اور کیا۔؟

نطشے کا کلام مجھے اس لئے پسند ہے کہ اقبال کی اصل تصویر ہے۔ مہاتما بدھ کی ذات اقدس سے مجھے انتہائی عقیدت ہے۔ کہ
وہ دنیا کا پہلا عظیم انسان ہے جس نے آدمیت کو پیار کا سبق دیا تھا

ذرا سی بات میرے ان افسانوں کے متعلق بھی ہو جائے ۔۔۔۔ میں ہمیشہ سے بھوک اور پیاس کے متعلق سوچتا آیا ہوں مگر آج ضیاء
الرشید صاحب کے کھلے خط سے مجھ پر یہ واضح ہوا ہے۔ کہ جنس کو میرے افسانوں میں دخل ہے۔ گو جنس کو ہر آدمی کی زندگی میں دخل ہے
مگر انہوں نے اپنے الفاظ "منفی BEHAVIOUR کو ثابت کرنے کے لئے یہ کہنا ضروری خیال کیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں ہمیشہ
پیار لئے ہوئے ساٹھ ستر میل کا سفر طے کر کے ان کے پاس جاتا رہا ہوں۔ مگر افسوس یہ انکشاف بہت دیر میں ہوا۔

"روپ نگر" کے متعلق اپنی دانست میں انہوں نے میری بڑی تعریف کی ہے۔ مگر انہیں میری اس کتاب کے متعلق جو ابھی
مسودے کی شکل میں میرے پاس ہے کچھ کہنا مناسب نہ تھا۔

میں نے جو بات خلوص سے ان کے کان میں کہی تھی۔ وہ دوسرے کان تک نہیں پہنچنا چاہئے تھی۔

[illegible]

نواب امداد امام اثر

دنیا بدل گئی

اگلوں کا حال کس سے کہیں اور کیا کہیں
تب لوگ اور ہی تھے ہمارے دیار کے

تھے دردمند کام بھی کرتے تھے درد کے
ہوتے تھے چارہ ساز ہر اک دل فگار کے

مسکین و ناتواں کی لیا کرتے تھے خبر
پُرسان حال ہوتے تھے بے روزگار کے

اہل کرم سے ملکِ خدا تھا بسا ہوا
مطلب برار ہوتے تھے امیدوار کے

آپس میں تھی شریفوں کے رسم برابری
پیدل بھی بیٹھتا تھا برابر سوار کے

دل میں بھری تھی ایسی شجاعت کہ وقتِ رزم
ہوتا تھا ایک شخص مقابل ہزار کے

زر کی ہوس سے پاک تھا ہر آدمی کا دل
کب کوئی پوجتا تھا قدم مالدار کے

حاسد، ستم شعار، جفاجو، نہ تھا کوئی
تھے لوگ آبرو کے، حیا کے، وقار کے

اپنا جواب آپ تھے اخلاق عام میں
گویا کہ خاص بندے تھے پروردگار کے

القصہ ان کا ذکر جو کرتا ہوں اے اثر
کہتی ہے بار بار یہ عبرت پکار کے

غافل ہے کس خیال میں دنیا بدل گئی
انداز اب تو اور ہیں لیل و نہار کے

مرد وفا کا نام زمانے سے مٹ گیا
اس وقت میں تو یار بھی دشمن ہیں یار کے

ہشیار رہو جہاں میں ہیں اہل غرض بہت
قابل نہیں ہیں اہل غرض اعتبار کے

خود دار دوست ایسوں کو کیونکر بنایئے
جو آشنا کبھی نہ ہوئے ننگ و عار کے

مرد فقیر ہوتے ہیں ثابت قدم اثر
دنیا کو سر چڑھاتے نہیں لات مار کے

(اشارہ)

امروز کی

پروفیسر اختر قادری

یہ دنیا!

یہ دنیا! کشمکش کی، جبر کی، پیکار کی دنیا
یہ دنیا! کلفتوں کی، رنج کی، آزار کی دنیا

یہ دنیا! جس میں، ہر سو ظلم کی ہے گرم بازاری
یہ دنیا! جس میں، ہر گوشے میں پلتی ہے سیہ کاری
یہ دنیا! جس میں ہے اندوہِ حرماں کی فراوانی
یہ دنیا! جس میں "افسانہ" ہوئی ہے پاک دامانی

یہ دنیا! جس میں، لفظِ رحم، ہے معنی سے بیگانہ

یہ دنیا! جس میں، ہمدردی ہے خود غرضی کا پیمانہ
یہ دنیا! جس میں، نیکوں کو نہیں جائے اماں کوئی
یہ دنیا! جس میں، بیکس کی نہیں سنتا فغاں کوئی

یہ دنیا! جس میں، ہے فقدان الفت کا مروت کا

یہ دنیا! جس میں ہے طغیان نفرت کا عداوت کا
یہ دنیا! جس میں، خوں کمزور کا پانی سے ارزاں ہے
یہ دنیا! جس میں، جو شہ زور ہے فرعون ساماں ہے

الٰہی! ایں جہاں با فطرتِ ما در نمی سازد
جہانِ تازہ پیدا کن کہ طرحِ دیگر اندازد

موجِ درد

از

اطہر نفیس

اب کسی سے نہ کہینگے کہ سُنے قصۂ درد
منتِ چارہ گراں اب نہیں ہوگی ہم سے

اب کسی سے نہ کہیں گے کہ جُدائی کا الم
شدتِ درد کو کچھ اور بڑھا دیتا ہے

اور اس کرب کے عالم میں یہی دامنِ صبر
درد کے تند شراروں کو ہوا دیتا ہے

ضبط کی سعیٔ مسلسل کا دھواں سینے میں
چند اشکوں ہی کو طوفان بنا دیتا ہے

اب کسی سے نہ کہیں گے کہ صبا کی نرمی
لب و رخسار کا پیغام سنا دیتی ہے

اب کسی سے نہ کہیں گے کہ نسیم سحری
کتنی خوابیدہ تمنائیں جگا دیتی ہے

اب کسی سے نہ کہیں گے کہ یہی موجِ خیال
یادِ محبوب کو تصویر بنا دیتی ہے

اب کسی سے نہ کہیں گے کہ سُنے قصۂ درد
قصۂ درد کہ جو دل میں چھپا رکھا ہے
قصۂ درد جو کہنے سے کہیں بڑھ کر ہے

الرشید

نکتہ چیں ہے غمِ دل...

سوگوار احساسات کے پس منظر میں ثریا کی نیم خوابیدہ گے نغمہ سرا ہے، جیسے سردیوں کی کسی اندھیری رات
دن کی کوئی چنچل ندی بہتے بہتے سو گئی ہو!!
رس فلمی مغنیہ حساس دلوں پر اپنے پرسوز آہنگ سے نمک پاشی کرتے کرتے جب مرزا کے مصرعے کو زبان کے
م دل" تک لاتی ہے اور خود سازوں میں پل بھر کے لئے کھو جاتی ہے، تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں ثریا کی
سے کہیں فضا میں لہرا رہی تھی کہ اچانک وہ مجھے چھوڑ کر سازوں میں کھو گئی اور اب میں تیزی سے پستی کی طرف
اہوں!
ڈوبنے لگتا ہے اور میں گھبرا کر چاروں طرف دیکھتی ہوں۔ ایک چیخ میرے لبوں تک آتے آتے رہ جاتی ہے
نکلتے ہوئے چاند کی طرح ثریا کی آواز سازوں میں سے طلوع ہوتی ہے۔ اور جیسے مجھے تھام لیتی ہے اور میں
اپنی تھکی تھکی سی آنکھیں بند کر لیتی ہوں
یہ سلسلہ نہ جانے کب سے رواں ہے اور نہ جانے میں کتنی مرتبہ ریڈیو گرام تک جا کر یہی ریکارڈ لگا آئی ہوں
مگر ہائے اب یہ سلسلہ ٹوٹ جائے گا نیڈل "ریکو" میں ہماری آسٹن رک چکی ہے۔ اس وقت شام کے سات
فہیم آج دفتر سے سیدھا کہیں چلتے پھر چلا گیا تھا۔ اس نے ساڑھے چار بجے مجھے بھی چلنے کے لئے فون کیا تھا
یہی مرزا کی غزل سن رہی تھی مگر میں نے دو لفظوں میں انکار کر کے فون بند کر دیا تھا۔ فہیم ڈرائنگ روم میں آگیا
اشعار ہیولوں کی طرح ایک دلنواز تبسم کے ساتھ صوفے سے اٹھتے ہوئے فہیم کا خیر مقدم بھی کیا ہے۔ اور مجھے کچھ
ن ہو رہا ہے کہ جیسے باہر انتہائی تیز ہوا کے جھکڑ چل رہے ہیں اور میں دریچے دروازے بند کئے ماضی کی سوگوار
اور میری یادوں کے پس منظر میں ثریا پُر درد لے میں نغمہ سرا تھی کہ اچانک ہوا کے ایک تیز و تند اور گستاخ
سے دریچے کا ایک پٹ کھول دیا اور میرے خیالات کو کاغذ کے پرزوں کی طرح منتشر کر دیا۔
مجھے فہیم پر غصہ آ رہا ہے، میں اس کی جانب دیکھ کر مسکرا رہی ہوں۔ فہیم مکاں نگی انداز میں جیب سے کچھ پلندہ
سینے پر چکا ہے۔ اب اپ جو توں کے تسمے کھولتے ہوئے بھی کو آوازیں دے رہا ہے۔ یہ سات آٹھ برس

ری سی بھولی بھالی نجمی فہیم کی پہلی بیوی سے ہے۔ اور میں اسے بالکل ماں کی طرح چاہتی ہوں۔ مجھے یہ بچی کبھی بری نہیں
میری سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی کہ آخر سوتیلی مائیں سوتیلی کیوں کہلاتی ہیں۔ فہیم نے ایک روز یہی بات مجھے کچھ
ندازمیں سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ میں اپنی جگہ پر جل بھن کر رہ گئی تھی۔ فہیم نے کہا تھا۔ فرید — تمہارا یہ پیار
ت تک ہے جب تک تم خود ماں نہیں بن جاتیں "۔ اس کے آگے فہیم نے مجھے اور کچھ نہ کہا تھا۔ لیکن میں جانتی
ا اگر وہ ایمانداری سے کام لیتا تو کہتا "اور فرید! — اسی لئے میں تمہارے جسم کی خوبصورتی اور تمہاری صحت
رے حسن کے نام پر زندگی کے فطری تقاضوں کو پورا کرنے سے گریز کرتا ہوں!!
— نجمی بھاگتی ہوئی آکر اپنے ڈیڈی کے گلے لگ گئی۔ اور اب وہ مجھ سے کہہ رہی ہے کہ "ممی چلئے کھانا کھائیں
یں بھوک لگ رہی ہے "
— فہیم مجھے اپنی پارٹی کے قصے سنا رہا ہے۔ فرید — تم آج چلتیں تو بڑا لطف رہتا۔ بڑی پر تکلف چائے
در آج تو مسز شمس بھی موجود تھیں بھئی بڑی باتونی عورت ہے اور جس رفتار سے باتیں کرتی ہے اسی رفتار سے کھاتی
تی ہے۔ ایک مزے کی بات سناؤں تمہاری بیگم صدیقی نے آج سگریٹ پیا اور ہم سب نے خوب تالیاں بجائیں
ا تو نہیں شرمائی "
— میں جانتی تھی فہیم بیگم اشرف یا صبوحی اشرف یا پھر مسز خان کی دونوں لڑکیوں پروین اور نسیم کے سوا باقی سب
ں کا ذکر کرے گا۔ میں فہیم کی طرف دیکھتے دیکھتے اس کے اس انداز پر مسکرانے لگی۔ اور پھر میں نے بظاہر بڑی سادگی سے پوچھا
بوحی بھی تو ہوگی، وہاں"
— "ارے ہاں، ہاں — بیگم اشرف اور اشرف صاحب بھی تھے" فہیم جلدی سے یہ بات کہہ کر اپنے کمرے کی طرف
بدلنے چلا گیا۔ وہ مجھے نہیں دیکھ رہا ہے۔ مگر میں ابھی تک اسی کی طرف دیکھ رہی ہوں اور مسکرا رہی ہوں۔ مسکراتے
ہوئے نجمی نے ایک بار پھر کھانے کا تقاضہ کیا۔ تو میں اپنے خیالات سے چونک کر محبت سے نجمی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے
کے کمرے کی طرف چل دی۔
— ہم کھانے کی میز پر آبیٹھے۔ مجھے قطعاً بھوک نہیں تھی لیکن میں فہیم کے "تکلیف دہ اصرار" اور "تصنع آمیز پوچھ گچھ"
کے سبب سر جھکائے چھوٹے چھوٹے لقمے لیتی رہی۔ میں نے کن انکھیوں سے فہیم کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ چپ چپ سا تھا۔
بوحی اشرف والا کچوکا آج ذرا اوچھا ہو گیا۔ مگر کوئی ایسی بات نہیں۔ فہیم کی یہ سنجیدگی عارضی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد
پنے مخصوص لاابالی پن کے انداز میں باتیں کرنے لگے۔ ہنستے ہنساتے رہے کسی غم کو پالنا اس کی فطرت نہیں ہے۔ نجمی
پنے ڈیڈی سے اور کبھی مجھ سے کوئی بات کرتی رہی اور میں نجمی کی باتوں کا مختصر مگر محبت آمیز جواب دیتی رہی۔
— کھانے کی میز پر خاموشی کے وقفوں میں ثریا کی آواز ایک بار پھر میرے ذہن پر چھا گئی اور درد و ہو (?) واقعات جن کا
نظر ثریا کی یہ سوگوار لے تھی — ایک بار پھر میرے ذہن میں یوں جمع ہونے لگے جیسے فضا میں اڑتے ہوئے پالتو
پنے مالک کو دانہ بکھیرتے دیکھ کر اس کے گرد جمع ہو کر بیٹھ گئے ہیں یعنی گویا اپنے خیالات کو دانہ ڈال دیا

...ا ماضی ہیں اور میں جانتی ہوں کہ نہ تو رنگ کبوتر بازوں کو اچھی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور نہ ان کو جو ماضی کی یادوں
...آہیں بھرتے رہتے ہیں۔ لیکن میں جنونی قسم کے عام ماضی پرستوں سے بالکل مختلف ہوں میں نہ تو ہر وقت
...ماضی کی یادوں میں "حال" سے قطع تعلق کر لیتی ہوں میں تو ماضی کے سہارے "حال" کی ہر تلخی کو ہنس
...ہوں اور خوب جانتی ہوں کہ میری طرح بیک وقت دو کشتیوں میں پاؤں رکھ کر زندگی گزارنا عام لوگوں
...ہے۔ اور جب کبھی یہ سوچتی ہوں کہ میرا "ماضی" کہیں کوئی سپاٹ سنگین دیوار بنتا اور "حال" اسی طرح مستول
...امتزاج ——— تو مجھ پر کیا گزرتی؟ ۔ اس تصور ہی سے مجھ پر کپکپی سی طاری ہو جاتی ہے۔ اور پھر میں
...طرف دیکھتی ہوں جہاں "سکونِ دل" کی دیوی کی پوجا ہوتی ہے۔ اور میں فرطِ عقیدت سے اس مندر کی چوکھٹ
...کاش کوئی اس وقت میرے دل سے پوچھے کہ "سکونِ دل" کیا ہوتا ہے!!۔

...نے کھانے سے ہاتھ کھینچنا چاہا تو بیلے۔ "سویٹ ڈش" اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ بھی تو لو"
...کے انکار پر میں نے "خوبصورت" اصرار کیا اور اٹھلا کر کہا۔ یہ تو ہم نے تمہارے لئے آج خاص طور پر تیار کی
...خوبصورت اصرار نے فہیم کی وہ عارضی سنجیدگی ختم کر دی۔ اور وہ مجھے اپنے بوڑھے چیف انجینئر کے لطیفے
...اپنے کسی ساتھی انجینئر کا قصہ کسی چالاک ٹھیکیدار کا ذکر جو مفت ہی میں اپنا کام "پاس" کرانا چاہتا تھا۔
...باتیں بڑے غور سے سنتی رہی اور مسکراتی رہی اور اس کی بعض روزمرہ کی باتوں کے جواب بھی دیتی رہی
...مگر پھر بھی لیکن میرے اور فہیم کے درمیان ذہنی فاصلہ بڑھتا جاتا ہے۔ میرے خیالات کے پس منظر میں ثریا کی
...اور جب ثریا "غمِ دل" پر آ کر ایک لمحے کیلئے سازوں میں کھو جاتی ہے۔ تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے اس نے
...دریا میں تیزی سے نیچے چلی آ رہی ہوں اور میرا دل ڈوبا جا رہا ہے۔ پھر وہ بدلیوں میں سے نکلتے ہوئے چاند
...سے طلوع ہو کر جیسے مجھے تھام لیتی ہے۔!!

فرخندہ باجی کی شادی کو آج سولہ سترہ برس ہو چکے ہیں۔ میں ان دنوں آٹھ یا نو برس کی تھی۔
...اور دولہا بھائی کے آرسی مصحف کے وقت تنہا سے آتے ہوئے ایک شلوار پوش لڑکے نے
...میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ میں نے جب گھوم کر دیکھا تو میری نگاہوں میں غصہ تھا اگرچہ
...منے دولہا بھائی کا پھوپھی زاد بھائی تھا مگر میرے لئے تو بالکل اجنبی تھا لڑکا بڑا حساس تھا۔ وہ
...ری نظر کو پہچان گیا اور اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا ——

...سال بعد اس لڑکے نے ایک دفعہ آدھی رات کو میرے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔ "فریدہ۔
...تم نے نفرت اور غصے سے میری طرف دیکھا تو میں تم سے ڈر گیا تھا۔ اور بعد میں اپنے آپ پر شرم
...ان کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ایک خوبصورت لڑکی تھیں۔ دوسری وجہ یہ کہ تمہارے کپڑے بڑے
...اور میری وجہ یہ کہ میں تمہاری دیہن ہے اور میری شلوار کو دیکھتے دیکھتے تمہاری ناک نفرت
...سے سکڑی ہوئی تھی کہ میں نے اپنی اس وقت ہی کمتری محسوس کرنے لگا تھا۔ فریدہ ...

تم پھر غصہ آ گیا ۔ میں سوچ رہی تھی کہ آخر کیا ہوا ۔ ہاتھ رکھ دیا تو اس میں اس طرح بچوں کے دیکھنے کی کیا ضرورت
تھی بڑی آئی غرارے والی!!"

— اس لڑکے کا نام شفیق تھا۔

— جب شفیق میٹرک کا امتحان دے کر کچھ دنوں کے لئے پھر ہمارے ہاں آیا تھا تو ہم کیرم اور بیڈمنٹن
کھیلنے لگے تھے کھیلتے کھیلتے میں نے ایک دن شفیق کو چھیڑا۔ شفیق تم تو اب پتلون پہننے لگے ۔ ۔ ۔ ۔ وہ تمہاری
شلوار کیا ہوئی ۔ ! ۔ اور شفیق کو بات میں سے بات نکالنے کی عادت تھی — کہنے لگا "میں نے اب شلوار
کی جگہ غرارے پہننے شروع کر دیئے ہیں"۔

— اور جب شفیق فرخندہ باجی اور دولہا بھائی کے ساتھ واپس جانے لگا تو میں نے محسوس کیا
وہ بہت اداس ہے اور جیسے مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے اور پھر یہ سوچ کر کہ یہ پردیسی لڑکا نہ جانے مجھ سے کیا
کہہ دے میں نے کوشش کی کہ اسے کچھ کہنے کا موقع نہ دوں ۔ لیکن شفیق کے چلے جانے کے بعد مجھے اپنے
آپ پر بڑا غصہ آیا۔

— اور آج سے بہت دن پہلے شفیق نے مجھے بتایا "فریدہ اس مرتبہ لوٹتے وقت میں بہت
اداس تھا ۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن تم قصداً دور — دور —"

— میں نے شفیق کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا "میں جانتی ہوں شفیق — میں جانتی ہوں —
آرسی مصحف والے دن ہی سے ہماری نگاہیں ایک دوسرے سے بڑی خاموشی کے ساتھ باتیں کر رہی

— اور پھر قریباً سال بھر بعد شفیق میرے لئے سرخ رنگ کا چھوٹا سا نازک سا چینی کا گلدان
میں نے اپنی کوٹھی کے کونے والے جامن کے درخت تلے ایک جامن اٹھا کر شفیق کے منہ میں ڈالتے ہوئے
کہا "شفیق تم صورت سے تو بڑے بھولے نظر آتے ہو مگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " اور میں گلدان کو دیکھ کر ہنسنے لگی
— شفیق نے بڑی سادگی سے جواب دیا "یعنی میں نے لاہور میں ایک فلم دیکھی تھی جس میں ہیرو نے ہیروئن
کو اسی طرح کا ایک گلدان تحفے میں دیا تھا ۔ چنانچہ میں نے بھی کتابوں کے بہانے امی سے دس روپے لئے آٹھ
روپے میں انارکلی کی ایک بہت بڑی دوکان سے یہ گلدان خریدا اور دو روپے میں ایک فلم دیکھی"

"اور اس فلم سے کیا سیکھا" میں نے ہنستے ہوئے سوال کیا۔

"وہ انگریزی فلم تھی" اور شفیق نے اچانک میرے لبوں پر ۔ ۔ ۔ ۔

— اور مجھے اس حرکت پر واقعی غصہ آ گیا میں شفیق کو جامن کے پیڑ تلے چھوڑ کر چلی آئی۔

اور یہ گستاخ لڑکا پاکستان بننے پر ایف ۔ اے ۔ میں فیل ہو جانے کے بعد نئے سرے سے کالج میں
داخلہ لینے کے لئے والدین کو لاہور چھوڑ چھاڑ کر کراچی آ گیا جہاں ہم پاکستان بننے کے بعد آباد ہو چکے تھے کوٹھی
کیا تھی — ایک بلڈنگ کی بالائی منزل کے چار دس فلیٹ [illegible] خاندان کے [illegible]

ایک فلیٹ میں تقسیم سے پہلے ہی فرخندہ باجی اور دولہا بھائی مقیم تھے اور انہی کی مدد سے باقی تینوں فلیٹ ہمیں مل گئے۔ شفیق فرخندہ باجی کے ساتھ رہنے لگا۔ ہمارا اور فرخندہ باجی کا فلیٹ آمنے سامنے تھا اور بیچ میں صرف ایک دو گز چوڑی گیلری سی تھی جس کے ایک سرے پر بالکنی تھی اور دوسرے سرے پر نیچے اترتا ہوا زینہ۔ اس گیلری کی بالکنی میں شفیق نے مجھے بتایا کہ فیل ہونے پر کئی ماہ کی کوششوں کے بعد اسنے والد کو منایا اور وہ یہاں آگیا۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا "شفیق تم نے بہت برا کیا"

شفیق مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ آہ بھر کر بولا "ابی میں نے کیا —— برا ہو اس دل کا جس نے یہ برا کیا"

کھانے کی میز سے اٹھ کر میں، نجمی اور فہیم اپنے بنگلے سے نکلے اور حسب معمول تارکول کی سڑک پر چہل قدمی کرنے لگے۔ فہیم ... سے پائپ پی رہا ہے نجمی اس کی انگلی پکڑے ہوئے چل رہی ہے۔ اور میں ان دونوں سے چند قدم پیچھے۔ اگرچہ آج ... چہل قدمی پر مائل نہ تھا۔ لیکن میں نے تو خود ہی فہیم سے چلنے کو کہا تھا۔ اور پھر دیر تک اپنی اس حرکت پر خود بخود مسکراتی ... فہیم کبھی کبھی مجھ سے کوئی بات کر لیتا ہے۔ اور میں محبت آمیز لہجے میں اس کی بات کا صحیح جواب دے دیتی ہوں کبھی ... سے کسی درخت کا انگریزی نام پوچھتی ہے۔ اور میں اسے ماؤں کی طرح سمجھاتی ہوں مگر اسکے ساتھ ہی میرا دل بدستور ... کے مندر کی سیڑھیوں پر جھکا ہوا بھی ہے یعنی فریاد بدستور نغمہ سرا ہے، اور ہر زلف کے معرے کو "تم دل" کہتا۔ اگر جب وہ ... کے لئے سازوں میں کھو جاتی ہے تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں خلا سے پستی کی طرف چلی آرہی ہوں۔ میرا دل ڈوبنے لگتا ہے ... یا بدلیوں میں سے نکلنے والے چاند کی طرح سازوں میں سے طلوع ہو کر جیسے مجھے تھام لیتی ہے۔ میں جس تارکول کی سڑک ... رہی ہوں اسکے دونوں طرف بنگلوں کی قطاریں ہیں۔ میں چلتے چلتے بنگلوں کے باہر ناموں کی تختیاں بھی پڑھتی جاتی ... ان کے پڑھتے ہی بنگلے والوں کے مانوس چہرے بھی ذرا ذرا سی دیر کے لئے میری نظروں کے سامنے آجاتے ہیں مجھے سڑک ... سے لگے درختوں کی قطاروں کا بھی پورا احساس ہے۔ اور میں برقی روشنی میں بہتی کھمبوں اور درختوں کے دراز قامت ... برابر دیکھ رہی ہوں۔

اور کبھی کبھی چند لمحوں کے لئے سب کچھ بھول کر اپنی ذہنی کیفیت پر تعجب بھی کرنے لگتی ہوں کہ وہ بیک وقت کتنے کام ... اور اسکی رفتار کس قدر تیز ہے۔ فہیم سے باتیں، ماضی کی یادیں، نجمی کے سوالات، تارکول کی سڑک کھمبوں کے سائے اور بنگلوں کے باسی —— اس شعور پر مجھے اپنے ذہن کی عظمت کا قابل فخر احساس ہونے لگتا ہے پھر مجھے یاد آتا ہے ... مجھے سب "ذہین" کہا کرتے تھے۔ میرے ابا ان کے دوست کہتے تھے "آپ کی ساری اولادیں یہ بچی ... ذہین ہے"

شفیق بھی مجھے ذہین کہتا تھا۔

اکثر یہ سوچتے سوچتے مجھے ایک مقولہ یاد آجاتا۔ پتہ نہیں یہ مقولہ کس کا ہے یاد نہیں کہاں پڑھا تھا یا کہاں سنا تھا —— ہو سکتا ہے یہ میرے ہی ذہن کی اختراع ہو —— کہ اگر خدا نہ ہوتا —— تو انسان

اپنے ہی ذہن کی پرستش شروع کر دیتا۔

یہ کیسی عجیب بات تھی۔ یہ کیسا دلفریب اتفاق تھا کہ جس طرح میں سوچتی جس انداز سے میں محسوس کرتی ان ہی زاویوں پر شفیق کا ذہن بھی سوچا کرتا تھا۔ ہم ان اتفاقات پر بچوں کی طرح خوش ہوا کرتے میں کوئی بات کہتی — شفیق چیخ اٹھتا۔ فریدہ — فریدہ بالکل یہی حال میرا ہے۔ اور جب وہ کسی احساس کا ذکر کرتا تو مجھے یوں لگتا جیسے وہ میرے ہی ذہن کی ترجمانی کر رہا ہو۔

ہمیں ایک ہی رنگ پسند تھا۔ لباسوں کے متعلق ہماری پسند ملتی جلتی تھی فلموں اور گانوں کے متعلق ہماری رائے ایک ہوتی۔ زندگی اور زندگی کے نشیب و فراز کے متعلق ہمارا نظریہ ایک تھا۔ مستقبل اور مستقبل کے ارادوں کے متعلق بھی ہمارے ذہن ہم آہنگ تھے۔

ہمیں اردو اور انگریزی ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ ممتاز مفتی ہمارا محبوب فن کار تھا۔ راجندر سنگھ بیدی کے افسانے ہم بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ کرشن چندر کی وہ کہانیاں جو اس نے دل سے لکھی ہیں ہمیں بہت پسند تھیں منٹو ہمیں اچھا لگتا تھا۔ اور ہم منٹو سے اسی طرح پیار کرتے تھے جیسے کوئی ماں اپنے کسی آوارہ بیٹے سے پیار کرتی ہو۔ غالب ہمارا محبوب شاعر تھا اور شفیق کہتا تھا کہ منٹو نے اپنی زندگی میں صرف ایک کام کی بات کہی ہے۔ اور وہ یہ کہ "غالب کے بعد اب کسی کو شاعری کرنے کی ضرورت نہیں"۔ شفیق کے پاس سہگل اور طلعت کے گائے ہوئے غالب کی غزلوں کے سب ریکارڈ تھے۔ وہ کہتا تھا "فریدہ — اگر مجھے گانا آتا تو میں غالب کا پورا دیوان ریکارڈ کرا دیتا۔

شفیق کے پاس رفتہ رفتہ کتابوں کی ایک اچھی خاصی لائبریری بن گئی تھی۔ ایک مرتبہ شفیق کوئی امریکی ناول لے کر آیا جس پر دو مصنفوں کے نام تھے میں نے کہا "شفیق ہم بھی مل کر ایک ناول لکھیں گے"۔ شفیق نے میرے خیال کی مخالفت کرتے ہوئے کہا "ہمارے ادیب بننے سے ملک کو دو اچھے ادیب تو نہیں ملیں گے — البتہ ہمارا ادب دو اچھے پڑھنے والوں سے محروم ہو جائے گا"۔ اور میں نے شفیق کے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے اس خیال کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھلا دیا — میں سوچا کرتی تھی کہ شاید ایسے ہی خوبصورت اتفاقات کو محبت کہتے ہیں!! —

اور اب میں فہیم سے محبت کرنے کے لئے اپنی زندگی میں ان ہی جیسے حسین اتفاقات کو کھینچ کھینچ کر لاتی ہوں!! فہیم کہتا ہے "مجھے گلاب کا پھول پسند ہے" اور میں فوراً فرط مسرت سے مسکرا کر کہتی ہوں "سچ فہیم مجھے بھی گلاب بہت ہے گلاب کے سوا کسی دوسرے پھول کی طرف تو دیکھنے کو بھی میرا جی نہیں چاہتا — اور جب میں یہ بات کہتی ہوں تو میرے ذہن میں سورج مکھی مرجھانے لگتی ہے — مگر کیا کروں ذہن کے سورج مکھی کو زندہ رکھنے کے لئے حقیقت کا گلاب نظر انداز کیسے کیا جا سکتا ہے۔ یہ اتفاقات کو کھینچ کھینچ کر لانا اگرچہ بڑا کٹھن ہے لیکن زندگی کے لئے کس قدر ضروری ہے مجھے اس "اداکاری" کی عادت سی ہو چلی ہے [illegible] میری فطرت ہو جائے گی پھر مجھے اپنی اداکاری کا احساس تک نہ رہے گا — تب زندگی کتنی [illegible] ہو جائے گی — یہ سوچ کر میرے دل پر خود اعتمادی اور سکون کی ایک پر لطف کیفیت طاری ہو جاتی ہے!!

اپنا ہندوستان [illegible]

میں بہت کم تھے مگر وقت کے لحاظ سے بہت زیادہ بھائی جان اگر پنڈی میں میجر ہو گئے تھے تو ان کے اپنے اخراجات بھی ویسے ہی تھے۔ منجھلے بھائی اگر لندن میں چھ سات سو روپے ماہوار کما رہے تھے تو ان کے اپنے بیوی بچے تھے اور چھوٹے بھیا کالج کے تیسرے سال میں تھے۔ چھوٹے بھیا اور شفیق کی بڑی دوستی تھی۔ وہ دونوں ایک ہی کالج میں پڑھتے تھے۔ شفیق کو اس کے والد ہر ماہ معقول جیب خرچ بھیجتے تھے۔ مگر شفیق کو ہر مہینے امی یا فرخندہ باجی سے اپنے جیب خرچ کے لئے دس بیس ادھار لینے پڑتے تھے۔ اب یہ الگ بات تھی کہ اسکے روپے زیادہ تر "کے والٹی" میں ہم سب کی آئس کریم" اور "کریم کونی" کی نظر ہو جاتے تھے۔ میں میٹرک میں تھی رفعت نویں میں نگہت ساتویں میں ـــ فرخندہ باجی کے ساتھ ساتھ میں نے اور رفعت نے بھی برقع اتار دیا تھا۔ امی تو ہندوستان ہی میں برقع اتار چکی تھیں۔

ایک رات جب میں حسب معمول اپنے اور فرخندہ باجی کے پلنگوں کی درمیانی دو گز کی گلیاری عبور کرکے شفیق کے کمرے میں گئی تو اسنے غیر معمولی سنجیدگی سے کہا "فریدہ ـــ جہاں تک میرا تعلق ہے میں بہت "فراخدل" ہوں لیکن اگر تم شادی کے بعد پردہ ترک کرتیں تو بہتر ہوتا۔ میرے والدین ... ـ" شفیق کہتے کہتے رک گیا میں نے ٹھٹکا کر شرمندگی کے احساس کا گلا گھونٹتے ہوئے کہا "ہم سے نہیں پہنا جاتا برقع"
کیا مطلب ہے فریدہ ـــ" شفیق ہچکچایا اور پھر کچھ سوچ کر بڑے پیار سے اسنے کہدیا۔ "چلو لعنت بھیجو ـــ بھاڑ میں جائے گا ـــ اور اسکے بعد ہم نے کبھی اس مسئلے پر گفتگو نہیں کی۔

میری اور میری بہنوں کی بے پردگی کی خبر سارے خاندان میں پھیل گئی۔ اور پھر ایک روز شفیق نے مجھے اپنی والدہ کا خط دکھایا جس میں ماں نے بیٹے کو لکھا تھا کہ "لاہور واپس آ جاؤ تمہارے والد بہت ناراض ہیں۔ ایسے آزاد خیال گھرانے میں تمہارا رہنا ان کو قطعی ناپسند ہے" میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور شفیق نے میرے آنسو دیکھ کر جیسے اپنی ماں کو اپنے ذہن سے نکال دیا۔

پھر جب شادی کے چند روز بعد نتھیا گلی سے مری آتے ہوئے۔ فہیم نے شفیق کا ذکر چھیڑ دیا اور کہا۔ "لیکن فریدہ میں ... دل ہوں ـــ میں ایسی باتوں کی پرواہ نہیں کرتا ـــ میں چاہتا ہوں کہ نہ تو لوگ میرے ماضی کو کریدیں اور نہ ہی میں لوگوں کا ماضی کھنگالوں" تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے فہیم نے انتہائی سرد رات میں میری ننگی کمر پر پانی کی بوند ٹپکا دی ہو! لیکن میں نے اپنی حالت پر قابو پا لیا اور بھاگتی ہوئی کار کے شیشے میں سے عمیق گہرائی کی طرف پر حسرت نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی "ایسی کوئی بات نہیں وہ ایک آوارہ سا لڑکا تھا۔ فرخندہ باجی کی وجہ سے ہمارے گھرانے میں رہتا تھا بس خواہ مخواہ باتیں شروع ہو گئی۔ تم چاہے یقین کرو یا نہ کرو ـــ میں نے تو اسے کبھی لفٹ نہیں دی۔ رہی غلط فہمی تو وہ آجکل کے نوجوانوں کے درمیان کبھی ہو جاتی ہے۔" ان تمام سب باتوں کے دوران میں ایک آرزو میرے دل میں برابر تڑپ رہی تھی۔ کاش ہم ڈوب گئے اچانک اس گہرائی میں جا پڑتے۔ اور پھر میں نے۔ فہیم سے پوچھا۔ "فہیم ـــ اس طرف کہیں گر بھی تو پڑتی ہو گی" میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور وہ کہنے لگا "تمہارے ہاتھ کتنے ٹھنڈے ہو رہے ہیں ـــ ایک دو مرتبہ اور مری آ لگی

تو یہ خوف دور ہو جائے گا"

اور پھر میں سوچنے لگی شفیق بھی کہتا تھا کہ میں "فراخدل" ہوں اور فہیم نے بھی یہی کہا۔ کیا سارے مرد فراخدل ہوتے ہیں یا پھر یہ "فراخدلی" ان کی پناہ گاہ ہے جس میں چھپ کر وہ زندگی کے سنگین حقائق سے فرار حاصل کرتے ہیں پناہ لیتے ہیں میں آج بھی یہی بات سوچا کرتی ہوں مگر جسقدر سوچتی ہوں۔ گتھی اسی قدر اور الجھتی جاتی ہے شفیق نے اپنے آپ کو فراخدل کہہ کر کم از کم وقتی طور پر اپنے ماں باپ کے ایک تقاضے سے فرار حاصل کر لیا تھا —— اور فہیم نے اپنے آپ کو فراخدل کہہ کر جیسے سینہ تان کر کھڑے شفیق کو کسی پہاڑی کی چوٹی سے نیچے دھکیل دیا تھا۔ لیکن پھر میں سوچتی کہ شاید کوئی اور بات ہو — کوئی بھید ہو — کوئی اور رمز ہو!!

— شفیق نے بڑی مشکل سے ایف اے پاس کیا میں نے آسانی سے میٹرک کر لیا چھوٹے بھیا چوتھے سال میں چلے گئے رفعت اور نگہت بھی پاس ہو گئیں۔ ابا جنہوں نے ساری عمر کاشتکاروں کی محنت کھائی تھی اور شکار کھیلا تھا اب واقعی بڑے ہراساں تھے۔ اور امی ہر وقت کھوئی کھوئی رہتی تھیں میرے علاوہ رفعت بھی شادی کے قابل ہو چلی تھی۔ فرخندہ باجی کو شفیق اسقدر پسند تھا کہ میں سمجھتی ہوں وہ اگر کنواری ہوتیں تو کب کی میری رقیب بن چکی ہوتیں فرخندہ باجی کی معرفت شفیق کو سمجھایا گیا۔ شفیق نے لاہور خط لکھنے شروع کئے اور شفیق کے والد نے اس کا ماہانہ بند کر دیا۔

بھائی جان چند دنوں کے لئے پنڈی سے آئے تو ان کی کوششوں سے شفیق نے کالج چھوڑ کر ہوائی جہازوں کی ایک کمپنی میں خاصی معقول ملازمت کر لی شفیق کو نائٹ ڈیوٹی کا الاؤنس وغیرہ مل کر ڈھائی سو روپے ملتے تھے۔ اور جب وہ نیلی سرج کی چمکتے ہوئے بٹنوں والی وردی اور پی کیپ پہن کر رات کی ڈیوٹی پہ جانے لگتا تو میں اپنے فلیٹ کے دروازے میں چھپنے سے تھرموس میں اسکی چائے لئے کھڑی رہتی تھی۔ وہ مجھے چوم کر الوداع کہتا اور زینے سے اترنے لگتا اور میں بھاگ کر اپنے فلیٹ کی بالکنی میں جا پہنچتی اور جب وہ بلڈنگ سے نکل کر فٹ پاتھ پر آ جاتا تو ہم ایک دوسرے کو خوبصورت الوداعی اشارہ کرتے۔ شفیق اب انتہائی کنجوس ہو گیا تھا ہر وقت روپیہ جمع کرنے کی دھن اس کے سر پہ سوار رہتی۔ امی نے شفیق کی سو روپے ماہوار کی کمیٹی کہیں ڈلوادی تھی۔ جب شفیق کو کمیٹی کے بارہ سو روپے ملے تو ہم دونوں نے جا کر آٹھ سو روپے کا فرنیچر خرید لیا۔ ایک ڈبل بیڈ تھا۔ تپائیاں تھیں۔ آرام کرسیاں تھیں۔ خوبصورت پردے تھے۔ اور پھر تو شفیق ہر مہینے کچھ نہ کچھ خریدتا رہتا۔ چند دنوں میں سال بھر گذر گیا۔ شفیق کی تنخواہ پونے تین سو ہو گئی۔

ہم چہل قدمی کر کے گھر لوٹ آئے ہیں فہیم اپنی نیلی دھاریوں والی شب خوابی کا لباس پہن کر اور کتاب لے —— کر پلنگ پر لیٹ گیا ہے۔ میں نجمی کو اسکے کمرے میں سلا آئی ہوں اس ڈھیلے ڈھالے شب خوابی کے لباس میں فہیم کا بدن پھولتا ہوا جسم اور بھی رستا نظر آ رہا ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا: "فہیم تمہارا ڈائٹنگ کورس کب شروع ہوگا"

فہیم نے پیٹ پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔ "فریب —— ڈائٹنگ کا نام نہ لو یہاں کے دونگے ڈکڑے ہو جاتے ہیں

۔ میں فہیم کی اس ہنسانے والی بات پر ہنس دی فہیم پائپ سلگا رہا ہے اور میں اپنے کپڑے بدل رہی ہوں ۔۔
شفیق اپنے کمرے میں ضروری سامان باندھ رہا تھا۔ شفیق کے والد پہلے تو اپنے بھتیجے یعنی میرے دولہا بھائی کو خط پہ خط لکھتے رہے۔ پھر وہ خود ایک روز ذرا سی دیر کیلئے لاہور سے ہمارے ہاں آ گئے۔ شفیق اس وقت گھر پہ نہیں تھا۔ وہ شفیق سے ملے بغیر لاہور واپس چلے گئے۔ ادر ابا اور دولہا بھائی نے شفیق سے اپنی رہائش کا کہیں اور بندوبست کرنے کے لئے کہہ دیا۔ جب شفیق اپنا سوٹ کیس اور بستر لے کر فلیٹ سے نکلنے لگا تو میں نے اچانک زور سے اپنے فلیٹ کا دروازہ بند کر دیا۔ میں بہت دیر سے فلیٹ کے دروازے میں شفیق کو دیکھنے کے لئے کھڑی تھی مگر عین وقت پہ میری ہمت جواب دے گئی اور میں بھاگ کر اپنے کمرے میں جا پہنچی۔ چند لمحوں تک یوں بے قرار ادھر سے ادھر پھرتی رہی جیسے میرا کمرہ کوئی پنجرہ ہو جس میں مجھے ابھی ابھی لا کر بند کر دیا گیا ہو اور میں پنجرہ سے باہر نکل جانے کے لئے بے قرار ہوں پھر میری نظر کمرے کے کھلے دروازے پہ پڑی۔ میں تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی لیکن جیسے میرے کمرے کے فرش نے میرے پاؤں پکڑ لئے میں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگالی۔ اور پھر مجھے احساس ہوا جیسے میں اس بند پنجرے میں۔ اس زندگی میں بالکل محفوظ ہوں۔ مجھے جسمانی تھکن کا احساس ہونے لگا میں اپنے پلنگ پر گر گئی۔ میں اس وقت اپنے آپ کو ساری دنیا کی وحشت سے محفوظ تصور کر رہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ اب یہاں کوئی نہیں آ سکتا لیکن دفعتاً شفیق کا غمگین چہرہ میرے سامنے آ کر مجھ سے حسرتناک لہجے میں کہنے لگا

۔ فریدہ ۔۔ کیا میں بھی نہیں آ سکتا " ؟

۔ نہیں ۔۔ نہیں ۔۔ میں بلند آواز سے چیخی اور بھاگ کر بالکنی میں جا پہنچی ۔۔ نیچے سڑک پر ۔۔ ہماری بلڈنگ کے سامنے سے ایک وکٹوریہ ابھی۔ روانہ ہوئی تھی مجھے شفیق کے سوٹ کیس کا ایک حصہ نظر آیا میں نے اس سوٹ کیس میں ہاں شفیق کے دھوبی کے لائے ہوئے کپڑے تہہ کر کے رکھے تھے ۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وکٹوریہ منظر دھندلا ہوتا چلا گیا۔ اسی وقت میں نے اپنے شانے پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ یہ فرخندہ باجی کا ہاتھ"

میں ان دنوں کالج کے دوسرے سال میں قدم رکھ چکی تھی۔ اور رات دن خاندان کے چاروں فلیٹوں میں گویا کسی ڈھونڈتی پھرتی تھی۔ پنڈی سے بھائی جان کا خط آیا کہ وہ چند دنوں کیلئے بھابی اور بچوں اور اپنے ایک انجینئر دوست کے ہمراہ آ رہے ہیں۔

شفیق ایک مرتبہ بھی لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ میرے اصرار پر فرخندہ باجی نے چھوٹے بھیا سے شفیق کا اتہ پتہ معلوم کرنے کے لئے کہا۔ معلوم ہوا کہ وہ باقاعدہ ڈیوٹی پر جاتا ہے اور خیریت سے ہے۔

۔ اور ۔۔ " میں چھوٹے بھیا کو چپ ہوتے دیکھ کر پوچھے بغیر نہ رہ سکی چھوٹے بھیا نے غور سے میری طرف دیکھا پھر وہ نگاہیں پھیر کر کہنے لگے ۔۔ میں نے شفیق سے کہا تھا کبھی کبھی آتے رہا کرو ۔۔ کہہ رہا تھا ۔۔ میں کچھ پوچھنا چاہتی تھی کہ میرے پاؤں پر فرخندہ باجی کا پاؤں آ گیا۔ میں نے دیکھا فرخندہ باجی کے ہونٹوں پہ انگلی رکھی ہوئی تھی [illegible]۔

ایک روز رات کے دس بجے میں نے چاہا کہ چل کر شفیق کی الماری میں سے سہگل کے ریکارڈ نکالوں اور گراموفون لے کر فلیٹ کی کھلی چھت پر چلی جاؤں اور رات بھر ریکارڈ سنتی رہوں۔ اداسیوں میں گھرا ہوا دل اپنی اس آرزو پر مچلنے لگا اور میرے قدم فرخندہ باجی کے فلیٹ کی طرف اٹھ گئے۔

شفیق کے صوفے پر ایک پریشان بالوں والا لڑکا بیٹھا فلسفیوں کی طرح سگریٹ پی رہا تھا۔ بیچارہ لڑکا۔ اپنی جوانی کے حسین دور میں بھی کس قدر دکھی نظر آ رہا تھا۔ میں اس لڑکے کو فرخندہ باجی اور دولہا بھائی کے آرسی مصحف والے دن سے جانتی تھی۔

تو مجھے تب پتہ نہیں" میں نے یہ سوچ کر غصے سے فرخندہ باجی کی طرف دیکھا جو ایک کرسی پر دراز اپنے بچے کے موزے بنے جا رہی تھیں۔

ایک مرتبہ شفیق پر مسلسل ڈیڑھ مہینے تک وکٹر ہیگو کی "لا مزرابلز" پڑھنے کا دورہ پڑا تھا۔ شفیق نے مجھے ان دنوں اس عظیم کتاب کے کئی حصے زبانی سنائے تھے۔ اور اب فرخندہ باجی کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے وکٹر ہیگو کا یہ کہنا یاد آ گیا تھا کہ اگر روحیں انسانی آنکھ کو نظر آ جاتیں تو یہ حیرت انگیز حقیقت واضح ہو جاتی کہ ہر انسانی صورت کسی نہ کسی جانور سے مشابہت رکھتی ہے۔ اور مجھے آج تک حیرت ہے کہ اس روز مجھے کیوں فرخندہ باجی کی روح دکھائی دے گئی۔ میرے سامنے فرخندہ باجی کے روپ میں ایک لومڑی بیٹھی اپنے بچے کے موزے بن رہی تھی۔

فرخندہ باجی نے کہا "آؤ فریدہ بیٹھو"۔ میں بیٹھ گئی۔

۔ کیسے ہو۔ میں نے لڑکے کی طرف پُر حسرت نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

لڑکا میری طرف مسلسل دیکھ رہا تھا۔ وہ جواب میں صرف مسکرا دیا۔ اور مجھے اپنے سوال پر ندامت ہونے لگی۔

جب فرخندہ باجی خلافِ معمول ایک لمحے کے لئے ہم دونوں کے درمیان سے نہ ٹلیں تو مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی ــــ میں تو اس روز فرخندہ باجی کی روح دیکھ چکی تھی۔ ہم تینوں کے درمیان بڑا تکلیف دہ سکوت حائل تھا اور میں پریشان نظروں سے مسلسل اس غیر مرئی دیوار کو گھور رہی تھی جو چند دنوں اور صرف چند دنوں کے اندر میرے اور شفیق کے درمیان جیسے خود بخود طلسمی انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اور میں اس غیر مرئی دیوار کا بوجھل احساس لئے بیٹھی اپنے ناخنوں کو گھورتی رہی کریدتی رہی

فرخندہ باجی نے سلائیاں چھوڑ کر ایک مصنوعی انگڑائی لی اور کہنے لگیں "شفیق اگر مکان اچھا مل گیا ہو تو اپنا سامان لے جانا ــــ تمہیں تکلیف ہو رہی ہو گی"۔

یہ ماحول میرے لئے ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ میں اُٹھ کر چل دی۔ جب میں اپنے فلیٹ کے دروازے میں پہنچی تو میری آنکھوں میں کب کے بھرے ہوئے آنسو رخساروں پر ڈھلک آئے۔

۔ فریدہ ــــ میں ٹھہر گئی۔ فرخندہ باجی نے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھا اپنے دوپٹے کے پلو سے میرے آنسو پونچھے پھر انہوں نے مجھے لپٹ کر گلے سے لگا لیا اور کہنے لگیں۔ میری اچھی بہن ــــ ہم سب کی اور تیری

بہتری اسی میں ہے :

اپنے کمرے میں پہنچ کر نہ جانے کیونکر میں نے اس غیر مرئی دیوار کو مسمار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں فلیٹ سے نکل کر بلڈنگ کے زینے میں شفیق کے انتظار میں کھڑی ہو گئی۔ فرخندہ باجی کے فلیٹ کا دروازہ کھلا۔ میں نے فرخندہ باجی کی آواز سنی — مجھے کبھی روزانہ ملنا مگر تو دکھانا — اور کبھی کبھی — فرخندہ باجی اس کبھی کبھی پر آ کر رک گئیں اور پھر کہنے لگیں تمہارے بھائی تو آج اتفاق سے پکچر چلے گئے۔ کبھی کبھی ان سے مل لیا کرو۔"

میں فرخندہ باجی کی باتوں پر مسکرا رہی تھی۔

شفیق ہولے ہولے زینے سے اتر رہا تھا اور پھر ذرا سی دیر میں ہمارے دل کی دھڑکنیں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو گئیں۔ میں نے شفیق سے کہا کہ "ہر رات کو ایک بجے کے بعد فلیٹ کا دروازہ کھول کر میں تمہارا انتظار کیا کروں گی" اور تب ہی تو شفیق کے اداس چہرے پر زندگی کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اور میں اثبات میں اشارہ کر کے اپنے فلیٹ کی طرف لوٹ گئی کیونکہ میں جانتی تھی کہ فرخندہ باجی کے اندر والی لومڑی انہیں قطعی اطمینان کی غرض سے میرے کمرے کا چکر لگوائے بغیر چین نہیں لینے دے گی۔ اور وہی ہوا۔ فرخندہ باجی میرے پہنچتے ہی آئیں اور "ڈکس" کی شیشی کا بہانہ کر کے لوٹ گئیں!!

اس رات جب شفیق نے مجھے گھر سے بھاگ چلنے کا مشورہ دیا تو میں ہنسے بغیر نہ رہ سکی میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے میں اس بلڈنگ کا زینہ چڑھتے ہوئے ہانپ جاتی ہوں — بھاگنا میرے بس کا روگ نہیں۔"

شفیق نے سنہرے مستقبل کی انتہائی دلکش جھلکیاں مجھے دکھائیں۔ اس نے مری کے "ہنی مون" کا لالچ دیا اس نے ہر ممکن طریقے سے مجھے یقین دلانے کی کوشش کی کہ اس کے والدین کی ضد شادی کے بعد ختم ہو جائے گی۔ میں سنتی رہی۔ کبھی میں ذرا سی دیر کے لئے سنجیدہ ہو جاتی اور کبھی شفیق کی باتیں ان سنی کر کے پیار کی باتیں کرنے لگتی اور پھر شفیق کے اصرار پر میں نے جھنجھلا کر کہا۔ "اور ہمارے آرسی مصحف کا کیا ہو گا —"

شفیق نے کہا۔ "ہم دونوں ایک آئینہ اور قرآن لے کر پلنگ پر بیٹھ جائیں گے" اور میں ہنسنے لگی۔

شفیق نے گھڑی دیکھی تو صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ میں دبے پاؤں شفیق کو لے کر فلیٹ سے نکلی اور میں نے کہا "ابھی کیا جلدی ہے مجھے کون لئے جاتا ہے۔ تم لاہور جا کر اپنے والدین کو منانے کی کوشش کرو — میں بھاگ نہیں سکتی — میں تو ذرا تیزی سے چلوں تو میری سانس پھول جاتی ہے۔" شفیق چند دنوں کے لئے لاہور چلا گیا۔

اسی سے بھائی جان اور ان کے انجینئر دوست فہیم آ گئے۔ فرخندہ باجی تو جیسے فہیم کی منتظر بیٹھی تھیں۔ فوراً شفیق کے آراستہ پیراستہ کمرے میں فہیم کو ٹھہرا دیا۔ مجھے روز بروز فرخندہ باجی سے شدید قسم کی نفرت ہوتی جا رہی تھی۔

فہیم نے مجھے دیکھا، سارے گھر کو دیکھا۔ ہم سب بھائی جان اور فہیم کے ہمراہ ایک روز "ہاکس بے" پکنک پر گئے۔ فرخندہ باجی کی تجویز پر سب لڑکیاں نہانے کے لئے کپڑوں کا ایک ایک تھیلا ہمراہ لے گئی تھیں۔ بھائی جان، فہیم، چھوٹے بھیا اور بھائی جب نہانے چلے گئے تو ہم سب نے بھی اپنے کپڑے کیبن میں بدلے اور مردوں سے ذرا فاصلے پر پانی میں

اتر گئے۔

ذرا سی دیر میں فہیم اور بھائی جان پانی میں سے نکل کر ہمارے قریب کنارے پر آن کھڑے ہوئے۔ بھائی کو جانے کیا خیال آیا ۔۔۔ انہوں نے کہا۔ فریدہ ذرا اس طرف آ کے اس فرخندہ کی بچی کو غوطے تو دے دو ۔۔۔ فرخندہ باجی پر غصہ تو تھا ہی ۔۔۔ میں بظاہر ہنستے ہوئے فرخندہ باجی کی طرف اٹھ کر دوڑی۔ فرخندہ باجی اپنے بچاؤ کے لئے پانی میں بیٹھی بیٹھی زور زور سے چھینٹے اڑانے لگیں ۔۔۔ تبھی مجھے احساس ہوا میری قمیض اور شلوار بھیگ کر میرے جسم سے چپک گئی ہے اور پھر نہ جانے کیوں فوراً میری نظریں فہیم کی طرف گئیں ۔۔۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی ۔۔۔ فہیم منہ پھاڑے بھونڈے انداز میں مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھے جا رہا تھا ۔۔۔ میں جلدی سے پانی میں بیٹھ گئی اور ایک لہر میرے اوپر سے ہو کر گزر گئی میں نے ایک بار گول مٹول فہیم کی طرف دیکھا جو سوئمنگ ٹرنک پہنے اچھا خاصا پہلوان نظر آ رہا تھا۔ ہماری نظریں پھر ملیں اس بار بھی مجھ کو نظریں جھکانی پڑیں

بھائی جان کو شاید میرے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ کر شرم آ گئی تھی وہ ہم سب بہنوں کو بڑے بھائی کی طرح چھیڑتے اور ہنستے ہوئے فہیم کا ہاتھ پکڑ کر سمندر کے کنارے کنارے پلٹ گئے

بھابی رفعت نگہت اور فرخندہ باجی کے اصرار کے باوجود میں بھاگ کر کیبن میں کپڑے بدلنے چلی گئی ۔۔۔ نہ جانے کیوں میں اس وقت بے حد مغموم ہو گئی تھی اور نہ جانے کیوں مجھے اس دم شفیق بری طرح یاد آنے لگا تھا۔

واپسی پر راستے بھر فہیم ہنسنے ہنسانے والی باتیں کرتا رہا۔ فرخندہ باجی اس ہنسی میں برابر کی شریک تھیں اور مجھے ان پر یونہی غصہ آئے جا رہا تھا۔ مجھے بھائی جان پر بھی غصہ آ رہا تھا مجھے یوں لگ رہا تھا بھائی جان نے آج نہایت ہی کمینی حرکت کی۔ میں سوچ رہی تھی کہ کیا بھائی جان نے جان بوجھ کر مجھے فہیم کی، میں پانی میں سے اٹھنے کے لئے کہا تھا؟ مگر میرا ذہن کوئی قطعی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔ باتوں باتوں میں فہیم نے بھی سمندر میں نہانا ہو تو آپ لوگ صحیح طریقے سے نہایا کیجئے ۔۔۔ میرا مطلب ہے شلواروں اور قمیضوں کے ساتھ کچھ عجیب سا لگتا ہے ۔۔۔ اور میں پانی پانی ہو گئی میرا بس چلتا تو کار کے کشن کے اندر گھس جاتی۔ بھائی جان بولے ارے یار ۔۔۔ یہ پاکستان ہے ۔۔۔ آہستہ بولو ورنہ ہماری عورتیں اگر بیدنگ سوٹس پہن کر بیچ پر نکل آئیں تو ملک میں مذہب خطرے میں پڑ جائے گا۔ بھابی اور فرخندہ باجی نے فہیم کے خیال سے اتفاق کیا۔ میں دم بخود بیٹھی رہی۔ اور فہیم اور بھائی جان اور دولہا بھائی مل کر ملاّازم کا ہنس ہنس کے مذاق اڑانے لگے۔ میں اسٹیشن ویگن سے باہر مسلسل دیکھتے ہوئے شفیق کے بارے میں سوچنے لگی۔

رات کے آٹھ بجے جب ہم گھر پہنچے تو تھوڑی دیر کے بعد شفیق آ گیا۔ میں اس کا چہرہ دیکھ کر سمجھ گئی کہ ابھی کا سفر ناکام رہا۔ شفیق بھائی جان سے ملا۔ بھائی جان نے اس کا تعارف فہیم سے کرایا اور فہیم نے شفیق سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ گلیڈ ٹو سی یو۔ شفیق نے ایک نظر اٹھا کر کمرے میں فہیم کے بکھرے ہوئے سامان

اور پھر اسنے پل بھر کے لئے مجھ سے نظریں ملائیں۔ میںنے نگاہیں جھکا لیں۔ تھوڑی دیر کے بعد شفیق چلا گیا۔

دوسرے روز بھائی جان اور بھابھی اپنے دوست فہیم کے ہمراہ راولپنڈی لوٹ گئے۔ شفیق کا کمرہ خالی ہوا تو میرے دل کا نامعلوم سا بوجھ کم ہو گیا۔ میں نے بڑے اہتمام سے شفیق کے کمرے کی صفائی کی اور بہت دیر تک اسکے ریکارڈ سنتی رہی۔ فرخندہ باجی مجھے جھاڑ پونچھ کرتے دیکھ کر کچھ اس انداز سے بولیں جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی ہوں "آخر کبھی روز نے ہی جائے گا اپنا سامان۔" میں نے فرخندہ باجی کی طرف دیکھا اور انکے چہرے میں سے جھانکتی ہوئی لومڑی کو دیکھ کر نفرت سے نگاہیں پھیر لیں۔

مگر ایک روز رات گئے جب شفیق ہمارے فلیٹ میں آیا تو میں سہمے ہوئے بچے کی طرح اس کے سینے سے لگ کر سسکیاں لینے لگی۔ اور پھر میں نے کہہ دیا "شفیق مجھے لے چلو ۔۔۔ مجھے کہیں لے چلو ۔۔۔ اس سے پہلے کہ راولپنڈی سے فہیم کی بارات مجھے لینے آ جائے۔"

شفیق کو جیسے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ اسنے بڑے جوش سے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا "فرید کیا کہہ رہی ہو ۔۔۔۔ ؟"

اور پھر بالکنی میں سے نظر آنے والے آسمان کے افق پر سپیدۂ سحر نمودار ہونے تک ہم پروگرام بناتے رہے اور میرا خوف و اضطراب مٹتا گیا۔ "ایک ہفتے کے بعد ۔۔۔ صرف ایک ہفتے کے بعد"!!۔

تیسرے روز شفیق آیا اور مجھے بتا گیا کہ اسنے سارے انتظامات قریباً مکمل کر لئے ہیں۔

لیکن پانچویں روز جب رات گئے شفیق آیا تو میں نے ہنستے ہوئے اس کا سارا ہوائی قلعہ مسمار کر دیا۔ شفیق کو افسردہ ہوتے دیکھ کر میں نے مصنوعی غصے سے کہا "بڑے خود غرض ہو ۔۔۔"

شفیق جیسے کسی خیال سے چونکتے ہوئے بولا "ارے ۔۔۔ نہیں فرید ۔۔۔ یہ بات نہیں ہے ۔۔۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی ۔۔۔ بلا ٹل گئی ۔۔۔ اور ہم دونوں کی عزت رہ گئی۔"

پھر میں نے تفصیل کے ساتھ شفیق کو بتایا کہ کیسے فہیم کی والدہ اور بھائی ہمارے متعلق خفیہ طریقے سے معلومات کرنے کراچی آئے اور کس طرح ہمارے کسی ہمدرد دشمن نے انہیں میرے اور تمہارے تعلقات کی اطلاع دے دی اور آج بھائی جان کا خط آیا کہ فہیم تو ابھی تک رضامند ہے مگر اس کے والدین نے قطعی طور پر انکار کر دیا ہے ۔۔۔

اور پھر میں نے شفیق کو بڑی مشکل سے ایک دفعہ اور لاہور جانے پر مجبور کر دیا۔ بیس دن کے بعد شفیق دوبارہ لاہور چلا گیا۔ اور اس کے جانے کے چھٹے دن میں اجڑی اجڑی سی مانمدن دلہن بنی راولپنڈی جانے کی تیاری کر رہی تھی اور شفیق کے کمرے میں فہیم بھی اپنا سامان باندھ رہا تھا۔ دو گھنٹے پیشتر ایک قاضی صاحب میرا اور فہیم کا نکاح پڑھا کے گئے تھے۔

دو روز پیشتر بھائی جان اچانک فہیم کو لے کر آئے۔ بھائی جان نے سارے خاندان کا منہ یہ کہہ کر بند کر دیا کہ سب ٹھیک ہے کہاں تا، بارات یا جاناجا ۔۔۔ سب بکواس ہے۔

میں دروازے کی چوکھٹ سے لگی بھائی جان کی باتیں سنتی رہی۔ اچانک میری زبان سے نکل گیا۔ "اور بھائی جو آرسی مصحف کا کیا ہوگا"

بھائی جان میری طرف دیکھتے ہوئے ہنسنے لگے۔ فرخندہ باجی بھی ہنس دیں۔ دولہا بھائی کو بھی ہنسی آ گئی اماں تک روتے روتے مسکرانے لگیں اور سب سے زیادہ تعجب خیز میری اپنی ہنسی تھی۔ میں ہنستے ہنستے ا۔ کمرے میں بھاگ گئی اور کمرے میں پہنچ کر جونہی میں نے دروازہ بند کیا رونا آگیا میں رونے لگی۔ اور دو گھنٹے تک کمرے میں پڑی مسلسل روتی رہی۔ سارے گھر میں سے کسی نے میری خبر نہیں لی اور اب خبر لینے کی ضرورت بھی کیا تھی ـــــ سب کے سامنے تو میں ہنستی ہوئی آئی ـــــ!!

میں آج تک نہیں سمجھ سکی کہ اس وقت سارے گھر کے سامنے مجھے ہنسی کیوں آئی تھی وہ غیر ارادی ہنسی جو زندگی کا سب سے بڑا حادثہ بن کر رہ گئی۔ اور اب میں یہ سوچ کر اپنے دل کو بہلایا کرتی ہوں کہ حادثہ ہو چکنے کے بعد کی وجہ پر غور کرتے رہنا کتنی بڑی حماقت ہے۔ "حادثہ" جب رونما ہو چکتا ہے تو ایک سنگین حقیقت بن جاتا زندگی کے سنگین حقائق کے سامنے ہم سب بے بس ہیں مجبور ہیں ـــ پاپج ہیں!!

میری قسمت کی وہ اٹل اور مہلک ہنسی میرا "دلی اقرار" سمجھی گئی۔ اسی روز فہیم نے راولپنڈی کے لئے فرسٹ کلاس کا کوپے محفوظ کرا لیا اور اگلے روز بڑے موڈرن طریقے پر ہمارا نکاح ہو گیا۔

روانگی سے تھوڑی دیر پہلے پوسٹ مین ایک ہی رنگ کے تین لفافے لے کر آیا۔ ایک فرخندہ باجی کے تھا۔ ایک ابا کے نام اور ایک "فریدہ" کے نام تینوں لفافوں پر ایک ہی تحریر تھی اور جب میں لفافہ کھول رہی تو میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"فریدہ ڈیئر ـــــ تو خوشخبری سنو ـــــ" میں نے گھبرا کر خط بند کر دیا امی قریب ہی کھڑی تھیں میں ان کو خط دے اپنے آنسو چھپانے کے لئے ایک طرف کو ہو گئی۔

ریل کے فرسٹ کلاس کے کوپے میں ہماری شبِ عروسی گویا ریل کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے ختم اس سے پیشتر کہ ریل سندھ کی حدود سے نکلتی ـــــ فہیم نے بیئر کی درجن بھر بوتلیں ڈبے میں منگوالی تھ شب عروسی ختم ہوئی اور ریل سندھ کے ریگستان سے نکل کر پنجاب کے سر سبز و شاداب میدانوں میں د لگی تو محبت آمیز جذباتی باتوں کی جگہ زندگی کے حقائق کے متعلق باتیں شروع ہوئیں۔ فہیم نے مجھ کو بتایا کہ اس کی پ سے ایک بچی بھی ہے۔ یہ خبر اگرچہ میرے لئے نئی تھی مگر مجھے کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی۔ غالباً اس کی وجہ میری ذہنی حاضری ہو گی۔

"میں نے اسے طلاق دے دی تھی"

"طلاق ـــــ میرے ذہن پر تھوڑا سا لگا اور میں نے چونک کر فہیم کی طرف دیکھا پھر فہیم دیر تک سمجھا کہ اس کی پہلی بیوی کیسی جاہل، بدمزاج اور قسی القلب تھی۔

میں نیم کی باتیں سنتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ شفیق کا خط کم از کم پڑھ ہی لینا چاہئے تھا۔
اور پھر مجھے محسوس ہوا کہ نیم مجھے پیار کر رہا ہے۔ میں نیم کی طرف جھک گئی۔ نیم نے کہا۔
• فریدہ —— نہ تمہیں میرے ماضی کے متعلق سوچ کر پریشان ہونا چاہئے۔ اور نہ مجھے تمہارے ماضی کے متعلق
—— اور اس روز تمہیں ہاکس بے "پر پانی میں دیکھ کر مجھے یقین آگیا تھا کہ واقعی جل پریاں ہوتی ہوں گی۔!!"
نیم نے کتاب بند کر دی ہے۔ اور ٹیبل لیمپ بجھا دیا ہے۔ گھڑی ساڑھے دس بجا چکی تھی نیم نے پوچھا۔ فریدہ ——
سو گئیں تم؟ نہیں —— تو "میں نے ادھوری انگڑائی لیتے ہوئے جواب دیا۔

ہمارے پلنگوں کے درمیان تقریباً دو گز کا فاصلہ ہے۔ ہمارے اور فرخندہ باجی کے فلیٹوں کے درمیان بھی اتنا ہی فاصلہ تھا۔ میرے اور نیم کے پلنگ کے درمیان کا فاصلہ ظاہری ہے اور کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ لیکن دو فلیٹوں کے درمیان کا وہ فاصلہ آخری دم تک میرے اور شفیق کے درمیان خلیج کی طرح حائل رہا۔
کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ اگر کسی رات میرے اور شفیق کے درمیان کا "وہ" فاصلہ مٹ جاتا تو کیا ہوتا؟۔
اس خیال پر میرا احساس ایک مسرت انگیز "خوف سے دوچار ہوتا ہے۔ اور بے اختیار فرسٹ کلاس کے کوپے کی رات یاد آجاتی ہے۔

بیڈ روم میں تاریکی اور نیم سرگوشیوں میں مجھے اپنے پاس بلا رہا ہے۔ معاً مجھے خیال آیا کہ آخر ہم انسان اکثر اندھیروں میں سرگوشیاں کیوں کرنے لگتے ہیں؟ اندھیروں کی یہ سرگوشیاں ایسی جذبات انگیز کیوں ہوتی ہیں؟ اور پھر دنیا کے ادب کی شاعری کا بیشتر حصہ راتوں سے کیوں منسوب ہے؟ اور یہ راتوں سے متعلق شاعری سرگوشیوں کا ساموزہ کیوں ہوتی ہے؟ ان ذہنی سوالات کے ساتھ ساتھ مجھے یاد آ رہا ہے کہ میں اور شفیق بھی تاریکی میں خود بخود غیر ارادی طور پر سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگتے تھے۔ اور دن بھر کے ہنگاموں اور شور مسلسل کے بعد اندھیروں کی یہ سرگوشیاں کانوں کو کتنی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ طلسمی سرگوشیاں کم از کم وقتی طور پر انسانی ذہن کو سارے تفکرات سے آزاد کر دیتی ہیں اور میں نیم کے پہلو میں پہنچ چکی ہوں!!۔

نیم ایک محبت کرنے والے شوہر کا "رول" ادا کر رہا ہے۔ میں ایک وفا شعار بیوی کی ایکٹنگ شروع کر چکی ہوں نیم ایک عمدہ اداکار ہے۔ وہ کہتا ہے ہمیں کم از کم دس برس تک بچے نہیں چاہئیں۔ فریدہ —— تمہاری صحت خراب ہو جائے گی۔ تم اتنی خوبصورت ہو جاؤ گی پھر مجھے بھی اچھا نہیں لگتا ہے" میں نیم کی ان باتوں پر دلی مسرت کا اظہار کرتی ہوں۔ اور نیم پر اپنی اداؤں سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتی ہوں کہ میرے دل میں اپنے متعلق اس کے خیالات کا کتنا احترام ہے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ در اصل وہ بچی کے علاوہ مزید بچے پیدا کر کے ذاتی اخراجات کم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے یہ بھی شبہ ہے کہ میں خود ماں بن کر بچی سے ماؤں جیسا پیار نہیں کر سکوں گی۔
اللہ جانے میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اس کی پہلی بیوی جاہل اور پھوہڑ نہیں تھی بلکہ وہ اس کی شراب نوشی اور کلب بازی سے عاجز آ چکی تھی۔

ـ میں اس کی پہلی بیوی کی طرح جاہل اور چڑچڑی نہیں ہوں۔ میں اس کی شراب نوشی پر بھی ناک بھوں نہیں چڑھا
میں اسکے ساتھ کلب بھی جاتی ہوں۔ میں وہاں سب کچھ دیکھتی ہوں اور جیسے کچھ بھی نہیں دیکھتی۔

فہیم کو یقین ہے کہ میں اس کی اداکاری کو اداکاری نہیں سمجھتی۔ میں بھی ایک کامیاب ایکٹریس ہوں اور تمام
کے اس احساس کو سنبھالے رہوں گی۔ میں اسکے اس یقین کو بھی ٹھیس نہیں پہنچاؤں گی !!

فرخندہ باجی بھی ایک اچھی ایکٹرس ہیں۔ گھر سے شفیق کے جاتے ہی انہوں نے ایک نئی فلم میں نیا رول شروع
تھا۔ اور فہیم کے سامنے وہ تیسرے انداز میں جلوہ نمائیں شفیق بھی ایکٹنگ کرنے لگا ہے۔ مگر ابھی نیا ہے۔ اور مجھے اس
اداکاری پر ہنسی آتی ہے۔ ابھی وہ۔ ایسی حرکتیں کرتا ہے جن سے اسکا تصنع صاف جھلک جاتا ہے ــــ پاگل لڑکا
میں چند دنوں کے لئے کراچی گئی ہوئی تھی۔ چھوٹے بھیا یا شاید دولہا بھائی نے بتایا ہوگا ــــ ایک "چھوکری" کو
فرخندہ باجی کے یہاں آن دھمکا۔ اور بڑی کوشش سے چہرے کے اڑتے ہوئے رنگ کو اپنے کھوکھلے قہقہوں میں چھپا
ہوئے میرا تعارف اس چھوکری سے کرانے لگا :-

"فریدہ ــ میری "فیانسی" سے ملو۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مجھے بڑی ہنسی آئی اور وہ "چھوکری" اپنے لپ اسٹک لگے ہونٹ کھول کر گویا میری ہنسی پر حیرت کا اظہار کرنے
بیٹھے بیٹھے چوٹ کی "تو پھر تو تم اپنا فرنیچر وغیرہ لے جاؤ گے ؟"

بس میرے اسی فقرے پر مات کھا گیا ــ پاگل لڑکا ــ جل کر بولا

"اجی ــ ہٹاؤ ــــ نیا خرید لوں گا" اور پھر اس نے بڑی بھونڈی بات کہی "فریدہ ــ آجکل میری
زوروں پہ ہے ــ لگ روز جیتے ریس میں "ڈبل ٹوٹ" چلتی ہے۔ ڈبی سے پوچھ لو ـــــ" اور وہ چھوکری
کچھ اس انداز سے مسکرانے لگی جیسے میرے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بھی شفیق کی اس بات کا یقین دلا رہی ہو !!

میں ہنستی رہی اور وہ پاگل لڑکا ــــ وہ نیا ایکٹر اپنی "روبی" کو لے کر چلا گیا !!

میں اب سونے کے لئے اپنے پلنگ پر واپس آگئی ہوں اور جسمانی تھکن کے ساتھ ساتھ ذہنی تھکن بھی محسوس کر رہی
ہوں کہ مجھے فوراً نیند آجائے۔

میں اکثر سوچا کرتی ہوں اور اب بھی سوچ رہی ہوں کہ ہماری "اشرف المخلوقاتی" قدرت کا کتنا دلچسپ مذاق ہے
میں چیونٹی سے لے کر ہاتھی تک ہمارا دشمن ہے اور اپنی اپنی جگہ موقع ملتے ہی ہم پر وار کرتا ہے۔ دوسری طرف پتھر ہمارا سر پھاڑ
دریا اور سمندر ہمیں کو ڈبوتے ہیں پہاڑ ہمیں ہی لڑکاتے ہیں زلزلے ہمیں کو دھمکاتے ہیں صحرا ہمیں کو جلا کر راکھ کر دینے کی کوشش
ہوتے ہیں اور طوفانی ہواؤں کے جھکڑ بھی ہم سے ہی جسموں کے ٹکڑے فضائے بسیط میں اڑا دینے کے لئے چلا کرتے ہیں۔
ہیں۔ اور اس کائنات کا ذرہ ذرہ ہمارے خلاف جیسے مستقل جہاد میں مصروف ہے !!

اور ہم تصنع کا لبادہ اوڑھے، اپنی عظمت کے پندار کے سہارے زندگی کو فریب دیئے چلے جاتے ہیں ــ
سوچتے ہوئے مجھے پھر وہی بات یاد آگئی کہ اگر خدا نہ ہوتا تو انسان اپنے ذہن کی پرستش شروع کر دیتا۔

کبھی کبھی مجھے ساری دنیا کے انسان وہ معصوم بچے محسوس ہونے لگتے ہیں جنکے نازک کندھوں پر خالق اکبر نے خدائی قوتوں کا وزن رکھ چھوڑا ہے۔ اور پھر میں سوچا کرتی ہوں کہ ہم میں سے کتنوں کے کندھے پر رکھی ہوئی یہ وزنی قوتیں ساری عمر سوئی رہتی ! ——— یہ بچے اپنے کندھوں پر دھری ہوئی وزنی عظمت سے بے خبری رہتے ہیں۔ اور پھر میرا دل مجھ سے کہتا ہے کہ ایک لحاظ۔ ایسے بچے بڑے خوش ہیں۔

اپنے اپنے کندھوں پر خدائی قوتوں کا وزن اٹھائے ہوئے یہ بچے زندگی بھر گویا کھلونوں سے کھیلتے رہتے ہیں۔ اور جب انہیں کوئی کھلونا پسند آ جاتا ہے۔ تو اچانک ایک غیبی ہاتھ ان کے پسندیدہ کھلونے انکے ہاتھوں سے جھپٹ لیتا ہے بچے اداس ہو جاتے ہیں ——— اپنے کھلونوں کے لئے مچلنے لگتے ہیں اور پھر اگر یہ خوش نصیب بچے وہ ہوتے ہیں جنکے کندھوں پر والی خدائی قوت سو رہی تو یہ فوراً ہی ایک کھلونے کے غم کو بھلا کر دوسرے کھلونے سے دلچسپی لینے لگتے ہیں اور اگر یہ بدنصیب بچے وہ ہوں کہ جنکے کندھو پر والی خدائی قوت بیدار ہو تو پھر یہ سوچتے ہیں اور اپنے آپ کو سمجھاتے ہیں کہ رونا اور مچلنا کتنی بری بات ہے ——— دوسرے بچے ہمارے بارے میں کیا خیال کریں گے، کیا کہیں گے ——— اور یہ سوچ کر یہ بدنصیب بچے ایکٹنگ شروع کر دیتے ہیں اور وہ ا زباں سے کہتے اور اپنی حرکات سے ظاہر یہ کرتے ہیں کہ جیسے انہیں بھی دوسری قسم کے بچوں کی طرح اپنے کھلونوں کے چھن جانے کا ذ برابر غم نہ ہو ——— !! ہر ایسا بچہ ایکٹنگ کرتا ہے اور ہر ایک اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے کہ اس کی اداکاری کو س اصلیت اور حقیقت سمجھ رہے ہیں !۔

میں سو جانا چاہتی ہوں لیکن برا ہو اس ثریا کا جو ابھی تک مرزا کی غزل گائے جا رہی ہے۔ ظالم مجھے اپنی لے پر فضاؤں میں ا پھرتی ہے اور جب وہ "نکتہ چیں ہے غم دل ۔۔۔۔۔ ۔ کو غم دل" پر چھوڑ کر سازوں میں کھو جاتی ہے تو مجھے یوں لگتا ہے کہ میں تیزی سے پستی کی طرف گرنے لگی ہوں ———

میں سوچنا چاہتی ہوں کہ پھر ثریا بدلیوں میں سے نکلتے ہوئے چاند کی طرح سازوں میں سے طلوع ہو کر مجھے تھام لیتی ہے !! نسیم ہلکے ہلکے خراٹے لینے لگا ہے ——— یہ بہت برا ہوا مجھے نسیم کے سونے سے پیشتر ہی سو جانا چاہئے تھا۔ میں اتنے عرصے میں بھی اس کے خراٹوں کی عادی نہیں ہوئی ——— اب نہ جانے کب تک جاگنا ہوگا !!

میں اپنے پلنگ سے اٹھ کر باہر باغیچے کی طرف چلی آئی ہوں۔ باغیچے میں ہو کا عالم طاری ہے۔ درخت سو رہے ہیں پھول سو رہے ہیں۔ گیراج میں ہماری آسٹن سو رہی ہے۔ مہندی کے پتوں کی باڑھ بھی سو رہی ہے۔ سڑک پر کھمبوں سے لگے ہوئے برقی قمقمے بھی جلتے جلتے سو گئے ہیں۔ صرف آسمان پر ستارے پلکیں جھپکا رہے ہیں۔

یہ بدنصیب ستارے ——— جنکی ہر رات یونہی پلکیں جھپکاتے گزر جاتی ہے ——— !!!

منظور ممتاز

دو گداگر

عرب کے ایک شہر میں ــــ شہر کے ایک بازار میں ــــ بازار کی ایک دکان میں ــــ ایک پاکستانی جمع۔ الجبنوں میں دھنسا رہتا ہے۔

صبح سے شام تک گداگر بازار کی ہر ایک دکان پر صدا کرتے قرش لیتے یا "اللہ یعطیک" کا دل شکن کلمہ سنتے چلے جاتے ہیں۔

گداگر اس پاکستانی کی دکان پر بھی صدا کرتے قرش لیتے یا اللہ یعطیک سنتے چلے جاتے ہیں۔

سال میں ایک دو مرتبہ ایک دو ماہ کے لئے کچھ بدو عورتیں گداگروں کی تعداد میں اضافہ کر دیتی ہیں۔ اس سال عورتوں نے بھیک مانگنے والوں کی تعداد بڑھائی۔ ان میں ایک خوبصورت نوجوان لڑکی بھی تھی۔

جنیک سے لوٹتے وقت اس پاکستانی نے برابر کی دکان والے عرب کو ریال کا نوٹ دیتے ہوئے لڑکی کا ہاتھ دیکھ کر پیشانی پر شکنیں ڈالیں اور دکان میں کرسی پر آن بیٹھا

کیش بک کھولے وہ بیلنس ملانے میں مشغول تھا کہ اس لڑکی نے صدا کی ــــ یااللہ من مال اللہ (اللہ کی راہ مال سے کچھ دو)

امیشی (چلی جاؤ) اس نے اسے اللہ یعطیک بھی نہ کہا۔ اور پھر کیش بک پر نگاہیں گاڑ لیں۔

دوسرے دن روز آنے والے اندھے گداگر اور اس لڑکی نے یکے بعد دیگرے صدا کی ــــ اس نے اندھے ہوئے لڑکی کی طرف نفرت سے گھورا اور امیشی کہہ کر اپنی توجہ سامنے کھلی فائیل پر مرکوز کر دی۔ پھر دو چار دن صدا نہیں سنی ــــ روز آنے والا اندھا گداگر آتا رہا اور چھوٹے سکے لے جاتا رہا۔ ان دو چار دنوں میں اور بھی کئی اور دو دو چار چار قرش کے سکے لے جاتے رہے۔

دو چار دن بعد پچھلے پہر کا وقت تھا چپراسی نے پاکستانی نیسٹ کی دودھ ملی چائے بنا کر اس کے سامنے لی اور اسکو اپنا گھر یاد آگیا۔

اس نے مہینوں کی منت زاری کے بعد اس نے عمانی چپراسی کو اپنے گھر کی چائے شکر اور دودھ کی مناسبت سمجھائی چھ ماہ کی ملازمت میں آج پہلے دن اسے گھر کی چائے بنا کر دی تھی۔

علی انت واحد زین (علی تم بہت اچھے ہو)

متشکر یاسیدی (شکریہ میرے آقا) علی نے اپنی تعریف سنکر شکریہ ادا کیا۔

چائے سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کے لئے وہ سگریٹ سلگائے کرسی پر مست ہوکر بیٹھ گیا۔ چائے کی دوسری چسکی لیتے وہ پھر گھر کی فضا میں لوٹ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھل گئی۔

"یا اللہ من مال اللہ" ——— اندھے گداگر اور اس لڑکی نے یکے بعد دیگرے صدا لگائی

آج وہ چائے کی اس نفیس پیالی کو سامنے رکھے بہت خوش تھا۔ یہ پیالی اسے گھر کی پیاری اور پرخلوص فضا میں واپس لے گئی تھی ——— اس نے میز کی دراز کھولی اور اندھے کی ہتھیلی پر ریال کا نوٹ رکھ دیا۔ اندھے نے دوسرے ہاتھ کی مٹھی میں رکھے کچھ قرش دے لوٹانا چاہے۔ مگر اس نے اندھے کی بند مٹھی واپس لوٹا دی۔ اندھا مسکراتے ہونٹوں سے اجنبی قسم کی بہت سی دعائیں دیتا بازار کیطرف بڑھ گیا۔

لڑکی نے پھر صدا کی ——— یا اللہ من مال اللہ۔

اس نے لڑکی کی صدا سے کان بند کر کے نگاہیں چائے کی پیالی کیطرف پھیر لیں ——— چائے کی پیالی میں مکھی ادھ ڈوبی ——— کڑی ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔

امشی ——— وہ نہایت غصّے سے پھنکارا۔

لڑکی پیچھے ہٹنے کی بجائے ایک قدم اور اندر بڑھ آئی

امشی ما تسمعی (چلی جاؤ۔ تم نے نہیں سنا)

سن لیا ——— تم مجھے صرف ایک ہی قرش دے دو۔ میں پھر کبھی تمہاری دکان پر نہیں آؤنگی

کیوں ——— ؟ اس نے اکدم چونکتے ہوئے لڑکی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

تم اس اندھے کو دیتے ہو جسکی دو بیویاں ہیں ——— اور مجھے نہیں دیتے جسکی دو بہنیں اندھی ہیں۔ لڑکی کی آواز میں مری ہوئی خو واپس لوٹ آئی تھی۔

تعال علی ——— اس نے نگاہیں جھکا کر کچھ سوچتے ہوئے چپراسی کو آواز دی۔ اور اپنی جیب سے کچھ نوٹ نکالکر علی کی مٹھی میں دبا ہوئے کہا۔ اس کو دے دو ——— لو یہ چائے اور بنا لاؤ۔

مبارک عظیم آبادی

گلہائے رنگ رنگ

نہ جانے کیا ہوئی آگے جو صبح و شام ہوتی تھی
نہ اب وہ صبح ہوتی ہے نہ اب وہ شام ہوتی ہے

ہزار مرحلۂ انتظار طے بھی ہوا
ہزار مرحلۂ انتظار باقی ہے

جس کو رہنا ہو رہے قیدیٔ زنداں ہو کر
ہم تو اے ہمنفسو پھاند کے دیوار چلے

نکلا چمک کے مہر قیامت بھی اور ہم
بیٹھے رہے چھپائے دلِ داغدار کو

کچھ عجب آگ لگی دل کی لگا دیتی ہے
کہ جہاں تک یہ بھڑکتی ہے مزا دیتی ہے

مرحبا بارِ امانت کے اٹھانے والو
کیا کلیجہ ہے تمہارا کہ یہ بار اٹھتا ہے

سنو تو واردات اپنی سناؤں
کہو تو سرگذشت اپنی کہوں آج

یہ بھی جی چاہتا ہے شکوۂ بیداد کروں
یہ بھی منظور نہیں کوئی پشیماں ہو جائے

اس کو پایا تو ہو گئے خود گم
اب ہمارا پتہ نہیں ملتا

جستجو کی منزلیں باقی رہیں
اور پائے جستجو باقی نہیں

اے نشاطِ زندگی کیا ہو گیا
زندگی کیسی جو تو باقی نہیں

آپ کا اختیار ہے سب پر
آپ پر اختیار کس کا ہے

دل کو جو ایذا ہوئی وہ راحتِ جاں ہو گئی
درد تو ہم دردمندوں میں دوا کا نام ہے

نہ بو کو بوئے گل ہونا پھلا پھولا گلستاں میں
نہ راس آیا چمن میں رنگ کو رنگِ چمن ہونا

آتی رہی خزاں چمنِ روزگار میں
دیتی رہی بہار کا دھوکا نظر مجھے

حریفِ موج و گرداب و تلاطم کم نظر آئے
بہت ساحل پہ دیکھے سیرِ ساحل دیکھنے والے

ہر قدم قافلے والوں کی شکستہ پائی
دوریٔ منزلِ مقصد کا پتہ دیتی ہے

فریبِ وعدۂ دلدار کا ہزار احساں
نہ ہوتی پاس تو امید اک بلا ہوتی

دردمندانِ محبت کا یہ کیا جانیں علاج
چارہ گر کی کیا سنیں ہم چارہ گر سے کیا کہیں

مجھ پہ ڈورے نہ بہارِ گل و گلشن ڈالے
میں نے دیکھا ہے گلستاں کا بیاباں ہونا

لیث قریشی

فطرتِ آب و گِل تو دیکھ جوششِ نمو ہوا نہ کم
جھوم اٹھا نہالِ شوق شاخ ہوئی اگر قلم

برق صفت ہیں گامزن جادۂ زندگی پہ ہم
جذبۂ نو نفس نفس۔ منزلِ نو قدم قدم

غیر کا درد اپنا درد۔ غیر کا غم بھی اپنا غم
ہم ہیں اسی سے بے نیاز ہے یہی مسئلہ اہم

یورشِ حادثات میں کشتیٔ زیست ہے رواں
موج بہ موج۔ جو بجو۔ سیل بہ سیل۔ یم بہ یم

نعمتِ غم سے انحراف۔ کفر ہے کفر کم نصیب
رنگِ رُخِ حیات غم۔ جلوۂ کائنات غم

آئے بصد خلوص پیش۔ سب سے وہ غیر ہو کہ خویش
میرے دل و نگاہ میں ہے وہی شخص محترم

لٹ گئی عصمتِ وفا مٹ گئی عظمتِ خلوص
بار گزر گیا اگر دوست پہ دوست کا کرم

انجمنِ حیات میں اہلِ نظر کے واسطے
جامِ جہاں نما سے ہے ایک جامِ سفال کب کم

بشیر فاروقی

ماہ و انجم کے نہ شرمندۂ احساں ہوں گے
ہم تو خود اپنی تجلی سے درخشاں ہوں گے
وادئ شوق میں کانٹوں کے سوا کچھ نہ ملا
ہم تو سمجھے تھے خیاباں ہی خیاباں ہوں گے
بجلیاں کہتے ہیں گلشن کی محافظ ہوں گی
برہمن سنتے ہیں کعبے کے نگہباں ہوں گے
آنکھ نمناک، زباں بند، مسرت موہوم
کس کو معلوم تھا یہ شوق کے عنواں ہوں گے
خامشی ساز بنیگی غم تنہائی کی
اور ہم ساز خموشی پہ غزلخواں ہوں گے
شورش وحشت دوراں کی شکایت کیسی
جب بہار آئیگی خود چاک گریباں ہوں گے
کیوں سراسیمہ ہو فاروقی اجل سے پہلے
مرحلے گردش ہستی کے دآساں ہوں گے

شہاب جعفری

مٹ گئے ہم اسرِ خرد دنیا ہوئی
اے محبت تو کہاں رسوا ہوئی

لو حریمِ دل کے پردے جل گئے
لو وہ جانِ شوق بے پردا ہوئی

ایک ایک کرکے امیدیں چل بسیں
دشتِ دل میں آرزو تنہا ہوئی

آہ رسوائی تجھے روتا ہوں میں
ایسی تنہائی بھری دنیا ہوئی

سنیو اے آوارگانِ راہِ شوق
گھر بسانے کی تمنا کیا ہوئی

کیسے کیسے قافلے گذرا کیے
چشمِ حسرت مٹ کے نقشِ پا ہوئی

ان نگاہوں سے مجھے اکثر تھا کام
وہ عداوت، وہ ندامت کیا ہوئی

پردہ دارِ شوق تھی چشمِ بدست
اب [illegible] رسوا ہوئی

کون سا عالم ہے حسرت کا شہاب
وہ تب و تاب تمنا کیا ہوئی

مظہر امام

نعمتِ فطرت ہے، ذوقِ ارتقا میرے لئے
ابتدا سے مضطرب ہے انتہا میرے لئے

آج تیری ہر ادا پر ہے قیامت کا گماں
کل قیامت بھی نہ ہو تیری ادا میرے لئے

میرے شوقِ ضوفگن نے بڑھ کے منزل دیکھ لی
ہیں چراغِ راہ میرے نقشِ پا میرے لئے

ماہ و انجم کی نگاہیں دیر سے ہیں فرشِ راہ
بن رہا ہے اب فلک پر راستہ میرے لئے

کام میرے آیا آخر میرا عزم چارہ گر
آپ کرتے ہی رہے برسوں دعا میرے لئے

ڈھونڈ لی ذوقِ محبت نے تری زلفوں کی چھاؤں
سایہ کرتا ہی رہا بالِ ہما میرے لئے

وقت کے تیور اگر نامعتبر ہیں بھی تو کیا!
معتبر ہے وہ نگاہِ آشنا میرے لئے

میرے شعروں نے جسے نامِ جفا بخشا امام
آج بھی جلتی ہے وہ شمعِ وفا میرے لئے

کتابوں میں

زخم کا ایک مشاعرہ مصنف پروفیسر سید محمد حسنین، ایم اے، پی ایچ ڈی، گیا کالج (گیا)

قیمت ۱۲/، ناشر:- ایوان اردو - پٹنہ ۴

ے ہوئے افراد کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں؟ اور دل تو یہی چاہتا ہے کہ اکبر کو تخت حکومت پر، اور میر تقی میر غزل پڑھتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے؛ ظاہر ہے کہ یہ ناممکن ہے، اس لئے مختلف وقتوں میں اہل قلم حضرات نے کی کوششیں کیں، اور فن تمثیل وجود میں آگیا۔ اردو کے شاعروں سے ملاقات کی بھی یہی ترکیب نکالی گئی۔ تذکرۂ ین آزاد نے تمثیل کا انداز اختیار کیا، فرحت اللہ بیگ مرحوم نے دلی کا ایک یادگار مشاعرہ لکھا، مولانا سید عبدالقدوس لونک کا مشاعرہ، سید مرتضیٰ حسین نے مشاعرہ عالم الحی اور ڈاکٹر عارف بٹالوی نے "جنت میں مشاعرہ" لکھا۔ ممکن ہے علاوہ بھی لوگوں نے ایسی کوششیں کی ہوں۔

ٹی سی کتاب اگرچہ مختصر ہے لیکن اس سلسلہ میں اس لئے غیر معمولی اہمیت کی مالک ہے کہ فاضل مصنف نے اسے ضہ رکھ کر لکھا ہے، اور نہایت کامیابی کے ساتھ انہوں نے اردو کے ہر دور اور ہر دبستان سے ایک یادو شاعروں شریک کرکے اردو نظم کی پوری تاریخ بتادی ہے، برابجا مزاج کے خوش گوار تنزل نے اس کیاری کی رونق میں اضافہ اشعار میں اس کا خصوصیت کے ساتھ خیال رکھا گیا ہے کہ صرف وہی چند اشعار مشاعرے میں پڑھوائے جائیں جو اس ان اور اس دور کی خصوصیت کو ظاہر کرسکیں۔

ے ہیں، میر، درد، سودا، انشا، نظیر، رنگین، نسیم لکھنوی، آتش، ناسخ، مومن، ذوق، غالب، انیس، حالی، چکبست ختر شیرانی، میراجی، اور مجاز۔ شریک ہیں، ان کی طبیعتوں کے انداز مکالمات سے اور شاعری کی خصوصیات ان ار سے ظاہر کی گئی ہیں۔

باب تعلیمی کوشش پر ڈاکٹر حسنین کو مبارکباد پیش کرتے ہیں، ... اور امید کرتے ہیں کہ تاریخ ادب پڑھانا ثابت ہوگا۔

قدیم تہذیبیں اور مذاہب مصنفہ پروفیسر ظفر عمر زبیری ایم اے، نیشنل کالج کراچی، حجم ۲۸۰ صفحات
تقطیع کراؤن کا سولہواں مجلد، قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے۔

پروفیسر زبیری نے یہ کتاب کالج کے ابتدائی کلاسوں کی تعلیمی ضروریات کو مدنظر رکھ کر لکھی ہے۔ اور انتہائی اختصار کے ساتھ چھوٹی سی اردو کتاب میں۔ فرعونی مصر، اشوری، کلدانی، بابلی، ہندوستانی، چینی، ایرانی، یونانی اور رومی، تہذیبوں کے عروج و زوال کے عاملوں کی سمجھ اور ان کے معیار کے بموجب پیش کیا ہے۔ آخر میں بالاختصار دنیا کے پانچ مذاہب، ہندو دھرم، بدھ مت، عیسائیت اور اسلام کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اردو میں ایک ایسی مختصر سی کتاب کی ضرورت تھی، اور یہ کتاب اسی ضرورت کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔

مصنف اپنے مقصد میں کامیاب ہیں، انہوں نے آسان زبان اور سلیس انداز میں بہت سی کارآمد باتیں بتا دی ہیں، صرف طلبہ ہی نہیں بلکہ عام مطالعہ کرنے والوں کے لئے بھی یہ کتاب کافی حد تک پر از معلومات ہے۔ لوگ اس کے مطالعے سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

چونکہ یہ کتاب خصوصیت کے ساتھ طلبہ کے لئے لکھی گئی ہے اس لئے ہم فاضل مصنف کی توجہ تصحیح کی طرف مبذول کرانے کی ضرورت سمجھتے ہیں۔ کتاب میں طباعتی غلطیاں کافی رہ گئی ہیں، اور کہیں کہیں پوری عبارت پوری نظرثانی کی محتاج ہے۔

اسی طرح مذاہب کے سلسلے میں ہم فاضل پروفیسر سے آئندہ نظرثانی کی سفارش کرتے ہیں۔ بعض ایسی باتیں بھی درج ہیں جو حقیقتاً صحیح نہیں ہیں۔ بلکہ انگریزی مصنفین کی نارسائی سے پیدا ہو گئی ہیں جن کی کتابوں سے فاضل مصنف نے تاریخی مواد حاصل کیا ہے۔ تاریخ نویس کو بیانات کی تحقیق میں کافی سخت ہونا چاہئے۔

خالہ اپوا کے نام مصنفہ مہر شاہ۔ حجم ۱۴۸ صفحات چھوٹی تقطیع، مجلد، رنگین گرد پوش
قیمت دو روپے۔ پتہ:۔ نیا کتاب گھر ۲/۱۵ سعود آباد کراچی ۲۶

مہر شاہ ایک نوجوان صاحب قلم ہیں۔ یہ کتاب آٹھ خطوط کی شکل میں ہے۔ جو آپا کی فرضی خالہ کے نام لکھے گئے ہیں۔ اس میں طنز و مزاح کو بہت سلیقہ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ نوجوان صاحب قلم نے اعلیٰ طبقہ کی پاکستانی خواتین اور نوجوانوں، سرکاری عہدہ داروں اور بدعنوانی کاروباریوں کی ذہنیتوں پر بہت ہی چبھتے ہوئے اور خوبصورت جملوں میں طنز کیا ہے۔ کتاب دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ مہر شاہ آئندہ ایک نامور طنز نگار ہوں گے۔ ان میں اس کی خاصی صلاحیت پائی جاتی ہے اور صاحب قلم کے لئے اس سے بہتر اور کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ جو صلاحیت اسے فطرت فیاض نے عطا کی ہو اس سے کام لے اور دنیا میں اپنا مستقل مقام پیدا کرے۔

سید مشتاق حسین ندوی۔ ایڈیٹر پرنٹر و پبلشر نے ... پریس میں چھپوا کر ... بہادر یار جنگ سوسائٹی کراچی سے شائع کیا۔

رسالوں میں

مئی کے تازہ شمارے میں مرحوم ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا مضمون "وحدت انسانی اور عقیدۂ توحید" [illegible]
انہوں نے واضح کیا ہے کہ قرآن کے پیش کردہ اسلام کے دو اہم ارکان ہیں ایک وحدت الٰہ دوسرے وحدت انسانی
اقبال اور قرآن میں یہ بتایا ہے کہ اقبال نے صاف لفظوں میں لکھ دیا ہے کہ اسلام کا آئین قرآن ہے۔ اور رموز بیخودی میں
کی تشریح میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے عربی حبشی تعلقات اور مکاتیب نبوی کے عنوان سے قبیلہ ابرہہ
کی جاہلی عربوں کے تعلقات نجاشی کے اسلام پر تاریخی بحث کی ہے اور مکاتیب نبوی نقل کئے ہیں۔
تمثیلات" جعفر شاہ صاحب پھلواری کا مضمون ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ہر قسم کی مادی تعلیم اور روحانی تربیت کی
ہوتی ہے۔ اسی سلسلے میں اس سے پہلے کی قسط قرآنی تمثیلات پر مشتمل تھی جو احادیث نبوی میں پائی جاتی ہیں
النبیین کا انتظام اور اقامت حدود اللہ وغیرہ شبیر احمد خاں غوری کے قلم سے "علم کلام کا آغاز و ارتقاء" پر مسلسل
یکی تحقیقی مقالہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ ساتویں قسط ہے اور عہد آخر ہندوستان کے علمی کارناموں پر مشتمل ہے
مختلف زمانوں کے اہم مفکرین کے سیاسی افکار کی بحث ہے۔ اس مرتبہ پروفیسر رشید احمد نے کیکاؤس کے
نامہ کی روشنی میں سیاسی نظریات، حکمران کے اوصاف و فرائض، اعمال، رعایا کے تعلقات، وزارت اور فوج کے

[illegible] کا مضمون فلسفہ کیا ہے بھی دلچسپ ہے آج کل جبکہ فلسفہ کا لفظ ہر شخص کی زبان پر بے تکلف آتا ہے اس قسم کے مضامین
ضروری ہے تاکہ لوگ اصطلاحوں کی حقیقت سے بھی آشنا ہوں۔
——— تازہ شمارے میں ڈاکٹر [illegible] کے قلم سے [illegible] نے ایک مختصر مضمون
[illegible] جس میں [illegible]
[illegible] اقبال [illegible] اس کا عنوان [illegible]
[illegible] اسلام کے نظریۂ قومیت [illegible]
[illegible]
[illegible] میں یہ بتایا ہے کہ [illegible]

موجودہ علوم و فنون سے آگاہی اور ہماری سیرت و کردار کی تعمیر میں مطالعہ ایک بنیادی اہمیت رکھتا ہے اس لئے ہر موضوع پر کم سے کم وقت اور زیادہ سے زیادہ موثر طریقہ پر مطالعہ کرنے کا گر یہ ہے کہ جس موضوع پر پڑھو ان لوگوں کی کتابیں پڑھو جو مستند (اتھارٹی) کی حیثیت رکھتے ہوں۔ اسی شمارے میں محسن انصاری کا مضمون آتش پر بھی ہے جس میں ان کی شخصیت، ان کے تغزل، فقر و توکل ہمت و حوصلہ اور انداز بیان پر روشنی ڈالی گئی ہے اور کہا ہے کہ آتش کی شاعری میں ان کے تصورِ حیات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ کیف تغزل کے عنوان سے حافظ محمد عظیم نے کیف ٹونکی پر ایک مختصر مضمون بھی اس شمارے میں شامل ہے۔ کیف ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے تھے، اور نواب سلیمان خان اسد لکھنوی کے شاگرد تھے۔ کیف فن عروض سے خاص ربط رکھتے تھے اور مہاراجہ بھوانی سنگھ والیٔ ریاست جھالرہ ان کے بڑے قدر داں تھے۔ کیف نے ۱۹۴۰ء میں وفات پائی۔

تحریک دہلی ——— اس ماہ ایڈیٹر نے "کیا اکثریت اقلیتوں کی دشمن نہیں" کے عنوان سے واضح کیا ہے کہ برسراقتدار قوم اقلیتوں کو کس کس طرح پامال کرتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اردو رسم الخط بدل کر دیوناگری کر دیا جائے تو ہم اسے اردو کے مخالفوں کی صف میں شامل کر لیتے ہیں۔ سوویٹ روس میں کیا حال ہے وسطی ایشیا کے مسلمانوں کی زبان عربی تھی، وہ عربی ہی پڑھتے تھے اور عربی ہی لکھتے تھے ۱۹۲۰ء میں یہ سلسلہ ختم کر کے لاطینی حروف کو لازمی قرار دیدیا گیا اور ۱۹۳۰ء کے بعد روسی رسم الخط ہی استعمال کئے جا رہے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کے مذہبی اور ثقافتی تصورات کا خاتمہ کیا جا رہا ہے۔ اور اب کہا جاتا ہے کہ روس میں صرف ڈیڑھ کروڑ مسلمان ہیں حالانکہ ۱۹۲۷ء میں تعداد چار کروڑ بتائی گئی تھی آخر باقی مسلمان کہاں گئے! ——— اسی شمارے میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا مضمون رومی اور اقبال کا تصور محبت بھی درج ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ اقبال اور رومی دونوں کا تصور یہی ہے کہ استدلال کے ذریعے زندگی کی توضیح ممکن نہیں، دونوں عقلیت کے مقابلے میں وجدان اور عزیمت کو حقیقت سے قریب تر خیال کرتے ہیں۔ محبت کو وجود کے اساسی محرک یعنی "ولولۂ حیات" یا اس کی علت غائی سے تعبیر کرتے ہیں۔ نثار احمد فاروقی نے آج کے ادبی مسائل پر بحث کی ہے اور کہا ہے کہ اس دور کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ قدیم کے سرمائے میں سے کیا لیا جائے۔ اور کیا چھوڑا جائے۔ قدیم روایات کی گرفت ڈھیلی ہوتی جا رہی ہے اور نئی روایات کے خدوخال ابھی رنگ نہیں بھر گئے ہیں۔ روایات کی تعمیر تاریخی تقاضوں سے ہوتی ہے۔ اور تاریخی تقاضے سماجی حوالے ہوتے ہیں۔ محمد حسین نے شیکسپیر کے طربیہ ڈرامے کے عنوان سے ایک مختصر مضمون لکھا ہے اور کہا ہے کہ یورپین ادب میں نشاۃ ثانیہ تخلیقی روح چونکہ اس کی سب سے نکھری ہوئی شکل انگریزی ڈرامہ ہے مگر انگریزی ڈرامے کو اخلاقی، مذہبی پابندیوں سے نکال کر حیات و کائنات کا آئینہ دار بنانا شیکسپیر کا کارنامہ ہے۔

اشارہ پٹنہ ——— تازہ شمارے میں عبدالباسط ضیا جالوی نے مخدوم الملک بہاری کی تصانیف کا مختصر تعارف کرایا ہے۔ اور اس مضمون میں ارشاد السالکین، مطالب الطالب، اسباب النجاۃ، رسالہ مکیہ، قصائد عشرہ، ارشاد الطالبین، مراۃ المحققین وغیرہ رسالوں کا تذکرہ ہے کتابوں کے تعارف کے علاوہ حضرت مخدوم کی تعلیمات و اقوال بھی درج کئے ہیں جن میں ایک قول یہ بھی ہے کہ عقل اس لئے نہیں دی گئی کہ اس سے خدا کے کمالات اور اس کی کنہ ذات سے آگاہی حاصل کریں بلکہ اس لئے کہ بندگی کے طریقوں کو جان سکیں۔ ——— حبیب عثمانی ندوی نے "اور عشق رسول" پر ان کے کلام سے اچھا مختصر مضمون لکھا ہے۔ اقبال کے نزدیک عشق سرمایۂ کائنات ہے اور اسی عشق کی بدولت انسان کو یقین و اذعان کی دولت حاصل ہوتی ہے چنانچہ اقبال کو حاصل تھی جو دوسرے شعراء کو نصیب نہ ہوئی۔ شکیل انصاری نے سلطنت مغلیہ کی اہمیت اور اس کے مقاصد پر قلم اٹھایا

ایں کہ ان کی مطلق العنانی یا استبدادی بادشاہت حقیقت میں رعایا کی حمایت پر مبنی تھی۔ مضمون معلومات افزا ہے۔

راچی ——— پہلا مضمون اردو رسم الخط پروفیسر نورالحسن برلاس کے قلم سے ہے۔ انہوں نے دنیا کی ترقی یافتہ ان کے حروف تہجی سے مقابلہ کر کے بتایا ہے کہ اردو کے حروف تہجی میں کتنی زیادہ آوازیں موجود ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے ن پر ہر لحاظ سے فوقیت ہے۔ عربی الفاظ کا تلفظ مشکل ضرور ہے مگر انگریزی کا رسم الخط تلفظ کے لحاظ سے بہت ناقص ہے۔ اردو سے زیادہ ٹائپوں کی ضرورت ہے تو یہ نہ عیب ہے نہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ۔ جاپانی زبان کو بے شمار ٹائپوں کی ضرورت جاپان کی ترقی ٹائپوں کی کثرت سے نہ رکی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ رومن رسم الخط کا اختیار کرنا ترقی کی ضمانت نہیں ہے مملکتیں رومن رسم الخط کے باوجود جہاں تھیں وہیں ہیں ترقی کا اصل محرک آدمی کا ایمان یا اس کی ذہنیت ہے۔ ترکی کی نے یورپ سے عاجز آکر رسم الخط بدلا ہے (ترکی میں لاطینی رسم الخط پہلے سے موجود تھا اور اخبار تک اس میں چھپتے تھے آشنا نہیں تھے) عربی رسم الخط کو چھوڑ کر ہم بہت بڑی برادری سے کٹ جائیں گے۔ دوسرا مضمون مہدی الافادی کا محمد احمد صدیقی ایم اے نے بتایا ہے کہ مہدی افادی عورت اور حسن کو مترادف سمجھتے تھے اور یہ تخیل یونانیوں کا تھا۔ لیکن سرے سے محبت کرنا ایک ناقابل معافی گناہ ہے۔ وقار راشدی نے ایک طائرانہ نظر کے عنوان سے بشیر فاروقی کے ی کا تعارف کرایا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ بشیر فاروقی کی شخصیت فکر و عمل اور اخلاص و محبت سے عبارت ہے اور یگین ہے۔

راچی ——— تازہ شمارے میں پہلا مضمون جمیل جالبی کا ہے: "پیسٹرنک بحیثیت شاعر" یہ مضمون اس روسی بو عد ۱۹۳۲ء کے انگریزی ترجمے کا مطالعہ اور اس مطالعے کا تاثر ہے۔ جمیل جالبی کی رائے میں احتساب فنکار کی انفرادیت بیٹھا کر اس کی فکر کی نشو و نما اور پرواز کو روک دیتا ہے ——— آج فنکار سے تقاضا ہے کہ مخصوص نقطۂ نظر اور مخصوص موضوعات سے نے اکثر دوسرے تیسرے درجے کے فنکاروں کو سر پر بٹھا دیا ہے۔ ایسی صورت میں فنکار کے سامنے دو ہی راستے بن جائے یا خاموش ہو جائے۔ پیسٹرنک ۱۹۳۲ء کے بعد جبکہ روس میں سماجی حقیقت پسندی کا دور دورہ ہوا اور اس س روز بروز ادب سے غائب ہونے لگی، خاموش ہو گیا۔ جمیل جالبی کی رائے میں پیسٹرنک کی عشقیہ شاعری کا امتیاز یہ ہے کہ عشق میں معاملے کے ساتھ پوری کائنات کو سمیٹ لیتے ہیں۔ شمیم احمد نے اپنے مضمون "غزل کے شکوے" میں غزل کے خلاف اٹھنے والی آوازوں پر تبصرہ کیا ہے۔ حضرت جوش نے پچھلے دور میں غزل پر لے دے کی تھی۔ شمیم احمد معرفت ہمارے جذبات و احساسات کا اظہار ہے بلکہ دو مصرعوں میں کسی خیال کو تکمیل کے ساتھ پیش کر دینا ایک فنی سمجھنے کی چیز ہے۔ تنہائی کی رفیق نہیں۔ ترقی پسند تحریک کے دور میں غزل کا حلقہ نظم کے مقابلے میں خاصہ گھٹ گیا تھا ساتھ نہ دے سکی۔ آزاد نظم بعد شور سے ابھری مگر آج وہ اپنے موجدوں کے دل سے بھی اتر چکی ہے اور غزل پھر شمیم احمد نے میر، مصحفی، آتش، غالب، مومن، حسرت اور فراق کے اشعار کے ساتھ عہد حاضر کے چند نوجوان شاعر یم احمد فراز، جاوید، اطہر نفیس کے منتخب اشعار بھی اپنے مضمون کے ضمن میں درج کئے ہیں، اور کہا ہے کہ دیکھنا غزل کی صورت ابھی قائم ہے۔ اور ہماری تنہائی کا مداوا کرتی ہے پتہ نہیں نظم کبھی یہ خصوصیت پیدا کر سکے گی یا نہیں۔

اس شمارے میں ایک مضمون فراق اور موسیقی بھی ہے کہ جس میں یہ خیال ہے انہوں نے مرحوم موسیقی اور موسیقی کا ایک جواب
شاعر ان کی موسیقی سے نکال لیں ۔۔۔۔۔ موسیقی کی علامت پر انہی نے شدید جذباتی وابستگی کے عالم میں یہ مضمون لکھا ہو اور وہ تمام
کیفیات سب اختیار اور ہم آہنگی ہیں جو موسیقی ہے جو بعض کی ایک ست کی خبر سن کر اس خبر کی چوٹ کھا کر اتنا ہی بے بسی کے ساتھ
میں پیدا ہوتی ہیں۔ موسیقی بہت بچے دوست تھے اور دوستوں کے محبوب ان کی موت کی خبر نے ہر دل کو تڑپا دیا اور دل سے بے ساختہ ابھری

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف ٭ کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

خیر میں تحقیق الفاظ کا ایک مضطرب بھی اس شمارے میں شامل ہے یہ ایک اچھا سلسلہ ہے لیکن اتنی لغوی اور فنی ابحاث سے
مضمون کو بوجھل ہونے سے بچا لیں گی اگر ہلکا پھلکا انداز اختیار کیا جائے تو دلچسپی کے ساتھ پڑھا بھی جائے گا اور محنت ٹھکانے بھی لگے گی۔

بقیہ۔ آزاد

شبو مظہر جان وتمدن عرب"(۶) مولینا محمد حسین آزاد"صاحب آب حیات"(۷) نواب سید محمد آزاد، نواب ڈھاکہ (۸) شیخ امیر اللہ آزاد، شاگرد غلام علی عشرت بریلوی (۹) میر ظفر علی آزاد شاہجہان پوری (۱۰) لالہ رام سنگھ آزاد (۱۱) علامہ فضل حق آزاد عظیم آبادی (۱۲) حکیم غلام حسین آزاد رامپوری (۱۳) مولانا آزاد سبحانی (۱۴) مولانا ابوالکلام آزاد (۱۵) مولانا آزاد صمدانی (۱۶) حکیم آزاد انصاری (۱۷) ابوالبیان آزاد دہلوی (ایڈیٹر تیغ) (۱۸) محمد عثمان آزاد مالک روزنامہ انجام (دہلی وکراچی) (۱۹) جگن ناتھ آزاد (۲۰) مختار آزاد علیگ ---------

ممکن ہے ان میں سے کچھ نام مولانا عبدالماجد دریابادی کے علم میں نہ ہوں لیکن اتنا تو یقینی ہے کہ غلام علی آزاد، محمد حسین آزاد، نواب سید محمد نواب ڈھاکہ، علامہ فضل حق آزاد اور حکیم غلام حسین آزاد رامپوری کے نام ان کے حافظے میں تازہ ہوں گے جو مولانا ابوالکلام اور مولانا آزاد سبحانی سے پہلے کے لوگ ہیں۔ عجب نہیں کہ مولانا دریابادی نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہو کہ مولانا ابوالکلام نے اپنا تخلص آزاد رکھا تو اس کی محرک کس آزاد کی شہرت و مقبولیت تھی، صاحب آب حیات کی یا صاحب سبحۃ المرجان و تمدن عرب کی یا کسی اور آزاد کی ۔۔۔۔۔ مولانا دریابادی اگر اس پر قلم اٹھائیں تو ایک اچھی اور معلومات افزا مضمون وجود میں آ سکتا ہے ۔ اور پھر یہ کہ کیا ایک آپ ہی نے شبلی جیسے استاد کی صحبت کے باوجود آزاد تخلص اختیار کیا ہے،

جولائی ۱۹۵۹ء

شمارہ نمبر ۴

ادارہ

حسن مثنیٰ ندوی
علی اکبر قاصد
ابوالخیر کشفی

سالانہ:- مبلغ چھ روپے
ششماہی:- مبلغ تین روپے چار آنے
فی پرچہ:- آٹھ آنے (۸/)

۲ بہار ہاؤسنگ سوسائٹی - ہاؤسنگ یونین ایریا، کراچی نمبر ۵
دفتر رسالہ [illegible] کراچی ۳

اس شمارے میں

جمادی

پرونکیاچی

پہلی کرن

کسے خبر ہے کہ واں جنبشِ قلم کیا ہے؟

پچھلے شمارے میں ہم نے جب ادبا و شعراء اور فنکاروں کے بارے میں کچھ عرض کیا، اور ان کے متعلق رائج ہو جانے
لی مبالغہ آرائیوں کی حقیقت واضح کرنے کی کوشش کی تو ضمناً فکرِ انسانی کے مختلف زاویے بھی زیرِ بحث آ گئے
پہلے ن کے شمارے میں ادب برائے زندگی پر کچھ لکھنا چاہا تو انہی وقتوں بھی سوشیل انیل نے، اس کی تعریف
س تعریف کے لازمی تقاضوں نے اپنے حقوق کا مطالبہ پیش کر دیا، ظاہر ہے کہ یہ باتیں خالص علمی و فکری مباحث سے
تی ہیں، اکثر و بیشتر تو ہم اعتماد ہی کرتے ہیں کہ اس قسم کے سنگلاخ میدان میں اشہبِ قلم کو فرّاٹے بھرنے کی اجازت
کان نہ دی جائے، لیکن اس قید کی مستقل پابندی شاید ممکن بھی نہیں، یہ دنیا جیسی کچھ بھی ہو، ہماری زندگی کے
روز اسی میں بسر ہو رہے ہیں، اور ہمارا کوئی قدم بھی ایسا نہیں ہے —— خواہ وہ کتنا ہی سیدھا سادا اور سرسری
—— جو ہمارے ذہنی تاثرات سے آزاد ہو، ہمارا ذہن کس کس طرح تیار ہوتا ہے مختلف لہریں کہاں کہاں سے
اس میں جمع ہوتی ہیں اور پھر ان سب کے امتزاج سے کچی پکی صورتیں کیسی کیسی اور کس تیزی سے وجود میں آتی ہیں،
یہ نہ اتنا آسان ہے نہ ہر کسی کے بس کی بات ہے کہ اس پر روشنی ڈالے، لیکن یہ ہرگز مشکل نہیں ہے کہ ہم لوگ
ور گفتگو کرتے ہیں، کچھ خیالات دوسروں سے اخذ کرتے ہیں کچھ اپنی ذہانت سے خود مرتب کر کے دوسروں کے سامنے
ھتے ہیں، بحثیں کرتے ہیں، نعرے لگاتے ہیں، تبصرہ کرتے ہیں، نثر لکھتے ہیں یا نظم و غزل کہتے ہیں، ان کے "ما لہٗ و ما علیہ" پر بھی
انکی ابتدا اور انتہا کو بھی سوچیں، ان کے آغاز و انجام کی ترتیب کو بھی پیشِ نظر رکھیں، یقین کیجئے ہماری بے شمار باتیں
ہیں، حتیٰ کہ مذاق و تفریح کی باتیں بھی، جن کا اگر تجزیہ کیا جائے تو وہ کسی نہ کسی مکتبۂ فکر سے وابستہ نظر آئیں گی چاہے
ں کا کوئی احساس و شعور ہو یا نہ ہو، مکتبۂ فکر سے ہماری مراد وہ بنیادی فکریں ہیں جو اس دنیا کے بارے میں ارباب
ش کی ہیں، اور بعض اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ ہماری ایک ہی تقریر یا تحریر میں بیک وقت متضاد افکار کی آمیزش
اور یہ آمیزش نہ صرف یہ کہ ہماری پراگندہ خیالی کی غمازی کرتی ہے بلکہ سننے والے کے ذہن میں بھی انتشار پیدا کرتی ہے
لہ بے خبر سہی یہ ضروری نہیں ہے کہ سننے والا یا پڑھنے والا بھی بے خبر ہی ہو، وہ لازماً سوچیگا کہ ہماری یہ باتیں یا خیالات
ارکس مکتبۂ فکر سے متاثر ہیں، کیا پیش کر رہے ہیں، اور آدمی کو کدھر لیجانا چاہتے ہیں، مثال کے طور پر میر تقی میر کے
ہیے، کتنا اچھا، کتنا دلآویز اور کتنا موثر نظر آتا ہے کہ —

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی ۔۔۔ چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

نہ جانے کتنی مرتبہ آپ نے خود بھی پڑھا ہوگا، سنا ہوگا، اور سر دھنا ہوگا، بلکہ بیسیوں کو سنایا بھی ہوگا۔ مگر کیا کبھی ایسا نہیں
ا کہ اس شعر کی بنیادی فکر نے آپ کے یا سننے والے کے ذہن کو جھنجوڑا بھی ہو؛ یقیناً یہ شعر کھوکھلا نہیں ہے۔ اور میر جیسے کتنے
"سر سری اس جہان سے گزرے" ہوں، ان کا یہ شعر سرسری وجود میں نہیں آیا۔ اس کے پیچھے ایک خاص تصور ایک خاص خیال
فرمائیے یہ خیال انہوں نے جہاں سے بھی مستعار لیا ہو جبری مکتبۂ فکر کا ترجمان ہے اب اگر ہمارے دل میں بھی اس شعر نے اپنی دلآویزی
ن کے سبب گھر کر لیا ہو تو اس کا مطلب یہی ہوا کہ ہمارا ذہن بھی اسی رخ پر جا رہا ہے اور آئندہ ہمارے اعمال و افعال بھی اسی فکر کے
زیر اثر ظہور میں آئیں گے۔

اسی طرح شاد کے اشعار بھی بہت مزے لے کر پڑھتے ہیں اور جھومتے ہیں اور جھومنا پذیرائی کی دلیل ہے، شاد کہتے ہیں۔

اسیر جسم ہوں میعادِ قید لامعلوم
یہ کس گناہ کی پاداش ہے خدا معلوم

مگر کیا واقعی شاد اسی مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے جس کا اظہار اس شعر میں ہوا ہے؟ اور شاد رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں، خود
ہم اس شعر کو پڑھ کر کہ "اسیر جسم ہوں میعاد قید لامعلوم" جب جھومتے ہیں تو اپنے ذہن و فکر کو کدھر لے جاتے ہیں؟ "اسیر جسم"، "میعاد قید"
گناہ کی پاداش" کی ترکیبیں تو یہ بتاتی ہیں کہ یہ شعر گوتم بدھ کا ہے یا سینٹ پال کا۔ ان دونوں کی نظر میں یہ دنیا ایک قید خانہ ہے اور انسان
اس قید خانے میں سزا یافتہ قیدی۔ یہ انہیں دونوں "قیدیوں" کی فکر ہے کہ "یہ جسم انسانی فطری طور پر بدی کا سرچشمہ ہے اور شر کا گہوارہ
جب تک انسان زندہ ہے بدی سے چھٹکارا کہاں، بدی سے چھٹکارا تو جبھی ممکن ہے کہ روح کو اس قید خانے سے نجات ملے" اب ظاہر ہے کہ
ہر قیدی اس قید سے نجات کی سوچے گا، چنانچہ یہی ہوا، واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں قیدیوں نے اس قید خانے سے نکلنے کی راہیں تلاش کیں۔ ایک نے سوچا: دیوار
توڑ کے نکل جاؤ۔" بالفاظ دیگر خودکشی۔ بالکل منطقی نتیجہ۔ دوسرے نے سوچا: نہیں، دیوار توڑ کے ہم اگر نکل بھی گئے تو جائیں گے کہاں؟ وہ پھر پکڑ کے کسی دوسری
کوٹھری میں بند کر دیگا، کیا خبر کہ پہلی ہی بناوٹ بھی ہو، اور پھر آواگون کے نہ جانے کتنے ہی چکروں سے گذرنا پڑیگا بہتر ہے کہ زندہ ہی رہو جسم
کی اس دیوار کا توڑنا غلط ہے۔ آخر یہ دونوں قیدی اس نتیجے پر پہنچے کہ نجات کا حاصل کرنا بہر حال ہمارے اپنے اختیار میں نہیں ہے، نجات دینے والا خود ہی
اپنی مرضی سے نجات دیدے تو دیدے، اس نتیجے پر پہنچ کے سینٹ پال نے یہ راہ نکالی کہ "لو مبارک ہو آخر وہ رحم آ گیا، اور خدا خود ہی انسان کے روپ میں ظاہر ہو
اور صلیب پر چڑھ کے تمام انسانوں کے اگلے پچھلے سب گناہوں کا کفارہ خود ادا کر گیا" اس خوشخبری کے مبارک ہونے میں کیا شبہ ہے سینٹ پال کی یہ دعا قبول
ہو گئی، لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ نظام الاخلاق کی جڑ بھی ساتھ ہی کٹ گئی، ہو گئی نہ یہ کہیے تو آج تک نادم گوتم بدھ سے جو تصور منسوب ہوا وہ یوں ہے کہ یہ دنیا قید
خانہ تو ہے ہی، دکھوں اور پریشانیوں کا گھر اور یہ ساری پریشانیاں اصل میں ہماری فطری خواہشوں کا نتیجہ ہیں جسم کی دیوار توڑ کے نکلنا ممکن نہیں تو خواہشات ہی کو
اور بس کچلتے رہو یہاں تک کہ کل کُل کے نروان حاصل ہو جائے نظام اخلاق کی جڑ یہاں بھی کٹ گئی گویا ایک نے رہبانیت کی کنجی میں سما جانے کا مشورہ دیا
دوسرے نے سب کا خاتمہ ہو جانے کا۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے؟ پھر بتلائیے کہ اس فنکار عظیم نے ہمیں کیا صلاح دی؟ اور اس شعر کا قطب نما کس طرف کی راہ دکھاتا ہے

یارانِ نکتہ داں

سلم :-

اویونس منزی کے توسط سے موصول ہوا۔ ترجمہ دو بھائی پڑھ کر ایک فنی خامی مجھے بری طرح محسوس ہوئی۔ ابتدا
۔ ۔ ۔ ۔ "اور "کارپورل" کا تمغہ بھی دونوں نے حاصل کیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " حالانکہ جنگ ہو یا امن "کارپورل" قسم کا کوئی تمغہ
ہوا ہے۔ یہ فوج میں نان کمیشنڈ آفیسر (N.C.O) کا سب سے پہلا عہدہ ہے جو بری فوج کے "نائک" کے برابر ہوتا
اسے ملک کی فضائی فوج میں یہ عہدہ قائم اور مشہور ہے۔ کارپورل کے بعد سارجنٹ کا عہدہ ہے۔ مزید تحقیق کے لئے
WORLDS GREATEST SHORT STO میں ناروے کے افسانہ نگار۔۔۔۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ BJORNSTJERNE B کے افسانے THE BROTHERS کا مطالعہ شروع کیا۔ اس میں بھی متعلقہ
AND BOTH ROSE TO THE RANK OF CORPORAL ....."
ر کارپورل کے عہدے تک پہونچ گئے) "RANK" کا ترجمہ "تمغہ" کس طرح ہو سکتا ہے۔
یہ افسانہ پڑھنے کے بعد مجھے ہنگری کا ایک افسانہ یاد آگیا جس کا ترجمہ میں نے کئی سال پیشتر کیا تھا اور بہ سبب طوالت
نہیں کی تھی، اب جبکہ آپ "پاکدامنی کے معیار" شائع کر چکے ہیں تو میں نے تمام سطور کا حساب لگا کر اندازہ کیا کہ یہ بھی
کے معیار جتنا ہی طویل ہے۔ اس لئے میں ارسال کر رہا ہوں۔

اپیل :-

کے بعد مہر نیمروز کا اچانک نظر آجانا اس چیز کا بیّن ثبوت ہے کہ مرشد ہی نہیں بلکہ آپ بھی ادبی تشنگی کے احساس میں
برابر شریک تھے۔
کی بات حاضر ہے، کچھ طویل ضرور ہے مگر امید ہے کہ آپ کو پسند آجائے گا۔

سدی :-

دلچسپی کے ساتھ میرے زیر مطالعہ رہا ہے۔ اس کے بعض شمارے حاصل نہ کر سکا جس کا مجھے افسوس ہے۔۔۔۔
صریرِ خامہ نوائے سروش ہے "ارباب فکر و ادب کو دعوت فکر و عمل دیتا ہے۔ سید جمال اختر صاحب ہاشمی
صاحب کے مضامین "عربی زبان کی اہمیت" اور "نقد" بےحد مفید اور معلومات افزا ہیں۔ حضرت محمد ۔۔۔

[?]یقیناً آج کل بڑی شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔ آپ نے ان کی گرانقدر تخلیق پیش کرکے بڑا کرم فرمایا ہے۔ مبارک عظیم
[?]ں جیسے بزرگوں کے افکار عالیہ کے لئے آنکھیں ترستی ہیں۔ پروفیسر ارشد کاکوی کی غزل بہت اچھی ہے۔

۲ اکبر علی خاں:۔

کلیات اقبال کی ترتیب نو | اردو شاعری میں علامہ اقبال کے کلیدی مقام کے پیش نظر اس بات کی بے حد ضرورت [?]
ان کے کلام کو نئے ڈھنگ سے نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اس طرح کہ تاریخی ترتیب کے دوش بدوش ان کے
[?]کی ارتقائی منزلیں اجاگر ہوکر قاری کے سامنے آجائیں۔ کسی بھی شاعر کے افہام و تفہیم کے لئے اس کے اشعار کا صحیح پیکر ضروری ہوتا
[?]س کے بغیر ہم مصنف کے مافی الضمیر کو نہیں پہچان سکیں گے اور اگر بصورت موجودہ کوشش کی بھی گئی تو اس کے نتائج نہ تو بجا
[?]درست ہونگے اور نہ دلآویز۔ اقبال کا کلام بھی بدذوق ناشروں اور کم استعداد کاتبوں کے بیباک اور بے رحم ہاتھوں کا آتش بار
[?]ہو چکا ہے کہ اب ہمہ تن فریادی ہے۔ نہ جانے کتنی چھوٹی بڑی غلطیاں اس میں راہ پاگئی ہیں۔ جن میں خصوصیت سے ہندوستان
[?]جعل ساز کتب فروشوں نے اپنا بھی حق ادا کر دیا ہے۔ ان اغلاط کی اصلاح کے بغیر شاعر اور شعر دونوں کے ساتھ انصاف کی توقع
[?]سود ہے۔ اس لئے کہ ایسی صورت میں ہم جو سمجھیں گے وہ شاعر کا مقصد نہیں ہوگا اور جو دراصل چارا سمجھنا چاہئے گا۔ وہ ہم سمجھ نہیں پائیں گے
مرف یہی نہیں علامہ اقبال نے خود بھی بانگ درا کو ترتیب دیتے وقت اس حد تک قطع و برید اور حذف و اضافہ سے کام
[?]تھا کہ اگر اصل ماخذوں سے مقابلہ کیا جائے تو ایک نئے اقبال کی دریافت عمل میں آجائے گی۔ شاعر کی درجہ بدرجہ بلند رفتاری کی
[?]ہی اور اسکے ذہنی تجزیے کے لئے بھی ایک ایسے مجموعۂ کلام کی اشاعت ناگزیر سی ہے۔ جو اس کے شاعرانہ سفر کی روداد کو بیک وقت
[?]بے نقاب کر دے۔ اقبال کا ابتدائی کلام جس کا معتدبہ حصہ بانگ درا میں شامل ہونے سے رہ گیا اور وہ بھی جو جستہ جستہ بانگ درا میں موجود
[?]ہے۔ مختلف قلمی بیاضوں اخبارات اور رسائل کے فائلوں میں دبا پڑا ہے۔ شاعر کے ذہنی پس منظر اور رفتار ترقی کو واضح کرنے کے لئے
[?]سکو بھی منظر عام پر لانا ہوگا۔ ان باتوں کو ذہن میں رکھ کر اقبال کے پسند کرنے والوں کی خدمت میں کلیات اقبال کا ایک مکمل ترین
[?]ایڈیشن پیش کرنے کا عزم میں نے کیا ہے۔ جس میں ان کا ہر ہر اردو شعر اپنی تمام ضروری تعلیقات، حواشی اور وضاحتی نوٹس کے
[?]ساتھ مندرج ہوگا۔

میں نے اپنے بس بھر اپنی آرزو کو تکمیل صورت دینے کی کوشش کی ہے لیکن میرے لئے اس سب تلاش محنت اور جستجو کے باوجود [?]
[?]نے اس کام میں صرف کی اور اس سب خلوص محبت اور عقیدت کے ہوتے ہوئے جو مجھے کلام اقبال سے ہے تمام پوشیدہ خزانوں تک پہنچ جانا [?]
[?]تمام تاریک گوشوں تک رسائی حاصل کر لینا ممکن نہ تھا۔ اسی لئے دوسرے اقبال دوستوں سے بھی یہ گزارش ہے کہ وہ اس کام میں میری
[?]مدد فرمائیں اور اگر ان کے پاس علامہ اقبال مرحوم کا کچھ غیر معروف کلام یا ابتدا ًاول اور رائج الوقت معروف حصۂ کلام کا اولین نقش [?]
ابتدائی متن کسی اخبار یا رسالے یا کتاب میں محفوظ ہو یا کسی نظم اور غزل وغیرہ کی تاریخ اشاعت کا پتہ چلتا ہو مکمل حوالے مع نام اخبار
رسالہ یا کتاب صفحہ نمبر سنہ اور تاریخ وغیرہ کے ساتھ مجھے عطا فرمادیں تاکہ اردو کلام کی حد تک کلیات اقبال کا ایک جامع نسخہ
(باجازت ورثا) اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچ سکے۔ میرا پتہ مندرجہ ذیل ہے:۔

(۱۰) اکبر علی خاں ——— محلہ بیلدار ——— رام پور ——— (اسٹیٹ) یوپی۔

جمیل نسیم

صبا اکبرآبادی کا ایک شعر

چند ماہ قبل غالب کے مشکل اشعار پر بحث کرتے ہوئے اعظمی عزمی صاحب نے کہا کہ تمہیں تو صبا صاحب نظر آئے گا۔ حالانکہ یہ تخلیق کائنات کے متعلق ہے۔ اور یہ کہکر عزمی صاحب نے شعر سنایا،

چونک احساس کے عکس کی آواز　　　　آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز

یا عزمی صاحب سے پہلے میری نظر سے گزرا ہوگا، مگر شعر کے معاملے میں میں بہت ہی بے تکا واقع ہوا ہوں آپ ہا ہوگا تو داد بھی دونگا اور نوٹ بھی کرلوں گا لیکن اگر خود پڑھوں تو خواہ وہ میر کا شعر ہو یا غالب کا بس پڑھ لوئی اثر مجھ پر نہ ہوگا، چنانچہ عکس کی آواز "والا شعر بھی یقیناً میں پڑھکر ہی رہ گیا ہونگا، لیکن عزمی صاحب سے پسند آیا۔ مگر معنی پر غور کیا تو کچھ عکس کی آواز، سمجھ میں نہ آسکی عزمی صاحب سمجھ لا کہ مطلب سمجھاتے رہے مگر معنی کی جگمگاہٹ نظر نہ آئی۔

میں نے مختلف سخن فہموں کی خدمت میں وضاحت مفہوم کی درخواست کے ساتھ روانہ کیا جن میں سے بل میں آپ بھی لطف اٹھائیے ان میں بعض اشارات بہت ہی مفید اور خیال انگیز ہیں والسلام (سلطان جمیل نسیم)

عبدالماجد دریابادی

برادرم، وعلیکم اسلام

ب کا یہ شعر با معنی تو ہے یہ اور بات ہے کہ واضح اور زیادہ ہونا تھا مفہوم وہی ہے جسکی جانب آپ نے اشارہ

والسلام

ننا عمادی (ڈھاکہ)

ب عزیز سلمکم اللہ تعالے وکفاکم وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ،

حضرت محترم کی خدمت میں جو عریضہ ارسال کیا اس میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ میرے دوست اس شعر کو تخلیق کائنات

(س ج ف)

لفافہ مورخہ ۲۹ اگست ابھی ملا، مصروفیت، باوجود پیرانہ سالی و علالت کے بہت ہے۔ اگر کسی دقت پر جواب کو اٹھا رکھتا تو شاید بھول جاتا۔ اس لئے فوراً جواب لکھ رہا ہوں، حضرتِ صبا اکبر آبادی کا یہ مطلع ؎

چونک اٹھا سن کے عکس کی آواز آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز

قطعاً مہمل ہے مفہوم شعر سے قطع نظر کرکے دونوں مصرعوں کی ترتیب بھی صحیح نہیں۔ کہنا یوں چاہئے تھا

آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز چونک اٹھا سن کے عکس کی آواز

بہرحال شعر مہمل ہے۔ اس لئے کہ عکس سے آواز پیدا نہیں ہوسکتی۔ اس لئے واقعہ نہیں ہوسکتا، اور حقیقی معنی مراد نہیں لئے جاسکتے مجازی معنی اگر کہیں تو اس کی بھی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔

مجاز کی مشہور قسم استعارہ ہے۔ اس میں مشبّہ اور مشبّہ بہٖ کی ضرورت ہے۔ یہاں پتا ہی نہیں ملتا کہ کس چیز کو کس چیز سے تشبیہ دی گئی ہے۔

کائنات کو آئینہ قرار دینا اور خالقِ کائنات کو آئینہ ساز بہت صحیح ہے، صوفیوں کے عقیدہ وحدت شہود کے مطابق کائنات کی ہر شے مظہر صفات الٰہی ہے ؎

ہر چہ بینی بداں کہ مظہر اوست بچشمانِ دل مبیں جز دوست

یعنی مظہر صفات اوست۔

اس لئے صوفیوں کی زبان میں کہا جاسکتا ہے کہ مجموعۂ کائنات ایک آئینہ ہے جو خالق کائنات کے پیشِ نظر ہے، اس آئینہ میں اس کے صفات کمال کا جو جلوہ نظر آرہا ہے وہ اس کا عکس ہے، یہاں تک تو صوفیانہ عقیدے کی رو سے صحیح کہا جاسکتا ہے لیکن اس میں عکس کی آواز کس چیز کو قرار دیا ہے، اس کا پتا نہیں ملتا۔ اس لئے مجازاً بھی عکس کی آواز ایک مہمل سی بات ہے اگر یہ مطلع یوں ہوتا تو ایک حد تک صحیح ہوسکتا ہے ؎

آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز ہنس پڑا، پا کے عکس کا انداز

یا یوں کہئے

آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز کھل گیا عکس اگلنی کا راز

یا یوں ہو

آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز اور اب عکس سے ہے ناز و نیاز

مگر یہ سب زبردستی کے مصرعے ہیں، محض سرسری فکر میں قلم برداشتہ یہ تین مصرعے ذہن میں آگئے اس لئے لکھ دیئے ورنہ یہ مقصود نہیں کہ صبا صاحب کے شعر کی اصلاح کردوں،

اس قسم کے مضامین سے مجھکو مطلقاً دلچسپی نہیں ہے، میں عقیدۃً محض مسلم ہوں، میرا دین صرف اسلام ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا دین تھا، وہ لوگ صوفی نہ تھے نہ حنفی نہ شافعی نہ مالکی نہ حنبلی نہ شیعہ نہ سنّی اور نہ اہل حدیث اس لئے مجھکو بھی ان فرقہ بندیوں سے سخت بیزاری ہے۔ تصوف کا میں مطلقاً منکر ہوں اور چونکہ تصوف کی بنا

پاچکا ہوں اس لئے تصوف کی خرابیوں سے خوب واقف ہوں تو پھر صوفیانہ مضامین کے اشعار کس طرح
ں، لکھنا تو گناہ سمجھتا ہوں، اور جو مضامین تصوف کی کتابوں میں صحیح ہیں وہ تصوف کے مضامین ہی نہیں
ہیں" اس لئے ان کو تصوف کی طرف منسوب کرنا ہی غلط ہے۔ صوفیوں کے پاس تو توحید تک صحیح نہیں ہے
حدت شہود یہ ساری باتیں غلط اور گمراہ کن بھی ہیں میں دونوں کا منکر ہوں اور صرف توحید اسلامی پر ایمان
لٰہ محمد رسول اللہ بس یہی میرا ایمان ہے۔

میرے معروضات سے آپ کو بھی اتفاق ہو اور میرے کسی جملے سے آپ کو ملال نہ پہنچے، والسلام

چند محروم (دہلی)

مکرمی۔ تسلیم

پ کا عنایت نامہ عزیز جگن ناتھ کی معرفت ملا۔ میرے خیال میں شعر مہمل نہیں ہے اور تخلیق کائنات کے متعلق
نا یوں ہوگی کہ خالق کائنات نے کائنات پیدا کی یہ گویا آئینہ سازی تھی پھر اس نے اس آئینے میں اپنی قدرت
۔ کائنات کا ہمہ ہمہ جوش و خروش سنکر چونک اٹھا۔

ے معمولی سا اعتراض وارد ہوتا ہے کہ وہ علیم کل ہو کر جانتا تھا کہ دنیا میں جوش و خروش کا پیدا ہونا ضروری
ونک اٹھنے کا کیا مقام ہے؟ لیکن یہی اعتراض ابلیس کی تخلیق پر بھی ہو سکتا ہے کہ خدا کو معلوم تھا کہ شیطان
تا لیکن اُسے پیدا کر ہی دیا۔ اس کا جواب فقیہ یا عالم دیگے شاعر کو اس سے غرض نہیں۔ والسلام

سعود حسن رضوی ادیب (لکھنو)

مکرمی۔ تسلیم

مہ ملا۔ آپ نے صبا صاحب کے اس شعر کے متعلق میری رائے دریافت فرمائی ہے

آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز   چونک اٹھا سُن کے عکس کی آواز

عر کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ معلوم نہیں کہ یہ میرا قصورِ فہم ہے یا شاعر کا عجزِ بیان۔ والسلام

حسن امام (کراچی)

کرم فرما۔ سلام مسنون

نامہ نے شرف بخشا۔ میری کوتاہ نظری جواب دہ ہے کہ جناب صبا اکبرآبادی کے مطلع پر کوئی اظہار
ں نہیں آیا۔ یہ بھی سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اس پراسرار حاصل کرنے کا مقصد کیا ہے۔ مطلع خاصہ ہے خیال
ہنگر آئینہ ساز کا اپنی آواز کو عکس کی آواز سمجھ کر چونک اٹھنا معقول نہیں، دوسرا مصرعہ عامیانہ اور ردد
ن کی تان ہونی چاہئے۔ المستشار موتمن کا لحاظ ہے۔ ورنہ تنقیص مدنظر نہیں۔

شور (علیگ)

ی نسیم صاحب۔ تسلیم

مرسلہ شعر بظاہر مبہم ہے لیکن اس کے امکانی مفہوم کو تصوف کی روشنی میں یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ آئینہ (۲) آئینہ ساز (۳) عکس، اور (۴) عکس کی آواز میں جو رمزیت ہے اس کو واضح کر لیا جائے۔

یہاں	"آئینہ"	مراد ہے	ذاتِ آدم سے
	"آئینہ ساز"	مراد ہے	خلاقِ کائنات سے (خالقِ آدم)
	"عکس"	مراد ہے	اس آئینہ کے جوہر یعنی انسان کی صفاتِ عالیہ سے
	"عکس کی آواز"	مراد ہے	"نفسِ ناطقہ" کے جوہر کے کھلنے سے

اس کاوش کے بعد امکانی مفہوم شعر کا یوں ہوگا۔

خلاقِ کائنات کو انسان کی تخلیق سے پہلے اس کا اندازہ نہ تھا کہ اس کی خلاقی کے اس شاہکار کی عظمت کا نقطۂ عروج [کیا] ہوگا۔ جب اس نے اپنی صناعی کے اس بہترین شاہکار میں اپنے ہی منتہائے کمال کا مشاہدہ کیا تو اس کو خود محسوس ہونے لگا کہ [ان]سان کی ذات اپنی صفات کے اعتبار سے کس قدر بلند ہوتی ہے۔ —— فقط

رعنا اکبر آبادی (کراچی)

—————— ——————

عزیزم —

خط ملا، اس دور میں جب شعر کو سمجھنے کے نظریات بدل چکے ہیں، تمہارا ایک قدیم الخیال اور قدامت پسند، شاعر سے رجوع کرنا کہ وہ تمکو ایک شعر کے معانی و مطالب سمجھائے یا بتائے ذرا عجیب سی بات ہے۔ شعر سمجھنے کے لئے اس کے الفاظ اور انداز بیان کا تجزیہ کرنا ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے شاعر کا مفہوم سامع یا ناظر سمجھ سکے۔ اسمیں اختلاف آرا بھی ہو سکتا ہے اور اپنی اپنی سمجھ کے مطابق اس کے مطالب کے بیان کرنے میں تضاد بھی پیدا ہو سکتا ہے فی زمانہ شعر کو حسب ضرورت سمجھا جاتا ہے حسب حیثیت نہیں سمجھا جاتا پھر لطافت شعر اور حسن خیال کو سمجھ لینا ہر شخص کے بس کی بات بھی نہیں ہے مرسلہ شعر

چونک اٹھا شُن کے عکس کی آواز　　آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز

اس شعر میں کیا بات سمجھ میں نہیں آتی، صاف ستھرا شعر ہے، بلند خیالی ہے، پاکیزہ الفاظ ہیں اور شعر اپنے الفاظ کے آئینہ میں سے خود بول رہا ہے کہ شاعر نے کہنا چاہا تھا خالق و مخلوق کے متعلق مگر شعر کے انداز بیان نے نعت بنا دیا ہے۔ آئینہ ساز سے مراد صانع حقیقی اور آئینہ کا مطلب مصنوع، جو نقش اولیں کے علاوہ کچھ اور نہیں اور نقش اولیں نور محمدی ہے۔ "اوّل ما خلقت نوری" ——

خلوت ازل میں جب صانع حقیقی نے اپنے مصنوع یعنی نور محمدی کی تسبیح و تہلیل سنی اسے اپنے کمال صنعت پر ناز ہوا چونک اٹھنے کا مطلب حیرت واستعجاب نہیں ہے بلکہ فخر و مباہات ہے۔ تم کو عکس کی آواز پر اعتراض ہے، یہ بھی عجیب بات ہے اساتذہ نے متعدد اشعار میں تصورات کی آوازیں نظم کی ہیں مثلاً "منزل پکارتی ہے"، "ساحل آواز دیتا ہے"، "تصویر بولتی ہے" "نقش فریادی ہے" میرے خیال میں شعر نہایت بلند بلیغ اور لطیف ہے۔ مختصراً مفہوم شعر یہ ہو سکتا ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی صورت پر خلق کیا اور انہی صفات کا حامل بنایا اور اسے بےمثل اور بےمثال بنایا تو فخر صناعی میں جھوم اٹھا۔

اٹھا" کا ٹکڑا شعر میں نہایت چونکا دینے والا ہے۔ اس کی جگہ شاعر جھوم اٹھا، کہتا تو شعر کا لطف کم ہو جاتا۔ اگر
ی حیرت و استعجاب کے لئے جائیں تو مذہبی نقطۂ نظر سے خالقِ حقیقی کے لئے یہ بات کھٹکتی ہے کہ اسے کیوں حیرت
بلکہ اس کے علم میں ہر چیز تھی۔ مگر اب یہ شعر جو مولانا محسن کاکوروی نے نعت میں کہا ہے۔ سنو

بنا کر آئینہ اک قدِ آدم
خدا نے آپ دیکھا اپنا عالم

یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ خدا کو اپنا عالم دیکھنے کی کیا ضرورت تھی کیا اسے اپنے عالم کا علم نہیں تھا؟ مگر اس
بیت کا بہترین شعر ہے۔ غالب نے حمد میں کہا ہے۔

ساس عالم وعیاں بہ پیوندِ الف
ہمچناں بہ صورت علم وعیاں انداختہ

یہ مکمل اعتراف کے باوجود جب شعر میں مجازی اقدار قائم کئے بغیر ذاتِ باری کا تصور قائم نہیں ہو سکتا تو پھر
اٹھنے کے معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔ وحدت الوجود کے ماننے والے کسی عالم کو تسلیم نہیں کرتے، یہ کائنات
ن۔ سب کے منکر ہیں، صرف ذاتِ باری کو تسلیم کرتے ہیں، اس عقیدے کی نمائندگی ہیں غالب کا یہ مطلع دیکھئے،

ز دہم غیرِ غوغا در جہاں انداختہ
گفتہ خود حرفی و خود را در گماں انداختہ

بات کر سکتا ہے تو جھوم بھی سکتا ہے خوش بھی ہو سکتا ہے فخر بھی کر سکتا ہے۔

الی تاباں (دہلی)

برادرم - تسلیم

نامہ صادر ہوا۔ شکریہ، میں نے بہت غور کیا مگر شعر سمجھ میں نہیں آیا۔ خدا جانے اسمیں شعر کا قصور ہے یا میری

یہ مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔

نظر انصاری (رےپور)

چونک اٹھا شن کے عکس کی آواز
آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز

زنے شعر کے مفہوم کو ذرا الجھا دیا ہے جیسا کہ اکثر ندرتِ بیان اور دور از کار تشبیہات و استعارات کے
بہر کیف شعر اپنی صوری و معنوی ہر حیثیت میں مکمل ہے میرے نزدیک اس قسم کا ابہام شعر کے حسن میں
اہے سے

ایک دو تین چار یا پانچ نہیں
سب خطائیں مری معاف کرو

نیا پڑھ لکھے میں کسی منزل پر شعر کا مرتبہ دینے کو تیار نہیں ہوں اور اس قسم کے کلام پر شعر کا اطلاق ہو سکتا
وہی ہے جو اپنے حسنِ اجمال میں لا تعداد تفصیلات رکھتا ہو جو بلندیٔ تخیل کے ساتھ ساتھ حسنِ بیان کا بھی
م منزل کو شعر کا مرتبہ حاصل ہوا ہے اور نہ ہو گا۔
جبکہ اس قسم کے اشعار پر وہی حضرات محظوظ ہوتے ہیں جو سہل ممتنع کے غلط معنی ذہن نشین کر کے اپنے

ع کو تجسس و تفکر کی زحمت سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں اور ہمیشہ سپاٹ شعروں کو معراجِ فصاحت اور جانِ بلاغت سے
ہرتے ہیں۔

چونک اٹھا سن کے عکس کی آواز　　آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز

میرے نزدیک شاعر کا مفہوم یہ ہے کہ جب خلاق کائنات کو خود اپنی تجلیات کا مشاہدہ مطلوب ہوا تو آئینۂ عالم موجودات تخلیق فرمایا اور کائنات کی ہر چیز میں اپنا عکسِ جمال ملاحظہ فرمایا۔ اس مشاہدے سے جو کیفیت استعجاب پیدا ہوئی اس کو شاعر نے انتہائی شدتِ احساس کے ساتھ چونک اٹھنے سے تعبیر کیا ہے۔ اور آوازِ عکس سے تجلیات کے وہ اثرات مراد ہیں جو بعد میں مشاہدۂ ذہنِ شاہد پر مرتسم ہو کر باعث حیرت و استعجاب ہوتے ہیں۔ شعر کا مفہوم صرف اتنا ہے کہ عالم موجودات آئینہ ہے اور خالقِ عالم موجودات آئینہ ساز ہے۔ چونک اٹھنے سے وہ کیفیت استعجاب مراد ہے جو آئینہ کو دیکھ کر پیدا ہوگی ——— والسلام

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی (لکھنؤ) ————

مکرمی۔ تسلیم

جواب میں عرض ہے کہ جو شعر آپ نے لکھ بھیجا ہے اس میں عکس کی آواز سن کر آئینہ ساز ہی نہیں بلکہ ہر شخص جو اردو بولتا اور سمجھتا ہے چونک پڑیگا کہ یہ کیا فاش غلطی شاعر نے کی ہے۔ "کی" کی وضاحت کسی ذی روح یا بے جان کی آواز کے سلسلے میں اسی وقت لائی جاتی ہے جبکہ اس میں آواز پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہو، ورنہ "سے" کا استعمال ہوتا ہے اور اگر یہ لفظی غلطی نہ ہوتی تو بھی شعر اپنے صوفیانہ مفہوم کے لحاظ سے صرف دوسرے درجہ کا ہے

بقیہ - پہلی کرن ——— صـ۴

چھوڑیئے اوروں کو، اور تو صرف شاعر تھے، مگر غالب تو ایسا نہیں تھا، اس کے متعلق تو آج قریب قریب سبھی اہل قلم متفق نظر آتے ہیں کہ وہ بلند فلسفی اور مفکر تھا، تو پھر آیئے اسی کے کلام کا جائزہ لیں، یہ شعر غالبؔ اس کے مشہور ترین اشعار میں سے ہے کہ

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

پڑھا آپ نے بھی بارہا ہوگا لیکن ایک مرتبہ پھر زحمت کیجئے پھر پڑھئے اور خود غور کیجئے شعر بہت صاف ہے۔ دیکھئے اگر آپ ہم سے پوچھیں تو ہم اس کے سوا اور کیا [illegible] کہ حقیقت بندِ غم اور موت سے پہلے نجات حاصل کرنے کا تصور یہ ساری باتیں [illegible] کر رہے ہیں کہ شعر بھی اصل میں [illegible] جو ملت کے [illegible] نواب میرزا اسد اللہ خاں غالب کا ہرگز نہیں ہے یہی سبب ہے کہ ہم نے ہر وقت ان کو [illegible] دیا تھا۔

- چشمِ کرم کہاں "اسیرِ محبت" کی زندگی

[illegible]

پوری

رباعیات فانی کا ایک اہم پہلو

صدی کا آغاز گویا دنیا کی سماجی زندگی میں ایک آتشیں انقلاب کا آغاز تھا جنگ عظیم کے بھونچال نے اے
دن دنیا کے معتقدات و نظریات یکسر الٹ پلٹ گئے۔ پاک و ہند جیسے پس افتادہ ممالک بھی اس عالمگیر انقلاب
زندگی کی قدریں بدلنے لگیں۔ وطنیت۔ قومیت، مادیت اور عقلیت کے تصورات کا نفوذ بڑھنے لگا۔ سرسید احمد
برادران کے دوسرے رفقائے کار کے اثر سے یہ رجحانات انیسویں صدی کے اواخر ہی سے اردو ادب میں
تھے۔ لیکن جنگ عظیم کے بعد وہ اجتماعی طور پر ایک تحریک کی صورت میں بروئے کار آنے لگے۔ غزل کی جگہ نظم نے لے
ت و موضوع کے بے شمار نئے تجربے کئے گئے غزل بھی ساتھ ساتھ چلتی رہی لیکن عام رجحان یہ ہو چلا کہ غزل نئے
ترجمانی کا حق ادا نہیں کر سکتی۔ خیال کے پھیلاؤ اور تفصیل کے لئے جو وسعت درکار ہے۔ غزل کی تنگ نائے
نہیں ہے۔ نظم میں یقیناً ہر خیال کو وضاحت سے بیان کرنے کی گنجائش تھی لیکن چونکہ یہ زمانہ سماجی افراتفری سیاسی
ات اور ذہنی الجھنوں کا تھا۔ اس لئے جو تسلسل خیال فکری ارتفاع اور فنی ٹھہراؤ نظم کے لئے مطلوب تھا وہ پوری
اور چند ایک بلند پایہ نظم گو شعراء کے سامنے آجانے کے باوجود بہ حیثیت مجموعی نظم میں بلحاظ فن وہ ترفع پیدا
ل کا طرۂ امتیاز ہے۔ لوگ بین بین راستہ تلاش کرنے لگے اور حالی و اکبر کے زیر اثر ایک پس افتادہ صنف سخن
نے جس میں غزل کی غنائیت اور نظم کی وسعت دونوں کی گنجائش تھی میری مراد رباعی سے ہے۔ چونکہ سماجی
بیت کی بنا پر بدیہہ گوئی۔ اور متفرق خیالات کے اظہار کے لئے موزوں ترین صنف سخن ہے اس لئے اس
تقل صنف کی صورت اختیار کر لی۔ اور جوش۔ ساجد۔ فراق۔ سیماب اور یگانہ وغیرہ جیسے ممتاز رباعی
وں نے رباعی کو نظم و غزل کے مقابل لا کھڑا کیا۔ چنانچہ ان شعراء کی بدولت آج جدید نظم و غزل میں جن
ہے ان سب کی ترجمانی رباعی میں ملے گی۔ اب تک اردو شعری ادب میں دو خط مستقیم غزل و نظم کے نام
ہے رباعی نے دونوں کو ملا کر مثلث صورت قائم کر دی اور آج بھی ہمارا شعری ادب اسی مثلثی نوعیت سے ارتقاء

غزل گو اور نظم گو دونوں قسم کے شعراء رباعی کی طرف مائل ہوئے اور بہت جلد اسے جلد میلانات حیات کا
نکہ قدیم کلاسیکل انداز میں لکھنے والے شعراء بھی جو ہمیشہ سے رہا تھا یہ زندگی کا ادبیت کرتا اس طرح ذکر کے

…ان میں سے بعض نے رباعی گوئی میں وہ کمال بہم پہنچایا کہ ان کی رباعیوں کو نظر انداز کر کے صرف ان کی غزلوں کی مدد سے ان کی شخصیت اور کلام کو سمجھنا ممکن ہی نہیں ان قدیم رنگ کے غزل گو شعرا میں فانی بدایونی کا نام بڑا ہے جن کی رباعیاں ان کی غزلوں سے کم رتبہ نہیں ہیں اور جن کا مطالعہ فانی کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ کلیات فانی مرتبہ عبدالحق اکاڈمی حیدر آباد دکن میں دو سو کے قریب رباعیاں ہیں۔ ان میں بہ حیثیت مجموعی وہی یاس انگیزی اور حسرتناکی ملتی ہے۔ جو ان کی غزلوں کا محور ہے۔ لیکن ایک چیز ان کی رباعیوں کو غزل سے جدا کرتی ہے۔ میرا مطلب فانی کی اس حیاں سوز غم پسندی کے اسباب سے ہے جو ان کی غزل کی نسبت رباعی میں زیادہ واضح اور نمایاں ہیں۔ بظاہر فانی ایک خوشحال متوسط گھرانے کے فرد تھے۔ اور ان کے ذاتی ماحول پر غم زندگی اور باد اس قدر نہ تھا جو انہیں یکسر جبر کا قائل بنا دیتا ایسا معلوم ہوتا ہے احساس غم کے سلسلے میں فانی ایک غیر متوازن ذہن لے کر آئے تھے اور دوسروں کے غم سے غیر متوقع طور پر بہت زیادہ متاثر ہوتے تھے۔ ان کی شخصی زندگی تو یقیناً ایسی سخت کوش اور تنگ و تار نہ تھی جو ان کی ساری زندگی کو کڑھن اور گھٹن میں تبدیل کر دیتی۔ لیکن ملک کی عام معاشی و تہذیبی پستی کو دیکھ کر انہیں اس درجہ دکھ ہوتا تھا کہ وہ غم دنیا کو اپنا غم سمجھنے لگے تھے۔ سماجی زندگی کی ہر ناہمواری پر ان کا جی کڑھتا تھا۔ ان کی غم پسندی کا اندازہ غزلوں سے نہیں بلکہ صرف اس قسم کی رباعیوں سے کیا جا سکتا ہے۔ برصغیر کے ہندو مسلم معاشرے میں عورت کی جو سماجی حیثیت تھی اس سے فانی مطمئن نہ تھے۔ خواہ یہ کسی پردہ نشیں محبوبہ کے نظارہ کی خواہش کی بنا پر رہا ہو لیکن یہ امر واقع ہے کہ وہ پردے کے سخت مخالف تھے اور انہیں عورتوں کی مسدود و مجبور زندگی کا بڑا دکھ تھا۔ جس کا ثبوت یہ رباعیاں ہیں:-

محکوم ہیں حاکم کی حکومت کا شکار ❖ کمزور زبردست کی قوت کا شکار
تھوڑی ہے نہ ہو جو عورتوں پر سختی ❖ جب تک ہیں یہ مردوں کی جہالت کا شکار

دکھ عورتوں کے سوز نہانی ان کی ❖ سننے ہی کے قابل ہے کہانی ان کی
ٹیڑھے ہیں تو کون بل نکالے ان کے ❖ سیدھے ہیں جو مرد مہربانی ان کی

پاکیزہ ہوا کی تازگی سے محروم ❖ دیواروں میں بند روشنی سے محروم
ہے قابلِ رحم عورتوں کی حالت ❖ زندہ ہیں مگر ہیں زندگی سے محروم

سماجی زندگی کے جس ظلم و جبر سے فانی متاثر تھے یہ رباعیاں ان میں سے ایک پہلو کا واضح اظہار کرتی ہیں لیکن بات ہم تک نہیں ہے۔ انہیں سماجی زندگی کی ہر حالت زار کا ایسا شدید احساس تھا کہ وہ دنیا کی خوشگوار سے خوشگوار فضا میں بھی اسے فراموش نہ کر سکتے تھے مثلاً کشمیر اپنے قدرتی مناظر اور حیات خیز فضا کی وجہ سے برصغیر میں یقینی جنت ارضی کی حیثیت رکھتا ہے لیکن وہاں کے عوام ایک مدت سے جس افلاس و نکبت کا شکار ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں یہ اور بات ہے کہ کشمیر کی فضا دلفریب ہے ہم عام انسانی زندگی کی کس مپرسی سے آنکھ بند کر لیں۔ فانی جیسا حساس شخص وہاں زندگی کی عام سطح کو نظر انداز نہیں کر تا وہاں کی سماجی صورتوں اور معاشی تنگیوں سے متاثر ہوتا ہے۔ اور کشمیر جیسی جنت ارضی بھی اسی لئے ان کی نگاہ میں افسردہ و ویران ہے

دیکھئے شاید فانی کے ذہن کی یہ تحریریں ان کی غزلوں میں نہ پڑھی جا سکے

پھولوں کی نظر نواز رنگت دیکھی + مخلوق کی دل گداز حالت دیکھی
قدرت کا کرشمہ نظر آیا کشمیر + دوزخ میں سموئی ہوئی جنت دیکھی

کشمیر میں حال اہل کشمیر تو دیکھ + ہر پاؤں میں افلاس کی زنجیر تو دیکھ
سمجھے ہم کیسے تھے دیکھئے ہم کیا ہیں + کشمیر کے خواب اپنی تعبیر تو دیکھ

اس باغ میں جو کلی نظر آتی ہے مجھے + تصویر فسردگی نظر آتی ہے مجھے
کشمیر میں ہر حسین صورت فانی + مٹی میں ملی ہوئی نظر آتی ہے مجھے

شدید احساس نے سوسائٹی کے اجتماعی غم کو ان کے لئے شخصی بنا دیا تھا اور چونکہ وہ بقول آل احمد سرور نہ ہونے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔ اس لئے خود اپنی انفرادیت کے خول میں سمٹ گئے نتیجتاً ناامیدی یاس دان کی شخصیت کا جزو اعظم بن کر ان کے کلام پر چھا گئیں زندگی کے جبر اور فراوانی غم کے یقین نے ان کے شکر دیا۔ اور ان کے لب و لہجہ میں ایک ایسا اعتقاد اور اخلاقی الگ نمودار ہوا جو غزل میں دھکا چھپا رہتا صاف جھلکتا ہے بطور مثال ذیل کی رباعیاں دیکھئے

عاقبت اندیش قیامت کو سمجھ + مظلوم سے ڈر خدا کی عادت کو سمجھ
عرش کو سو بار ہلا آتی ہے۔ + آواز شکست دل کی طاقت کو سمجھ

اے فتنۂ روزگار آہستہ گذر + آشوب دل فگار آہستہ گذر
نازک ہے بہت دماغ ارباب جنوں + اے نکہت زلف یار آہستہ گذر

یا خضر طریق کہہ کے رہزن کہتے + بنتی نہیں موم کہہ کے آہن کہتے
سنہ وہ دوستوں نے ایذا دی ہے + شرم آتی ہے دشمنوں کو دشمن کہتے

بل بشر نہیں ہے انساں ہونا + یا صف میں فرشتوں کے نمایاں ہونا
ل ہے عجز بندگی کا احساس + انسان کی معراج ہے انساں ہونا

سے فانی کے ان رجحانات کی نشاندہی کرنی مقصود تھی جو غزل سے نہیں بلکہ رباعی کے مطالعہ سے ساتھ ہی فانی کے ذاتی عقاید و حالات بھی ان کی رباعیوں میں پوری طرح آشکارا ہیں۔ یوں

ثیت مجموعی ان کی رباعیاں خواہ کسی موضوع پر ہوں فنی اعتبار سے مکمل ہیں۔ رباعی گوئی کی تاریخ میں فانی کی رباعیوں
م درجہ حاصل ہے۔ ان کی غزل کی طرح ان کی رباعیوں میں وہ تمام محاسن و خصوصیات کارفرما ہیں جنکی بنا کر انہیں بعض
ے غالب کے بعد سب سے بڑا الفکر آمیز غزل گو شاعر تصور کرتے ہیں۔ ذیل میں چند رباعیاں اسی قبیل کی ہیں۔

بجھتی نہیں شمع جلے جاتی ہے + گنتی نہیں رات۔ ڈھلے جاتی ہے
جاری ہے نفس کی آمد و شد فانی + سینے میں چھری ہے کہ چلے جاتی ہے

کیا جانئے کس کی جستجو جاری ہے + اک عمر سے رسم آرزو جاری ہے
کچھ اپنی زباں میں دل کہے جاتا ہے + بے معنی ہوئی گفتگو جاری ہے

قطرے کو یہاں سحاب بھی کہتے ہیں + دریا ہے جسے حباب بھی کہتے ہیں
ہر جزو بجائے خویش کل ہے فانی + ذرے ہی کو آفتاب بھی کہتے ہیں

آنکھوں سے جو خونِ دل بہے بہنے دے + تخفیف نہ چاہ دل کو غم سہنے دے
غم میں یہ تصرف ہے خیانت فانی + غم اس کی امانت ہے یونہی رہنے دے

یاں بعد خزاں بہار آجاتی ہے + اک لمحۂ عیش بعد غم لاتی ہے
اک اپنی ہی عید پھر نہ پلٹی ورنہ + اب تک رمضاں کے بعد عید آتی ہے

لیکن جو چیز فی الواقع رباعیات فانی کے مطالعہ کو اہم بناتی ہے وہ ان کے دفتر غم کی نوعیت ہے جسکا واضح اظہار
رف ان کی رباعیات میں ہوا ہے اور غزل جسکو سمجھانے سے قاصر رہی ہے۔

عبدالحق بحیثیت محقق

نظر سے قاضی صاحب کے مضامین مثلاً محمد حسین آزاد بحیثیت محقق، یا غالب
یرہ گذر چکے ہیں وہ اس مقالے کی اہمیت کو پوری طرح سمجھ سکیں گے۔ اس مقالے میں
کی تحقیق و تنقید اور تفسیر، و ترجمۃ الرائے زیر بحث آئی ہے اور ساتھ ہی میر تقی
نکات الشعراء اور ذکر میر اور وہ خیالات و بیانات جو ان کتابوں میں درج ہیں ان سب
ں کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ اتنا طویل ہے کہ ہم ایک ہی قسط میں شائع کرنے پر قادر نہیں
قسط وار پیش کیا جائیگا لیکن پوری کوشش کی جائیگی کہ کوئی قسط اپنے مفہوم و معنی کے
باقی نہ رہے ———— (ادارہ)

ے محقق، نقاد اور انشا پرداز سمجھے جاتے ہیں بلا انہوں نے مدتوں تحریک اردو کی قیادت کی ہے۔ اس مقالے کی
ے ان کے سہ جہتی کی تعیین ہے۔ ان کی کسی اور حیثیت کا اگر ذکر آگیا ہے تو وہ محض ضمنی طور پر ہے، دو
ہیں (الف) ڈاکٹر عبدالحق کی غلطیوں اور فروگزاشتوں کا استقصائے کامل مدنظر نہیں (ب) اس مقالے
ری کسی سابقہ تحریر کے مطابق نہ ہوں، میں نے ہر جگہ صراحتہً اس کا ذکر ضروری تصور نہیں کیا۔

ذکر میر میر کی آپ بیتی ہے جسے ۱۹۲۸ء میں انجمن ترقی اردو ہند کے مطبع نے ٹائپ میں چھاپا تھا۔
ات، مقدمہ، ۲۰، متن مع حواشی از ص۱ تا ص۱۵۳)۔ قبل اس کے کہ ڈاکٹر عبدالحق کے مرتبہ نسخے سے
ب پہلا اپریل سنہ ۲۶ء کے اردو (ص۱۹۹ تا ص۲۶۲) میں جو مقالہ ان کے قلم سے نکلا تھا اس کا جائزہ لینا ضروری
(۱) مقالے میں تمہید کے بعد ذکر میر کے مطالب کا خلاصہ درج ہے اور آخر میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اس

عبدالحق انجمن ترقی اردو کے معتمد تھے۔ لیکن یہ کوئی راز نہیں کہ انہیں اس ادارے میں مرتبہ آمریت حاصل تھا
ں منتخب ہوں گی، اگر کتاب پرانی ہے تو اس کی ترتیب و تہذیب کا فرض کون انجام دیگا، کس مطبع میں اور کس طرح چھپے
ں کے ذمے ہو گی، کتاب میں غلط نامہ شامل ہوگا یا نہیں، ان کل امور کا فیصلہ وہ بے شرکت غیرے کر سکتے تھے۔ اس
لہ کے مستحق وہی ہیں۔

ب سے میر کے حالات پر کیا روشنی پڑتی ہے اور تحریر مقالہ کے وقت ذکر میر کا کون سا نسخہ پیش نظر تھا۔

(۲) خلاصے میں بکثرت اغلاط ہیں:۔

(۱) فارسی داں جانتے ہیں کہ فارسی میں عم و عمو کی طرح خال و خالو[1] میں فرق نہیں، اور فارسی سے اردو میں ترجمہ کریں گے پہلے یہ دیکھیں گے کہ خالو کس طرح آیا ہے۔ ذکر میں یہ تین شخصوں کے لئے مستعمل ہوا ہے۔ اور یہ تینوں شوہر خالہ نہیں، ماموں ۔۔ انتظام الدولہ (عماد الملک ان کا خواہر زادہ، ذکر میر ص۷۲) سالار جنگ (آصف الدولہ ان کا بھانجا، ذکر میر ۱۳۹) ۔۔۔ آرزو (میر کی سوتیلی ماں کے بھائی، صفحات ۶۷، ۷۵ وغیرہ) ڈاکٹر عبدالحق نے انتظام الدولہ عماد الملک کے رشتہ کا تو ذکر ہی نہیں کیا۔ سالار جنگ کو آصف الدولہ (ص۲۴) اور آرزو کو میر اپنی کے بھائی کا (صفحات ۲۰۷، ۲۰۹، ۲۱۳، ۲۱۳، ۲۴۶) خالو لکھا ہے۔ اردو میں خالو صرف شوہر خالہ کو کہتے ہیں۔ فارسی خالو کی جگہ اردو میں خالو لانا اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے کہ فارسی میں واقعی شوہر خالہ مراد ہو۔

(۳) تاریخ ہند کے ابجد خواں بھی اس سے ناواقف نہ ہوں گے کہ عالمگیر ثانی بہادر شاہ کا پوتا تھا۔ ذکر میر ص۱۴۷ میں آ "نبیرۂ بہادر شاہ" کہنا صحیح ہے۔ لیکن ڈاکٹر عبدالحق کا اسے نواسہ[2] لکھنا کسی طرح روا نہیں، فارسی میں نبیرہ و نواسہ کے معنی میں فرق نہیں، دونوں بیٹے اور بیٹی کی اولاد کے لئے آتے ہیں۔ اردو میں نبیرہ اپنی جگہ پر رہا لیکن نواسہ بیٹی کے بیٹے کیلئے مخصوص ہو گیا ہے۔

(۳) "رعایت خاں ۔۔۔۔ عظیم اللہ خاں کا بیٹا اور ۔۔۔۔ قمر الدین خاں کا نواسہ[3] ص۲۰۰ "رعایت خاں ۔ پسر عظیم اللہ خاں بیزنہ ۔۔۔ قمر الدین خاں" ص۹۴ "نواسہ اسی صورت میں صحیح ہو سکتا تھا کہ بیزنہ" داماد کو کہتے ۔ لیکن یہ بہنوئی کیلئے آتا ہے (ترکی لغات کے علاوہ غیاث اللغات میں ہے)

(۴) فخر الدین خاں نے جو ۔۔۔۔ ان کے رشتہ دار تھے[4] "ہمسر فخر الدین خاں کہ قرابت قریبہ داشت" ص۶۵ "ہمسر یہاں بی بی کے لئے آیا ہے۔ ذکر میر ص۱۹ میں بھی اسی طرح مستعمل ہوا ہے۔

(۵) "سعد الدین خاں ساماں" ص۲۲۱ تھے "میر سعید (سعد صحیح جو ذکر میر ص۷۲ میں بھی ہے) الدین خاں خان ساماں" ص۹۲

---

[1] میر تقی میر۔ حیات اور شاعری ص۳۹ میں آرزو کو میر کا سوتیلا ماموں لکھا ہے۔ سوتیلا ماموں ماں کے سوتیلے بھائی کو کہتے ہیں سوتیلی ماں کے بھائی کو سوتیلا ماموں کہنا غلط فہمی کا باعث ہو سکتا ہے۔ یہ لفظ آرزو کے لئے ڈاکٹر عبدالحق نے بھی استعمال کیا ہے۔ مقدمہ) میر ص۲۱۲ میں سالار جنگ کو بھی خالو کہا ہے اور لطف یہ ہے کہ مقدمہ ص۴۲ میں ڈاکٹر عبدالحق پر اس کے لئے اعتراض بھی ہے۔

[2] میر ص۱۴۳ میں بہادر شاہ کا بیٹا، مگر ص۱۴۲ میں نواسہ

[3] میر ص۹۸ و ص۱۱۳ میں رعایت خاں کو قمر الدین خاں کا بہنوئی لکھا ہے۔ لیکن ص۴۳ میں ڈاکٹر عبدالحق پر اعتراض کیا ہے کہ بھانجے کی جگہ نواسہ کیوں لکھا۔

[4] اس بحث میں ص کے بعد ہمیشہ ذکر میر کی عبارت ہے۔

جگہ خود شوہر تھا یہاں بہن کی جگہ بھائی کو دی ہے۔ خان ساماں سے قبل ایک اور "خاں" تھا اس کا حذف
عث ہوسکتا ہے۔

لدولہ کے بھتیجے، خواجہ محمد باسط میر کو اپنے چچا کے پاس لے گئے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ ان کے والد میر محمد علی ہیں
غلطے میں اسکی جگہ میر علی متقی ص۲۰۶۔ ص۲۵۶ میں مرقوم ہے کہ ذکر میر میں ہر جگہ یہی ہے۔ مقدمہ ذکر میر میں بھی
ہے۔ اور صمصام الدولہ کی خدمت میں حاضری کے بارے میں خاص طور پر تحریر کیا ہے کہ اس موقع پر بھی علی
ما۔ اپنی مرتبہ کتاب سے یہ ناواقفیت حیرت انگیز ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ محمد علی نام تھا اور علی متقی لقب۔ مگر
میر کی عبارت "بخطاب علی متقی امتیاز یافت" ص۸ کے باوجود مصر ہیں کہ علی متقی لقب نہیں، نام تھا وجہ یہ ہے
دوسرا نام نہیں ملتا۔ اس سے قطع نظر کہ یہ دعویٰ غلط ہے۔ بہت سے لوگ صرف لقب سے مشہور ہیں ان کے نام
ت کم لوگ انہیں جانتے ہیں، ڈاکٹر عبدالحق کا یہ قول بھی غلط ہے کہ ذکر میر میں "میر علی متقی" ہے۔ اس کتاب
کے ساتھ "میر" نہیں، یہ خود ان کا اضافہ ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات نہیں یہ کہہ دی جائے تو بے محل نہ ہو
مقدمے دونوں میں ہے کہ گلزار ابراہیمی (اضافہ یا غلط) میں میر کے والد کا نام میر عبداللہ درج ہے، یہ کتاب
اس کے کئی خطی نسخے (از انجملہ نسخہ پٹنہ) میری نظر سے گذرے ہیں کسی میں یہ، یا کوئی دوسرا نام موجود نہیں۔
دار اکبرآباد کی فوجداری پر سرفراز ہوئے" ص۲۰ فوجداری گرد اکبرآباد سرافراز گشت ص۴ گرد سے

خاں۳ ۔۔۔۔ عم بزرگوار کا مرید" ص۲۰۶ آدم سید مکمل خاں ۔۔۔ مرید عم بزرگوار" ص۵ تفاوت ظاہر ہے۔
۔۔۔۔ درد اٹھا" ص۲۰۷ درسینہ اش دردے ظاہر شد" ص۹، فرق واضح ہے۔
یہ نہ کبود جامہ! اتنے دور دراز کا سفر کیوں اختیار کیا" ص۲۰۳ لے سیرا بہ پٹنہ (بہ زبان فارسی) کبود جامہ
اختیار کردی" ص۲۹ اردو عبارت میں "لے سیرا بہ پٹنہ" کے بعد "ما" سے لازماً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سیرا بہ پٹنہ اور
مضاف الیہ نہیں، یہ بات کہ ڈاکٹر عبدالحق کے نزدیک کبود جامہ کا یہاں پر کیا مفہوم ہے واضح نہیں ہوتی
ایک مقام کا نام ہے۔ ذکر میر میں خود "سیرا بہ پٹنہ" کی زبان سے نکلا ہے "از کبود جامہ بار بہ چاہتے" اکبرآباد
ہدایت میں ہے کہ یہ مازندران کا ایک شہر ہے جیسا کہ مطلع السعدین، ظفر نامہ وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے
ماں مجھے میرے سر کی قسم دینے لگے" ص۲۱۱ گفت شمارا بسر من" ص۳۔ رعایت خاں اور میر کا سر ایک نہیں۔
اور کے کارخانے میں تلاش روزگار کی" ص۲۱۱ تلاش روزگار نمانہ نواب بہادر کردم" خانہ وکارخانہ ایک نہیں ہیں
میں ان (عمادالملک) کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں، تو بہت محظوظ ہوکر آتا ہوں،" ص۲۳۳ گاہ گاہ بخدمت

فوجداری گرد شہر دہلی"
میں بھی یہی لکھا ہے۔

۔۔۔ادھاحاضر شدہ ام (خط رشتہ چاہیئے) برداشتہ" ص۱۳۱ "برداشتہ" کا فاعل عماد الملک ہے، میر نہیں۔

(۱۴) "شجاع الدولہ کا اس وقت طوطی بول رہا تھا حافظ رحمت روہیلہ سے قرابت اور خصومت رکھتا تھا اس سے لڑائی ہو گیا" ص۲۴۳ "شجاع الدولہ سر بفلک داشت بجنگ حافظ رحمت (رضا خاں صرد) روہیلہ کہ با او (ربا او چاہیئے) ہسری می زد و خصومت می کرد برآمد" ص۱۳۲ "ان دونوں میں مطلقاً قرابت نہ تھی۔ "ہمسری" یہاں برابری" کا مترادف ہے۔ "خصومت می کرد" کا فاعل شجاع الدولہ نہیں حافظ رحمت خاں ہے۔

(۱۵) "سورج مل جو ایک قومی (قوی) زمیندار تھا اور جس کے آبا و اجداد ہمیشہ بادشاہان الوالعزم (اولوالعزم صحیح) کے ... ہیں" ص۲۲۶ "سورج مل کہ زمیندار زور آور بست آبا و اجداد او ہمیشہ مورد عنایات بادشاہ اولوالعزم ماندہ اند" ... ظاہر ہے۔

(۱۶) "جگل کشور ۔۔۔ ناگر مل کے ہاں گئے اور میری تقریب کی، اور مجھ سے ملنے کیلئے کہا، میں گیا اور ملا" ص۲۱۵ "جگل ... نہانہ ۔۔۔ ناگر مل رفت و تقریب من کردہ طلب داشت، رفتم و بدست او ملاقات کردم" ص۱۲۸ اختلاف نسخ ہے۔

(۱۷) "جگل کشور کی وہ عورت جس کا حال لکھا جا چکا ہے" ص۲۱۹ "آں زن جگل کشور کہ احوالش نگاشتہ آمد" ص۱۳۰ اس ... شوہر کا ذکر ہے، بی بی کا نہیں۔ میر کا قاعدہ ہے کہ اس طرح دو کا ذکر ہو تو کاف بیانیہ کے معاً بعد کی عبارت اس نام سے ... ہوتی ہے جو مؤخر الذکر ہے۔

(۱۸) "بہادر سنگھ نام پسر ۔۔۔۔ رادھا کشن کہ بیشتر (بیشتر چاہیئے) خزانچیگری معتمد جنگ داشت" یہ عبارت ذکر میر ۹ کی ہے اور میر نے باپ کو خزانچی کہا ہے، ڈاکٹر عبدالحق نے بیٹے کو بنا دیا ص۲۲۔ بیٹے کا تعارف باپ کا نام لے کر کرا رہے ... جو مشہور تر آدمی ہے۔ اگر بیٹا خود خزانچی رہا ہوتا تو اس موقع پر باپ کا نام بتانے کی حاجت نہ تھی۔

(۱۹) "صلح کے بعد میں خواجہ بزرگ (نواب بہادر) کی بارگاہ پہ زیارت کی سعادت حاصل کرنے ۔۔۔ حاضر ہوا اور ... کی سیر کر کے واپس آگیا" ص۲۱ "من پس از صلح برائے حصول سعادت زیارت درگاہ فلک اشتباہ خواجہ بزرگ ... سیر آں نواحی کردہ برگشتم" ص۹۶۔ نواب بہادر "جاوید خاں خواجہ سرا کا لقب تھا۔ اس کے مکان کو میر کے عہد میں کوئی ... "درگاہ" نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ لفظ درویشوں کے مزار اور اس سے متعلقہ عمارت کے لئے مخصوص ہو گیا ہے۔ "سعادت زیارت" الفاظ بھی اس کے مکان کو دیکھنے کے سلسلے میں شاید ہی کوئی شخص استعمال کرتا۔ غنیمت ہے کہ مقدمۂ ذکر میر میں یہ سمجھ میں ... ہے کہ "خواجہ بزرگ" سے خواجۂ اجمیر مراد ہیں۔

(۲۰) "فقیر کے مکر پہ لعن طعن کی" ص۲۰۔ فقیر نے یہ کہا تھا کہ میں دین مہدی کی تائید کرتا ہوں، اس پر قتل کی دھمکی دی تھی ذکر میر ص۹

(۲۱) "اکثر امراء نے علی متقی سے ملنا چاہا" ص۲۰۲۔ ذکر میر ص۱۱ میں صرف "امرا" خاص طور پر صمصام الدولہ کا نام

(۲۲) "جہاں امان اللہ جاتے، میر بھی ساتھ رہتے،" ص۲۰۲۔ ذکر میر ص۳۵ میں صراحۃً "اکیلے ایک فقیر سے ملنے کے لئے جانے کا ذکر ہے

(۲۳) "علی متقی گھر سے باہر کہیں نہیں جاتے تھے" ص۲۰۲۔ ذکر میر ص۹، ص۱۰ میں لاہور و دہلی جانے کا ذکر ہے اور ص۵ میں ہے

ں محمد باعث کے یہاں گئے تھے۔

ہوں نے بہت کچھ علاج کیا "ص۲۰۵۔ ذکر میر ص۹۵ میں صرف ایک طبیب کا ذکر ہے جس کا نام ابوالفتح ہے

ہ کو "گولی" لگنے کا ذکر مقالے کے ص۲۰۹ میں ہے، ذکر میر ص۶۵ میں اس کی جگہ "گولہ" ہے

! میں دو جگہ رنجیت سنگھ، یہ دراصل نجت سنگھ ہے جیسا کہ ذکر میر ص۶۹ میں ہے۔

میں ابے سنگھ، ذکر میر ص۶۹ کے متن میں بھی یہی، مگر حاشیے میں بحوالۂ نسخۂ لاہور ابے سنگھ، اور یہی صحیح ہے۔

مام الدولہ اور میر آتش اور چند نمک حراموں "ص۲۱۳ صمصام الدولہ میر آتش و حرامخورۂ چند ص۷۲۔ فرق ظاہر ہے۔

شب ۔۔۔۔ گیا، دربان نے روکا ۔۔۔ دوسرے روز نماز عشا کے بعد پھر گیا "ص۲۱۶ ۔۔۔ رفتم دربلے

۔۔۔ دیگر بعد از نماز عشاء باز رفتم" ص۷۹۔ ذکر میر میں "دیگر" سے قبل "روز" چھوٹ گیا ہو تو اور بات ہے، ورنہ ایک

یا نا ہوا۔

لخ ذبح کردہ کامان چلی گئی میں بھی ایام عشرہ میں وہیں رہا" ص۲۱۹۔ مقدمۂ ذکر میر میں ہے کہ دوبارہ کامان جانا ہوا

ار میں نہ آئے تو دوبارہ نہیں ہو سکتا۔ ذکر میر میں صراحتہً "ذن راجہ" کے ساتھ وہاں جانا مرقوم نہیں، میرا خیال ہے کہ

رہ گئے تھے اور وہیں سے کمبیر گئے۔

امیں "روزینہ" اور ذکر میر ص۹۵ میں "علوفہ"

نفن کے ساتھ لاکر وزیرت اجازت چاہی "ص۲۲۴ حاشیۂ ذکر میر ص۹۹ سے واضح ہے کہ لفظی معنے مراد نہیں ۔۔۔

دہ "۔ "لبخدر بسیار" کے لئے کنایتہً آیا ہے۔ غالب کا شعر یاد ہے۔

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں + عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لاویں گے کیا

تیغ و کفن باندھے ہوئے جانا بطور محاورہ نہیں استعمال ہوا، لفظی معنے میں آیا ہے۔ مقالے میں لفظی ترجمہ ٹھیک نہیں

خاں جو اپنے کو بادشاہی لشکر کا ایک سپاہی سمجھتا تھا" ص۲۳۶ نجف خاں کہ خود را از لشکر بادشاہی سپاہی می گرفت"

ں کا مطلب اس کے سوا نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے کو ایک معمولی سپاہی سمجھتا تھا۔ فارسی عبارت کا مطلب بالکل ۔۔۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری

تحقیق حق

قاضی عبدالودود صاحب کا مقالہ "ڈاکٹر عبدالحق بحیثیت محقق" ہمارے پاس کئی ماہ سے آیا رکھا تھا۔ مصنف نے نظرثانی کے بعد ہمیں بھیجا تھا۔ گذشتہ مہینے اس کی کتابت شروع ہوئی لیکن اس سے پہلے کہ اس کی پہلی قسط ہمارے یہاں درج ہوتی، معلوم ہوا کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری صاحب نے اس مقالے کا (جو معاصر میں چھپا تھا) جواب لکھا ہے، اور یہ خوب ہی ہوا کہ یہ بھی مل گیا ہم قومی زبان سے اخذ کر کے یہاں درج کرتے ہیں ——— (ادارہ)

قاضی عبدالودود بیرسٹر ایٹ لا پٹنہ کبھی آوارہ گردِ شعار کی جہان بین کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے شعر پردازوں کی طرف توجہ فرمائی اور ان کی "غلطیاں" ڈھونڈنے لگے غالب کو لیا اس کی راست بازی کا مضحکہ اڑایا۔ اس کو فرضی بتایا "غالب بحیثیت محقق" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ لکھا اور اس میں "غریب شہر" کو دل کھول کر برا بھلا کہا ناواقف، بے خبر، معوج الذہن ٹھہرایا مولانا محمد حسین آزاد پر نظرِ عنایت فرمائی تو "نوائے ادب" (بمبئی) کی مسلسل چار اشاعتوں میں چار سو سے کچھ اوپر غلطیاں دکھا کر دادِ تحقیق دی۔ اب بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی باری ہے "عبدالحق بحیثیت محقق" کے عنوان سے "معاصر" کے پیر صویں حصے میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس کی علت غائی محقق سے ان (مولوی عبدالحق) کے مرتبہ کی تعیین ہے۔ مقالے میں نہ تو مولوی عبدالحق کے مرتبے کی تعیین کی گئی ہے۔ اور نہ تحقیقات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بلکہ "ذکر میر" مرتبہ مولوی عبدالحق اس کے مقدمہ اور مولوی صاحب قبلہ کے ایک مضمون مطبوعہ اردو (اپریل ۱۹۲۶ء) پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کا ایک بڑا حصہ نقوش (اکتوبر نومبر ۵۳ء) "کچھ میر کے بارے میں" شائع ہو چکا تھا۔ نظرثانی اور ترتیب نو کے بعد نامناسب عنوان دے کر شاید کسی خاص جذبے کے اثر سے دوبارہ شائع کرایا گیا ہے۔

قاضی صاحب فرماتے ہیں "ڈاکٹر مولوی عبدالحق اردو کے محقق، نقاد اور انشا پرداز سمجھے جاتے ہیں یہ مطلق مولوی عبدالحق نہ محقق ہیں، نہ نقاد ہیں اور نہ انشا پرداز لوگ ناواقفیت کی بنا پر انہیں ان صفات کا مالک سمجھتے ہیں یہ ہیں کہ مولوی صاحب محقق نہیں قاضی صاحب مولوی صاحب کی چند غلطیاں دکھاتے ہیں اور ذہن نشین ناظرین کراتے ہیں کہ مولوی صاحب کی غلطیاں اس قدر زیادہ اور گزاشتوں کا استقصاء کامل مدنظر نہیں۔ یعنی یہ چند غلطیاں ہیں۔ ان کے

بے شمار غلطیاں مولوی صاحب سے ہوئی ہیں۔ لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے۔

میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

قاضی صاحب مولوی عبدالحق کی غلطیاں نکالنے چلے تھے خود غلطیاں کر بیٹھے میں پہلے ان کا ذکر کروں گا۔

(۱) میر تقی نواب عماد الملک کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں (ص۱۱۳) "وہ یگانۂ زمانہ ہیں۔ بڑی خوبیوں کے انسان ہیں ..... ہرگاہ بخدمت او حاضر شدہ ام محظوظ برداشتہ" مولوی عبدالحق نے اس کا ترجمہ کیا "جب کبھی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں تو بہت محظوظ ہو کر آتا ہوں"۔ قاضی صاحب کہتے ہیں "یہ غلط ہے" برداشتہ "کا فاعل عماد الملک ہے۔ یعنی میر جب عماد الملک کی خدمت میں جاتے ہیں تو عماد الملک میر کی صحبت سے محظوظ ہوتے ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہو گا جیسے کوئی کہے۔ قاضی صاحب بڑے محقق ہیں۔ جب میں ان سے بات کرتا ہوں تو وہ بہت لطف اٹھاتے ہیں۔ "برداشتہ" اصل میں "برداشتہ ام" تھا۔ "حاضر شدہ ام" میں "ام" موجود تھا اس لئے "برداشتہ ام" سے گرا دیا گیا۔ قاضی صاحب اسے غائب کی ضمیر سمجھے اور یہ نہ دیکھا کہ میر عماد الملک کی تعریف کر رہے ہیں اور یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے جب میر ان کی صحبت سے محظوظ ہوں۔

(۲) "آن زن جنگل کشور کہ احوالش نگاشتہ آمد" ذکر میر کی یہ عبارت نقل کرنے کے بعد قاضی صاحب فرماتے ہیں "اس سے قبل شوہر کا ذکر ہے بیبی (بیوی) کا نہیں۔ میر کا قاعدہ (عادت) ہے کہ اس طرح دو کا ذکر ہو تو کاف بیانیہ کے مابعد کی عبارت اس نام سے متعلق ہوتی ہے جو مؤخر الذکر ہے۔" (ص۲۴۹) حسن عبارت سے قطع نظر اس میں ذیل کی غلطیاں ہیں۔

(الف) یہاں کاف بیانیہ نہیں موصولہ ہے۔ اسم اشارہ اور اس کے بعد کاف موصولہ ہوا کرتا ہے۔

(ب) کاف موصولہ کا تعلق موصول سے ہو گا یعنی اس اسم سے جس پر اسم اشارہ داخل ہو "آن پسر عالم کہ مرد" اور "پسر آن عالم کہ مرد" میں یہ فرق ہے کہ پہلی مثال میں مرنے والا پسر ہے دوسری مثال میں عالم پہلی مثال میں کاف پسر سے متعلق ہے جو مقدم ہے دوسری مثال میں عالم سے جو مؤخر ہے۔

(ج) یہ قطعی غلط ہے کہ میر کے یہاں کاف بیانیہ مؤخر الذکر اسم سے متعلق ہوتا ہے "خالوئے برادر کلاں کہ سراج الدین علی خاں رزو باشد" (ذکر میر ص۳۱) میں کاف بیانیہ خالو سے متعلق ہے جو مقدم الذکر ہے۔

(د) اگر پہلے زن جنگل کشور کا ذکر نہیں ہوا تو "آن زن جنگل کشور" کہنا صحیح نہیں "زن جنگل کشور کہ احوالش نگاشتہ آمد" چاہئے

(ہ) آن کا اشارہ زن جنگل کشور کی طرف نہیں۔ لفظ "شب" اس کا مشار الیہ ہے۔ میر فرماتے ہیں "شب در سرائے زیر ستے بسر بردم صبح آن (اس کی صبح کو) زن جنگل کشور کہ احوالش نگاشتہ آمد از آں راہ گذشت"

(۳) "بہادر سنگھ نام پسر لالہ رادھا کشن کہ پیشتر خزانچی گری صفدر جنگ داشت" یہ عبارت نقل کرنے کے بعد قاضی صاحب فرماتے ہیں "یہ عبارت ذکر ص۹۱ کی ہے۔ اور میر نے باپ کو خزانچی کہا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق نے بیٹے کو بنا دیا بیٹے کا تعارف باپ

ملہ قاضی صاحب بیبی (چھوٹی بچی یا خاتون) کو بیوی (زوجہ) کے معنی میں استعمال کرتے ہیں "اس طرح دو کا ذکر ہو" یعنی بطور اضافت "اس نام سے" یعنی مضاف الیہ سے "مؤخر الذکر" بیکار اور زائد ہے۔

کا نام لے کر کر رہے ہیں جو مشہور تر آدمی ہے۔ اگر بیٹا خود خزانچی رہا ہوتا تو اس موقع پر باپ کا نام بتانے کی
اس سلسلے کی فردگزاشتیں ملاحظہ ہوں:۔

(الف) یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ میر نے باپ کو خزانچی کہا۔

(ب) ضروری نہیں کہ بیٹا کسی عہدے پر ہو تو باپ یا دادا کا نام نہ لیا جائے: "عماد الملک نبیرۂ آصف جاہ داشت عزو کرامت" عماد الملک بخشی ہے اس کے یا جد دادا کا نام لیا جا رہا ہے۔

(ج) "خزانچی گری مقدر جنگ داشت" کے بعد ہے "دریں اوقات باراجہ بود۔" یہ جملہ بہادر سنگھ سے متعلق ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ داشت کا فاعل بہادر سنگھ ہو۔ عطف کی صورت میں فعل معطوف و معطوف علیہ کا فاعل ایک ہو۔ عبارت کا ترجمہ یوں ہوگا۔ رادھا کشن کا لڑکا بہادر سنگھ جو اس سے پہلے مقدر بیگ کا خزانچی تھا اور اس وقت راجہ کے پاس تھا، شام کو آیا۔

(۴) "درسینہ اش دردے ظاہر شد" کا ترجمہ "دل میں درد اٹھا" کیا گیا تھا۔ قاضی صاحب اس پر معترض ہیں کہ درد سینہ سے میر کی مراد دل کا درد ہے جیسا کہ ذیل کے جملوں سے ظاہر ہے: "خفگی بمرتبہ ایست کہ نفس تنگ است" (کا یہ حال ہے کہ سانس رکا جا رہا ہے) "وقتے دلش بسیار گرفتہ" (کبھی دل بہت گھٹتا ہے) "دست بر دل نہاد" (دل پہ ہاتھ رکھا اور جاں بحق ہوئے)

(۵) "سیرابہ پز کبود جامہ" پر اعتراض ہے: "ڈاکٹر عبدالحق کے نزدیک کبود جامہ کا یہاں[1] پر کیا مفہوم ہے؟ ایک مقام کا نام ہے۔" کبود جامہ کے لغوی معنی مراد ہیں یعنی وہ شخص جس کا کرتا نیلے رنگ کا ہو۔ میر نے سیرابہ پز کہا ہے: "درویش اسداللہ نام پیراہن نیلی در بر (اسداللہ نامی فقیر جو نیلا کرتا پہنے ہوئے تھا)۔"

(۶) "شبے رفتم۔ دیگر بعد از نماز عشا باز رفتم" یہ عبارت نقل کر کے قاضی صاحب فرماتے ہیں: "دیگر سے روز دیگر مراد ہو۔ عشا سے پہلے کے وقت کو شب سے تعبیر نہیں کیا جاتا۔" گیا ہو تو اور بات ہے ورنہ ایک ہی رات دو بار جانا ہوا۔ دیگر سے قبل روز کی ضرورت نہیں۔ سیاق عبارت سے روز دیگر مراد ہو۔ عشا سے پہلے کے وقت کو شب سے تعبیر نہیں کیا جاتا۔

(۷) میر تقی کے والد میر متقی لاہور اور دہلی وغیرہ مقامات کی سیر و سیاحت کے بعد جیسا کہ خود میر نے لکھا ہے خانہ نشین ہو گئے (میر کے الفاظ یہ ہیں "با دل جمع درخانہ خود پا کشید۔") اور آنا جانا چھوڑ دیا۔ مولوی عبدالحق نے یہ بات اپنی لکھی تھی۔ اس پر قاضی صاحب فرماتے ہیں: "یہ صحیح نہیں۔ ذکر میر ص۔ د ص۱ میں لاہور اور دہلی جانے کا ذکر ہے اور ص۵ میں محمد عاشق کے یہاں گئے تھے۔"

اس میں حسب ذیل تسامحات ہیں:

الف۔ لاہور اور دہلی کے سفر کے بعد خانہ نشین ہوئے۔ ان سفروں کو خانہ نشینی کے رد میں پیش نہیں کیا

---

[1] "پر" غلط اردو ہے۔ صرف "یہاں" چاہیے۔

(ب) "گھر سے باہر نہ جانے" کا مطلب یہ ہے کہ عام طور سے کسی کے یہاں آتے جاتے نہ تھے۔ محمد یوسف کے یہاں عیادت کے لئے گئے جو ایک مسلمان کے دینی فرائض میں سے ہے صرف اس ایک واقعے سے عمومیت باطل نہیں ہوتی اور مولوی صاحب کا یہ فرمانا کہ وہ کہیں نہیں جاتے تھے غلط نہیں ٹھہرتا۔

غلطیوں کے علاوہ قاضی صاحب کے مقالے میں غلط بیانیاں بھی ہیں اور غلط فہمیاں بھی۔ غلط بیانیاں ملاحظہ ہوں:۔

(۱) "ڈاکٹر عبدالحق کا یہ قول بھی غلط ہے کہ ذکر میں میر علی متقی ہے۔ اس کتاب میں کسی جگہ بھی لقب کے ساتھ میر نہیں۔ یہ خود ان کا اضافہ ہے۔" ص۹۲

مولوی عبدالحق نے مقدمہ ذکر میر میں تین مقامات پر میر کے والد کا نام لکھا ہے۔ دو مقامات میں صرف علی متقی بجائے "میر"، جہاں کہیں انہوں نے والد کا ذکر کیا ہے تو علی متقی کے نام سے (ص۶ سطر۱۸) ہر جگہ علی متقی لکھا ہے۔ (ص۷ سطر۶) صرف ایک جگہ علی متقی پر لفظ میر اضافہ کر کے مولوی صاحب میر علی متقی لکھتے ہیں (ص۸ سطر۱۰) قاضی صاحب اس کو پکڑ لیتے ہیں اور بقیہ دو مقامات کو چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ کھلی ہوئی غلط بیانی ہے۔ اس کے علاوہ یہ نظر انداز کر دیتے ہیں کہ اس ایک مقام میں بھی لفظ "میر" نام کا جزو نہیں، میر صاحب کے والد کی سیادت جتانے کے لئے ہے۔

(۲) "مقالے اور مقدمے دونوں میں ہے کہ گلزار ابراہیم و گلشن ہند میں لکھنؤ جانے کا زمانہ ۱۱۹۰ھ مرقوم ہے۔ گلزار ابراہیم میں لکھنؤ جانے کا مطلقاً ذکر نہیں۔ اس کے مصنف کا بیان ہے کہ فی الحال ۱۱۹۶ھ وہ مقیم دہلی ہیں۔ اس کتاب کے مندرجات کے متعلق یہ دوسری غلطی ہے جو ڈاکٹر عبدالحق سے سرزد ہوئی ہے۔" (ص۹۱-۹۰)

اس میں حسب ذیل افسوسناک غلط بیانیاں ہیں:۔

الف۔ مولوی صاحب فرماتے ہیں "گلشن ہند اور گلزار ابراہیم میں ان کے (میر کے) لکھنؤ جانے کی تاریخ ۱۱۹۰ھ لکھی ہے" (مقالہ ص۲۲۳ و مقدمہ ص۱۰) قاضی صاحب مولوی صاحب کی عبارت الٹ دیتے ہیں اور گلزار ابراہیم و گلشن ہند لکھ کر اعتراض کرتے ہیں گلزار ابراہیم میں لکھنؤ جانے کا ذکر نہیں۔ اس تصرف کو قاضی صاحب کیا کہیں گے۔

ب۔ گلشن ہند میں ہے کہ میر صاحب ۱۱۹۰ھ میں دہلی سے لکھنؤ گئے۔ اس سے مولوی صاحب کا بیان غلط نہیں۔ قاضی صاحب خود غلط بیانی کے مرتکب ہوئے ہیں۔

ج۔ مصنف گلزار ابراہیم کے اس بیان سے کہ فی الحال ۱۱۹۶ھ میر مقیم دہلی ہیں ثابت ہوتا ہے کہ میر صاحب ۱۱۹۶ھ کے بعد لکھنؤ گئے۔

(۳) مولوی عبدالحق نے مثنوی "پر شمار البسر من" کا ترجمہ کیا، "اس نے اپنے سر کی قسم دی"۔ مقالے میں کاتب کی غلطی سے "اپنے" کی جگہ "میرے" چھپ گیا اس پر قاضی صاحب معترض ہیں۔ "رعایت خاں اور میر کا سر ایک نہیں" (ص۹۳) یہ کھلی ہوئی غلط بیانی ہے۔

غلط فہمیاں خاصی دلچسپ ہیں:۔

(۱) قاضی صاحب کو تسلیم ہے کہ میر صاحب دو بار کاماں گئے پہلی بار نواب راجہ جگل کشور کے ساتھ دوسری بار

راجہ ناگرمل کے ساتھ جا پہنچا ... اور بکامل رفت ... ۔ چند آنجا اقامت نمودم ۔ میر کی یہ عبارت نقل کرکے فرماتے ہیں:
یہاں بار بار کامل جانے کا ذکر ہے ... میر کا دوسری بار دہلی جانا راجہ ناگرمل کے ساتھ ہوا تھا ۔ (نقوش اکتوبر نومبر ۱۹۵۲ء صفحہ ۱۶
لیکن عبدالحق بحیثیت محقق ایسی لے مبتلاتے ہیں: ذکر میں صراحتاً نہیں راجہ کے ساتھ وہاں جانا مرقوم نہیں میرا خیال ہے کہ یہ
برسانہی میں ہو سکتے ہو (صفحہ ۹۶)

(۲) میر تقی میر امان اللہ کے بارے میں لکھتے ہیں "ایک لمحے کے لئے بھی وہ مجھے اپنے سے الگ نہیں کرتے تھے (لمحہ از خود جدا
نمی کرد صفحہ ۲) مولوی عبدالحق نے اس کی وضاحت کی جہاں وہ جاتے یہ ساتھ رہتے جہاں یہ سوتے یہ بھی وہیں سوتے " اس
قاضی صاحب کو اعتراض ہے کہ یہ صحیح نہیں ۔ خود میر نے صراحتاً ایک فقیر سے ملنے کے لئے جانے کا ذکر کیا ہے۔

(۳) "روزینہ اور علوفہ ہم معنی الفاظ ہیں مولوی عبدالحق نے علوفہ کا ترجمہ روزینہ کیا ۔ قاضی صاحب معترض ہیں اور اسے
غلط بتلاتے ہیں۔

(۴) مولوی عبدالحق خوب جانتے ہیں کہ خال یا خالو اردو میں ماموں ہے چنانچہ انہوں نے ذکر میر اور اس کے مقدمے میں
سراج الدین علی خاں آرزو کو میر کا سوتیلا ماموں کہا ہے اس کے باوجود قاضی صاحب کو اصرار ہے کہ مولوی صاحب خال یا خا
کے معنی نہیں جانتے اور مقالے میں آرزو کو میر یا ان کے بھائی کا خالو بتلاتے ہیں یہ واضح غلط فہمی ہے۔

(۵) مقالے میں خواجہ بزرگ کی شرح غلطی سے قوسین میں (نواب بہادر کر دی گئی ۔ قاضی صاحب سوءِ ظن کی بنا پر کتابت کی غ
کو سوءِ فہم پر محمول کرنے لگتے ہیں ۔ غنیمت ہے کہ مقدمہ ذکر میں یہ سمجھ میں آگیا ہے کہ خواجہ بزرگ سے خواجہ اجمیر مراد ہیں" مقدمہ ذکر
وضاحت کے بعد مقالے کی اک خطی غلطی کو اجاگر کرنا غلط فہمی نہیں تو کیا ہے ۔

(۶) "خود را در لشکر بادشاہی سپاہے می گرفت" کا ترجمہ مولوی عبدالحق کرتے ہیں "جو اپنے کو بادشاہی لشکر کا ایک سپا
سمجھتا تھا" قاضی صاحب فرماتے ہیں: اردو عبارت کا مطلب اس کے سوا نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے کو معمولی سپاہی سمجھتا تھا۔
فارسی عبارت کا مطلب اس کا الٹا ہے" اردو عبارت فارسی عبارت کا لفظی ترجمہ ہے ۔ اور اس کا مطلب بھی وہی ہے جو فا
عبارت کا ہے ایک سپاہی یعنی بہادر انسان ۔

(۷) مولوی عبدالحق فرماتے ہیں ۔ ذکر میر کی اشاعت سے پہلے میر اور ان کے سوتیلے ماموں آرزو کے ناخوشگوار تعلقات
کا کسی کو علم نہ تھا ۔ آزاد نے میر اور آرزو کے بگاڑ کا ذکر کیا تو لوگوں نے آزاد کی داستان طرازِ طبیعت کا اختراع سمجھا ۔ ذکر میر
اشاعت کے بعد معلوم ہوا کہ آزاد بڑے پتے کی بات لکھ گئے ہیں ۔ مولوی صاحب نے میر اور آرزو کے بگاڑ کو پتے کی بات بتلا
قاضی صاحب لوگوں کو باور کراتے ہیں کہ انہوں نے بگاڑ کی وجہ کو پتے کی بات کہا فرماتے ہیں ۔ اس بات کا مطلقاً ثبوت نہیں کہ م
آرزو میں مذہب کی وجہ سے بگاڑ ہوا ۔ اس صورت میں یہ کہنے کی کوئی معقول وجہ نہیں کہ آزاد بڑے پتے کی بات کہہ گئے ہیں "

(۸) میر اپنے والد کے متعلق لکھتے ہیں: انہوں نے ایک روز اپنے شیخ طریقت شاہ کلیم اللہ سے سوال کیا ، آپ کو ا
ہے کہ میں نے اپنے عقائد کی اصلاح کر لی ہے ۔ لیکن حاکم شام کے باب میں کچھ خلجان ہے ۔ آپ اس کے حق میں کیا فرماتے
شیخ نے چند روز کے بعد جواب دیا ۔ میری زبان پر اس کا نام کبھی نہیں آیا ۔ اس کا ذکر کس زبان سے [illegible] مولوی عبد

ل وجواب سے نتیجہ نکالا کہ میر کے والد اصلاً شیعہ تھے بعد میں انہوں نے یا تو شیعہ مذہب ترک کر دیا یا بعض عقائد (مثلاً تبری)
لی۔ اس پر قاضی صاحب معترض ہیں، فرماتے ہیں علی متقی کا یہ سوال اس پر دلالت کرتا ہے کہ وہ سنی تھے ..... "تبدیل مذہب
ے سلسلے میں ذیل کے امور اہل علم کی توجہ کے قابل ہیں۔

- علی متقی سنی تھے تو وہ کون عقائد ہیں جن کی انہوں نے اصلاح کر لی
- حاکم شام کے باب میں خلجان وسوال سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ وہ سنی تھے۔

اس کا کیا ثبوت ہے۔ کہ میر اصلاً شیعہ نہیں تھے انہوں نے ترک مذہب کی۔

ی صاحب فرماتے ہیں۔ حاکم شام سے ڈاکٹر عبدالحق کی مراد یزید ہے۔ یہ بڑی حیرت انگیز بات ہے کہ ایک شیعی سوال کو
ر حق یزید چسپاں فرمایئے۔ اس سے بڑھ کر غلط فہمی یا غلط نمائی نہیں ہو سکتی۔ علی متقی یزید کے بارے میں یہ سوال اس وقت کرتے
شیعہ مذہب ترک کر چکے ہیں یا اپنے پہلے شیعی عقائد کی اصلاح کر چکے ہیں۔ اس لئے یزید کے بارے میں یہ سوال ایک شیعی کا
ال ہے۔ اس پر حیرت کیوں؟ قاضی صاحب کے خیال میں علی متقی کا یہ سوال امیر معاویہؓ کے بارے میں تھا۔ وہ کہتے ہیں یہ سوال
ے لئے کیا تھا کہ سنی امیر معاویہ کو قابل ملامت سمجھتے ہیں لیکن صحابی ہونے کی وجہ سے ان کے بارے میں اظہار رائے مناسب
لا ہر غلط ہے امیر معاویہؓ کو کسی سنی عالم نے قابل ملامت نہیں کہا۔ ابن خلدون جیسا قابل اعتماد مورخ لکھتا ہے: امیر معاویہ
ہ بدگمانی ممکن نہیں ان کی عدالت اور صحبت ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتی۔ تمام بڑے بڑے صحابہ کی موجودگی اور ان کی
ن، شک اور شبہ کے تمام پردے چاک کر دیتی ہے (ص ۱۷۶) دوسرے مقام پر ہے: کوئی اس باب میں شبہ نہ کرے
کے باب میں بدگمانی کو راہ نہ دے۔ امیر کو اگر یزید کے فسق و فجور کا یقین ہوتا تو وہ کبھی اس کو اپنا خلیفہ یا ولی عہد مقرر
ر امیر کی فطرت سے بعید تھا (ص ۱۰۲) (باقی آئندہ)

شیفتہ

سرِ ناؤ نوش

ایامِ ہجر میں جو اجل کا خیال ہے
بیشک دماغ میں اثرِ اختلال ہے

کیا نسترن ہو تم کہ یہ پیاری شمیم ہے
کیا برگِ گل ہو تم کہ یہ زیبا جمال ہے

ساقی کو میکدہ میں سرِ ناؤ نوش ہے
صوفی کو خانقاہ میں سرِ وجد و حال ہے

عاشق کو اضطراب ہے عجز و نیاز سے
معشوق کو غرور ہے غنج و دلال ہے

منظور ہے حکیم کو ہر شے کی معرفت
حالانکہ اپنی معرفت اس کو محال ہے

ہر کام فلسفی کا سفاہت کے ساتھ ہے
ہر بات منطقی کی مرادِ جدال ہے

اربابِ حکمتِ نظری کو عمل نہیں
اہلِ کلام کو ہوسِ قیل و قال ہے

جن کو کہ دستگاہ ہے فنِ نجوم میں
عمر اُن کی صرفِ زائچۂ ماہ و سال ہے

ہیں بعض لوگ درپئے اسراف رات دن
بعضوں کو روز و شب سرِ توفیرِ مال ہے

بعضوں کو ہے مذاق میں فخرِ نسب لذیذ
بعضوں کو ذوقِ دعویٰ فضل و کمال ہے

مفلس کو فکر ہے کہ کسی ڈھب سے کچھ ملے
منعم غریقِ لجۂ بیمِ زوال ہے

جو ہیں حریصِ سیرِ چمن ان کو بزم میں
ذکرِ شمیم کبھی، کبھی فکرِ نہال ہے

جی میں کسی کے خواہشِ آرائشِ لباس
دل میں کسی کے حسرتِ جاہ و جلال ہے

کوئی طلب میں اشہبِ گلگوں نظیر کی
کوئی اسیرِ شوقِ شکارِ غزال ہے

کوئی فدائے قامتِ آفت خرام ہے
کوئی خرابِ نرگسِ جادو مثال ہے

ناحق کسی کو شکر کسی کو شکایتیں
بے وجہ کوئی خوش ہے کسی کو ملال ہے

کس واسطے ہم آئے ہیں دنیا میں شیفتہ
اس کا جو دیکھیے تو بہت کم خیال ہے

سید اجتبا حسین رضوی

امامتِ فقر

ہے روشِ کہنۂ ستم موجود — ابھی کہ ہے تپشِ جانِ بیکساں باقی
لشدگی ہے نصیبِ فکر و عمل — ابھی کہ ہے رہِ ظلمت پہ کارواں باقی
ع البشر ہے خرابِ بادۂ جہل — ابھی کہ زعمِ خودی کا ہے امتحاں باقی
رقِ مدارج ہے قیدِ خانۂ زیست — ابھی کہ ہے یہ زمین اور وہ آسماں باقی
بغض و عناد و ہوس کے پنجوں میں — ہے توسنِ روشِ دہر کی عناں باقی
بضِ امم پر بادِ علائے علاج — سیاستوں کی ہیں مفلوج انگلیاں باقی
اعقۂ قہر ہے محیطِ فضا — اک آگ ہے نہ قفس ہے نہ آشیاں باقی
ہرۂ معصوم آدمیت پر — بہیمیت کے طمانچوں کے ہیں نشاں باقی
بیِ رحمت کا دل ہے جگر پکاں — ابھی کہ مریمِ عصمت ہے نوحہ خواں باقی
اثر میں پہ بستۂ مذاقِ شہود — قفس میں ہے نگراں سوئے آشیاں باقی

گھڑی ہے فطرتِ آدم انہیں حصار نہیں — کہ جن پہ ضربِ محمدؐ کے ہیں نشاں باقی
زمیں پکار رہی ہے پھر اُن شعاعوں کو — بجھے ہوؤں میں بھی ہے جنکی داستاں باقی
ہوائیں ڈھونڈ رہی ہیں سحابِ فاراں کو — شکن شکن ہیں ابھی جس میں بجلیاں باقی
وفا کے دیس میں خاک اڑ رہی ہے صدیوں سے — وہی ہیں فطرتِ سرکش کی آندھیاں باقی
اٹھ اے گلیمِ فقیری کے اوڑھنے والے — کہ خواجگی ہے بہ نقارۂ و نشاں باقی
اٹھ اے کرامتِ تقویٰ، اٹھ اے امامتِ فقر — کہ دستِ حرص میں ہے تیغِ خونچکاں باقی
اٹھ اے امینِ دلِ بے دلاں، اٹھ اے محبوب — کوئی گھڑی کو ہے اب بزمِ عاشقاں باقی
اٹھ اے طبیب کہ سینہ میں زندگی کے ہیں اب — گرہ بنی ہوئی دو چار ہچکیاں باقی
اٹھ اے حکیمِ تمدن، اٹھ اے مسیحِ حیات — بتا کہاں نہیں باقی ہے دم، کہاں باقی
وہ ناؤ ڈوب چلی، ناخدا خبر لینا! — کہ جس پہ ہے تری چادر کا بادباں باقی
پھر اک حیاتِ دگر لے امینِ رازِ حیات — کہ تیرے دم سے ہے آہنگِ کن فکاں باقی

ہوائے دامنِ رحمت کو تیز کر کہ ابھی
دلِ فسردہ میں ہے گرمیٔ اذاں باقی

سلطان جمیل نسیم

آگ اور سمندر

یہ مزار بھی ہے اور سمادھی بھی۔

اس مزار پر گاؤں کے مسلمان ہر جمعرات کو چراغ جلانے، فاتحہ پڑھنے آتے ہیں۔ چند دعائیں مانگ کر اور پھول بکھیر کے چلے ہیں:—

ہر بدھ وار کو گاؤں کے ہندو یہاں پھول بکھیرتے ہیں۔ گنگا جل چھڑکتے ہیں اور منتیں مانگ کر لوٹ جاتے ہیں۔

گاؤں بھر میں کہرام مچ گیا۔ رام بھروسے نے روتے روتے اپنی آنکھیں سجا لیں اور شدت غم کے باعث اپنا سر دیوار سے ا۔ عبداللہ نیم دیوانہ سا ہو گیا۔ اس نے اپنے سر کے بال نوچ لئے اور گریبان چاک کر ڈالا اور سارا گاؤں تو اس الم نحے سے متاثر تھا ہی۔۔۔۔۔۔

عالم نے آج اپنی آنکھوں میں تیرتے ہوئے تقدس سے رام بھروسے اور عبداللہ کے درمیان بھڑکتی ہوئی نفرت کی آگ — ان کے دلوں کو اپنا خیال —— اپنا غم —— اپنی لازوال محبت دیکر نفرت کے اس نخل کو اکھاڑ پھینکا جو پروان زہریلے پھل اور پھول دیتا۔

وارے سے پہلے گاؤں والے ایک دوسرے سے بھائی چارے کی زنجیر سے منسلک تھے۔ اگر اودے سنگھ کی فصل اچھی ہوگئی اپنے تینوں بھائیوں کو لیکر اس کی مدد کو چل پڑا —— اور اگر کسی سال رمضان خاں لگان نہ دے سکا تو دھنی رام نے گاؤں کہہ دیا، جو کچھ تم دے سکتے ہو دیدو باقی کمی میں پوری کردونگا۔ مگر تقسیم کے بعد دھنی رام ہندو ہو گیا تھا وہ کیوں میاں بھائی کے لئے چندے کی اپیل کرتا —— اللہ رکھا مومن تھا وہ ایک کافر اودے سنگھ کی فصل اچھی ہو جانے پر اپنے بھائیوں کی مدد کو کیوں جاتا ——؟

ملکی بٹوارے کے بعد ہندو، ہندو بن گیا تھا اور مسلمان مسلمان ہو گیا تھا —— مگر سارے گاؤں میں ایک عالم کی ذات ہی ایسی کی بیٹی کے سہاگ گیت کے بول اپنے ہلتے ہوئے دانتوں سے اگلتی رہی —— اور محمد دین کی مرحوم کو غسل میت بھی دیدیا۔ اللہ رکھا نے انہیں دیا، خدا کی بہن کے سہاگ گیت گھنٹہ سنا رکھا۔

[illegible] خواب کہہ رہی ہے۔"

اور جب دھنی رام کو یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے محمد دین کی مردہ بہو کو غسل میت دیا ہے تو غصہ میں بڑبڑایا۔

"یہ بڑھیا پاکستان کیوں نہیں چلی جاتی۔ وہاں جاکے مسلمانوں کے مردے نہلائے"

مگر خالہ کو نہ تو دھنی رام کی باتوں سے لگاؤ تھا اور نہ وہ اللہ رکھا کے کہنے پر توجہ دیتی تھیں۔ وہ سارے گاؤں کی خالہ تھیں — جو کچھ کرتیں اپنا فرض سمجھ کر۔

اور یہی بات جب انہوں نے اللہ رکھا سے کہی تو اس نے جواب دیا۔

"خالہ — تمہیں کبھی نماز پڑھتے تو نہیں دیکھا — پہلے وہ فرض تو پورا کرو۔۔۔۔"

خالہ نے مسکرا کے کہا۔

"پگلے نماز آج فرض نہیں رہی۔۔۔۔"

اللہ رکھا نے یہ سنکر زمین پر تھوکا — دونوں کان پکڑ کر توبہ کی اور بولا۔

"خالہ — کیوں بڑھاپے میں کفر بکتی ہو —"

"شان ہے اللہ کی — اس عمر میں کافر کہلائی جا رہی ہوں —"

خالہ زیر لب بڑبڑائیں اور اپنی بیساکھی ٹیکتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود لوگ خالہ کی عزت کرتے تھے ان کی جلالی آنکھوں سے خوف کھاتے تھے وہ جانتے تھے کہ خالہ میں بہت اثر ہے۔ اور خالہ کے دل میں بہت درد ہے۔

اس چھوٹے سے گاؤں میں خالہ نے اس وقت جنم لیا جب نہریں خشک کنوئیں اندھے اور زمین پیاسی تھی۔ آسمان انگارہ رہا تھا۔ فصلیں سوکھ گئی تھیں۔ لوگ گاؤں چھوڑ کر بھاگ رہے تھے — جو کسی وجہ سے گاؤں نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ وہ دعائیں کر رہے تھے زندگی کی — اور خواب دیکھ رہے تھے موت کے — چھوٹا سا گاؤں کا مندر جسمیں ہر وقت پوجا ہونے لگی۔ بھجن گائے جانے لگے۔ مدد کیلئے شیام کو منایا جانے لگا۔ اور سدا خالی رہنے والی مسجد لوگوں سے بھر گئی تھی وہاں نمازیں کم پڑھی جا رہی تھیں اذانیں زیادہ دیکر اپنی سوئی قسمت کو جگایا جا رہا تھا۔ نورو بھی انہیں میں شامل تھا۔ گاؤں وہ بھی چھوڑ دیتا مگر اس کی بیوی کی حالت قابل نہیں تھی کہ وہ سفر کی صعوبتیں برداشت کرتا۔ اسی لئے وہ کچھ دن کو ٹھہر گیا۔

اور جس صبح نورو کے ہاں بچی پیدا ہوئی۔ اسی صبح کی شام کو سوئی ہوئی قسمتیں جاگ اٹھیں۔ آسمان پر گھنگھور گھٹائیں اور جب برسیں تو نہریں طویل انگڑائیاں لینے لگیں۔ کنوئیں پانی سے بھر گئے۔ زمین سیراب ہو گئی اور دہقانوں کے دل کا کنول

اس وقت نورو خوشی کے مارے پاگل سا ہو گیا۔ اس نے بیچ کھیت سب کو بتا دیا۔

"لوگو — یہ سب میری بچی لائی ہے"

لوگوں نے نورو کی یہ بات سنی تو مسکرا دیئے۔ ان کے دل میں نورو کے لئے احترام اور اس کی بچی کے لئے محبت پیدا ہو گئی اور ہر پانچویں سال آنے والا یہ سوکھا موسم پھر کبھی نہیں آیا۔ پھول کھلتے رہے۔ کلیاں مسکراتی رہیں۔ کھیت لہلہاتے رہے

اپنا خزانہ لٹاتا رہا۔ فضا گنگناتی رہی اور یونہی نور وکی پی شاداں جوان ہو گئی۔

وں نے دیکھا کہ گاؤں کی حسین ترین دوشیزائیں اس سانولی سلونی شاداں سے لگا نہیں کھاتیں جس کی بھیگی بھیگی آنکھو
سے جل رہے ہیں۔ اور یہی جلتے ہوئے چراغ دیکھنے والوں کی نظروں کو خیرہ کر دیتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گاؤں والے اگر
نظر بھر کے دیکھ لیتے تو فوراً ہی نظریں جھکا لیتے ـــــ ان کا دل اس طرح دھڑکنے لگتا جیسے انہوں نے کوئی بڑی بے ادبی
ـــــ جیسے وہ کسی پیر کے مزار پر جوتے پہنے ہوئے چلے گئے ہوں ـــــ شاداں کی جوانی کوئی غیر معمولی جوانی نہیں تھی
اس سے زیادہ حسین لڑکیاں موجود تھیں۔ لیکن یہ سیک سے ناک نقشے والی، سانولی سلونی شاداں وہ آنکھیں ایسی پیکر آئی
بت بھی تھی اور وقار بھی ـــ ایثار کا اجالا بھی تھا اور پاکیزگی کی روشنی بھی ـــ اس کی ان دو آنکھوں نے اسے سب کا
سب سے ممتاز بنا دیا تھا۔ لیکن ـــــ دوسروں کے کھلیانوں پر کام کرنے والے حسن علی نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں سرخ
یک جال بھی ہے۔ اور اس جال میں اس کے خیالات اسیر ہیں۔ ان حسین آنکھوں میں وہ نشتر بھی ہیں جو خیالات کو اگر آزاد
تو دلیں چھبنے لگتے ہیں۔ دل کی یہی چبھن لیکر جب وہ شاداں کے سامنے آیا تو وہ مسکرا دی ـــ اس وقت حسن علی نے
کھوں میں وہ جادو بھی ہے جو زخموں کا مداوا بن جائے۔

ن علی اور شاداں کی محبت خاموشی سے پروان چڑھتی رہی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ دوسروں سے بے نیاز ہو کر ایک دوسرے میں
ر جب شاداں دلہن بنکے اس کے جھونپڑے سے کٹیا نما مکان میں پہنچی تب حسن علی نے یہ بھی محسوس کیا کہ ان آنکھوں میں
ہے ایسی گہرائی جس میں ڈوب کر نکلنے کو جی نہیں چاہتا اور سچ مچ حسن علی کی محبت شاداں کی آنکھوں کی گہرائی سے گذر
دل کی تہہ تک پہنچ گئی تھی۔ بلکہ شاداں سراپا حسن علی کی محبت بن گئی تھی۔

داں کے لئے حسن علی جیسی چاہت دو اور نوجوان بھی رکھتے تھے اور وہ تھے نیاز اور رام سروپ ـــ نیاز شاید پہلا
جس نے جرات سے کام لیکر ـــ شاداں کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے تقدس اور جلال سے بے نیاز ہو کر اس کا ہاتھ تھاما
وئی آواز میں کہا۔

"مجھے چاہتا ہوں شاداں ـــ"

داں کا بچپن نیاز کے ساتھ گذرا تھا۔ نیاز کے ساتھ ہی اس نے شباب کی حدوں کو چھوا تھا ـــ اور جب اس نے نیاز
ی ـــ تو کچھ دیر کے لئے اس پر سکتہ سا طاری ہو گیا ـــ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور بڑی بیچارگی کے لہجہ میں بولی
باز بھیا ـــ میں تو ایسا نہیں سمجھتی تھی۔"

نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں ـــ پھر اچانک ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

داں نے آنسو دیکھے تو لرزتی آواز میں کہا۔

"از بھیا ـــ میں۔ ۔ ۔ ۔"

نے تڑپ کر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس کے ہونٹوں پہ رکھ دیا اور کرب انگیز لہجہ میں بولا۔

"اداں ـــ تو مجھے اپنی محبت نہیں دے سکتی ہے یہ میری قسمت ـــ لیکن مجھ سے تو یہ درد کی دولت نہ چھین۔"

اور اس دن کے بعد سے نیاز کے نغموں کا گلا گھٹ سا گیا اس کی بانسری کی لے نہ جانے کن ویرانوں میں گم ہو گئی - - - . .
اور رام سروپ ——— وہ تو بس چاہتا تھا — سب کچھ اور کچھ نہیں ——— اس نے نیاز کے نغموں کی موت دیکھی تھی
——— اسے تو شاداں سے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی ——— وہ تو بس اسے جب بھی دیکھ لیتا تو نظروں کے ساتھ ساتھ سر بھی جھکا
اور ہاتھ جوڑ کے زیر لب لکنا تا ——— پرنام ——

شاداں کی حسن علی سے شادی ہو جانے کے بعد بھی رام سروپ اسی عقیدت مندانہ انداز میں سلام کرتا رہا - اور نیاز ———
وہ تو گھبرا کے گاؤں چھوڑ گیا - اور جب واپس آیا تو اس کے جسم پر خاکی وردی تھی اور جیب میں سونے کے چند زیور ——— اور
ادھر شاداں کی گود میں کھیلتا ہوا بچہ ——— اور جب نیاز نے حسن علی کی موجودگی میں شاداں کے آگے اپنی جیب الٹ دی تو رام
سروپ کو نیاز کی شخصیت بڑی پیاری اور بہت عظیم نظر آئی - شاداں کے ننھے منے خوبصورت سے بچے کے گال میں آہستہ
پیار بھری چٹکی لیکر نیاز نے حسن علی سے کہا -

"حسن بھائی — میں فوج میں چلا گیا ہوں - بڑے مزے کی زندگی ہوتی ہے"

حسن علی ابتک ان چمکتے ہوئے چھوٹے چھوٹے زیوروں کو دیکھ رہا تھا جو شاداں کے آگے پڑے تھے - نیاز کی بات سن کر
وہ چونکا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھکے آہستہ سے کہا -

"اب تم جاؤ گے تو میں بھی چلونگا تمہارے ساتھ"

"اور میں بھی —" رام سروپ نے بھی جیسے بغیر کچھ بوجھے حسن علی کی تقلید میں کہدیا -

نیاز نے حسن علی کا کندھا تھپتھپایا -

"رام سروپ جا سکتا ہے لیکن تم نہیں ——— تم شاداں کی زندگی ہو - اس بچے کی زندگی ہو ——— اور فوج میں زندگی ملتی
نہیں بلکہ چھنتی ہے"

لیکن حسن علی کے سر میں نہ جانے کیسا سودا سما گیا تھا - اس کی آنکھوں میں بس وہی سنہرے زیور رقص کر رہے تھے جو نیاز
لایا تھا - اور وہ سوچ رہا تھا کہ اگر میں ایسے ہی سنہرے زیوروں سے شاداں کو سجا دوں تو ——— تو حسن علی کو نہ شاداں
کی سسکیاں روک سکیں اور نہ نیاز کے لہجے کی تلخی ——— وہ فوج میں چلا ہی گیا -

گاؤں کی دوشیزاؤں کے کنوارے گیت سہم گئے - نے تھرتھرانے لگی — بول بدلنے لگے -

پھر یہ نغمے خاموش ہو گئے -

اور ان نغموں کے بجائے سرگوشیاں جنم لینے لگیں - رفتہ رفتہ — آہستہ آہستہ

پہلی سرگوشی سے شاداں لرز اٹھی - اس کے ہونٹ پھڑپھڑانے لگے -

"نیاز فوج میں مارا گیا ———"

اور دوسری سرگوشی سنکر شاداں کی آنکھوں میں وہ پانی ہلکورے لے کر باہر نکلنے کے لئے مچلنے لگا — جسکو وہ گاؤں والوں
کے لئے لائی تھی - - - - قصبہ والوں کے لئے لائی تھی — بلکہ پورے صوبے کے لئے لائی تھی -

م سروپ بھی اس آگ میں بھسم ہو گیا۔"
پھر ـــــ پھر تو شاداں کی آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے سمندر میں طوفان آگیا۔ اس کی پرسکون دنیا میں ہلچل سی مچ
نسے بن گئے ـــــ سرگوشی چیخ بنکر فضا میں پھیل گئی ـــ ایک الم انگیز اور دکھ بھری چیخ ـــ اس لئے کہ
ن علی کی موت کی خبر آئی تھی۔ اس لئے کہ یہ شاداں کا غم تھا اور شاداں کا غم تو گاؤں والوں کا اپنا غم تھا۔ شاداں
ی آہ لیکر دھڑکتے دل کے ساتھ سوچا۔

، دور دیس جانے والے مسافر نے میرے دل کو اپنی منزل کیوں بنا لیا تھا "
قت سب سے بے نیاز ہو کر گذرتا رہا۔
ت گزرتا رہا ـــ پانی برستا رہا ـــ کھیت لہلہاتے رہے ـــ فصلیں کٹتی رہیں ـــ اور شاداں کی گود میں کھیلنے
ب گود کی ضرورت نہیں رہی ـــ وہ وقت کے ساتھ بھاگنے کی کوشش کرنے لگا ـــ اور شاداں اسے
رہی ـــ برستے ہوئے بادلوں کی مانند ـــ۔
زندگی کی سطح پھر ہموار ہو گئی ـــ کبھی حسن علی کی یاد ایک کنکر بنکے آتی اور اسکے پرسکون تالاب میں ہلچل مچا دیتی
کے بعد وہی ٹھہراؤ ـــ وہی روز کے کام ـــ اب شاداں کی تمناؤں کا واحد مرکز اس کا مسکراتا ہوا بچہ تھا
ن کھیلتے دیکھکر نہال ہوتی رہتی اور رات کو سینے سے لگا کر بیتی ہوئی بھٹی کو ٹھنڈا کر لیتی لیکن ایک دن وہ بچہ
ا۔ نہ بیماری نہ حادثہ ـــ صبح اٹھا تو ناک بہہ رہی تھی رات ہوئی تو بخار تھا اور دوسری صبح کو شاداں کی
اہو چکی تھی۔
ن اس نے اپنا آنسوؤں کا خزانہ لٹا دیا۔ جتنا بین کر سکتی تھی کیا۔ اور دوسرے دن سے وہ اپنے روز کے کاموں میں
لگی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے ـــ البتہ اسکی آنکھوں میں جلال کا پرتو نظر آنے لگا۔ تقدس اور پاکیزگی کا اجالا اور
روشنی اور پھیل گئی
اداں کے سر میں پہلا سفید بال آیا تو گاؤں کے بچوں نے اسے "خالہ" کہنا شروع کر دیا اور جب اس کے نصف
د ہو گئے تو وہ پورے گاؤں کی خالہ بن گئی۔ گاؤں والے جو محبت شاداں کے لئے دلیں رکھتے تھے وہ عزت
لی۔ یہ عزت اور احترام اسوقت تو اور بھی بڑھ گیا جب دیا نند کی منجھلی بہن کی برات حسب مرضی جہیز نہ ملنے پر
ٹ رہی تھی تو خالہ نے نیا نے کے دیئے ہوئے زیوروں سے حسن علی کی کمائی سے پس انداز کی ہوئی رقم سے اجلنے
گے دیوار کھڑی کر دی۔ . . . دیا نند خالہ کے قدموں پر گر پڑا ـــ اور اس کی بہن ـــ جسکی بارات لوٹ رہی تھی
یہ تو دیوی ہے ماں ـــ کے تو پیروں پر سر رکھ دینا چاہئے۔" اور واقعی جب خالہ نے اسے سینے سے لگا کر اس
الہاسہ دیکھ ـــ اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اس کے سر پر رکھکر کہا۔

بی۔ یہ کہکر ان کے قدموں میں گر پڑی ـــ خالہ نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

"میں تیری ماں ہوں دیوی نہیں — تو میری بیٹی ہے — تو میرا بیٹا ہے،، خالہ کا گلا رندھ گیا۔
اور پھر پورے چالیس سال کے بعد آسمان نے شعلہ بار نگاہوں سے زمین کو دیکھا تو کسان کا دل دہل گیا۔ کھڑی فصل کچھ مرجھا سی گئی کنوئیں کے پانی کی سطح نیچی ہوتی گئی اور نہروں کا پانی دھرتی کے سینے سے لگتا گیا۔ اس وقت پنڈت اور مندر بیکار ہوگئے۔ اور جب لوگوں کی دعائیں اور التجائیں رائیگاں جانے لگیں تو وہ کچھ سوچکر خالہ کے پاس آئے۔ اسوقت خالہ پر ایک عجیب جلالی کیفیت طاری تھی۔ ان کے سفید بال بکھرے ہوئے تھے — آنکھوں میں آنسو تھے اور زبان پر پانی پانی —
گاؤں والے یہ کیفیت دیکھکر خالہ کے ساتھ محو دعا ہوگئے۔
دوسرے دن ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی اور شام کو موسلادھار بارش ہوگئی۔ گاؤں والے جو خالہ کے لئے عزت اور احترام دلمیں رکھتے تھے۔ عقیدت مند بن گئے۔
اور پھر یہ بھی خالہ ہی کا دم تھا کہ انہوں نے اس گاؤں میں فساد کی آگ کو نہ بھڑکنے دیا۔ ورنہ عبداللہ اور رام بھروسے تو ذراسی بات پر ایک دوسرے سے الجھ کر گاؤں والوں کو مشتعل کر چکے تھے۔
خالہ نے آگے بڑھ کر رام بھروسے کا گریبان پکڑ لیا اور چیخ کر کہا۔
"تو اگر مسلمانوں کو مارنے کی سوچ چکا ہے تو آ — پہلے مجھے مار ڈال۔ اس لئے کہ میں مسلمان ہوں،،
پھر عبداللہ کے بال کھینچ لئے۔
"تم لوگوں کے دلمیں اگر فساد بھرا ہے تو پہلے میرے سینے کو چھید ڈالو اسلئے کہ سب سے بڑی ہندو میں ہوں،،
یہ سنکر رام بھروسے سٹپٹا گیا۔ عبداللہ کانپ اٹھا — دونوں کے ہاتھ شل پڑ گئے۔ نظریں جھک گئیں اور گاؤں میں سکون ہوگیا۔ مگر دلوں میں خلش پیدا ہوگئی تھی۔

دن ڈھلے جب خالہ چھوٹی حویلی کے پاس سے گزریں تو سوچا لاؤ رام بھروسے کی بہو سے ہی دو باتیں کرتی چلوں —
خالہ نے ابھی دہلیز میں قدم ہی رکھا تھا کہ باہر سے رام بھروسے بدحواسوں کی طرح چیختا ہوا آیا۔
"خیریت! خیریت؟،، خالہ نے رام بھروسے کو اس طرح بدحواس دیکھکر پوچھا۔
"خیریت کہاں خالہ۔ میرا بچہ اور عبداللہ کا منا دونوں آگ میں گھر گئے ہیں۔ دعا کرو،،
رام بھروسے ایک سانس میں کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔
"کہاں — آگ کہاں لگ گئی،، خالہ گھبرا کے چیخیں۔
"عبداللہ کے بھوسے کی کوٹھی میں —،، رام بھروسے نے چیخ کر جواب دیا اور اندر جاکر اپنی بیوی سے نہ جانے کس چیز کے بارے میں تیز آواز میں پوچھنے لگا۔
خالہ نے یہ سن کر اپنی بیساکھی پھینکی اور جھکی ہوئی کمر کے ساتھ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی بلکہ بھاگتی ہوئی عبداللہ کے گھر پہنچ گئیں۔ آگ چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ لوگ عبداللہ کو مشورہ دے رہے تھے کہ جو کچھ بھی نکال سکتے ہے نکال لے ورنہ کچھ

یہ بھروسے کی کوٹھی کی آگ گھر تک پہنچ جائیگی۔ عبداللہ کے ہوش و حواس زائل ہو چکے تھے۔ اس کی بیوی اپنے بچے
ں بیہوش پڑی تھی۔ اور جب رام بھروسے اور اسکی چیختی ہوئی بیوی وہاں پہنچے تو خالہ آگ کے شعلوں میں گم ہو چکی تھیں
ے شور مچایا اور بوڑھوں نے خدا اور بھگوان کے واسطے دیکر لوٹ آنے کو کہا — مگر جب خالہ ان شعلوں میں گم ہو گئیں
خاموش ہو گئے۔

خالہ کو آگ میں جلتے ہوئے دیکھکر کچھ لوگوں میں جوش پیدا ہوا۔ مگر ہولناک آگ دیکھکر انکی ہمت پگھل گئی۔
اور جب لوگ یہ سوچنے لگے کہ۔ اس دیوانی بڑھیا نے پرائی آگ میں کود کر اپنے دلمیں لگی ہوئی آگ کو بجھا لیا — اور
اور رام بھروسے کے بچوں کے ساتھ بھسم ہو گئی ۔۔ اس وقت یہ بات سوچنے والے دماغ ماؤف ہو گئے — اور دیکھنے
ی آنکھوں کے ساتھ ساتھ منہ بھی کھلے رہ گئے۔ خالہ دونوں بچوں کو سینے سے لگائے اور اپنے کپڑوں میں آگ بھڑکائے
ی تھیں — فوراً ہی بچوں کو ان سے الگ کر کے کپڑوں کی آگ بجھائی گئی۔
خالہ کے سفید بال جل گئے تھے۔ جسم جل گیا تھا۔ لیکن پانی کا وہ خزانہ جسکو وہ اپنی آنکھوں میں گاؤں والوں کے لئے
چھپائے تھیں خشک نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے اشارے سے عبداللہ اور رام بھروسے کو قریب بلایا — اور لڑکھڑاتے
ہوئے کہا —
"اب تک میں تمہیں ہر غلط بات پر ٹوکتی رہی تھی۔ لیکن اب — ہاں تم دوسروں کو ہمیشہ غلط بات پر ٹوکنا — لیکن
خود کوئی غلط بات نہ کرنا"
انکی آنکھوں سے آنسو نکلے اور پھر آنکھیں بند ہو گئیں۔
رام بھروسے نے اپنا سر دیوار سے دے مارا۔ ۔ ۔ ۔ اور عبداللہ نیم دیوانہ سا ہو گیا۔

یہ مزار بھی ہے اور سمادھی بھی :
اس مزار پر گاؤں کے مسلمان ہر جمعرات کو چراغ جلانے، فاتحہ پڑھنے آتے ہیں — چند دعائیں مانگ کر اور پھول
چڑھا کر چلے جاتے ہیں۔
ہر بدھ وار کو گاؤں کے ہندو یہاں پھول لے کر آتے ہیں گنگا جل چھڑکتے ہیں اور منتیں مانگ کر لوٹ جاتے ہیں

شفیق ندوی، ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے ایس ایم، اے پریس میں چھپوا کر بخشا بہار ہارمنگ سوسائٹی کراچی سے شائع کیا

مہ زبیں سکندر مہرا

آنچل سے پرچم تک

جب رفیق خاموشی سے اشرکماس کے قریب سے گزرتا ہوا باہر کے کمرے میں جا رہا تھا تو اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے اس کی ویران لیکن پرکشش آنکھوں میں ایک جوان عزم اور ایک بلند حوصلہ ٹھوکریں کھاتا نظر آ رہا تھا۔ اسکے اپنے ارادوں کو بری طرح ٹھیس پہنچی تھی۔ وہ تھکا تھکا سا نظر آ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اب کچھ دیر وہ تنہا رہنا چاہتا ہو۔ جیسے اسے آرام کی ضرورت ہو جیسے وہ سکون چاہتا ہو۔ چاہے یہ سکون دو گھڑی کے لئے ہی کیوں نہ ہو! ــــ کوئی نصف گھنٹہ قبل جب وہ دفتر سے آیا تھا تو اس کے چہرے پر بلا کی رونق تھی۔ دل میں محبت اور الفت کے جوان پھول کھل رہے تھے۔ لبوں سے خواہ مخواہ ایک عجیب ترانہ سا پھوٹ رہا تھا۔ پیر ستے کر زمین پر پڑنے کا نام نہ لیتے تھے۔ لیکن جب دوبارہ نہ چاہتے ہوئے بھی غیر ارادی طور پر وہ گھر سے باہر نکل رہا تھا۔ تو چہرے کی رونق سب سے غائب تھی۔ محبت اور الفت میں سرشار کسی حسین سے گیت کے میٹھے میٹھے بول کو جیسے گھر کے ویران ماحول نے ڈس لیا تھا۔ دل کے جوان پھول یکلخت مرجھا گئے تھے۔

کوئی نصف گھنٹہ قبل وہ دفتر سے واپس آیا مہینے بھر کی تنخواہ خورشید کے ہاتھوں میں تھما دی۔ کچھ دیر خورشید سے باتیں کیں جس میں اس کے قہقہے خاص طور سے نمایاں تھے۔ پھر وہ اپنی ماں سے سرگوشی کے انداز میں کچھ کہا سنا۔ اور دوسری بار جب وہ خورشید کے قریب سے گزرا تو اس کے چہرے پر نفرت و حقارت کے آثار موجود تھے۔ وہ پریشان نظر آ رہا تھا! ــــ اس نے ایک لمحہ خورشید کو کچھ عجیب نگاہوں سے دیکھا۔ اور پھر سر جھکائے ہوئے اس کے سامنے سے گزر گیا۔ ایک لفظ بھی تو نہ کہا۔

خورشید نے اس کے تیور دیکھے۔ اور انجانے خوف نے اس کے دل میں جنم لینا شروع کیا۔ وہ مارے ڈر کے کانپ اٹھی۔ اس کا سارا جسم کپکپانے لگا۔ اور جب رفیق باہر کے کمرے میں میز کے سامنے پڑی ایک کرسی پر بیٹھا جوتے پہن رہا تھا۔ تو وہ بھی اس کی تقلید کرتی ہوئی تیزی سے وہاں جا پہنچی۔

رفیق نے جوتے کی ڈوریوں کی آخری گرہ مضبوط کی۔ اور پھر سر اٹھا کر اسکی طرف دیکھا ــــ اس کی آنکھوں میں شعلے سے لپک رہے تھے! ــــ خورشید نے اسے گھور کر دیکھا لیکن اس کی شعلہ بار نگاہوں کی تاب نہ لا کر سر جھکا لیا ــــ رفیق بدستور اسکے چہرے پر نگاہیں جمائے اس کے معصوم دل میں اٹھنے والے نامعلوم خیالات کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"آخر بات کیا ہے؟" خورشید نے اپنے چہرے پر ایسے تاثرات پیدا کئے جیسے ابھی ابھی وہ رو پڑے گی۔ پھر بدستور سر جھکائے ہوئے اور اپنی بڑی بڑی پلکیں اوپر اٹھاتے ہوئے اس نے اپنے مخصوص پیار بھرے انداز سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا اس کے لبوں پر ایک خفیف

رونما ہوئی۔ اور خاموشی کا سینہ چاک کرتی ہوئی اس کی دھیمی لیکن صاف اور واضح آواز کمرے میں گونج اٹھی ۔۔۔ "آخر بات کیا ہوا
بیان کیا۔

لیکن اب رفیق کا چہرہ پرسکون تھا۔ اس نے لپنے پیپر زمین پر پھینک دیئے پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا اسکے قریب
اس نے لپنے کانپتے ہوئے ہاتھ اسکے شانوں پر رکھ دیئے ۔ دائیں ہاتھ سے اسنے سیاہ اور ریشم کی مانند ملائم بالوں میں آئی ہوئی گرد کو
بالوں کو سنوارا۔ آنچل کو سینے پر درست کیا پھر اسکے چہرے کو اپنے موٹے بھدے اور سیاہ ہاتھوں میں لیکر آہستہ سے اسکی پیشانی پر بوسہ
اس کے ملائم اور تندرست ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیکر غیر معمولی طور پر زور سے دبا دیا۔ اس کے بعد اس نے میز کے ایک کونے پر رکھی
پیپر کو اٹھا کر کوٹ کی جیب میں ڈال لیا اور بغیر ایک لفظ کہے خاموشی سے اس کے قریب سے گزرتا ہوا دروازہ کھول سڑک پر نکل گیا۔
رشید نے آج تک رفیق کو ایسی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ چنانچہ رفیق کے اس غیر معمولی طرز عمل کا احساس اس کے ذہن میں چکر کاٹنے
لگا۔ جس کا موزوں کھلا کا کھلا رہ گیا۔ حیرت کے عالم میں دوڑتی ہوئی وہ دروازے کے پاس چلی گئی۔ اور کواڑوں کو بند کرکے ان
میں سے جھانکنا شروع کیا۔۔۔

کوئی دو فرلانگ تک سڑک سیدھی چلی گئی تھی۔ اسکے علاوہ چونکہ یہ شہر کے نسبتاً غیر آباد علاقے میں واقع تھی۔ یہاں عام طور پر زیادہ شور
نہ ہوتا تھا۔ اور دن رات یہ سڑک سنسان رہا کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ رفیق اسے بڑی دور تک نظر آتا رہا۔ وہ بڑی دیر تک رفیق کی طرف
وہ بڑی دیر تک اس کی پشت پر نظریں جمائے کھڑی رہی جتی کہ رفیق کے وجود کا احساس اس کی نظروں سے اوجھل ہو کر اسکے دل میں
اس نے اپنے بدن میں ایک پھریری سی محسوس کی۔ اسے اپنے شانوں پر رفیق کے بھدے ہاتھوں کا بوجھ محسوس ہوا۔ پھر اس نے اپنے
اسکے بھدے موٹے اور سیاہ ہاتھوں کا لمس محسوس کیا۔ اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں کمرے میں اس کے علاوہ اور کوئی
نہ تھا۔۔۔ بے اختیار اس نے اپنے ہاتھوں کو چوم لیا۔۔۔!

اس نے اپنا سر دیوار پر ٹیک دیا۔ اور سلجھے بکھرے ہوئے بالوں کو خواہ مخواہ الجھاتی ہوئی رفیق کے اس غیر متوقع طرز عمل کے بارے میں سوچنے
لگی۔ وہ ابھی ذہنی الجھن میں مبتلا ہی تھی کہ خیالات کا یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اسکے ذہن کو ایک دھچکا سا لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا۔
جیسے پھیلے ہوئے پانی کی پرسکون، نیلگوں وسعتوں میں کوئی پتھر بڑی ہی بے ہنگم اور پرشور آواز کے ساتھ آگرا۔ اور پھر پانی کی لہریں
پھیلنے لگیں پھیلتی ہی چلی گئیں ۔۔۔ کوئی دروازے پر ہلکی ہلکی دستک دے رہا تھا ۔۔۔ اس کا دماغ جھنجھنا اٹھا۔ اس
کے ساتھ دروازہ کھولا ۔۔۔ تنہا اقبال۔

کھڑا تھا ۔۔۔ ایک بغل میں دو چار پرانی بوسیدہ کتابیں دبائے، دوسرے ہاتھ سے انہیں سنبھالنے کی کوشش کرتا، اپنی
آنکھوں کو معصومانہ انداز میں پھیلائے وہ کچھ اس طرح اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کہ بے اختیار خورشید مسکرا اٹھی۔ ذہن کی رواں
ہوتے لاتعداد خیالات یکلخت ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر تحلیل ہو گئے۔ نرم و ملائم اور تندرست ہاتھوں پر ثبت جسم کا لمس
شعور کے اندھیروں میں بھٹکتی ہوئی اچانک نہ معلوم کدھر غائب ہو گئی۔ اسے صرف اقبال کی معصوم نگاہوں کا احساس تھا! بے اختیار
ایک پیار بھری مسکراہٹ ابھر اٹھی!
بے اختیار چاروں طرف نظریں دوڑائیں ۔۔۔ سڑک سنسان تھی۔ کوئی راہگیر آتا جاتا نظر نہیں آتا تھا ۔۔۔ اس نے اپنا

دروازہ کھول دیا۔ اور پھر اقبال کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اندر کی جانب کھینچ لیا!

اقبال کے اندر آجانے کے بعد سب سے پہلے اس نے دروازہ بند کیا۔ اور پھر اقبال کی طرف بھرپور نگاہوں سے دیکھا جو بہت ہی چونکتا ہو کر اپنے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسے بے اختیار اقبال پر پیار آگیا! ——— جانے کیا بات تھی آج اس کے جسم کا رواں رواں محبت کے حسین رنگ الاپ رہا تھا۔ ایک طویل مدت بعد آج پھر اس نے اس گھر کی ہر شے کے لئے اپنے دل میں انسیت کا جذبہ محسوس کیا تھا۔ ماحول کی سنگین دیواروں کو توڑ کر اسکے دل کے کسی گوشے میں نہاں ماتا کا جذبہ آج پوری شدت سے اُمنڈ آیا تھا!

پھر کسی انجانے جذبے سے متاثر ہو کر وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئی۔ اُس نے اقبال کے ننھے ننھے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ اور پھر کانپتے ہوئے انہیں اپنے شانوں پر رکھ لیا۔

تنہا اقبال کھڑا کچھ دیر تو اسے حیرت سے تکتا رہا۔ پھر اس کے جسم میں ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی۔ بوسیدہ کتابیں ہلکی سی آواز پیدا کرتی زمین پر گر پڑیں۔ دوسرے ہی لمحے خورشید نے اسے اپنی جانب کھینچ لیا!۔

اقبال کو اپنی سانس گھٹتی سی محسوس ہوئی۔ اس نے بغور اقبال کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کے معصوم چہرے پر گھبراہٹ اور پریشانی کے آثار صاف نظر آ رہے تھے۔ یقینی طور پر آج پھر اس نے اسکول میں کوئی ہنگامہ کھڑا کیا تھا۔ کسی کی کتابوں پر ہاتھ ڈالا تھا۔ یا پھر اپنی ہی کتاب کو اکسا میں پھینک گیا ہوگا! خورشید نے خیال کیا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے دریافت کیا۔

"کچھ بھی تو نہیں!" اقبال نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات پیدا ہوئے گویا اب اس جواب سے وہ مطمئن نہیں۔ خاموشی کے ایک مختصر سے وقفے کے بعد وہ پھر بول اٹھا ——— "بھوک لگی ہے"۔

"تو پھر جاؤ کھانا کھالو" اس نے کہا۔

وہ آہستہ سے اٹھا۔ جھک کر زمین پر پڑی کتابیں سمیٹیں۔ اور بوجھل قدموں سے چلتا میز کے قریب جا پہنچا۔ اور کتابوں کو لاپرواہی سے میز پر پھینک دیا۔ اس کے بعد اس نے قمیض کے دامن سے آنکھیں صاف کیں اور پھر ایک بار مڑ کر عجیب خوفزدہ نگاہوں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا جو زمین پر جھکی نہ معلوم کیا سوچ رہی تھی۔ ایک طائرانہ نظر اُس پر ڈالنے کے بعد اس نے تیزی سے زینہ طے کیا۔ اور اندر بھاگ گیا۔

خورشید بدستور سر جھکائے بیٹھی رہی۔ سر جھکائے اور نگاہیں فرش پر جمائے وہ بڑی دیر وہاں بیٹھی رہی۔ اسے وہ بات یاد آ رہی تھی! طویل مدت سے لاشعور کی وسعتوں میں چکر کاٹنے والی وہ بات اسے یاد آ رہی تھی۔ یہ وہی بات تو تھی جس کا تذکرہ آج صبح اس نے رفیق سے کیا تھا۔ اور جسے سن کر رفیق کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی! خورشید کو اچھی طرح یاد تھا۔ جب اس نے رفیق سے اس بات کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔ تب پہلے تو رفیق نے پلکیں اٹھا کر عجیب نگاہوں سے خورشید کی طرف دیکھا تھا۔ اور پھر اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اسے وہ نگاہیں اچھی طرح یاد تھیں۔ ——— جن سے بے پناہ درد جھلک رہا تھا جن میں دنیا بھر کے غم پوشیدہ تھے۔ وہ ان عجیب نگاہوں اور اس پھیکی مسکراہٹ کو کیسے بھول سکتی تھی!۔

صبح اس کی بات کو اطمینان سے سننے کے بعد رفیق کی اس پھیکی مسکراہٹ اور اس کی ان عجیب نگاہوں کو دیکھ کر اس نے سوچا تھا کہ وہ اسکی بات ضرور مان لے گا - - - - - - - - - - رفیق نے آج تک اسکی کسی بات کو نظر انداز نہیں کیا؟

ہمیشہ اس کے مشوروں کو خندہ پیشانی سے قبول کیا تھا۔ اس نے ہمیشہ اس کی خواہشات کا احترام کیا تھا۔ لیکن پھر بھی آج صبح رفیق
بات کا ذکر کرتے ہوئے اس کے چہرے پر خوف جھلک رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ اس کے جسم کا ایک ایک عضو
کی کیفیات کا اظہار کر رہا تھا۔ مگر جب رفیق نے اس کا جواب پھیکی مسکراہٹ اور عجیب غمگین نگاہوں سے دیا۔ تو وہ کچھ مطمئن ہو گئی
آج تک اسے پہلا ایقین تھا کہ رفیق اس کی بات ضرور مان لے گا۔ اس کی خواہش کے سامنے ہمیشہ کی طرح آج بھی سر جھکا دے گا۔

——— ؟

لیکن ابھی کچھ دیر قبل شام کو دفتر سے واپس آنے کے بعد جب وہ خاموشی سے اٹھ کر اس کے قریب سے گزرتا ہوا باہر کے کمرے میں جا رہا
اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے۔ اس کی ویران لیکن پرکشش آنکھوں میں ایک جوان عزم اور ایک بلند حوصلہ
جھلکتا نظر آ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے اونچے ارادوں کو بری طرح ٹھیس پہنچی ہو!

——— اور جب وہ رفیق کے اس اجنبی اور غیر معمولی طرز کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ تو بے شمار شبہات اس کے ذہن میں
رہے تھے۔ اور بے شمار الجھنیں کروٹیں بدل رہی تھیں!

اسے رفیق پر پورا پورا بھروسہ تھا۔ تبھی تو وہ بلا جھجک ہر بات اس کے سامنے بیان کر دیا کرتی تھی۔ تبھی تو آج صبح، رفیق سے یوں بات
نے اس نے ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی تھی۔ لیکن آج شام کو رفیق نے جس غیر متوقع طرز عمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے اس کے ذہن
جھنجھوڑ ا تھا ——— اس کی آنکھوں سے انجانے خوف کے آثار جھانکنے لگے۔!

جانے کیا بات تھی! یہ رفیق کا ہر دم مسکراتا چہرہ تھا۔ یا رفیق کا وہ پیار۔ جس نے اس کے ذہن میں رفیق کی عظمت کا احساس پیدا کیا تھا۔
یہ وہی احساس تھا جس سے متاثر ہو کر اس نے رفیق کو اپنے دل کے اندر جگہ دی تھی! بہرحال بات کچھ بھی ہو ——— خورشید نے سوچا
بات کچھ بھی ہو۔ اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں۔ کہ رفیق اس کی ہر خواہش کے سامنے سر جھکا دے۔ اس کی ہر بات قبول کر لے۔!
ے دے کر بات یہیں پر آ کر رک گئی تھی! ——— شام والے واقعات سے خورشید کے جذبات کو کچھ بری طرح ٹھیس پہنچی تھی۔ اسے
بس ہو رہا تھا۔ جیسے کسی نے اسے پہاڑ کی چوٹی سے اٹھا کر عمیق گہرائیوں میں پھینک دیا ہو ———

اس نے آج تک اپنی ماں کی کوئی بات نہ مانی تھی۔ اپنے باپ کی ہر بات کو وہ نظر انداز کرتی آئی تھی۔ اپنے بڑے بھائی کی لمبی چوڑی باتوں
سیدھے مشوروں سے اسے نفرت تھی۔ اپنی نجی زندگی میں کسی کی دخل اندازی کو اس نے کبھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا! وہ ہمیشہ
قائل رہی تھی۔ اس نے ہمیشہ اپنی بات کو ترجیح دی تھی۔ اس نے ہمیشہ من مانی کی تھی۔ اور ایسا کرتے ہوئے اس نے ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ
راستے پر چل رہی ہے۔ اور یہ کہ اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا! خود مختاری کی اس عادت نے اسے کہیں کا نہ رکھا تھا۔ اسی عادت کی بنا پر
یا ہر کسی سے جھگڑا مول لینا پڑا تھا۔ بے پناہ مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ان بے پناہ مخالفتوں کا سامنا اس نے ڈٹ کر کیا تھا۔ ان دنوں
ہوتے اسے عجیب لذت محسوس ہوتی تھی۔ ان دنوں ایسا کرتے ہوئے۔ اس نے یہی سوچا تھا کہ اپنی زندگی کا دامن مسرتوں سے بھرنے
یہ قربانی کرنا لازمی ہے۔ لیکن آج ——— آج وہ سوچ رہی تھی کہ اس نے ناحق اتنی تکالیف برداشت کیں۔ آج اگر رفیق انکار
کر دے۔ تو اس کے سارے منصوبے بے معنی ہوئے جاتے ہیں۔ خاک میں ملے جاتے ہیں۔!

اسکول کی ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد سے بے پناہ مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اور تب اس نے کالج کی زندگی میں قدم رکھا

تھا۔ کالج میں اس نے اپنی جوانی کے ابتدائی تین سال بتائے تھے۔ اس طویل مدت کا ایک ایک لمحہ اس نے سوچ سوچ کر استعمال کیا تھا
ان ایام میں اس کا ذہن کیسی عجیب عجیب باتیں سوچا کرتا تھا کیسی عجیب عجیب باتیں اس کے ذہن کو اپنی آماجگاہ بنائے رکھتی تھیں
ان دنوں اپنی سینکڑوں تمناؤں کا گلا گھونٹ کر اس نے ایک گونا سکون کا احساس کیا تھا۔ بارہا دل میں اٹھنے والے سینکڑوں طوفان۔
سامنے اس نے اپنے بلند ارادوں کی سنگین دیوار کھڑی کر دی تھی۔ لیکن لاکھ کوشش کے باوجود اتفاقاً راہ چلتے جب اس کی نظر بھرے
جسم والے کسی نوجوان پر جا پڑتیں۔ تو لاشعور کے اندھیروں میں چھپنے والی خوابیدہ امنگیں جیسے لمحہ بھر کے لئے بیدار ہو جاتیں۔ پلکیں بوجھل
ہو جاتیں، آنکھوں میں ایک خمار سا چھا جاتا۔ چال میں لڑکھڑاہٹ آ جاتی دل و دماغ پر ایک نشے کا سا عالم طاری ہو جاتا! ایسے موقعہ پر اسکی شعوری
کوشش یہی ہوا کرتی کہ بیدار ہونے والی یہ امنگیں پھر سو جائیں۔ گہری نیند سو جائیں! ——— امنگیں واقعی نیند کی آغوش میں جا
وہ چونک اٹھتی! بلند ارادوں کی سنگین دیوار جذبات کی راہ میں حائل ہو جاتی اور وہ پھر کام کی طرف متوجہ ہو جاتی۔ اپنے مقصد کے
کی جدوجہد میں لگ جاتی۔۔!

ایسے موقعہ پر ہمیشہ اس نے اپنی بے کیف زندگی کے متعلق سوچا تھا۔ اسی بے کیف زندگی کے متعلق جس میں کوئی زندگی
جو موت سے بدتر تھی! ——— پھر پانچ افراد پر مشتمل اپنے چھوٹے سے خاندان کا احساس اس کے ذہن میں کروٹیں بدلنے لگتا ———
اسے اپنے بوڑھے باپ کی یاد آتی۔ وہی بوڑھا مریل باپ۔ جو بات بات پر اپنے شریف پڑوسیوں سے جھگڑا کرنے کا عادی تھا ———؟
اپنی ماں یاد آ جاتی۔ وہی گھسی پٹی ماں جس کی ماتمی لے بارہا اسے موت کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا ——— اور پھر وہ
بھوت۔ اس کا بڑا بھائی! کھردرے جسم اور لانبے دبلے پتلے ہاتھ پیر والا۔ اس کا وہ بڑا بھائی تیلی تیلی سوکھی انگلیوں اور لمبے لمبے بھو
بالوں والے اپنے اس بڑے بھائی پر نظریں ڈالتے ہی اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ کبھی کا مر چکا ہو۔! ——— پھر اسے اپنا پرانا
مکان یاد آتا ——— بس۔ ایسی تو تھی اس کی زندگی۔ ماں کے گھر بچپن سے لے کر آخیر تک اس نے کچھ ایسی ہی پھیکی اور بے لطف زندگی
گزاری تھی۔ لیکن اس بوجھ کو اس نے ہنستے کھیلتے ڈھویا تھا۔ اس بوجھ کو اس نے خندہ پیشانی سے قبول کیا تھا۔ کیونکہ ان دنوں اپنی
اسے سامنے نظر آ رہی تھی۔ کیونکہ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مستقبل قریب میں اسے اپنے خوابوں کی تعبیر ملے گی!۔

ان دنوں کچھ عجیب خیالات اس کے ذہن میں پرورش پا رہے تھے ——— وہ کوئی نامعلوم خوبصورت نوجوان تھا جس
کی اس ننھی سی دنیا میں جنم لیا تھا۔ ویران تنہائیوں میں اکثر اس نامعلوم خوبصورت نوجوان کا احساس اس کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ اس
نوجوان سے بہت جلد وہ مانوس ہو گئی تھی۔ اس نوجوان کے لئے اس نے اپنے دل میں گہری انسیت کا جذبہ محسوس کیا تھا۔ اس کی
تھی کہ یہ نوجوان اس کا ساتھی ہو۔ زندگی بھر کا ساتھی! اور زندگی کی کٹھن پیچ پیچ راہوں پر وہ اپنے نوجوان ساتھی کے ساتھ شانہ بشا
اسکی مسرتوں کو چار دانگ بخشے اس کے غموں کو اپنانے کی کوشش کرے۔ لیکن۔۔ ———

رفیق سے شادی کے بعد اس نے سوچا تھا۔ کہ اسے اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی ہے۔ لیکن آج ——— ؟ آج اسے ایسا محسوس
تھا جیسے رفیق نے اسے دھوکا دیا ہو۔ اپنے غم میں اسے شریک کرنے سے انکار کر کے اس نے پہلی مرتبہ اسے کتنا بڑا دھوکا دیا تھا۔!
بے شمار خیالات ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر ذہن میں ایک عجیب انتشار پھیلا رہے تھے۔ ایک طوفان برپا کئے دے
——— ایک لمحے کے لئے اسے ایسا محسوس ہوا۔ گویا اس کا دماغ پھٹ جائے گا اور اس کی دھجیاں اڑ کر فضاء میں لہرانے لگیں

وہ تیزی سے اپنی جگہ پر اٹھ کھڑی ہوئی۔ الجھے ہوئے بالوں کو دھیرے دھیرے سنوارا۔ آنچل کو سینے پر درست کیا۔ اور پھر تیزی سے
دھرے چلی گئی۔

رفیق کی بوڑھی ماں۔ اقبال کو اپنی سوکھی گود میں لئے اس کے کان کے قریب اپنا پوپلا مونہہ لاکر سرگوشی کے سے انداز میں کچھ بتا رہی
ی۔ دونوں معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے ——— اس نے ایک عجیب حقارت بھری نظر ان پر ڈالی۔ اور پھر
اورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

وہ بڑی دیر تک وہاں کام کرتی رہی۔ جھلاہٹ میں اسے خیال بھی نہ رہا۔ کام کرتے ہوئے جانے کب اس کی انگلیوں میں زخم
لگیا تھا۔ اسے اس کا احساس اس وقت ہوا۔ جب کام ختم ہونے پر ہاتھ دھونے کے بعد وہ تولیے سے انہیں خشک کر رہی تھی۔ اور صحت
مند انگلیوں سے تازہ تازہ سرخ لہو ٹپک رہا تھا۔! ——— جب وہ دالان میں سے ہوتی ہوئی گزر رہی تھی۔ تو اس نے اندازہ لگایا ———
ق کی بوڑھی ماں نے ایک لمحہ بغور اس کی زخمی انگلیوں کی طرف دیکھا۔ اس کے جھریوں دار چہرے پر ایک کھنچاؤ سا پیدا ہوا اور پھر اس نے اقبال
زور سے اپنی چھاتی سے چمٹا لیا۔! ——— خورشید غصے میں اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبائی ہوئی قریب کے کمرے میں چلی گئی۔!

اور جب وہ اپنی متناسب صحت مند انگلیوں سے ٹپکنے والے گرم گرم خون کو اپنی ساری کے سفید آنچل میں جذب کر رہی تھی۔
چانک خون کی دو چار موٹی موٹی بوندیں سفید آنچل کے ایک حصے کو سرخی میں تبدیل کرتی زمین پر گر پڑیں۔ لال لال خون سفید کپڑے پر
ل گیا ——— اسے یہ سرخ کپڑا بہت بھلا معلوم ہوا۔ اور تب غیر شعوری طور پر اس کا دھیان اپنے اس جوڑے کی طرف چلا گیا۔ جو اس نے
شادی کے موقعہ پر پہنا تھا۔ نرم۔ ملائم اور سرخ ریشم کی میٹھی میٹھی یاد اس کے دل کو گدگدانے لگی اور وہ سرخ جوڑا اس کے ذہن میں چکر
ٹنے لگا۔! ——— جب وہ اٹھ کر برتن صاف کرنے جا رہی تھی تو اس کی نگاہیں بار بار اپنی ساری کے سفید آنچل کی جانب اٹھ جاتی
ں جس کے ایک گوشے میں بیضوی شکل کا وہ سرخ داغ موجود تھا۔! اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سرخ جوڑا اس کے ساتھ ساتھ
رہا ہو اور اسے کسی منچلے، دل پھینک نوجوان کی طرح اپنی جانب متوجہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہو ——— جب وہ باہر کے کمرے
شلف میں پڑی اور میز پر بکھری کتابوں کو سلیقے سے ترتیب دینے جا رہی تھی۔ تو وہ سرخ جوڑا اس کے آگے پیچھے چکر کاٹ رہا تھا
——— اور جب وہ کل ہی دھوبی کے پاس سے آئے ہوئے رفیق کے دو سوٹ انتہائی سلیقے سے تہہ کر کے صندوق میں بند کر رہی تھی
وہ سرخ جوڑا چپکے چپکے صندوق کے اندر سے نکل کر اس کے دماغ کے گوشوں میں جگہ بنا چکا تھا ——— اور جب وہ اپنا تمام
ختم کر کے اپنی ملائم ہتھیلیوں کو پہلے کے مقابلے میں سخت ہوتا محسوس کرتی، آئینے کے سامنے کھڑی بال سنوار رہی تھی تو اسے ایسا محسوس
ہا تھا جیسے دنیا کی ہر شے میں سرخی کی جھلک پیدا ہو چلی ہے ———!

اور واقعی وہ اتنے ضبط کی عادی نہ تھی۔ بال سنوارنے کے بعد وہ سیدھی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ اور جب۔ واپس آئی
س کے دائیں ہاتھ میں چابیوں کا ایک چھوٹا سا گچھا جھول رہا تھا۔!

پہلے تو وہ باہر کے کمرے میں گئی اور اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ دروازہ بند ہے یا نہیں؟ اور پھر دالان سے متصل ایک دوسرے کمرے
رف چلی گئی۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد دروازہ بند کرنے سے پہلے اس نے جھانک کر صحن کی طرف نظریں دوڑائیں ———
کی بوڑھی ماں ایک سہ پائی پر بیٹھی زبان کو دانتوں کے نشیب و فراز سے آگاہ کر رہی تھی۔ اقبال اسی چارپائی پر اس کے

قریب ہی لیٹا صحن کے ایک گوشے میں لگے چند خوبصورت پودوں کی طرف متوجہ تھا۔! ——— وہ زیرِ لب مسکرائی۔ اور پھر دروازے بند کر لیا ——— ہولے ہولے قدموں سے چلتی وہ صندوق کے قریب جا پہنچی۔ اپنے دل کی ہر لمحہ تیز ہوتی ہوئی دھڑکنیں اسے سنائی دے رہی تھیں۔ اس نے تالا کھولا ——— اور اپنی شادی کے موقعہ پہ پہنا ہوا وہ سرخ جوڑا باہر نکال لیا۔!

بڑی دیر تک بیٹھی وہ اس کے گہرے سرخ رنگ سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ سرخ اور ملائم ریشم کا نرم نرم لمس اس کے کو دھیرے دھیرے گدگداتا رہا۔ اس کے چہرے پر مدھم مدھم سی سرخی پھیلتی رہی بسنتی رہی! ——— اور جب اس نے اپنا میلا کچیلا کردہ سرخ جوڑا پہن لیا تو بیک وقت سینکڑوں نغمات اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ شہنائی کی میٹھی میٹھی آواز اس کے کانوں میں رس گھولنے لگی۔ ماں باپ کی شفقت آمیز مسکراہٹ اس کے دل میں محبت اور الفت کے جوان پھول کھلانے لگی۔ ہزاروں ہنگم آوازیں اسے شرمانے لگیں! اور سینکڑوں پُر رشک نگاہیں اسے فاخرانہ انداز میں اپنی گردن اونچی کرنے پر مجبور کرنے لگیں! پل بھر کے اندر اندر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔!

اور اس شور و غل کے درمیان، ان حسین لمحات کا تصور توڑ کر اُس کے دل کی دیواروں پر اُس شام کے سائے رینگنے لگے۔ وہ تھکی ماندی کالج سے لوٹی تھی اور ———

جنوری کی ایک خوشگوار شام تھی وہ۔ کوئی چھ بجے کا عمل تھا۔ اور اس وقت وہ تھکی ماندی کالج سے واپس لوٹ رہی ——— گھر میں قدم رکھتے ہی اپنی بوڑھی ماں کی سرگوشیوں کے ساتھ ساتھ چند اجنبی آوازیں اس کے کانوں سے آ ٹکرائیں۔ لیکن اس نے کچھ زیادہ دھیان نہیں دیا۔ اسے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ چنانچہ کتابوں کو اپنی ٹوٹی پھوٹی میز پر پٹک کر وہ کھانا کھانے چلی گئی ——— اور جب وہ کھانا کھا کر باہر نکل رہی تھی۔ تو اسکی ماں دنیا بھر کی شفقتیں چہرے پہ لئے دروازے کے سامنے کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ خورشید کے باہر نکلنے پر اس نے معنی خیز نگاہوں سے اسے دیکھا اور مسکرا دی۔ خورشید کو یہ مسکراہٹ کچھ عجیب سی معلوم ہوئی۔ لیکن جواباً اس نے بھی مسکرا کر اپنی ماں کی طرف دیکھا ———

"ادھر آؤ!" جھریوں دار چہرے پر ایک کھنچاؤ سا پیدا ہو گیا۔ اور وہ تیزی سے لپک کر اسکے قریب جا پہنچی۔

"خورشید!" اسکی ماں نے دھیمی لیکن صاف اور واضح آواز میں اسے مخاطب کیا۔

"کیا ہے؟" ماں کے اور قریب آتے ہوئے اس نے تیزی سے سوال کیا۔

"ابھی کتنے مہینے باقی ہیں امتحان کے لئے؟"

خورشید کو ایسے سوال کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار ہویدا ہو گئے ——— یہی کوئی ——— مہینے ———" کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

"ابھی ابھی کچھ لوگ مجھ سے ملنے آئے تھے۔"

"تو پھر ——— ؟" اس نے بات کاٹ دی۔

"میں نے تمہاری شادی کے لئے ایک جگہ بات طے کی ہے۔ کہو تو اگلے مہینے یہ کام پورا ہو جائے"

"لیکن ــــ" اس نے کہا اور خاموش ہو گئی۔ اس کے عارض دہک اٹھے۔ وہ دل ہی دل میں مسکرا دی۔ مگر زبان سے صرف ایک لفظ ادا ہوا۔ "لیکن ــــ" اس نے کہا اور خاموش ہو گئی۔

اس کی ماں نے کچھ دیر جواب کا انتظار کیا۔ اور پھر بول اٹھی ــــ "لیکن کیا ــــ؟"

"کچھ بھی تو نہیں! بس۔ میں نے یوں ہی کہہ دیا تھا"

"تو طے ہو گیا نا ــــ؟"

"کیسی باتیں کرتی ہو تم بھی!"

"کیوں! کیا ہوا؟ ایسی کونسی بری بات کہہ دی میں نے؟" اسکی ماں نے مصنوعی غصہ چہرے پر پیدا کرتے ہوئے کہا ــــ

ــــ "وہ تو میں نے یوں ہی پوچھ لیا تھا۔ ورنہ بات تو کبھی کی طے ہو چکی تھی"

"طے ہو چکی تھی؟" اس نے تعجب سے کہا "اور مجھے خبر تک نہ ہوئی!"

"کوئی خاص ضرورت نہیں تھی انہوں نے۔ وہ تو میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔ یاد رہ گیا تھا۔ وہ لوگ آج ہمارے آخری فیصلے کے لئے آئے تھے نا! ــــ اچھا۔ اب جاؤ۔ اپنا کام کرو ــــ کھانا تو کھا لیا ہے نا تم نے؟"

"ہاں" مختصراً اس نے جواب دیا۔ اور بے شمار الجھنیں ذہن میں سمیٹے۔ کتابیں لئے باہر کے کمرے میں چلی گئی۔

دوسرے دن سارے گھر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تھا!

اس روز وہ کالج بھی نہیں گئی تھی ــــ ایک چھوٹے سے کمرے میں داخل ہو کر اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ اور کوئی ناول انتہائی بے دلی سے پڑھ رہی تھی ــــ باہر دالان میں اس کا بڑا بھائی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ادھر سے ادھر ٹہلتا پھر رہا تھا۔ اور اس کی ماں وہیں ایک کونے میں بیٹھی نصیحتوں کے دفتر کھول چکی تھی ــــ اور اس کا بوڑھا باپ اپنے شریف پڑوسی سے کسی معمولی سی بات پر جھگڑا کر رہا تھا ــــ وہ چاہتی تھی کہ اس کی چھوٹی بہن آن گھر پر رہے۔ تاکہ اسکی میٹھی میٹھی باتوں میں کھو کر وہ کچھ دیر کے لئے اپنی ساری پریشانیاں اور ساری الجھنیں بھول جائے۔ کوئی اور وقت ہوتا۔ تو شاید اس کی بہن رک بھی جاتی۔ لیکن آج تو اسے خاص طور سے بردستی اسکول روانہ کر دیا گیا تھا ــــ اور یہ سب کچھ صرف اس لئے ہو رہا تھا کہ اس نے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ابھی اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتی تھی۔ اس کے مقاصد ابھی پورے نہیں ہوئے تھے۔ ابھی اسے اپنے بلند ارادوں کو پایۂ تکمیل تک پہونچتے دیکھنا تھا۔ اس کی منزل تو ابھی بہت دور تھی۔!

گھر کی یہ حالت دو روز تک برقرار رہی۔ بڑے بھائی کے بوجھل قدم مسلسل دو روز تک اس کے ذہن کو کچوکے دیتے رہے۔ ماں کی نصیحتیں اسکے لئے مستقل عذاب کی صورت اختیار کر گئی تھیں۔ بوڑھے باپ اور شریف پڑوسیوں کے درمیان ہونے والے جھگڑوں نے اس کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ چھوٹی بہن کی غیر موجودگی نے تو گویا اس کی زندگی میں ایک خلا سا پیدا کر دیا تھا! ــــ اس نے بغور اپنے انکار کا ردعمل دیکھا۔ اور وہ بیزار ہو گئی۔ دل ہی دل میں کڑھتی چلی گئی۔!

تیسرے دن شام کو وہ کھانے کے لئے کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔ تو اس نے دیکھا ــــ اسکی ماں دروازے کے قریب جانے کب سے کھڑی تھی! ــــ وہ ٹھٹھک کے رہ گئی۔ اسے کچھ ندامت کا احساس ہوا۔ اس لمحہ ماں نے بڑی دیر تک اسے دیکھا۔

سوچتی رہی۔ سوچتی ہی رہی ـــــ اور تب دوسرے دن ماں کو اپنے کمرے میں لے جاکر اس نے کہہ ہی دیا ـــــ

اس نے کہا ـــــ

"ماں۔ میں تیار ہوں۔ لیکن ابھی نہیں ـــــ امتحان کے بعد!"

اس کی ماں کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" اس نے سوال کیا۔

"بس! اب کچھ نہ کہو ـــــ اگلے مہینے یہ کام ہو جائے گا!"

"لیکن ـــــ میرا خیال تو کچھ اور ہی تھا ـــــ" وہ کہہ رہی تھی کہ اس کی ماں نے پلٹ کر کچھ عجیب نگاہوں سے اسکی طرف دیکھا۔ ان نگاہوں کا مفہوم اس کی سمجھ میں نہ آیا، مگر جانے کیا سوچ کر وہ خاموش ہو گئی!

پھر دروازے کے باہر ماں کے قدموں کی چاپ ۔۔۔ سنائی دی۔ آواز جلد ہی خاموشی میں ڈوب گئی۔ اسکی ماں جا چکی تھی ـــــ

شکست خوردہ احساسات سے بوجھل ذہن لئے وہ ایک تھکے ہوئے جواری کی طرح پلنگ پر گر پڑی اور لحاف کو شدت سے اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا!

اگلے مہینے اسکی شادی ہو گئی۔

رفیق پہلا مرد تھا جسے اس نے قریب سے دیکھا تھا۔ اور گٹھیلے بدن والے اس لاابالی نوجوان کو دیکھ کر وہ یوں مطمئن ہو گئی گویا اسے اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی ہو ـــــ اس نے محسوس کیا جیسے ویران تنہائیوں میں اس کے ذہن میں جس ساتھی کا تصور رینگا کرتا تھا۔ وہ رفیق ہی تھا! ـــــ اس احساس نے اس کے ذہن پر گہرا اثر ڈالا۔ اور اسکی زندگی کا دامن مسرتوں سے بھر گیا۔

اب اسے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ رفیق اس کا اپنا تھا۔ جو اسکے قدموں میں محبت اور عقیدت کے پھول نچھاور کرنے کو تیار رہا کرتا تھا۔ اقبال تھا جس کی معصوم حرکتیں اسے ماں کا درجہ بخشتی تھیں۔ پھر رفیق کی بوڑھی ماں تھی۔ ایک چھوٹا سا مکان اور چھوٹا سا خاندان۔

شادی کے بعد یوں تو تقریباً ایک سال تک اس نے کوئی تکلیف محسوس نہیں کی اسے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا لیکن جس دن اس نے اس گھر میں قدم رکھا تھا۔ اسی دن اس نے اچھی طرح جان لیا تھا کہ رفیق کی گہری محبت کو برقرار رکھنے اور مسرتوں کو دائمی بنانے کے لئے اسے سخت جد و جہد کرنی پڑے گی! ـــــ خورشید کو اچھی طرح یاد تھا ـــــ پہلی بار جب اس نے گھر میں قدم رکھا تھا۔ تو اس نے کیسے دھیان سے گھر کی ایک ایک شے پر نظر ڈالی تھی۔ ایک ایک چیز سے کیسا افلاس ٹپک رہا تھا ـــــ اسے اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہ لگی تھی کہ اپنی ننھی ننھی خوشیوں کو برقرار رکھنے کے لئے اسے رفیق کے شانہ بہ شانہ چلنا ہوگا کام میں ہاتھ بٹانا ہوگا۔ اسکے غموں کو اپنانا ہوگا! اور تب بے اختیار اس کا دل خوشی سے ناچ اٹھا تھا۔ اس نے سوچا کہ بے شمار کو برداشت کرکے اور بے پناہ مخالفتوں کا سامنا کرکے تعلیم حاصل کرنے کے لئے اس نے جو جد و جہد کی تھی۔ وہ رائیگاں نہ جائے گی پھر جانے کیا بات ہوئی۔ اور اس نے اس ارادے کو ترک کر دیا۔ اس خیال کو ایک لفظِ غلط کی مانند ذہن سے خارج کر دیا

بات کو وہ تقریباً بھول چکی تھی۔ لیکن ــــــ

اِدھر چند مہینوں سے اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے ایک عجیب بدمزگی سارے گھر میں پھیل رہی ہے۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے گھر کے سارے افراد ایک دوسرے سے بیزار سے ہوں ــــ وہ دیکھ رہی تھی۔ اب رفیق کا چہرہ سدا بہار نہیں رہتا تھا اداسیاں اور ویرانیاں اکثر اسکے چہرے کو اپنی آماجگاہ بنائے رکھتی تھیں۔ آنے والی کسی نامعلوم مصیبت کا احساس خوف بن کر اسکی پرکشش آنکھوں میں سے جھانکا کرتا تھا۔ وہ اب بھی برابر اپنے مخصوص پیار بھرے انداز میں اس سے گفتگو کرتا تھا لیکن ایسی گفتگو کے دوران میں خورشید نے ہمیشہ عجیب بے لطفی محسوس کی تھی۔ اسے یہ سب پھیکا پھیکا سا لگتا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ بیٹھے بیٹھی باتوں کا ڈھونگ رچا رہے ہوں! ــــ اور پھر رفیق کی وہ بوڑھی ماں؛ اس کے چہرے کی جھریوں میں اضافہ ہوگیا تھا پیشانی کی شکنیں تھیں کہ ٹوٹنے کا نام نہ لیتی تھیں ــــ صرف اتنا ہی نہیں۔ خود اقبال کا بھی یہی حال تھا۔ اس کا معصوم چہرہ اکثر ایسی ایسی کیفیتوں کا اظہار کرتا۔ کہ بے اختیار خورشید کا دل گھبرانے لگتا ــــ اسے ایسا لگتا تھا جیسے ان چھوٹی چھوٹی معاشی پریشانیوں نے زندگی کے ہر موڑ پر انہیں شکست دینے کی ٹھان لی ہو! ــــ وہ محسوس کر رہی تھی۔ رفیق کے کپڑے اب پہلے کے مقابلے میں بوسیدہ ہو چلے تھے وہ اب بہت لاپرواہ ہوگیا تھا۔ اس نے اپنی طرف دھیان دینا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اب بدمزاج ہوتا جا رہا تھا۔ کئی مہینوں سے سوائے خورشید کے اس نے گھر میں کسی سے سیدھے منہ بات تک نہ کی تھی ــــ اقبال کے اسکول کی تھوڑی سی فیس ادا کرتے ہوئے خود اس کی پیشانی پر بل پڑ جایا کرتے تھے ــــ سارا ماحول بدلا بدلا سا تھا۔ گھٹا گھٹا سا تھا ــــ!

سرخ لباس میں ملبوس خورشید سر جھکائے بیٹھی رہی۔ سر جھکائے اور نگاہیں فرش پر جمائے وہ بڑی دیر تک وہاں بیٹھی رہی۔ اسے وہ بات یاد آ رہی تھی۔ ایک طویل مدت سے لاشعور کی وسعتوں میں چکر کاٹنے والی وہ بات اسے یاد آ رہی تھی۔ یہ وہی بات تھی جس کا تذکرہ، آج صبح ڈرتے ڈرتے، اس نے رفیق سے کیا تھا۔ اور جسے سن کر رفیق کے ہونٹوں پر ایک پھیکی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی ــــ!

صبح، دفتر جانے سے پہلے، کھانا کھانے کے لئے رفیق نے جب کمرے میں قدم رکھا تو اس نے اچانک گفتگو کا آغاز کر دیا۔

"آج کل بارش خوب زوروں پر ہے" اس نے کہا۔

"ہاں۔ ہے تو" رفیق نے جواب دیا۔

"تم جلدی آفس چلے جاؤ"

"کیوں؟"

"ابھی تھوڑی دیر میں بارش شروع ہو جائے گی۔ تو کپڑے خراب ہو جائیں گے ــــ ہے نا؟"

"ٹھیک ہے!"

"دیکھو نا! ان کپڑوں کی کیا حالت ہو رہی ہے۔ پہلے تو یہ بوسیدہ ہو چلے ہیں۔ اور اس پر یہ بارش! ــــ اگر تم نے ذرا بھی پرواہ نہ کی۔ تو کل یہ کسی کام کے نہ رہیں گے"

"آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟" بات کاٹ کر رفیق نے کہا۔ وہ کچھ اکتایا اکتایا سا نظر آ رہا تھا ــــ

"تم مزید دو تین جوڑے کیوں نہیں بنوا لیتے! دو سوٹ تو گھر میں پڑے ہیں۔ لیکن وہ بھی جلد ہی جواب دے جائیں گے"۔

"یہ تم کہہ رہی ہو؟" رفیق نے نگاہیں اٹھا کر خورشید کی طرف دیکھا اور خورشید نے گھبرا کے سر جھکا لیا۔

خورشید نے سر جھکا لیا۔ وہ اب مزید کچھ کہنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن فوراً ہی اسے یاد آیا —— بے پناہ مخالفتوں کے باوجود اس نے کالج کی زندگی میں قدم رکھا تھا۔ تاکہ زندگی کی کٹھن اور پیچ دار راہوں پر اپنے شوہر کے شانہ بشانہ چل سکے۔ اسکی مسرتوں کو جاودانی بخشے۔ اس کے غموں کو اپنانے کی کوشش کرے! —— اسے یاد آیا۔ دو تین ہفتہ قبل یوں ہی باتوں باتوں میں رفیق نے اس سے تذکرہ کیا تھا۔ اس کی فرم میں کام کرنے والی دق کی مریضہ ٹائپسٹ لڑکی کا۔ جو اس روز چل بسی تھی، وہ جگہ ابھی تک خالی تھی، اس جگہ کے لئے آفس میں عرضیوں کے انبار لگ رہے تھے۔ یہ بات خود رفیق نے اسے بتائی تھی —— اس کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں۔!

"جہاں تک میرا خیال ہے۔ میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کہی" دفعتاً خورشید بول اٹھی —— "آج آفس جاؤ۔ تو ایک بات ہرگز نہ بھولنا۔ امیدواروں کی فہرست میں میرا نام بھی شامل کر لینا"۔

رفیق چونک پڑا۔ اس نے سر اٹھا کر خورشید کی طرف دیکھا۔ اسکی نگاہوں سے بے پناہ درد جھلک رہا تھا۔ اسکی نگاہوں میں دنیا بھر کے غم پوشیدہ تھے۔ پھر اس کے ہونٹوں پہ ایک پھیکی، بے جان سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اور —— بس! اس کے بعد وہ آفس چلا گیا۔

اور شام کو جب وہ دفتر سے واپس آیا تھا۔ تو اس کے چہرے پر بلا کی رونق تھی۔ دل میں محبت اور الفت کے جوان پھول کھل رہے تھے۔ لبوں سے خواہ مخواہ ایک عجیب ترانہ سا پھوٹ رہا تھا۔ پیر تھے کہ زمین پر پڑنے کا نام نہ لیتے تھے۔ لیکن جب دوبارہ نہ چاہتے ہوئے بھی غیر ارادی طور پر وہ گھر سے باہر نکل رہا تھا۔ تو چہرے کی رونق سرے سے غائب تھی۔ محبت اور الفت میں سرشار کر دینے والے گیت کے میٹھے میٹھے بول کو جیسے گھر کے ویران ماحول نے ڈس لیا تھا۔ دل کے جوان پھول یکلخت مرجھا گئے تھے۔

وہ دفتر سے واپس آیا۔ مہینے بھر کی تنخواہ خورشید کے ہاتھوں میں تھما دی۔ کچھ دیر خورشید سے باتیں کیں۔ جس میں اس کے لہجے خاص طور سے نمایاں تھے۔ پھر دو لمحہ اپنی ماں سے سرگوشی کے انداز میں کچھ کہا سنا اور دوسری بار جب وہ خورشید کے قریب سے گذرا۔ تو اسکے چہرے پر نفرت و حقارت کے آثار موجود تھے۔ وہ پریشان نظر آ رہا تھا۔! —— اس نے ایک لمحہ خورشید کو عجیب نگاہوں سے دیکھا۔ اور پھر سر جھکائے ہوئے اسکے سامنے سے گذر گیا۔ ایک لفظ بھی تو نہ کہا۔!

ابھی وہ رفیق کے اس غیر ارادی طرزِ عمل کے متعلق سوچ ہی رہی تھی، کہ اچانک دروازے پہ ہلکی سی دستک کی آواز سنائی دی پھر صحن سے کسی کے بھاگنے کی آواز آئی۔ یہ یقیناً اقبال تھا۔ پھر ایک اونچی آواز پیدا کرتا ہوا دروازہ کھل گیا۔ اور کوئی بھاری بھاری قدم رکھتا باہر کے کمرے میں داخل ہوا۔

اس نے تیزی سے سرخ جوڑا اتار کر پھینک دیا۔ اور وہی پرانے کپڑے پھر ایک بار پہن لئے۔ اس نے تیزی سے کھڑکی کھول دی۔ اور باہر کی طرف نظر ڈالی —— ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ شام کا ہلکا ہلکا ملگجا اندھیرا رات کی گہری سیاہی میں روپوش

بجتا جارہا تھا۔ شاید سات بج رہے تھے ـــــ اس نے تیزی سے دروازہ کھولا اور دوڑتی ہوئی باہر کے کمرے میں چلی گئی۔
اس کا اندازہ درست نکلا۔ باہر کے کمرے میں رفیق اپنے بھاری اور بوجھل قدموں سے ٹہل رہا تھا۔ بائیں ہاتھ میں انگلیوں کے درمیان سگریٹ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا دبا ہوا تھا۔ خورشید کو دیکھتے ہی ایک پھیکی مسکراہٹ اسکے لبوں پر رقص کرتی گذر گئی۔
"کیا ہوا تھا شام کو؟" چھوٹتے ہی خورشید نے سوال کیا۔
"کچھ بھی تو نہیں تھا" اس کے لہجے سے بناوٹ صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ لیکن خورشید نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا ـــــ
"میری جانب سے عرضی لکھ کر دے دی ہے یا نہیں؟"
رفیق نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے لیکن دوسرے ہی لمحے وہ خاموش ہو گیا۔ خورشید کو یہ خاموشی بہت ناگوار گذری۔ اس نے پھر وہی سوال دہرایا ـــــ
"میری جانب سے عرضی لکھ کر دے دی ہے یا نہیں؟"
"نہیں!"
"نہیں؟" اس نے چونک کر رفیق کی طرف دیکھا ـــــ یہ دوسری غیر متوقع بات تھی۔ جو اس نے شدت سے محسوس کی۔ لیکن کہا کچھ نہیں ـــــ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔
رفیق کمرے کے ایک کونے میں پڑی میز کا سہارا لیکر کھڑا ہو گیا۔ اس نے سر جھکا لیا اور دبی دبی سی آواز میں بولا ـــــ "ماں سے پوچھنا ضروری تھا ـــــ" پھر نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا ـــــ "ماں سے پوچھنا ضروری تھا ـــــ تھا یا نہیں؟"
اس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ وہ رفیق سے اور کچھ سننے کی خواہشمند تھی۔ لیکن یہاں پہنچ کر رفیق رک گیا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ اور پھر دھیرے دھیرے گنگنانے لگا۔ اسے بے اختیار رفیق پر غصہ آ گیا۔ اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا۔ کہ دفعتاً رفیق بول پڑا ـــــ سب بکواس ہے! ـــــ کوئی اچھی سی بات کرو ـــــ
"ماں سے پوچھا تھا یا نہیں؟" خورشید نے ایک بار پھر اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔
رفیق بڑھ کر اس کے قریب چلا آیا۔ اور پھر اس کے شانوں پر اپنے بھدے، موٹے اور سیاہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے کہا ـــــ
"شام کو آفس سے آنے کے بعد میں ماں سے اسی بارے میں گفتگو کر رہا تھا ـــــ"
"پھر؟"
اب کے رفیق نے اپنے ہاتھ اس کے شانوں سے ہٹا لئے۔ اور پھر اس کے بائیں ہاتھ کو اپنی بھدی اور موٹی انگلیوں کی گرفت میں لیتے ہوئے کہا ـــــ "چلو! ابھی پھر بات ہوئی جاتی ہے۔" اور وہ دونوں زینہ طے کرتے ہوئے تیزی سے اندر کی جانب چلے گئے۔
"کھانا کھا لیا آپ نے؟" رفیق نے اپنی ماں سے پوچھا۔
"نہیں بیٹا ـــــ ڈاکٹر نے رات کو صرف پھل کھانے کو کہا تھا۔"
"تو پھر ـــــ پھل وغیرہ لئے یا نہیں؟"
"نہیں!" مختصر جواب ملا۔

"کیوں —؟"

اس کی ماں نے نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہی ہو — "پھل نہیں آئے! — کیوں؟ — کیا اس با
کا جواب دینا ضروری ہے؟ — کیا سچ مچ تم نہیں جانتے پھل کیوں نہیں آئے؟؟"

"ایک بات کہوں؟" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد دوبارہ رفیق نے کہا — "اگر — اگر خورشید بھی نو
کر لے تو؟ —"

"پھر وہی بات —!" اس کی ماں سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"اگر جگہ معقول ہوئی تو — آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟ مجھے تو کوئی خرابی نظر نہیں آتی!"

"تم نہیں جانتے۔ تمہیں کچھ نہیں معلوم —" اس کی ماں نے تیز لہجہ میں کہنا شروع کیا — "تمہیں کچھ نہیں معلوم۔ تمہیں تو کچھ نہ
میری بنی بنائی عزت خاک میں مل جائے گی — بہو کو گھر سے نکالنا چاہتے ہو! — بے وقوف ہوئے ہو! —" پھر ا
نے خورشید کو آواز دی۔ خورشید رفیق کے پیچھے ہی کھڑی تھی۔ اب سامنے آ گئی۔ ماں نے ہاتھ پکڑ کر اسے قریب بٹھا لیا۔ اور پھر ا
بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہنے لگی — "بے وقوف ہوئے ہو! — کان کھول کر سن لو۔ میرے جیتے جی یہ کبھی نہ ہوگا"

رفیق نے ایک لمحہ خورشید کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

اور وہ خواہ مخواہ انجان بنی، اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

مبارک عظیم آبادی

جس آشیاں سے لاگ تھی وہ آشیاں کہاں
گرتی ہے برق آتی ہیں اب آندھیاں کہاں

بکھری ہوئی ہے یوں مری وحشت کی داستاں
دامن کہاں کہاں ہے گریباں کہاں کہاں

کہتا ہوں روز ان سے نئی وارداتِ دل
کہتے ہیں روز وہ، یہ نئی داستاں کہاں

آزاد بندِ شوق ہے عشاق کی نماز
سودائیوں میں وقت کی پابندیاں کہاں

شاید قریب منزلِ مقصود آ گئی
کیا بیخودی ہے ہوش میں اب کارواں کہاں

جب دیکھو تازہ روپ میں صبر آزما ہے حسن
ہوتا ہے ختم مرحلۂ امتحاں کہاں

ایسے میں کیا چلے ہو مبارک چمن کو تم
بلبل کہاں، بہار کہاں، باغباں کہاں

احمد سعید ایم اے

پہنچی نگہِ عالم رنگینیٔ داماں تک
وہ گل ہوں کہ گریاں ہے خود حسن پہ گلستاں تک

اس شاہدِ رعنا کا نظارہ ہو لیکن
سو درد ہوئے پیدا اک درد کے درماں تک

پائے گی نہ گلشن میں جب اپنے ہی وحشی کو
شاید کہ بہار آئے کھنچ کر درِ زنداں تک

میری مژۂ غم پر آنسو نہیں موتی ہیں
یہ کاش پہنچ سکتے اس شوخ کی داماں تک

وہ دورِ اسیری بھی تھا کتنا نشاط افزا
پروازِ تخیل تھی زنداں سے گلستاں تک

ان کو مری الفت کا آیا نہ یقیں کچھ بھی
میں جن پہ لٹا بیٹھا جان و دل و ایماں تک

شہرت ہے سعید اپنے افسانۂ الفت کی
صحراؤں کے دامن سے پھولوں کے گریباں تک

محشر بدایونی

جذبۂ دل کو نا معتبر کہہ گئی
کچھ نہ کہہ کر بھی کچھ وہ نظر کہہ گئی

ایک خاموش بیگانہ رَو کی ادا
کتنی باتیں سرِ رہگذر کہہ گئی

اک فسانہ ترے رنگِ رخ نے کہا
اک کہانی مری چشمِ تر کہہ گئی

کل بھی اُس کی زباں کے سخن تلخ تھے
آج کل سے بھی کچھ تلخ تر کہہ گئی

مرگِ غیرت کا حال اہلِ پرواز سے
رخصتِ جنبشِ بال و پر کہہ گئی

دورِ منزل سے گذرے ہیں جو حادثے
سب وہ منزل سے گردِ سفر کہہ گئی

چپ ہوں محشر کہ آخر زباں بےزباں
کوئی دل کی دبی بات اگر کہہ گئی

رسالوں میں

فاران کراچی ——— تازہ شمارے میں پہلا مضمون ہے "صدیق فاروق مستشرقین کی نظر میں" اور ان میں نام ہے سر ولیم میور، نولدیکی، ایڈورڈ ایٹیا کا، ان کی تحریروں کے اقتباس ترجمے کی صورت میں پیش کئے گئے ہیں۔ مولانا ما نے مضمون سے پیشتر ایک نوٹ درج کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابو بکر و عمر پر کسی کا اعتراض ان کی نظر سے گذرا ہے اسی کے میں انہوں نے یہ مضمون مرتب کر کے پیش کیا ہے۔ کہ اپنے تو اپنے اغیار بھی جنکی عادت ثانیہ ڈھونڈ ڈھونڈ کے خامیاں ڈھونڈنا ہے۔ وہ تک یہ لکھتے ہیں۔ صورت حال اگر یہ نہ ہوتی تو ہم عرض کرتے کہ قرآن کی، رسول کی اور جاں نثاران رسول کی عظمت و صدا مستشرقین یورپ کی تصدیق و توثیق سے بہت بلند ہے ——— اسی شمارے میں روح انتخاب کے صفحے پر "قرآن کریم کی عظ و صداقت کا اعتراف غیر مسلم مشاہیر کی زبان سے" پیش کیا گیا ہے۔ مگر اس قسم کے مضامین بالعموم قرآن کی عظمت سے پہلے عطا کرنے والوں کی عظمت دلوں میں بٹھاتے ہیں، اور یہ اس کا برا پہلو ہے۔ قرآن علی الاعلان صرف اسی شخص کو عظیم قرار دیتا ہے نے کائنات پر اس کے بتلائے ہوئے فطری زاویہ نظر سے غور و فکر کیا ہو اور پھر خدائے واحد کے سامنے جھک گیا ہو ——— و چاہے کوئی یونان کا فلسفی ہو روما کا اسقف اعظم ہو، جزیرۃ العرب کا سب سے بڑا سردار عمرو بن ہشام ہو، یورپ کا رہنما ہو یا امر یکہ سے تعلق رکھتا ہو یا ہندوستان و پاکستان سے، چین کا رہنے والا ہو یا روس کا ——— زندگی اور کائنات کے بارے اس کا زاویہ نظر دوسرا ہے۔ تو وہ عام اصطلاح میں جاہل نہ سہی مگر ابوجہل تو ضرور ہے "جاہلیت" کی قرآنی اصطلاح ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہئے۔ پھر کسی ایسے کی طرف سے قرآن کی تحسین و تصدیق کیا وہ کوئی شرف ہے۔ جو داد کا منتظر ہو؟ ——— اور داد دینے و اس کا تعلق صرف اسی قدر ہو جتنا کسی شاعر میں کسی شعر سے ہوا کرتا ہے؟ ایسا نہیں ہے۔ یہ اصول فکر و نظر اور قوانین زندگی ہے، اصول و قوانین داد نہیں چاہتے! ——— سر ولیم میور، نولدیکی اور ایڈورڈ ایٹیا اور ان کی فہرست کے اہل قلم سب اس ہیں کہ ان کے زاویہ نظر کی صحت پر کمی جائے۔) دوسرا مضمون فقہ اسلامی کے تاریخی ادوار، محمد اکرام کا لکھا ہوا ہے۔ یہ عنوان تفسیر آپ ہے لیکن جس انداز کی بحث ہونی چاہئے تھی، وہ نہیں ہے، یہ ایک سرسری تذکرہ ہے چند تاریخی واقعات کا اور اخ مشورہ دیا گیا ہے کہ علماء کرام تدوین فقہ کی خدمت انجام دیں، (مضمون کے دوسرے ہی پیراگراف کی یہ عبارت قابل اعتراض "اسی زمانے میں جمع القرآن کا کارنامہ سرانجام پایا" تدوین فقہ پر قلم اٹھانے سے پہلے ضروری تھا کہ اکرام صاحب مسئلہ جمع القرآ طرح غور و فکر کر لیتے۔ وہ شاید سمجھتے ہیں کہ قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جمع نہیں ہوا پھر دور دوم کی شبلی سرخ

ٔ شہادت عثمان اور خلافت علی کے بارے میں ان کی چند سطریں بھی گمراہ کن ہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس یہ بات کہ علی سے بار بار خون
ن کے قصاص کا مطالبہ کیا جاتا رہا لیکن آپ ہر مرتبہ بعض وجوہ کی بنا پر خاموش ہو جاتے، نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت علی اور امیر معاویہ
اس مطالبہ کرنے والوں میں پیش پیش تھے) کے درمیان جنگ صفین برپا ہوئی۔ تاریخ کی توڑی مروڑی ہوئی صورت ہے
اس قسم کا بیان جیسا آج کل سیاسی پارٹی کے افراد دیا کرتے ہیں، ــــــ اسی طرح یہ عبارت کہ جمہور مسلمان حضرت علی اور
معاویہ کی کش مکش کو اجتہادی غلطی تصور کرتے تھے۔۔۔۔ غلطیوں اور مغالطوں کا مجموعہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار
ن صاف نہیں ہے، نہ واقعات کا تفصیلی جائزہ انہوں نے لیا ہے نہ ان کا تجزیہ کر سکے ہیں، نہ ان تفصیل طلب نازک واقعات
ذکر کے مختصر لفظوں میں صحت کے ساتھ ادا کرنے کی قدرت حاصل کی ہے) تیسرا مضمون "جانشین شبلی" میں سید سلیمان ندوی کی شخصیت پر بحث
یہ طویل مضمون کسی ایسے شخص کے جواب میں ہے جس نے لکھا تھا کہ اقبال سہیل مرحوم شبلی کے صحیح جانشین ہو سکتے تھے، آج نہ
ہیں، نہ سید سلیمان، نہ اقبال سہیل، نہ جانے کس ستم ظریف نے یہ مسئلہ کیوں چھیڑا تھا۔ اس قسم کی بحث سے کسی کو فائدہ نہیں
سکتا، ویسے یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اگر سید سلیمان نہ ہوتے تو نہ شبلی کی سیرۃ النبی تکمیل میں آتی، نہ دار المصنفین، نہ وہ تمام
مے جو دار المصنفین سے وابستہ ہیں، سید سلیمان نے تو جانشینی سے بھی بڑھ چڑھ کر خدمات انجام دی ہیں۔ اس شمارے میں جمال
ہاشمی کا مضمون پاکستانی تہذیب بھی شامل ہے یہ نہایت مفید معلومات افزا اور اہم ہے۔ پاکستانی تہذیب پر قلم اٹھانے
ضرورت تھی، جمال اختر نے اس عنوان پر غور و فکر کرنے والوں کو ایک نا دیئہ نظر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عربی تمدن کا اثر ہماری اجتماعی
ی کے ایک ایک شعبے پر موجود ہے۔ جائزہ لیجیے۔

افکار کراچی ــــــ پچھلے ماہ افکار نے ڈھائی سو صفحات کا ایک عمدہ افسانہ نمبر شائع کیا تھا جس میں سنجیدہ
و مزاحیہ افسانوں کے علاوہ ڈاکٹر عبادت بریلوی اور سید وقار عظیم کے مضامین بھی شامل کر دیئے گئے ہیں، عبادت
ی نے جدید اردو افسانے پر قلم اٹھایا ہے، اور آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد افسانہ نویسی کی رفتار کا جائزہ لیکر بتایا ہے
ب کسی ملک کے افق پر ہنگاموں کی تاریکیاں چھا گئی ہیں تو افسانے نے ترقی کی ہے، فرانس میں، روس میں، چین میں، ہندوستان
ہر جگہ کی تاریخ یہی بتاتی ہے، مختصر افسانہ ہمیشہ انتشار ہی پنپا ہے کیونکہ افسانے کی صنف ذہانت کے ایک نقطۂ عروج کی
دار ہے۔ جب کسی قوم میں انتشار کے بعد ذہنی اور عملی تحریک کا آغاز ہوتا ہے تو یہ ذہانت شباب پر پہنچتی ہے۔ لیکن آزادی کے بعد
مل کا تار و پود بکھر گیا جس میں افسانہ نگاروں کی ایک بڑی حسین قطار نظر آتی تھی، آزادی کے بعد یوں محسوس ہوا جیسے کچھ پانے کی
ں ہم نے سب کچھ کھو دیا ہو، لوگ زندگی سے بیزار ہو گئے۔ قدروں اور معیاروں کو خاک میں ملتے ہوئے دیکھا ہوس زندگی کا معیار
یا اور خیر کا تصور ہی زندگی میں باقی نہ رہا۔ ایسی صورت میں لوگ ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھ جاتے ہیں، افسانے تو آج بھی لکھے جا رہے
لیکن اس میں بے حسی کا ماحول ہے۔ اور ایک بھلا پن اور لفظی بازیگری۔ سید وقار عظیم نے اپنے مقالہ "فسانۂ عجائب کا لکھنوی
" میں فسانۂ عجائب اور لکھنوی مزاج دونوں کا جائزہ لیا ہے، اور جا بجا مثالوں سے اپنے بیانات کو مضبوط کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں
جس چیز کو لکھنوی تہذیب اور اس کے مزاج کا تکلف و تصنع کہتے ہیں وہ حقیقت میں ذوق کی نفاست اور حسن معاشرت کی نفاست
کی کا عکس ہے جو عمل اور رد عمل کو ہمیشہ نزاکت کی حد تک توازن اور اعتدال کی حدود میں رکھتا ہے جذبات اور خصوصیت

سے دوسروں پر اثر انداز ہونے والے جذبات کے اظہار میں احتیاط اور ضبط سے کام لینا۔ ہر حال میں دوسروں کی خوشنود[ی]
کو اپنے ضابطۂ اخلاق کی بنیاد بنانا اس لطافت ذوق اور حسن معاشرت کے چند نمایاں پہلو ہیں، رعایت لفظی اور محاورہ
وذم میں تکلف، انسانی گفتار و رفتار کی شاعرانہ توجیہ، انداز بیان میں سے ہر چیز سے ایک لطیف اور خوش آہنگ تاثر پیدا کر[نا]
سب اسی کی کڑیاں ہیں اور فسانۂ عجائب سے زیادہ لکھنوی ماحول کی عکاسی کرنے والی کوئی کتاب نہیں۔ مشہور فنکار
کا مضمون عظمت فن بھی اس نمبر میں شامل ہے۔

تازہ شمارے میں عبادت بریلوی نے لکھنؤ کا شاہی اسٹیج کے عنوان سے مسعود حسین ادیب رضوی کی کتاب پر
اور بتایا ہے کہ ایک عرصے سے ایسی دلچسپ تحقیقی کتاب شائع نہیں ہوئی تھی۔ حامد امجد کے قلم سے "روتا ہی رہا ہوں"
خاکہ اس شمارے میں شامل ہے۔ "روتا ہی رہا ہوں" انہوں نے ایک مختصر سی نظم از افسردہ آلام نگری لکھی ہے
"تنقیدی جائزہ بڑے فنکارانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ تنقید میں آج کل مواد، ہیئت، عظمت فن، اور مغربی فنکاروں
تقابل نیز مغربی نقادوں کے اقوال زریں سے اپنے دعووں کو مضبوط کرنے کا بڑا زور ہے۔ اور اس قسم کی تنقیدی بحثوں
آسمان کے شاندار قلابے ملائے جاتے ہیں، حامد امجد نے بھی یہی کیا ہے۔ اور اس خوبی اور سنجیدگی اور گہرائی کے ساتھ کہ
توجہ کے بغیر نہ رہیں۔ اس کو پڑھ کر آپ پر عہد حاضر کی تنقید نگاری کے بے شمار جوہر بے نقاب ہوں گے۔ اور غالباً تنقید
ڈھنگ ہی معلوم نہیں ہوگا بہت سے گر بھی آپ سیکھ سکیں گے۔ حامد امجد کے بعض جملے تو واقعی بہت اہم ہیں۔ مثلاً "ہیئ[ت]
یہ عبارت کہ ہربرٹ ریڈ کہتا ہے، ہیئت دراصل فنکار کی شخصیت کی عکاس ہوتی ہے۔ مڈلٹن مرے اس سلسلے میں سب سے
افسردہ کا فنی شعور اتنا بلند اور پختہ ہے کہ اس کی شخصیت غیر محسوس حد تک پراسرار ہو گئی ہے۔ اس کے بے آہنگ چھوٹے
شاعر کی قلبی پریشانی کے عکاس ہیں، ان بے ربط سطروں میں ایک عظیم روح کا اضطراب پوشیدہ ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مادہ
کے تحت یہ جملہ بھی قابل داد ہے کہ "مواد اور ہیئت آپس میں اس طرح مدغم ہیں کہ ایک کو دوسرے جدا نہیں کیا جا سکتا"۔
کی عظیم شاعری کی تعریف ایسے ہی فن پاروں پر صادق آتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فیثا غورث ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مارس بورا ۔ ۔ ۔ ۔
اور آخیر میں ان کا یہ کہنا کہ "ملیرڈ نے جس طرح ملٹن کی مشہور رزمیہ "فردوس گمشدہ" کے شعوری اور غیر شعوری مع[انی]
ہیں ہمیں بھی اس نظم کے دو معانی متعین کرنے ہوں گے" ــــــ جس کے بعد حاصل بحث یہ ہے۔ کہ "افسردہ کا ہم پا[یہ]
مغربی ادب میں کوئی نہ مل سکا۔ اس سے کمتر کئی ہیں، اس سے بلند تر ہستیاں بھی یقیناً موجود ہوں گی لیکن بالکل اس کا ہم
شاعر نہ ملا۔ تلاش بسیار کے بعد جیمز جوائس کی یولی سز ہاتھ لگی ہے ــــــ ۔ ۔ ۔ "میں اکثر سوچتا ہوں وہ دن کب آئے"
میں جیمز جوائس اور ٹی ایس ایلیٹ پیدا ہونے لگیں گے۔ شکر ہے ہم میں ایک افسردہ تو ہے" ـــ حامد امجد کا یہ "تن[قیدی]
پڑھنے کے قابل ہے۔ اور ایک مدت کے بعد ایسی چیز پڑھنے کو ملی ہے ـــ مضمون نگار کی صحیح داد یہ ہے کہ اسے بار
اور اسی جذبے کے ساتھ جس میں ڈوب کر یہ جگر پارہ پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن کا مضمون "زمانہ، ذہن اور تنقید"
میں شامل ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ پچھلے دس سال میں ادیبوں اور شاعروں کے باہمی تعلقات جس قدر خراب ہوئے
[illegible] اور مصنفین کے [illegible] کے بعد شکل ہی سے ملیگی۔ سوال یہ ہے کہ ادبی نزاعیں فنا ادا کی کیوں ہو جاتی ہیں؟

احمد سلیم نے فن اور فنکار کے عنوان سے پروفیسر اختر انصاری کی شخصیت پر روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ ان کی شخصیت کا راز آہستہ آہستہ کھلتا ہے۔ وہ مجسم شعریت، مجسم اخلاق اور مجسم انسانیت اور بے حد نفاست پسند ہیں اور قیمتی چشموں کا خاصا ذخیرہ اپنے پاس رکھتے ہیں، پائپ پیتے ہیں اور چشمہ پائپ سے میچ کرتا ہوا ہوگا۔ وہ ہمیشہ بھی اسی نسبت سے بدلتے ہیں۔

ہمدرد ڈاکٹر کراچی ــــــــ مسیحا نفسوں کا یہ رسالہ ہر ماہ صحت و صفائی سے متعلق کسی نہ کسی پہلو کو ہمارے سامنے لاتا رہتا ہے، اور ساتھ ہی اپنی گل فشانیاں بھی خوب کرتا ہے۔ تازہ شمارے میں ڈاکٹر محمد نصیرالدین کے قلم سے ان کی ڈائری کے کچھ صفحات درج ہوئے ہیں، اور بہت دلچسپ ہیں، انہوں نے بتایا ہے کہ ایک ڈاکٹر کو زندگی میں کیسے کیسے مردوں اور عورتوں سے سابقہ پڑتا ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ ایک ڈاکٹر کے پاس خیالی مریض، جنسی مریض، مالی مریض، اور سیاسی مریض آیا کرتے ہیں، پروفیسر حمیدہ نسیم نے پنسلین کی کہانی اسی کی زبانی پیش کی ہے اور بہت اچھے انداز میں پیش کی ہے۔ مضمون خاصا دلچسپ ہے۔ خان بہادر قی محمد خاں خورجوی مشہور اور پرانے اہل قلم ہیں۔ انہوں نے دماغی خلفشار کے عنوان سے انسانی اوہام پر اظہار خیال کیا ہے اور مزے کی بات یہ لکھی ہے۔ کہ خیال انسان کے لئے ایسی دودھاری تلوار ہے۔ کہ کبھی وہ دشمن کی ہلاکت کا سبب ہوتی ہے اور کبھی ی ہی جان لیوا بن جاتی ہے۔ تمباکو نوشی سے متعلق حیرت انگیز انکشافات، ڈاکٹر زینب عبداللہ کا مضمون بھی اس شمارے میں شامل ہے یں سگریٹ نوشی کے مہلک اثرات بیان کئے گئے ہیں، احتشام علی چشتی نے اپنے مضمون عطائیت میں عطائیوں کی قلعی کھولی ہے اور ن کی قسمیں گنوائی ہیں۔ رفیع الدین خاں بھاگلپوری نے عہد طفلی کا دوسرا عجیب واقعہ پیش کیا ہے۔ اور بقول ڈاکٹر نصیر اس دفعہ سماں سے بجائے تبصروں کے مچھلیاں برسی ہیں ڈاکٹر سید ممتاز حسین نے طب قدیم اور طب جدید کا ایک تقابلی تذکرہ پیش کیا ہے یہ تیسری قسط ہے۔

اشارہ پٹنہ ــــــــ ہربنس لال ایم اے دہلی نے فانی کا غم ایک مختصر مضمون لکھا ہے۔ اور پروفیسر سید ن نے اردو ادب میں کرشن بھگتی کی روایت سے بحث کی ہے یہ مقالہ خاصا طویل ہے ہندوستان کی مذہبی تحریکات کا پس منظر لام کی آمد اور اس کے اثرات واضح کرنے کے بعد پروفیسر سید حسن نے ولی دکنی، نظیر اکبرآبادی، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں ت تلوک چند محروم، سیماب اکبرآبادی، ساغر نظامی، نازش پرتاب گڑھی اور عرش ملسیانی وغیرہ شعرائے اردو کے کلام سے کرشن ھیا کے تذکرے پیش کئے ہیں اور خواجہ حسن نظامی صاحب کی مشہور کتاب کرشن بیتی کے اقتباسات بھی پیش کئے ہیں کہ مسلمان کو خدا کا اوتار مانتے ہیں مگر ہندوؤں نے ان کو ایک ہوس ناک عیاش طبع نوجوان ظاہر کیا ہے۔

تحریک دہلی ــــــــ تازہ شمارے میں "فاعتبروا یا اولی الابصار" کی زہر بھری سرخی سے گوپال متل ایک مختصر مضمون میں اول تو پروفیسر احتشام حسین اور فراق گورکھپوری کی وہ شاندار عبارتیں درج کی ہیں جو ایک شاعر نذیر بنارسی نظموں اور غزلوں کے مجموعے گنگ و جمن پر ان دونوں نے بطور تعارف و دیباچہ لکھی ہیں اس کے بعد گوپال متل نے شاعر کے کلام کے نے پیش کئے ہیں اور پھر لکھا ہے کہ ان شعروں میں اگر آپ کو وہ خوبیاں نظر نہ آئیں جو پروفیسر احتشام اور پروفیسر فراق کو نظر آئی ہیں ے اپنی ہی کوتاہ فہمی اور بدذوقی پر محمول کیجئے کیونکہ پروفیسر احتشام ساہتیہ اکاڈیمی میں اردو کے نمائندے ہیں اور پروفیسر فراق س وقت عظیم شاعر اور عظیم نقاد ــــ اس شمارے میں قاضی عبدالودود کا ایک مختصر مضمون بخشی الملک راجہ الفت رائے بہادر

الفت بھی شامل ہے: الفت رائے راجہ لال جی کے بیٹے تھے شاہ دہلی نے ۱۲۴۳ھ میں لال جی کو راجہ کا خطاب دیا تھا۔ الفت رائے ۱۲۲۹ھ میں پیدا ہوئے ۱۲۴۹ھ میں اپنے والد کی طرح لکھنؤ آئے ۔ ۔ ۔ اور باپ کی وفات کے بعد یہ عہدہ بخشی گری اور خطاب راجگی و پنج ہزاری پر سرفراز ہوئے اور ۔۔۔ میں بعمر ۵۴ سال ۴ ماہ راہی عدم ہوئے۔ فارسی کے شاعر و نثر نگار تھے۔ الفت تخلص تھا اردو میں صرف نظم ملتی ہے اور واجد علی شاہ کی شان میں قصیدہ۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ حمد و نعت و مناجات پر تو مجھے تعجب نہ ہو مگر الفت کا یہ قطعہ دیکھ کر حیرت ہوئی:-

صفر کی تیسویں کو جب سلماں / باعلاں ہو گئے راجہ رتن سنگھ
کہا الفت نے الفت با دل خوش / مسلماں ہو گئے راجہ رتن سنگھ

نثار احمد فاروقی کے مضمون آج کے ادبی مسائل کی دوسری قسط بھی اسی شمارے میں درج ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ روایت ادب کا مزاج اور اس کا ذہن ہے۔ جب اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ ادب میں روایت کی اہمیت کو نظر انداز کیا جائے تو مراد یہ ہوتی ہے کہ غزل کے مزاج میں جو مشرقیت اور ہند ایرانی کلچر کی چھاپ ہے اسے انگریزی کے سانیٹ سے ٹکرا کر ایک بے معنی صنف بنا دیا جائے یا جاپانی شاعری کی صنف ہائیکو سے اس کا موازنہ کر کے اسے عہد وحشت کی یادگار ثابت کرنے کی کوشش نہ کی جائے اس کے علاوہ خود بیچ کر کے آزادی کو ترسایا جائے۔ ادب تو مر کر وہ آزاد نہیں ہو سکتی، فنا ہو سکتی ہے۔ ادب میں حقیقت ضرور ہو گی لیکن حقیقت ادب نہیں بن سکتی اگر ایسا ہو تو بقول کلیم الدین احمد پولیس رپورٹ کے رجسٹر سب سے بڑے ادبی شاہکار بن جا سکتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد گو وسیل کے جو اسلوب مغلوب و مطرود ہوتے تھے اب وہ پھر ایک تنوطی اور یاس آمیز لہجہ لیکر ابھر رہے ہیں۔ آج کی غزل پڑھ کر کتنے ہی شاعر میر و غالب کی تقلید کرتے نظر آتے ہیں۔ اور کئی شاہ نصیر کئی ناسخ اور ذوق یا ظفر سے کم نہیں ہیں۔ ذہنی اعتبار سے یہ لکھنے والے ابھی تک اپنے زمانے میں نہیں ہیں (جیسے پہلے نہ کبھی مارکس کو پڑھا تھا نہ طبقاتی کشمکش کا راز سمجھا تھا نہ سماجی شعور کے معانی اپنے ذہن میں متعین کر سکے تھے۔ ویسے ہی) آج ان کو سائنس کی کچھ خبر نہیں نہ عہد حاضر کی رفتار ترقی کا علم، ابھی تک روایت کے تسلسل کا احساس ہمارے ہاں نہیں ہے۔ "تمکین کاظمی تبرکات داغ کے عنوان سے استاد داغ کے خطوط پر روشنی ڈالی ہے اور کہا ہے کہ داغ کے خطوط میں گنتی کے چند ہی خطوط ایسے ہوں گے جن میں کوئی کام کی بات، کوئی ادبی نکتہ یا تذکیر و تانیث کے مسائل موجود ہوں۔ داغ کے نزدیک ٹوپی اوڑھنا غلط، پہننا صحیح ہے۔ اسی طرح ریاد مالکہ ہے، ایسے ہی مذکر ہے، مدبھیڑ بغیر نون کے بھی صحیح ہے۔ رشید احمد صدیقی کا مضمون مولانا آزاد کا اسلوب نگارش بھی اس شمارے میں شریک ہے، وہ لکھتے ہیں کہ مولانا نے لکھنے کا انداز لب و لہجہ اور مواد کلام پاک سے لیا۔ قرآن کو اپنے اسلوب کا سرچشمہ ۔۔۔ مولانا کی تحریروں میں وہ نرمی اور نوازش نہیں ملتی جو پیغمبروں کی دعوت میں ملتی ہے۔ یہاں پہنچ کر یہ بھید کھلنے لگتا ہے کہ مولانا کی تحریروں میں واقعیتی رنگ اور خطابت کا غلبہ کہاں سے آیا۔ مولانا کے ہاں انشا پردازی کے ایک سے زیادہ اسالیب ملتے ہیں الہلال میں دار و رسن ہے تذکرے میں دعوت دید و شنید غبار خاطر میں دعوت نوش و نیش، الہلال اور تذکرے کا اسلوب اپنی شوکت اور ۔۔۔ کے باوجود زمانے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ لیکن غبار خاطر کا اسلوب اردو میں نامعلوم مدت تک زندہ رہے گا۔ مبارز الدین رفعت نے پہلی براون کا ترجمہ ہندوستانی مصوری کا مغل اسکول اور مسز راہر گوپال تفتہ نے لینن ازم پر قلم اٹھایا ہے اور رشید الدین

بقیہ بر صفحہ

کتابوں میں

دیوان ناطق ——— سرود نو ——— زمزمستان

دیوان ناطق: — حضرت ناطق لکھنوی کا مجموعۂ کلام ہے سید رشید احمد اور سید اقبال عظیم نے مرتب کیا ہے اور انجمن تعمیر ادب چاٹگام (مشرقی پاکستان) نے شائع کیا ہے۔ قیمت پانچ روپے۔

یہ تین سو صفحات کی کتاب جو حسن کتابت، معیار طباعت، نفیس لمائشی جلد اور سنہرے حروف سے مزین ہے ان ظاہری خوبیوں کی وجہ سے بھی ارزاں ہے۔ چہ جائیکہ یہ حضرت ناطق لکھنوی جیسے فصیح اللسان اور سحر البیان شاعر کا دیوان ہو حضرت ناطق لکھنوی ایک اچھے شاعر ہونے کے علاوہ دنیا کی حقیقت پر نظر رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کے اشعار میں جہاں زبان کی سلاست، بیان فصاحت اور زور کلام پایا جاتا ہے۔ وہاں یہ خصوصیت بھی نمایاں نظر آتی ہے کہ شاعر کی نظر دنیا پر ایک تصور پرست نہیں بلکہ ایک حقیقت پسند کی نظر ہے، وہ صرف معاملات عشق و محبت ہی کو نہیں بلکہ دنیا کے اور دوسرے معاملات کو بھی پوری وضاحت کے ساتھ دل نشیں انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اور پھر ان سے کلیات بنا کر عملی زندگی کے لئے رہبری کا فرض ادا کرتے ہیں اس رباعی کو دیکھئے :

اپنوں کے شریک اہل وفا ہوتے ہیں غیروں کے حلیف اہل دغا ہوتے ہیں
انسانوں کے بھی فرقے جداگانہ ہیں حیوانوں کے بھی غول جدا ہوتے ہیں

دیوان کی ترتیب عام دواوین کی طرح ردیف پر نہیں بلکہ تاریخ نگارش پر ہے مرتبین دیوان نے یہ بہت اچھا کیا ہے کہ ہر غزل پر مقام اور تاریخ لکھ دی ہے۔ اس طرح شاعر کے ذہنی ارتقاء اور مشق شعر و سخن کے منازل کا مطالعہ کامیابی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ آخر میں حمد اور عذرا ربھی شریک ہے، یہ مثنوی خاصی طویل اور ایک واقعہ تاریخی کا بیان ہے۔ اگرچہ اس مثنوی میں وہ لزوم جو ذوق کی مثنوی میں ہے نہیں ہے۔ لیکن زبان اتنی شیریں اور ایسی سلیس ہے کہ عالم خیال کا دھوکا ہوتا ہے۔

دلدادگانِ ادب اردو سے توقع ہے کہ اس دیوان کی پوری پوری قدر کریں گے مقدمہ دیوان ناطق خود حضرت ناطق کا لکھا ہوا ہے جس میں علم و ادب اور شعر و سخن پر عالمانہ بحث ہے اور اس سے حضرت ناطق کے فن پر روشنی پڑتی ہے، وہ ظاہری شاعری اور داخلی شاعری کے شیدا ہیں اور شیدا ہی نہیں بلکہ لکھنؤ کے آخری عہد میں ان کا شمار ان لوگوں میں تھا جنہوں نے داخلی شاعری کو لکھنؤ میں بلند کیا اور جدید دور کے رہنما ہوئے سید اقبال عظیم نے اپنے دیباچے میں شکوہ کیا ہے کہ نقوش کے غزل نمبر میں صاحب

کا کلام درج ہے لیکن حضرت ناطق کی نسبت یہ خبر تک مرتب کو نہیں کہ وہ زندہ بھی ہیں یا رحلت کر چکے۔ یہ شکوہ اس لحاظ سے تو بجا ہے کہ حضرت ناطق جیسا مشہور و کہنہ مشق استاد پاکستان میں آکر رہا اور یہیں پیوند خاک ہوا کم از کم اتنی خبر تو پاکستان کے اردو دوستوں کو ضرور ہونی چاہئے تھی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہی ہے کہ نقوش اور اس کے ضخیم سے ضخیم نمبروں نے خواہ وہ غزل نمبر ہو، افسانہ نمبر ہو، شخصیات نمبر ہو یا طنزیات نمبر، یہ دعوےٰ کبھی نہیں کیا کہ وہ حرف آخر ہیں یا وہ تمام شاعروں، افسانہ نگاروں، ناول نویسوں اور اہل طنز و مزاح یا اہم شخصیات پر حاوی اور جامع ہیں۔ اس لئے قارئین کا ہم ان نمبروں کے متعلق ایسی کوئی رائے قائم کر لینا صحیح نہ ہوگا یہ شکوہ دراصل اس تن آسانی، سہل انگاری، بے ذوقی اور بے فکرے پن سے ہے جو بالعموم اہل اردو پر طاری ہے۔ اور جس کی بدولت خدمتگزاران علم و فن روز بروز فراموش ہوتے جاتے ہیں۔

سرود نو —— پروفیسر اختر قادری کا مجموعہ کلام۔ مجلد ۱۶۰ صفحات قیمت تین روپے آٹھ آنے ملنے کا پتہ حمید قادری منشی ایل ایس کالج مظفر پور (بہار)۔ پروفیسر عطا کاکوی نے تعارف لکھا ہے اور مقدمہ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے۔ اور "اختر قادری کی شاعری پر ایک نظر" کے عنوان سے پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی نے اختر کی شاعری کا جائزہ لیا ہے اختر صاحب کے اس مجموعے میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی، غم جاناں اور غم دوراں دونوں کی تجلیاں ساتھ ساتھ ہیں مناظر کی عکاسی ہو یا جذبات کی مصوری، غور و فکر اسرار حیات پر ہو یا مسائل تمدن پر، شاعر کے اس انداز متفکرانہ میں کوئی فرق نہیں آتا زبان و بیان پر بھی قدرت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ شاعر نے جو کچھ اپنے دل کی گہرائی میں محسوس کیا ہے اسی کو بیان کیا ہے سب سے بڑی خوبی یہی ہے۔ اس مجموعے میں یہ بھی ہے کہ ؎

اس ان دیکھے کی چاہت رنگ لائی — تصور رہنما ہے اور میں ہوں
روداد عشق اپنی عجیب مختصر سی ہے — دل اس کو ڈھونڈتا ہے جو دل سے قریب ہے
نگاہ شوق دل کی ترجماں ہے — خموشی سر بسر اک داستاں ہے

اور یہ بھی ہے کہ ؎

ہزار پیچ لگائیں خرد کے دیوانے — جنون عشق کی اک جست اور قصہ پاک
جگر کے سوز سے جب تک نہ ہو وجود یقیں — تمام دفتر دانش گماں کا پشتارا
احوال حوادث پہ نظر سب کی ہے لیکن — کچھ ہیں جو بہ انداز دگر دیکھ رہے ہیں
اختر ہزار بات کی اک بات ہے یہی — یعنی دماغ کا نہیں اب دل کا دور ہے
نگاہ عشق میں پست و بلند بے بنیاد — خرد طلسم نشیب و فراز میں محصور
قطرے جو صحرا ہو نہ سکا قطرے سے جو دریا نہ ہو سکا — اس ناشنفتی کو کیا کہئے کیا ہو کے رہ گیا ہوگا

اختر کا کلام پیام عشق ہے اور یہ عشق کیوپڈ کی اندھی محبت سے یقیناً الگ ایک چیز ہے سرود نو میں اقبال کے "سرود رفتہ" کی گونج صاف محسوس ہوتی ہے۔

ہندوستان —— پروفیسر حسن عظیم آبادی کے منتخب کلام کا مجموعہ، مجلد ۱۱۰ صفحات، قیمت تین روپے ملنے کا پتہ — پروفیسر حسن عظیم آبادی گورنمنٹ کامرس کالج چاٹگام مشرقی پاکستان یہ مجموعہ مکتبہ ماحول کراچی نے شائع کیا ہے۔ [illegible] جمال مظاہر نے لکھا ہے، دیباچہ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے اور کلام و صاحب کلام کے عنوان سے تعارف

[redacted]

ہی نے سپرد قلم کیا ہے۔ پروفیسر حسن عظیم آبادی فہیم و ذہین اور حساس شاعر ہیں شعر و ادب سے ان کو فطری لگاؤ ہے اور
رت جمیل ظاہری اگرچہ فن اور اصول فن کے ساتھ بے مروتی اردو ادب کے اس نئے دور کی کچھ خصوصیت سی ہو گئی ہے۔ لیکن
ں میں ایسی سرکشی اور سرگرمی کی مثال نہیں ملتی۔ پروفیسر حسن جدید دور کے شاعر ہیں لیکن قدیم روایات سے بھی ان کا
واسطہ اور [illegible] چونکہ مشق و ریاضت اور مسلسل فکر و کاوش پروفیسر حسن کے کلام کو اور خوبیوں سے مالا مال کر سکتی ہے وہ کہتے ہیں ؎

ہم کو تو ہر حجاب میں آتے ہو تم نظر — دھوکا وہ کھائے جو تمہیں پہچانتا نہ ہو
کس طرف کو جھکے جبین سجود — ہر طرف تیرا آستانہ ہے

پھر یوں بھی ہے کہ ؎

صحن چمن قفس سے نہ کچھ کم تھا اے حسن — نکلے تھے اضطراب میں جب آشیاں سے ہم
مے کدہ ہے وہی، وہی مے ہے — صرف بدلے ہوئے ہیں پیمانے
مایوسیوں کے ہاتھوں اپنی لگی یہ عالم — جیسے اجڑ گئی ہو بستی بسی بسائی

بیشتر غزلوں میں غزل مسلسل کا لطف بھی موجود ہے اس لئے تنقید جدید خوش ہو گی کہ شاعر کا ذہن ایک داخلی نظم
کا حامل ہے اور انسان میں یہ تیور بھی ہیں۔

جنوں کی بہار فکر کے دم سے تھا قائم جہاں گی — تلاش کی وسعتوں میں کھو کر ملی نئی منزلِ زندگی کا
ابھرا ہے نقش ہستی ہر موج آرزو سے — ڈوبے ہیں جب سفینے گرداب جستجو میں

غزلوں کے علاوہ اس مجموعے میں کچھ نظمیں رباعیات اور سلام بھی شامل ہیں۔ مجموعے کا نام زمزمستان ہے۔ اگر
سے بنایا ہے تو محل نظر ہے۔

بقیہ۔ رسالوں میں

زنک (ڈاکٹر ژواگو کے مصنف) بورس لیونیڈووچ پیسترناک ۱۸۹۰ء میں ماسکو میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ مصور تھا اور ماں کو موسیقی سے
موسیقی ورثے میں بیٹے کو بھی ملی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اس نے قانون پڑھا مگر طبعی رجحان نے ملنے کی طرف موڑ دیا پہلی جنگ
ظیم میں داخل ہوا جہاں ایک ٹانگ زخمی ہوئی واپسی پر ایک فیکٹری میں اسپرلائبریری میں ملازم ہوا۔ وہ مترجم بھی اچھا ہے۔ وہ
بھی اطالوی اور انگریزی بھی خوب جانتا ہے اور کامیاب ترجمے کئے ہیں روس میں بحیثیت شاعر مشہور ہے مگر آزاد شاعری
وہ افسانہ نویس بھی ہے۔ ڈاکٹر ژواگو نثر میں اس کی تیسری تصنیف ہے۔ اور ۱۹۰۳ء سے ۱۹۴۳ء تک کے روسی احوال پر
اس کتاب میں روسی اشتراکی انقلاب پر چوٹیں بھی ہیں وہ کہتا ہے یہاں سب کچھ موجود ہے صرف انسانیت نہیں انسانیت
مسلک پر قربان کر دی گئی ہے۔



مہر نیمروز

دسمبر ۱۹۵۹ء

جلد نمبر ۴ شمارہ نمبر ۹

ادارہ

حسن مثنیٰ ندوی

علی اکبر قاصد

ابوالخیر کشفی

کتابت:- صدیق عالم

قیمت:-

سالانہ:- مبلغ چھ روپے

ششماہی:- " تین روپیہ چار آنے

فی پرچہ:- آٹھ آنے (۸/)

پتہ:-

★ ـــــــ نمبر ۳۶۴ بہار ہاؤسنگ سوسائٹی، ہاؤسنگ یونین ایریا کراچی ۵

★ ـــــــ دفتر رسالہ "مہر نیمروز"، ۷۔ کوی روڈ صدر کراچی ۳

اس شمارے میں

پرنٹر و پبلشر سید حسن مثنیٰ ندوی نے انجمن پریس میں چھپوا کر دستگیر یونین ایریا کراچی سے شائع کیا

محمد فضل الرحمن

رَوایات

شائد دنیا میں کوئی چیز اس قدر تغیر پسند نہیں جتنا یورپ میں عورتوں کے لباس کے فیشن۔ ہر ہفتہ مصور اخبارات اور رسالوں میں نسوانی ٹوپیوں کی عجیب و غریب اور انوکھی تصویریں نکلتی رہتی ہیں اور شائد دنیا کی پوری سیاسی تاریخ میں اتنے انقلابات نہیں ہوئے جتنے کے عورتوں کے فیشن میں ایک سال میں وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ یہ فیشن ایک بڑی حد تک عورتوں کی جدت طرازی کی خواہش پر مبنی ہے۔ لباس میں تقلید کا جذبہ عورتوں میں بالکل نہیں ہوتا۔ ظاہری صورت میں ہر ایک بے نظیری نمونہ پیش کرنا چاہتی ہے۔ اور یہ ان کی فطری نیچر کے اظہار کی ایک شکل ہے۔ ایک حد تک اس میں جمالیاتی جذبات کا بھی دخل رہتا ہے۔ لیکن بالعموم حسن کو بے مثالی پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ ان کے لباس میں رنگ تراش، وضع وغیرہ میں ترمیم کی بہت گنجائش رہتی ہے۔ اس لئے بیک وقت ان میں رنگا رنگی اور بوقلمونی کا مظاہرہ نظر آتا ہے۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو اس بات کا احساس ضرور ہوتا ہے کہ باوجود اس قدر جدت پسندی کے بہت کم عورتیں ہیں جن کے لباس سے مذاق سلیم کا پتہ چلتا ہے۔ یا تو رنگ ایسا ہوتا ہے۔ جو انہیں زیب نہیں دیتا یا تراش میں کچھ قد و قامت اور ڈیل ڈول کا لحاظ نہیں رہتا یا ہیئت بد قوارہ نظر آتا ہے۔ غرض کے بالعموم جدت طرازی اور مناسبت میں مطابقت نہیں ہوتی۔ کہیں نہ کہیں بے ذوقی کا ثبوت ضرور موجود ہوتا ہے۔

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ لباس کی اساسی ماہیت میں زیادہ تبدیلی نہیں ہوتی ہر پھر کے وہی جوتے موزے، بلاؤز، ہیٹ بہروپیوں کی طرح نئے نئے سانگ بھر کے سامنے آتے ہیں۔ لوازمات لباس میں دراصل ایک بنیادی قدامت پسندی اور روایات کی تقلید سے کام لیا جاتا ہے۔ کیونکہ زندگی کے ہر شعبے میں بنیادی چیزیں جو سالہا سال کے تجربات پر قائم ہیں بہت ہی سادہ اور عام ہوتی ہے۔

اس مضمون کا مقصد ہرگز صنف نازک پر اعتراض نہیں۔ خدا ان کا بھلا کرے۔ اگر وہ روز بیٹھ کر اپنی زینت اور آرائش کے لئے نئی نئی تدبیریں نہ کریں تو دنیا نہایت ہی پھیکی اور بے مزہ ہو جائے۔ یہ ان کی جبلی فطرت ہے۔ اور اس میں قدرت کا بڑا راز مضمر ہے۔ بالا مقصد دراصل بعض ادبی مشاہدات کے لئے ایک تمثیل پیش کرنا ہے۔ مصوروں اور شاعروں کی طبیعت مستورات جیسی نازک اور سیمابی ہوتی ہے۔ انہیں بھی جدت طرازی سے بہت شغف ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے جذبات کے اظہار کے لئے ہمیشہ نئی اور انوکھی راہ ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ ہر بڑا شاعر اپنے ماحول کے خیالات و رسومات سے مدد لیتا ہے۔ اور وہ زبان سے نئی نئی اور ترکیبیں پیدا کرتا ہے۔ لیکن مدعا سے شاعری آج بھی وہی ہے۔ جو آج سے تین ہزار برس پہلے تھا۔ اور شاعری اور فنون لطیفہ کی

اصولی قوانین تمام دنیائے شاعری اور فنونِ لطیفہ کے لئے ایک ہی ہیں۔ ہاں، بعض دور میں یا کسی تمدن میں یا تو صحیح روایات کے فقدان کی وجہ سے یا معاشرتی یا تخیلی کمزوری کی بنا پر یا شاعر کی جذباتی بدنظمی یا خامی کی وجہ سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اعلیٰ قسم کی شاعری کے بجائے نہایت ہی بے جان یا سطحی قسم کی شاعری تخلیق کی جاتی ہے جس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ اس ملک یا دور میں تنقید بھی جزوی اور سطحی عناصر میں الجھ کر اصولی چیزوں کو نظر انداز کر دیتی ہے اسی امر کو ہمارے ہمعصر نقاد اکثر نہیں سمجھتے ان کو خیال ہوتا ہے کہ چوں کہ ان کے ملک یا زبان کے شعرا میں بعض روایات اور خصوصیات پائی جاتی ہیں اس لئے وہ معیاری چیزیں ہیں اور پھر وہ کسی دوسرے معیار کو خاطر میں نہیں لاتے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ جذبات کی صورت اور ان کے علامات مختلف ممالک میں مختلف ہوتے ہیں۔ وہ شاید یہ کبھی نہ کہیں گے کہ غم یا خوشی یا غصہ کا اظہار مختلف ممالک میں بالکل مختلف طرح سے ہوتا ہے۔ لیکن اگر انہیں جذبات کا اظہار زبان کے واسطے سے کیا جائے تو پھر وہ کہتے ہیں کہ مغرب کے اصول اظہار دوسرے ہیں، مشرق کے دوسرے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی الہامی وسیلے سے برعظیم میں جذبات کے اظہار کا دوسرا سامان کیا گیا ہے اور مافوق العادت طریقہ پر ایک نئے مذہب شاعری کی ایجاد ہوئی۔ کسی نقاد کے خیالات کا قطعی رد نہ کر کے اس پر مغرب زدگی کا الزام لگانا اور یہ سمجھنا کہ اس کے اعتراضات کا جواب طعنہ زنی سے ہو گیا اپنی تنگ نظری اور اپنے تخیلات کے محدود اور شور ہونے کی دلیل پیش کرنا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ بعض ممالک شاعری کے لئے زیادہ زرخیز واقع ہوئے ہیں اور بعض کم۔ لیکن زرخیز ملک میں بھی عمدہ شاعری بہت نایاب ہوتی ہے۔ اگر کوئی مغربی اصول نقد برعظیم میں نقاد یا شاعری کی رہبری کے لئے پیش کرتا ہے۔ تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ انگلستان یا فرانس کا دلدادہ ہے۔ ان ممالک میں بھی ہزاروں شعرا ہیں جو اکثر سطحی قوانین شاعری کو اخذ اور استعمال کرتے ہیں۔ اور ان کی فطرت صرف ردیف و قافیہ کی صحت تک محدود ہے۔ مثلاً الفرڈ نوائس اور مارٹن آرمسٹرونگ کو شاعر سمجھنے کے بعد کوئی کارآمد اور تخلیقی تنقید ناممکن ہے۔ یہ ان کا اہم نقص ہے کہ نہ تو انہوں نے انگلستان کی ادبی روایات سے جائز مصرف لیا نہ اپنے جذبات کے نقائص کو سمجھ سکے نہ انہیں اپنی زبان سے زندہ دلچسپی رہی نہ انہوں نے اپنے ماحول سے صحیح اور تخلیقی عناصر کو منتخب کیا غرض کہ نہ شاعری بہت آسان ہے نہ فنِ نقد۔

روایات سے افادہ کرنے کے معنی ہرگز پرانے مصوروں یا شعرا کی کورانہ تقلید نہیں اگر اس کا مفہوم صرف نقالی ہو تو اس سے زیادہ مضر شے فنونِ لطیفہ کے حق میں اور کوئی نہیں ہو سکتی اور اگر نظرِ بصیرت سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ماحول کے طرزِ خیال اور رسومات سے اسی بے دماغی سے مصرف لینا بھی ویسا ہی مضر ہے اور بے ثمر جیسا کہ روایات کا بیجا اتباع۔ غرض کہ روایات یا ماحول سے تخلیقی اور مفید مصرف لینا شاعر کی ذہنی کیفیت پر منحصر ہے اور ان میں شاعر کے نقطۂ نظر سے دراصل اس قدر فرق نہیں جیسا کہ لوگ عموماً سمجھتے ہیں۔ ہر دور میں ماحول کے خیالات اور عقائد اور معاشرتی زندگی اور شاعر کی ذہنیت کے درمیان ایک خاص تعلق ہوتا ہے جو دراصل ہر عہد میں قریب قریب ایک ہی ہوتا ہے۔ شاعر کو اپنے عہد کے اکثر مسائل کی عقدہ کشائی کرنی ہوتی ہے۔ اور وہ ہمعصر خیالات پر تنقیدی نظر ڈالتا ہے اسے اپنی فطری پرکھ سے کام لینا ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ ماضی کے بڑے شعرا بھی جنہوں نے اپنے زمانے کے ایسے ہی مسائل کو حل کیا اس کی اپنی ذاتی اور تنقیدی رائے

ساق کی راہبری کرتے ہیں۔ ہر عہد کے شاعر کو طریق عمل کے مسئلہ میں قبل کے شاعروں سے مدد ملتی ہے۔ خصوصاً اس سبب ان کے ادبی کارنامے تسلیم شدہ ہیں اور نسلوں کے تجربات کی کسوٹی پر پرکھے جا چکے ہیں۔ ہمعصر ادباء اور شعراء کے تیقن سے یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کس طرح کی فنی اہمیت رکھتے ہیں چونکہ ان کے کلام میں بہت سی ایسی باتیں ہوتی ہیں دلچسپ اور ضروری معلوم ہوتی ہیں لیکن وہ دراصل ہمارے عہد کی فوری دلچسپی کی چیزیں ہوتی ہیں اور شاعری امی عناصر سے غیر متعلق۔ بہت سے شعراء ہیں جن کے بارے میں ان کے ہمعصر نقادوں نے بڑے بڑے ادبی دعوے لیکن جنہیں یا تو آج کوئی جانتا نہیں یا جن کی فنی کمزوریاں ہم پر بہت ہی عیاں ہیں۔ کولرج جیسے صاحب بصیرت نقاد سدے (SOUTNEY) کی شاعری کو ملٹن اور دیگر بڑے شعرا کے کلام کے ہم وزن بتایا۔ آج سدے کو صرف بدمذاق ہی شاعر سمجھ سکتے ہیں۔ طریقت شاعری میں قدما کی رہبری اس لئے زیادہ مفید اور بارآور ثابت ہوتی ہے۔

روایات کی اہمیت غالباً شاعر کے اپنے ذاتی تجربات کی اصلیت سمجھنے سے زیادہ معلوم ہوگی۔ عام خیال میں ماضی ن بوسیدہ اور کہنہ خیالات رسومات اور اشیاء پر ہوتا ہے۔ لیکن دراصل حال ایک نہایت ہی عارضی کیفیت کا نام بلکہ ہر لمحہ، ہر آن، ہر پل حال ماضی میں مبتدل اور اس کی ریاست میں پیوست ہوتا جاتا ہے۔ حال تو دراصل ماضی اور کے درمیان ایک بہت ہی باریک خط کا نام ہے جو برابر ماضی سے مستقبل کی طرف بڑھتا رہتا ہے جس کے معنی ہیں تذ مستقبل ماضی میں بدلتا رہتا ہے۔ زمانۂ حال میں ہم صرف چند احساسات اور مشاہدات کو جذب کرتے ہیں ہمارے سر عالم مظاہر کے اثرات کو ہمارے دماغ تک ہر وقت پہنچاتے رہتے ہیں لیکن جب تک ان اثرات کی ایک اور بامعنی زنجیر تیار نہ ہو جائے یہ دراصل کوئی تجرباتی وقعت نہیں رکھتے۔ حال کے واردات جب تک ماضی کے ذہن جائیں عالم فن میں کسی طرح کارآمد نہیں ہو سکتے کیونکہ تجربات صرف تکمیل پانے کے بعد کیمیائے فن کے وسیلے نکار کی صورت میں جلوہ گر ہو سکتے ہیں۔ جب تک کوئی جذبہ یا تجربہ ہم پر گذرتا رہتا ہے شاعری کا موضوع سکتا کیونکہ یہ ضروری ہے کہ شاعر اپنے تخلیقی عمل میں اپنے تجربات کو ایک آزاد شکل دے سکے یعنی وہ اسے اپنی نسے علیحدہ کر سکے۔ مجسمہ تراش کو سنگ مرمر کی ناتراشیدہ چٹان کے امکانات کو عمل فن میں پیش نظر رکھنا پڑتا کہ وہ اس کے حدود سے باہر نہیں جا سکتا۔ اسی طرح شاعر کو ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اپنے جذبہ کو تول سکے اور امکانات کو سمجھ سکے اور یہ ممکن نہیں جب تک جذبہ تکمیل پا کر ختم نہ ہو جائے۔

س سے ظاہر ہوگا کہ شاعر کے اپنے تجربات اور ان روایات میں جن سے وہ سبق لیتا ہے اور جو اس کے تخیل ے کی نشو و نما کرتے ہیں اور ان کے عناصر بن جاتے ہیں کوئی زیادہ فرق نہیں۔ دونوں ماضی کی چیزیں ہیں۔ ایک دوسری ایک حد تک خارجی (ایک حد تک اس لئے کہ دراصل وہ روایات جن سے شاعر کو عمل تخلیق میں مدد س کے تجربات کے اجزاء ہیں) دونوں میں جو فصل ہے وہ عرصہ کا ہے۔ ایک زیادہ مدت کا ہوتا ہے دوسرا کم دور اور عہد کا فرق ہوتا ہے اور بس۔

علوم ہوتا ہے کہ اس کے بار بار دہرانے کی ضرورت ہے کہ تمدن میں جو کچھ ارتقاء ہوتا ہے خواہ وہ مادی ہو یا ذہنی

اور دماغی اس کا جذبات کی حقیقت اور فطرت پر کوئی ایسا بڑا انقلابی اثر نہیں پڑتا۔ جذبات وہی رہتے ہیں جو کا شتر آج کا سائنس داں کسی انقلابی ایجادیں کرتا ہے اور جیسی امیدیں اسے عمل کے نتیجہ سے وابستہ رہتی ہیں وہی کاوش اور وہی امیدیں قرونِ وسطیٰ کے کیمیاگر میں نظر آئیں گی۔ آج سے چار ہزار سال قبل ایک مصری بچہ مٹی کے کھلونے پاکر خوش ہوتا تھا۔ آج جاپان اور جرمنی کے متحرک مکانی کھلونے پاکر ہمارے بچے کو اسی طرح کی خوشی ہوتی ہے۔ نہ اس کی عقل بڑھی ہے نہ اس کی خوشی دوسری طرح کی ہو گئی ہے۔ نہ اسے اس بات کا احساس ہے کہ مٹی کے کھلونے مکانی کھلونے سے کم دلچسپ ہوتے ہیں۔ یہ کہنا کہ قدیم مصری بچے کے جذبات آج کے ہندوستانی بچے کے جذبات سے اس لئے جدا گانہ ہیں کہ کھلونے بدل گئے ہیں اور ان میں ارتقا ہو چکا ہے، مہمل ہے۔

جذبات کا جو تعلق آرٹ کے ساتھ ہے اس کی وضاحت ضروری نہیں اس لئے بحث کو طول دینا بیکار ہوگا۔ صرف ایک ذرا سی بات قابل غور ہے جو ایک مثال سے واضح ہو جائے گی۔ معشوق کے تیر نظر نے عاشق کے دل کو محمل ناقہ سے گرا یا کار کی پچھلی سیٹ سے بالکل جزئی اور غیر اہم تفصیل ہے۔ دل کا گھائل ہونا اہم ہے اگر واقعی گھائل ہوا ہو۔ اگر لیلیٰ کے زمانے میں موٹر کار ہوتی اور اسے اس کی استعداد ہوتی کہ ایک فورڈ ہی رکھ سکے تو محمل اور ناقہ کا قصہ ہی نہ آتا۔ کار کار رہتا اور نہ رہتا تو زمانے کے انقلابات کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے۔ شاعری میں اس کے ایک رسمی استعمال سے نہ شاعری کے اپج کا ترجمہ ہے نہ تخیل کا۔ ہاں لیلیٰ اور مجنوں کے قصے اور آج کی بعض نئی شاعری میں یہ فرق ضرور ہے کہ اگلے قصہ میں تخیل اور جذبات سے کام لیا گیا ہے۔ آج کی بعض مقبول شاعری میں دونوں مفقود ہیں کیونکہ دراصل یہ اشعار تجربات بلکہ لیلیٰ مجنوں کے پامال استعارات کو ذرا بھیس بدل کر پیش کر رہے ہیں۔ اگر دل واقعتہً گھائل ہو تو پھر آج بھی محمل اور ناقہ سے وہ اثر پیدا ہو جو جذبات کی غیر موجودگی میں رولس رائس میں ممکن نہیں۔

ایک اور مثال غالباً بے جا نہ ہوگی۔ سترھویں صدی کے مشہور انگریزی شاعر ماروِل نے اپنے محبوب کی محبت کو متوازی خطوط سے تشبیہ دی ہے اس تشبیہ سے اشعار میں نہ صرف ندرت اور اپج پیدا ہو گئی ہے بلکہ ان میں اس عہد کے بعض خاص طرز تخیل کی عکاسی ہوتی ہے۔ ماحول کا پورا اثر ان اشعار پر مرتب اس تشبیہ سے پیدا ہو گیا ہے اور اس قسم کی ذہنیت سترھویں صدی کے ماہر انگریزی جیومیٹری اسکول کے لئے اس سے کافی طور پر واقف تھے بلاشبہ ماحول کا اثر موٹر اور ریل کو اشعار میں ٹھونسنے سے ثابت نہیں ہوتا۔ روایاتی معمولی یا عام فہم چیزیں شاعر کے ذاتی احساسات اور ادراک اور زیرکی سے کیمیائی تغیرات قبول کر کے نئی اور نادر صورتوں میں آتی ہے۔ اگر یہ صفات شاعر میں نہ ہوں تو وہ سائنس کے جدید ترین ایجادات کی اپنی شاعری میں بھر مار کرے اور علم النفس کے تازہ ترین انکشافات کو کام میں لائے لیکن کسی صاحب بصیرت کو اس کی شاعری میں نہ ندرت معلوم ہوگی نہ تازگی نہ حقیقت بلکہ فرسودہ اور لایعنی معلوم ہوگی۔

شاعری زبان پر موقوف ہے۔ اور زبان کے معنی نہ صرف الفاظ اور ان کے بدلنے والے معانی ہیں بلکہ ان کا التزام اور شاعر الفاظ سے نئے کوائف پیدا کر سکتا ہے۔ اور اپنے خاص معانی میں استعمال کر سکتا ہے۔ ایک حد تک تغیر و تبدل ممکن ہے

وہ بالکل نئے معنی میں جن کا تعلق ان کے مروجہ معانی سے نہیں ہے، استعمال نہیں کر سکتا ہے۔ اگر وہ نئے الفاظ وضع کرے
کی شاعری مجذوب کی بڑ ہو گی جسے نہ کوئی اور سمجھ سکے گا نہ اپنے حواس کی حالت میں خود وہ سمجھ سکے گا۔ الفاظ کی شکل
نا میں برابر تغیر ہوتا رہتا ہے۔ لیکن یہ اچانک بالکل نہیں ہوتا اور یہ ایک غیر شعوری اور اجتماعی عمل ہے۔ زبان کا تعلق اگلی
ت کے ساتھ ہے۔ اور اسی طرح اگرچہ نئے بحور اور عروض کی نئی صورتیں نکلتی رہتی ہوں۔ وہ اگلی روایات ہی پر مستحکم ہیں
کی عمارت روایات اور ماضی کی اینٹوں سے بنی ہوئی ہے۔ لفظ "کار" بھی نیا نہیں۔ قرون وسطیٰ کی فرانسیسی شاعری میں
ار" (char) اور "شارت" (charette) کے بھیس میں نظر آتا ہے۔ حالانکہ وہ آج کی میم صاحب کا ہے
ہ نہایت انوکھا اور عجب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن یہ دراصل وہی ہے جو پرانے زمانے کی مضحک صورتیں پہنا کر ہی
موٹر کار اور شار میں سطحی فرق ہے۔ ورنہ اصل مفہوم وہی ہے۔ کار مکانکی ہے، خوب تیز چلتا ہے، انہیں اپنے عقل مند
قی یافتہ اور ممتاز ہونے کا دھوکا ہوتا ہے۔ پرانا شار ان صفات سے خالی تھا لیکن وہ بھی لوگوں کو ایک جگہ سے
دوسری جگہ پہنچا دیتا تھا۔ ہمارے رولس رائس اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے۔ وہ نہ رقص کر سکتے ہیں نہ فلسفہ
دے سکتے ہیں۔ ذرا آب و تاب زیادہ ضرور ہے۔

یہ موٹی باتیں غالباً موضوع بحث سے غیر متعلق معلوم ہوتی ہیں لیکن میں نے انہیں اس تفصیل سے اس لئے پیش
کیا کہ آج شاعری میں تجدید اور اپج کے معنی ہیں کہ زمانہ حال کے چند خصوصی ایجادات، خیالات اور اصطلاحات کو نظم میں
ڈال دیا جائے۔ یا انہیں موضوع شاعری بنایا جائے۔ محض غور کرنے سے اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ یہ چیزیں اس قدر
ہو گئی ہیں کہ ان کی موجودگی کا احساس نہ ذکاوت طبع کی دلیل ہے نہ قوت اپج کی اور شاعری کی۔ ان کا غیر تمثیلانہ
تخیلانہ استعمال نہ شاعری کی جدت طبع کا نمونہ پیش کرتا ہے نہ اس کی دلیری اور آزادیٔ طبع کا ثبوت ہے۔ بلکہ
وضعیت اور فنی جدت کے فقدان کو آشکار کرتا ہے۔ اگر روز مرہ جن چیزوں کو ہم دیکھتے یا محسوس کرتے ہیں ان کا علم
بیانات سے ظاہر نہ ہو تو ہمارے حواس خمسہ کا رہنا یا معطل ہو جانا بالکل برابر ہے۔ ہاں ان کا شاعرانہ استعمال ایک
دوسری چیز ہے۔

میں نے قبل کہا ہے کہ ہر عہد میں چند قسم کے فیشن ہوتے ہیں۔ لباس میں، طرز رہائش میں اور ادب میں بھی ان کی موجودگی
جائز ہے بلکہ ضروری ہے۔ لیکن انہیں نامناسب اہمیت دینا ذہنی اور تخیلی کم مائیگی کی دلیل ہے اور ان کی ناجائز اتباع
لقین اس سے بھی بدتر ہے۔ آج کل کئی نئے علوم ظہور میں آئے جن میں نفسیات سے نوجوانوں کو خصوصاً خاص دلچسپی ہے
کی وجہ شاید یہ ہے کہ علم النفس کی بحث سے اور اسے گفتگو یا ادب میں لانے سے انہیں اپنی روایات سے آزاد ہونے
طرز خیال سے پاک ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ نفسیات ایک بدیہی علم نہیں اور اس کے انکشافات کا ریاضیات کے
موضوعوں سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا تعلق انسانی خیالات، افعال اور سکنات کے ساتھ ہے جو نظام شمسی کی نسبت
زیادہ پیچیدہ، مبہم اور خود مختار ہیں۔ علم النفس کی کیفیت ایک نوزائیدہ بچہ کی سی ہے جس کی آنکھوں یا ہاتھ پاؤں پھینکنے
سے اس کا گمان کر سکتے ہیں کہ وہ آسودہ ہے یا اسے بھوک لگی ہے۔ یا نیند آ رہی ہے۔ لیکن یہ کوئی بات ہم یقینی طور پر

نہیں کہہ سکتے۔ علم النفس کے حقیقی ماہر ہو کو اس کا احساس ہے کہ اس دنیا میں اختلاف رائے کی بہت گنجائش ہے۔ اور ابھی اس کا دائرہ علم بہت ہی محدود ہے مگر

رموز مملکت خویش خسرواں دانند

اور لوگ اس کے انکشافات کو بالکل بدیہی معنوں میں تسلیم کرتے ہیں اور ایک آدھ مصنف کی کتابیں پڑھ کر اپنے علم کو تنقید کی کسوٹی قرار دیتے ہیں۔ نتیجہ ہے کہ قبل کے ادبا، شعرا اور ناول نویس انہیں نہایت ہی کم سوسٹ الجھے خیال اور کمینہ فقیرے معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں اس کا کبھی خیال نہیں ہوتا کہ شاعری ایک فن ہے۔ اور نفسیاتی تجزیئے اس کے پرکھنے میں بالکل ناقص اور لغو ہو سکتے ہیں۔ ادب کو نفسیات سے تعلق ضرور ہے۔ لیکن ادب کو نفسیات کے اصول موضوعہ سے جانچنا حماقت ہے۔ ان کی سرحد جداگانہ ہے۔ نئے خیالات اور نئے علوم بہت ہی اہم اور نادر معلوم ہوتے ہیں اور ان کی ضرورت سے زیادہ وقعت ہوتی ہے۔ علم النفس کی قدر و منزلت آج کل اسی سبب سے ہے۔ اس کے انکشافات انوکھے ہیں اور انسانی افعال کے اصل اور نیت پر نئی روشنی ڈالتے ہیں اور چونکہ تقریباً ہر فعل کو وہ شہوانی نیات سے وابستہ کرتے ہیں ہمارے نوجوانوں کی نفسیاتی دلچسپی دو بالا ہو جاتی ہے۔ اسے تجدید کی بہترین راہ قرار دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض اخلاقی مسائل جو ترویج مرماء سے وابستہ ہیں نہایت ہی پرانے ہیں۔ نفسیات کے یہ مشاہدات یونانی ڈراما میں بکثرت نظر آتے ہیں اور جس تخلیقی خوبی سے انہیں سوفوکلیس نے پیش کیا ہے۔ اس کی نظیر بعد کی شاعری میں بہت کم نظر آئے گی۔ حتیٰ کہ نفسیات کے بہت سے اصطلاحات اس کے ڈراما سے وضع کئے گئے ہیں مثلاً XDIPUS COMPLEX سوفوکلیس میں جذباتی متانت اور اخلاقی سنجیدگی ہے جس سے اخلاقی نقطہ نظر سے یہ تجربات بہت ہی مہتم بالشان معلوم ہوتے ہیں اور قاری کے تخیلات میں ہیجان اور انقلاب پیدا کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے آج کل کے اکثر شاعر اور افسانہ نگار سمجھتے ہیں کہ ماں بیٹے۔ اور بھائی بہن کے درمیان ہوسناک محبت کی داستان چھیڑے بغیر وہ لکیر کے فقیر سمجھے جائیں گے اور وہ اپنی اپج اور تجدید کی نظیر نہ پیش کر سکیں گے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے آج کل ایسے افسانے اگر وہ جذباتی حقیقت پر مبنی نہیں ہیں لکیر کے فقیر ہونے اور رسمی ذہنیت رکھنے کا ثبوت دیتے ہیں۔ رجعت کے معنی ہیں اپنے جذبات سے انحراف کر کے صرف انوکھا پن فیشن کی تقلید پر حقیقت کو قربان کر دینا۔ اگر جذبات صحیح ہیں تو پھر روایات کا اثر ضرور بہتر ہوگا۔ شاہ ایڈیپس۔ OEDIPUS TYRANNUS اور اورستایا (OYESTEIA) سے بڑھ کر موجودہ شاعر کے لئے کوئی بھی راہبر نہیں ہو سکتا۔

(باقی آئندہ)

[redacted]

سلطان جمیل نسیم

صبا اکبرآبادی

کا

ایک شعر

(تیسری قسط)

چونکہ ناشناسِ عکس کی آواز ✦ آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز

اس سے پہلے مولانا عبدالماجد دریابادی، علامہ تمنا عمادی، پنڈت تلوک چند محروم، سید مسعود حسین ادیب، مضوی، سید حسن مرزا، وارثی رعنا اکبرآبادی، غلام ربانی تاباں، عطاء اللہ انصاری، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، خواجہ غلام السیدین، علامہ نیاز فتح پوری، ضیاء احمد بدایونی، نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی، فراق گورکھپوری، سہا ظہیر، ڈاکٹر رشید اعجاز حسین، آل احمد سرور، ڈاکٹر احسن، ڈاکٹر مسعود حسین، جمیل مظہری، میکش اکبرآبادی، خواجہ دولت جعفر کے خطوط شائع ہو چکے ہیں۔ اس شعر کے متعلق اہل فکر و نظر کی رائیں مختلف ہیں اور ہر ایک نے اپنے اپنے انداز سے اس کی شرح کی ہے۔ اب رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر عزیز، سید ذوالفقار علی بخاری، نجم آفندی، سید آل رضا، ڈاکٹر وزیر آغا، شکیل بدایونی، شان الحق حقی، رشید ہاشم رضا، زاہد احمد دہلوی، صالحہ عابد حسین کی رائیں ملاحظہ کیجئے۔ ستمبر کے شمارے میں خواجہ عباداللہ اختر کی رائے بھی "یارانِ نکتہ داں" کے صفحات میں آپ کی نظر سے گذر چکی ہے۔

(ادارہ)

رشید احمد صدیقی:

محترمی سلام مسنون۔

تصوف کے اسرار و غوامض سے میں نا آشنا ہوں اور جب ان معنوں سے شعر سمجھے جاتے ہیں تو پھر میں کہیں کا نہیں رہ جاتا۔ لیکن آپ کی فرمائش کے احترام میں اپنے ایک دیرینہ رفیق کار سے رجوع کرنا پڑا جو صوفی طریقت اور شریعت کے کے علاوہ علم و ادب میں بھی ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں انہوں نے جو کچھ تحریر فرمایا ملاحظہ کے سامنے ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو انکو شکریہ کا خط لکھدیں اور میری خطا معاف فرمائیں۔

ڈاکٹر محمد عزیز (بنام رشید احمد صدیقی)

مخدومی و محترمی السلام علیکم

اس شعر کا مطلب تو کوئی صوفی ہی بیان کر سکتا ہے تاہم تعمیل حکم میں جو کچھ سمجھ میں آیا ہے عرض کئے دیتا ہوں۔

عکس کی آواز کے معنی یہ ہیں کہ وہ خود بول اٹھا کہ میں کس کا عکس ہوں۔ یہ کائنات گویا ایک آئینہ ہے جس میں ذاتِ باری تعالیٰ اپنی صفات کے جلووں سے پہچانی جاتی ہے ذات ہماری نظر سے مخفی ہے اور مخفی رہنا چاہتی ہے۔ صرف اسکی صفات کے جلوے ہمیں اس کائنات کے آئینہ میں دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن صفات کے یہ جلوے دیدۂ بینا کے لئے اتنے واضح ہیں کہ ان سے ذات کو پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی اور ان صفات کے عکس سے ذات کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔

رہا یہ سوال کہ عکس کی آواز سن کر آئینہ ساز کیوں چونک اٹھا تو اسکی وجہ یہ ہے کہ اس کا (یعنی خالقِ کائنات کا) مقصد تو یہ تھا کہ آئینۂ کائنات میں صرف اپنی صفات کے جلوے دکھلائے لیکن جب یہ جلوے اپنے کمالِ ظہور میں ذات کی معرفت کا ذریعہ بن گئے تو یہ بات کیونکہ اس کی توقع کے خلاف تھی۔ اس لئے چونکنے کا باعث ہوئی۔ توقع کے خلاف دو وجہ سے ایک تو اس لئے کہ وہ اپنی ذات کو مخفی رکھنا چاہتا تھا دوسرے اس وجہ سے کہ "ظلوم و جہول" انسان سے ایسی معرفت کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔

سید ذوالفقار علی بخاری

مکرمی آداب و نیاز۔

آپ کا گرامی نامہ مورخہ ۳۰ جون موصول ہوا۔

چونک اٹھا سن کے عکس کی آواز
آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز

یہ شعر ایسا جگمگ جگمگ کرتا ہوا شعر ہے کہ ہر مشاعرے میں چمکے گا لیکن اگر کوئی صاحبِ فکر اس کے معنی پر غور کرے گا تو شعر تو الگ وہ خود مبہم ہو کر رہ جائے گا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر یہ شعر کہتے وقت لفظوں کے طمطراق میں کھو گیا۔ شعر کے معنی بیچ ہی میں کہیں دب دبا کر رہ گئے یا شاعر سرے سے اس مطلع میں معنی ڈالنا ہی بھول گیا۔ اگر کوہ کندن کیا جائے تو یہ کاہ نکلے گا کہ آئینہ ساز نے آئینہ دیکھا اس کا خیال تھا کہ میں اپنے بنائے ہوئے آئینہ میں اپنے (خاموش) عکس کو دیکھوں گا۔ لیکن عکس بول پڑا۔ عکس کی آواز سن کر آئینہ ساز ہکا بکا رہ گیا کہ ہیں! عکس ہو کر بولتا ہے آج کل کے زمانے کے مطابق اس شعر کے معنی یہ ہونگے۔ "در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند" نہیں بلکہ انسان اپنے خالق کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ گیا ہے۔

"چونک اٹھا" کی جگہ اگر "ڈر گیا" بنا دیا جائے تو شاید شعر کی بھول بھلیوں کا ایک آدھ دریچہ کھل جائے اور شعر سننے والا معنی مستور کو جھانک کر دیکھ سکے۔ زیادہ دعا۔

حضرت نجم آفندی

عزیزم نسیم سلمہٗ

دعائیں۔ تمہارا خط مجھے ملا۔ میں آجکل ایسے عالم میں ہوں کہ میرے دل و دماغ ٹھکانے نہیں ہیں۔ بہر حال ہر خط کا جواب دینا ضروری تھا۔ جس شعر کے متعلق تم نے استفسار کیا ہے وہ مجھے بہت پسند آیا۔ نیاز فتح پوری صاحب تنقیداً بڑے اچھے نقاد ہیں مگر مذہبیات سے چونکہ انہیں کوئی واسطہ نہیں ہے لہٰذا اس شعر کی بلندی تک پہنچ نہیں سکے۔ یہ فرق

[redacted]

یہ شعر نہیں ہے عرش والا شعر ہے۔ میں تمہیں سمجھائے دیتا ہوں۔ اس شعر کا تعلق حقیقت محمدیہ سے ہے۔ آئینہ ساز سے مراد ذات باری تعالیٰ اور اس کا آئینہ اس کی پہلی تخلیق نور محمد ہے۔ اور نور محمدؐ نے خلق ہوتے ہی تسبیح و تہلیل پروردگار شروع کر دی تھی۔ یہ چیزیں تمہیں علماء سے معلوم ہو سکتی ہیں یا ان کتابوں سے جو ان مسائل پر لکھی گئی ہیں۔

اب تم عکس کی آواز کا مقصد اور چونک اٹھنے کا اشارہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہو یہاں چونک اٹھنے سے مراد دادِ تخلیق ہے ہم نے اک ایسا فردِ کامل پیدا کیا جس نے پیدا ہوتے ہی ہمیں پہچان لیا۔

چونک اٹھا سن کے عکس کی آواز
آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز

صبا صاحب سے میری طرف سے سلام کہو اور کہنا کہ یہ مطلع پڑھ کر میرا جی بہت خوش ہوا اور میں صمیم قلب سے داد دیتا ہوں۔

سید آل رضا

محترمی تسلیم و نیاز

اتنا بڑا اختلاف غالباً عکس کی آواز کا کرشمہ ہے۔ اسی قبیل کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔ آجکل یہ کوئی بات نہیں رہی۔ افکار کراچی میں چند ماہ ہوئے کسی ترقی پسند شاعر شبیر بدر کی ایک غزل شائع ہوئی ہے جیسی کہ آج کل غزلیں عام طور پر ہوا کرتی ہیں۔ اس کا ایک شعر ہے،

قفل جڑے ہیں اُس گھر کی ہر کھڑکی میں، دروازوں میں
پھر بھی دروازوں سے اکثر اک آہٹ جھانکا کرتی ہے

اب اگر آہٹ جھانک سکتی ہے تو عکس آواز کیوں نہیں نکال سکتا۔ رہا یہ امر کہ آئینہ ساز کے توقع کے خلاف ایک نیا پہلو ہوا اس کا انحصار آئینہ ساز کی منزلت پر ہے۔ ہم آپ ایسے موقعوں پر آئینہ ساز اس خالق کو سمجھتے ہیں جس کی قدرت اور علم بے حد و انتہا ہے۔ اسو جہ سے اس کے لئے چونک پڑنے کا مفہوم ہمارے لئے بعید از قیاس ہے۔ آپ کے دوست کے مطلب اس شعر میں جو آئینہ ساز ہے وہ کم درجہ کا ہوگا۔ میں نے چونک اٹھنے کی جگہ پر اپنی طرف سے چونک پڑنے کا استعمال کیا ہے کیونکہ میرے نزدیک ان دونوں فقروں میں بعض موقعوں پر قابل لحاظ فرق ہے باوجودیکہ دونوں فقرے حد تک مترادف ہیں۔ اگر کوئی سوتے سے ہوشیار ہو جائے تو اُس محل پر چونک اٹھنا ہی کہنا مناسب ہوگا۔

شعر زیر بحث کے پڑھنے پن میں یہ ایک کمی بھی معلوم ہوتی ہے کہ شاعر کے اس مفہوم سے کہ آئینہ ساز عام طور پر دیکھتا تھا یہ مفہوم شعریت کے لحاظ سے کہیں بہتر ہے کہ آئینہ ساز نے آئینہ بنا کر پہلے پہل دیکھا اور کوئی عجیب ہوا۔ غالباً ان شاعر صاحب کا یہی مقصد ہوگا۔ مگر اسکے اظہار کے لئے مناسب الفاظ استعمال نہ ہو سکے۔ ایک اور بات ہے مگر مقابلتاً کم۔ وہ یہ کہ عکس کس کا ہے۔ ظاہر ہے کہ شاعر کا مقصود خود آئینہ ساز ہی کا عکس ہے مگر اس کا حصہ تو نہیں ملتا یہی خوبیٔ اظہار کے منافی ہے آئینہ دیکھنے والے کو اپنے عکس کے علاوہ دوسرے کا عکس بھی دکھائی پڑ سکتا ہے

آرزو صاحب کا ایک شعر ہے

"ایک چپ کر دیکھنے والے کی کیا جانیئے کیسا حالت دیکھی
آئینہ اتنے میں چھوٹ پڑا اور پھر کے ہر ہی صورت دیکھی"

میں نے ترقی پسند شعراء کا تمام تر ورد دیکھا ہے اور انکی خوبیوں کو حتی الوسع سمجھنے کی کوشش بھی کی لیکن ہوں تو بہر حال پرانے خیال ہی کا۔ مجھے غالب کا وہ شعر بہت اچھا معلوم ہوتا ہے جسکا دوسرا مصرعہ ہے۔

"میں ہوں اپنی شکست کی آواز"

وہی باتیں اگر زیر بحث عکس کی آواز والے شعر میں ہوتیں تو مجھے یہ بھی بہت برا نہیں تو کم سے کم بڑا ہی معلوم ہوتا۔ میں یہ مانتا ہوں کہ استعارہ کے طور پر غیر ذی روح کو ذی روح سمجھ لیا جاتا ہے۔ اور اس طرح اور صفات بھی اشیا میں فرض کرلی جاتی ہیں جو واقعتاً نہیں ہوتیں لیکن استعارہ کے معروضات میں مناسبت ہونا ضروری ہے۔ ورنہ پھر شاعری کیا رہ جاتی۔ شاعرانہ نقطۂ نظر سے ہر شے کی فریاد یا اسی قسم کی کوئی اور بات ضرور ہو سکتی ہے لیکن ہر شے کی جانب آواز کو منسوب کرنا اور وہ بھی بغیر کسی خاص پس منظر یا دلیل کے میرے نزدیک مناسب نہیں ہے۔ معاف فرمائیگا میں نے عمداً آپ ہی کے گرامی نامہ پر اظہار خیال کیا ہے۔ ایک بات اور عرض کر دوں۔ میں لکھنوی نہیں ہوں حالانکہ ادبی و ثقافتی فیض سب لکھنؤ ہی کا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا

صبا صاحب کے شعر پر آپ نے بڑی دلچسپ بحث چھیڑ دی ہے۔ عملی تنقید کا یہ اقدام خاص طور پر اس لئے بھی مستحسن ہے کہ ہمارے یہاں آجکل نظریاتی بحث کا رواج بڑھ رہا ہے اور لوگ فن پارے سے بتدریج دور ہوتے جا رہے ہیں اس طرح اگر آپ کوئی نظم لے کر اس پر اہل نظر کی آراء طلب کریں تو یہ بھی ایک اہم ادبی خدمت ہوگی

صبا صاحب کا شعر ہے،

"چونک اٹھا ہی کے عکس کی آواز
آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز"

شعر خوبصورت ہے اور بے عیب ہے۔ میرے نزدیک اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ خدا نے اس کائنات کو تخلیق کیا! اور جس طرح آئینہ ساز آئینے کو تخلیق کرتا ہے۔ پھر اس نے اس آئینہ میں اپنے عکس کو دیکھا اور اپنے ہی حسن لازوال میں یکسر کھو گیا تاہم اس سے کوئی ہنگامہ پیدا نہیں ہوا، کوئی لہر نہیں چلی کوئی طوفان نہیں اٹھا نہیں ہوا اسلئے کہ تخلیق کے اس عمل میں کوئی اجتہادی بات نہیں تھی۔ خیر سے خیر کو تخلیق کر لیا تھا اور ارتقاء کی صعود میں یہ کوئی اہم قدم نہیں تھا۔ لیکن پھر ایک ہیجان پیدا ہوا جو ارتقاء کا لازمی نتیجہ ہے اور جو خود خالق کے لئے بھی حیرت و مسرت کا وافر سامان بہم پہنچاتا ہے واقعہ یہ تھا کہ بے جان عکس میں حرکت پیدا ہو گئی اور اس مظہر قدرت میں عمل نے خود خالق کو بھی چونکا دیا۔ مزید وضاحت کے لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاعر کے نزدیک خدا خیر کی علامت تھا۔ اس نے فرشتہ کو پیدا کیا اور پھر آدم کو تخلیق کیا یہ عمل آئینہ ساز کے آئینہ کو تخلیق کرنے کے عمل سے شدید مماثلت رکھتا تھا۔ اس نے کہ خدا کی طرح فرشتہ اور آدم

چنانچہ عارضتا اور صبا کی نمایاں خصوصیت کا گویا ایک عکس ہے ـــــ اس عمل سے بحیثیت مجموعی کائنات میں کوئی نئی بات پیدا ہوئی ـــــ پھر ایک معذ نیر کا عمل اپنے ارتقا پر پہنچنے کے بعد یکا یک اپنی اجتہادی روش کی صورت میں نمایاں ہوا تمام دیا گیا ہے۔ فرشتہ اور آدم کی اس بغاوت کا سوال کے معلوم نہیں ـــــ خود خالق کائنات کے لئے یہ تحیرت اب کا امر تھا۔

تخلیق کائنات کی اس روایت سے قطع نظر ہر تخلیقی عمل اسی نہج پر کار بند رہتا ہے تخلیق کا مابہ الامتیاز اس کا انوکھا پن ہے ایک سیدھی سڑک پر چلتے چلتے یکا یک ایک پگڈنڈی اختیار کر لیتے ہیں۔ اور یہ پگڈنڈی آپ کو نہ صرف ایک بلند تر سے لے جاتی ہے بلکہ اس کے طفیل آپ زندگی کو ایک بالکل مختلف زاویئے سے دیکھنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ سے آپ کو وہ حیرت آمیز مسرت حاصل ہوتی ہے جو تمام مسرتوں سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک بڑے کی تخلیق خود اس کے خالق کو حیران کر دیتی ہے۔

شکیل بدایونی ـــــــــ

مکرمی سلطان جمیل نسیم صاحب

چونک اٹھا ہی کے عکس کی آواز۔
آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز

(صبا اکبرآبادی)

اس شعر کے بارے میں آپ نے میری رائے طلب کی ہے۔ ہر شاعر فنکار ہونے کے علاوہ ایک "ادبی مجذوب" کی حیثیت رکھتا ہے بے شمار شعراء کے یہاں ایسے اشعار بھی پائے جاتے ہیں جنکا مطلب وہ خود ہی سمجھے اور دوسرے نہیں اس لئے میرا مشورہ تو یہ ہے کہ اس شعر پر شعراء کی آراء حاصل کرنے کے بجائے اگر خود صبا صاحب کی رائے جاتی تو بہتر تھا۔

غالب کے یہاں تو ایسے بہت سے اشعار ہیں جنکا مطلب سمجھانے کے لئے ناقدوں نے شرحیں تصنیف کر ڈالی ہے اس دور کے ناقدین صبا صاحب کے اس شعر میں بھی کوئی جامع حسن تلاش کر لیں مگر جہاں تک میری حقیر رائے ہے میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ شعر مبہم ہے۔

آئینہ ساز کا اپنے عکس کی آواز سن کر چونک اٹھنا اس وقت تک قابل توجہ نہیں ہے جب تک کہ اس آواز کی وضاحت کی جائے۔ اور وہ آواز کسی بات کی شکل اختیار نہ کرے۔ اگر عکس دیکھ کر چونکنے کی بات ہوتی تو یہی ایک مطلب تھی کہ شاید وہ اپنے عکس کا حسن دیکھکر ایک استعجاب کے عالم میں چونک اٹھا ہو مگر شعر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عکس کی آواز سن کر چونک اٹھا۔ لہٰذا عکس کی آواز کی تشریح ضروری ہے موجودہ شکل میں یہ شعر مبہم ہو گیا ہے صرف آواز سن کر چونکنا کوئی معنی نہیں رکھتا ـــــ

صبا صاحب کے اشعار متعدد اوصاف ہوتے ہیں جن ان کی شاعرانہ عظمت کا عرصہ دراز سے معترف ہوں لیکن

ان کے کلام میں اگر ایک دو اشعار اس قسم کے بھی نکل آئیں تو کوئی قابلِ حیرت بات نہیں کیونکہ سب ہی کے یہاں کوئی نہ کوئی شعر ایسا ضرور ملتا ہے۔ چنانچہ ان کا زیرِ بحث شعر بھی بہت کے قارئوں کا ایک ایسا ہی ہے جو نیم تراشیدہ ہے

فضل الحق حقی ـــــــــــــــــــ

مکرمی تسلیم۔

صبا اکبر آبادی صاحب کا جو شعر آپ نے تحریر کیا ہے اس کا مفہوم میرے نزدیک بالکل واضح اور بہت خوب ہے۔

یہاں عکس سے مراد کائنات اور آئینہ ساز سے مراد خالقِ کائنات ہی ہو سکتی ہے ـــ یہ استعارہ شاعری میں بہت مانوس ہے مثلاً غالب۔

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز ✦ پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

آپ عکس کے وہ معنی لیں جو مذکور ہوئے ہیں تو عکس کی آواز کا مفہوم کھل جائے گا۔ گویا مخلوق کو ایک انفرادیت بھی حاصل ہے۔ اس نکتے کی مجازی تعبیر بھی یعنی عکس کا بول اٹھنا بہت دلچسپ ہے۔

ہاشم رضا ـــــــــــــــــــ

مکرمی تسلیم۔

آپ کی تحریر بعنوان "جولائی" کے جواب میں عرض ہے کہ تنقید کے لئے فرصت چاہئے جو کہ سرکاری نوکری میں مفقود ہے اس شعر کا جس کے بارے میں آپ نے میری رائے پوچھی ہے پہلا مصرعہ اگر یوں تبدیل کر دیا جائے تو میرے خیال میں اس کا کچھ مطلب نکل سکے

عکس ایسا تھا جیسے ہو آواز   آئینہ دیکھتا تھا آئینہ ساز

شاہد احمد دہلوی ـــــــــــــــــــ

میری رائے میں یہ شعر بامعنی ہے اور ایک گہرے تاثر کا اظہار کرتا ہے۔ ایک حس کا کام دوسری حس سے لینا لطافت سے خالی نہیں سننے کی چیز ہے مگر مومن خاں کہتے ہیں آواز تو دیکھتے اسی طرح اس شعر میں عکس دیکھنے کی چیز ہے مگر شاعر عکس کی آواز کو سنکر چونک اٹھا

صالحہ عابد حسین ـــــــــــــــــــ

مکرمی تسلیم عنایت نامہ ملا۔ دیر سے جواب دینے کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ آپ نے جو شعر لکھا ہے میرے خیال میں تصوف ہی میں ہے۔ یوں تو اسے مجازی میں بھی لیا جا سکتا ہے لیکن بظاہر تو میری سمجھ میں اس کے یہ معنی آتے ہیں کہ آئینہ ساز یعنی خالق کا اپنی دنیا کو اپنے ہی بنائے ہوئے آئینے میں دیکھ رہا تھا کہ عکس یعنی انسان کو دیکھ کر وہ چونک اٹھا۔ اب آپ اس سے یہ مطلب بھی لے سکتے ہیں کہ انسان کا عروج اور ترقی اور ستاروں تک اس کی پرواز اس کے فکر و تخیل کی جولانی کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اور اگر شاعر موجودہ زمانے کا ہے تو یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ انسان کی تخریبی کارروائیوں اس کی ایٹم اور ہائیڈروجن بم کی تخلیق اس کی دنیا کی تباہی کی تدبیروں کو دیکھ کر چونک اٹھا کہ اس نے انسان کو کیا بنانا چاہا اور وہ کیا بن گیا۔

انسان کو یا کائنات کو خالقِ حقیقی کا عکس پہلے صوفیوں نے بھی کہا ہے اور موجودہ شاعر کے ذہن میں بھی یہ تصور ہو سکتا ہے

[redacted]

نجمی صدیقی

عبدالحق بحیثیت محقق

(دوسری قسط)

ر کے والد کا لقب، علی متقی عجیب نہیں کہ خود میر کا عطا کردہ ہو اذکر میں ۱۱۔ کے متعلق مرقوم ہے "در تعلیم عالم اجسام یکہ عم
ان اختیار از دست خود نداده . . . . . . اگر میبدیے ریسہ معروف چاہئے (یکجا ئے ریاے سروقد صحیح ؟) شاید ملک
مرا نیک گریباں بر آورده اند در تنگاں ہم پلے استقامت بایں خوبی کم انشرده اند۔" ۔ ایک حکایت ان کی یہ بیان کی جھکر
، ماما روٹی پکانے گئی۔ یہ بھیری ظاہر کرنے لگے ماما بولی کہ یہ فقیری ہے یہاں ناز کو دخل نہیں، یہ غصہ ہی اٹھ چل دیئے اور ایک
نشان خود کو قتل کی دھمکی دے کر وہ انہم دہلی سے یہاں پر ہجوم ہو اور بہت سے لوگ مرید ہوئے ۔ مراتے ملاقات چاہی ؟
یہی معاملہ صمصام الدولہ سے بھی گذرا۔ حالانکہ ان کے قدیم حقوق بھے کثرت خلق سے تنگ آ کر ایک شب بعد نماز تہجد میاں
لیئے اور ویرانہ پہنچے مسجد کے دروازے پر بیٹھ گئے ۔ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک خوبصورت سپاہی پسر نظر آیا۔ انہوں نے اسے
ح دیکھا کہ وہ بیہوش ہو گیا۔ لوگوں نے کہا کہ اس پر رحم کیجئے۔ انہوں نے اسے پانی پر کچھ پڑھ کر پلایا اور وہ ٹھیک ہو گیا۔
اس کا بیاہ درپیش تھا۔ یہ اس کے یہاں جا کر مقیم تو ہوئے "مگر نرم خروی" میں رشتہ یک نہ ہوئے بلکہ خود ازدواج کے خلاف تقریباً
کی ۱۳ سطروں میں آتی ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس موقع پر وہ یہ بات بالکل فراموش کر گئے ہوں گے کہ نکاح کی اسلام میں تاکید ہے۔
ذاتی بیان تو اس کے بارے میں وہ یہ کہتے ہیں "بندہ نیز در ابتدائے جوانی از شراب عشق مست بودم آخر غیرانتظار ۔۔۔۔۔
بودم ۔۔۔۔۔۔ چوں خدا ۔۔۔۔۔ از ین گرفتاری رہائیم داد نمود ۔ ایں ہمہ را دو ختم و نیساں شمع بر سر یک پا سوختم۔ اکنوں تو دہ خاکستر
دل کجا گہوں انگیز د" برات ہو والیس آئی تو دولہانے انہیں نہ پایا، دلہن کو چھوڑ چھانہ فوراً ان کی تلاش میں نکل پڑا مگر نا سراس
اسے پایا نہ کسی اور باشندے کو اس "مشہور آفاق" (ذکر ص۲۲) درویش کا نام و نشان بھی معلوم دیتا، ڈھونڈتے سے کچھ
تو خضر سے خطاب کیا کہ آپ رہنمائی کریں (اس موقع پر جو الفاظ سینا دسہ کی زبان سے نکلے ہیں وہ ذکر کے ایک صفحے میں آئے

ن سے پتہ چلتا ہے کہ جس وقت بیان گئے ہیں، کوئی بی بی زندہ نہ تھیں، لیکن میر ص۳ میں امان اللہ کے متعلق لکھا ہے: "با وصف
عدم تجرد الفت" یہ بیاہ نہ جانے کے بعد کی بات ہے اور اس پر مضطر کہ اس وقت میر کی ماں بقید حیات تھیں۔
ے "مخضر راہ" ص۱۵ مگر امکان ہے کہ علی متقی سے مراد ہو۔

ہیں اور ان میں میر کا ایک فارسی شعر بھی ہے) خرچ سے استعانت کا احساس نہیں ثابت ہوئی، ایک بزرگ نمودار ہوا اور اس نے ان کے سوال کے بغیر بتایا کہ علی متقی اکبر آباد میں رہتے ہیں (صلا تا صلا) سید زادے کی علی متقی کے یہاں بڑی خاطر مدارات ہوتی تھی اور "برادر عزیز" کا لقب ملا۔ ان کا نام امان اللہ تھا۔ علی متقی کی توجہ سے تھوڑی مدت میں ان کا یہ عالم ہوا کہ فقیر کامل ہو گئے "اگر چشمک (یا شاید پھول چاہئے) عجائبات نمودے واگر آستین افشاندے کرامت ظاہر شدے"۔ امان اللہ کی ذہن کو تو دق ہو گئی اور جلد ہی دنیا سے صادری ہمان کے فیض کا دروازہ کھل گیا ایک دن بازار گئے تھے کہ ایک روغن فروش پر عاشق ہو گئے۔ واپسی کے بعد علی متقی کے قدم دیکھے سے پہنچے۔ تو انہوں نے کہا آج دیر ہو گئی۔ جواب دیا کہ جمعہ بازار کی سیر کو گیا، انہیں پہلے ہی سب کچھ معلوم تھا، بولے آئندہ اپنے حجرے سے بالکل باہر نہ نکلو اور دیکھو کیا ہوتا ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ خود چلا آیا۔ اس کا لقب "جوان عزیز" رکھا گیا اور اسی لقب سے "مشہور عالم" ہوا اکابر شہر اس کی عزت کرنے لگے اور "مریدان خاص" کو اس پر رشک آنے لگا ص۱۹ تا ص۲۲۔

احسان اللہ ایک مست درویش تھے۔ ان کے متعلق لکھا ہے:۔ "مشیر انام، خورشید سوار[1]... بشیر عشق الٰہی بدر شمع سویدا۔" اکبر آباد بقول میر بڑے عاجزانہ انداز میں میر کے ساتھ ان کے پاس حاضر ہوا تھا، یہ علی متقی کو امان اللہ کی معرفت پہنچے ہیں (ص۲۵ تا ص۳۳) اور بانیہ یہ درویش ان کی تعریف میں یہ الفاظ اپنی زبان سے نکالتے ہیں:۔ "مرد لیست کلا نکار زد اسرار خورشید آسمان درویشے (خورشید آسمان درویشی "چاہئے") مشہور جہان (اس کے بعد واؤ چاہئے) جان درویشی، دریائے پر ہنر (ضروری ہے) است کہ زدگو ہر تر بیروں مے آید عافیتہا کنار۔ خشک داریم از ما چہ کشاید" بایزید چو پیام انہیں پہنچا ہے ـــــ "کوتاہی از شوق بے پایاں نیست شکستہ پلئے (پائی چاہئے) کو چہ نمیدہد۔۔۔ میخواہد کہ ازیں خرابہ سر بہ بیروں نہد، تو قلندر منش لاابالی ہمی بہ نسبت تو کو چک بدال ادر حق۔۔۔۔ من بشرط مساعدت وقت دعائے (دعائے چاہئے)" ص۲۵

علی متقی سے ان کے پیر نے وعدہ کیا تھا کہ جب تمہاری موت کو ایک برس سے زیادہ نہ رہے گا تو کبود جامہ کا "سیرابہ پشہ" اس تمہارے پاس پہنچے گا۔ وہ آیا تو یہ سمجھ گئے کہ پیام موت آگیا ہے۔ امان اللہ کو اس کا علم ہوا تو وہ بولے کہ میں اس دن کے دیکھنے کو زندہ گا، اور یہی ہوا مرض الموت میں سانس لینی مشکل تھی، لیکن "اگر سخن راندے ایں رباعی خواندے، المصنفہ:۔ وقت است کہ رد مرگ کنم الخ"۔ علی متقی کو بہت صدمہ ہوا اور سوم کے روز انہوں نے اپنا لقب "عزیز مردہ" تجویز کیا اور شہر میں اسی لقب سے شہرت پائی انکا حلوا تقسیم کر رہے تھے (ظاہراً چہلم کے دن) کہ ایک تازہ ولایت جوان، احمد بیگ پہنچا۔ یہ صبح کعبہ جانا چاہتا تھا۔ مگر انہوں نے اسے سات ماہ روکے یہ مرید ہوا اور مرتبۂ کمال کو پہنچ کر عازم حج ہوا اس کا لقب بھی "جوان عزیز" رکھا گیا تھا ص۲۴ تا ص۵۵۔

ایک دن دھوپ میں محو باہمٹ خواہر زادہ امان اللہ کی عبادت کو گئے تھے سامنے ... ن آئے اور اپنی مسجد میں دو نمازیں (عشائین؟) اس کے بعد تپ آگئی جسے علی متقی "حرارت آفتاب[2]" کا اثر سمجھے علاج شروع ہوا اور ایک ماہ کے بعد یہ تشخیص ہوئی کہ دق ہے، ا...

---

[1] "خورشید سوار" تو خیر مرتبہ کچھ معنے نہیں رکھتا "شیراز..." خورشید سوار کیا ہے؟ کیا واقعی یہ کہنا چاہتے ہیں کہ خیر احسان کے دروازے پر سوار رہتا تھا یا یہ بھی خورشید سوار کی طرح ہے؟

[2] اس کا ترجمہ میر نے "لو" کیا گیا تھا اور زمانہ دسمبر بتایا گیا تھا، یہ شبہ اعتراض کیا کہ دسمبر میں لو کہاں۔ نثار احمد صاحب فاروقی مترجم نے یہ لکھا ہے کہ بیماری کا زمانہ اس سے پیشتر تھا میرا خیال ہے کہ یہ جمادی الاخریٰ تھا۔

انہوں نے غذا بند کر دی۔ نرگس کے پھولوں کی خوشبو ان کے لئے کافی تھی، علاج کرانے سے بھی انکار کیا، طبیب دوا لایا تو پیالہ زمین پر پھینک کر کہا "اے مردہ فشو پردہ تاثیر دوا از روز اول ظاہر بود ... . افسوس کہ نہ فہمیدی ..... تا قباحت فہمی مرضیست کہ علاج ندارد"۔

مال تو علی متقی کے پاس کچھ تھا نہیں، حافظ محمد حسن کو بلا کر کہا کہ ۳۰۰ کتابیں ہیں، بھائیوں میں تقسیم کر لو[۲]۔ انہوں نے کہا بھائی کمسن ہیں، جمع کر دیں گے ان کا حصہ بھی میرے پاس رہنے دیجئے، وہ اس پر راضی ہو گئے۔ میرے وصیت کی کہ میرے ذمے ۳۰۰ روپے باقی ہیں ادا کرنے سے قبل مجھے دفن نہ کرنا، میں نے جواب دیا کہ کتابیں تو بڑے بھائی کے سپرد کر دیں، قرض کہاں سے ادا ہوگا، جواب دیا کہ ۵۰۰ کی ہنڈی میں ہے ص۵۹ تا ص۶۰۔ یہ بات سچ نکلی ہنڈی موت ہی کے دن آگئی قرض ادا کیا گیا اور وہ اپنے پیر کے بغل میں دفن کئے گئے ص۶۱۔

ڈاکٹر عبدالحق نے مقالے میں لکھا ہے :۔ "معلوم[۳] ہوتا ہے کہ ...... اپنے وقت کے بڑے نامی درویشوں میں تھے اور اگرچہ وہ گھر سے نہیں نکلتے تھے مگر ان کی شہرت دور دور پھیلی ہوئی تھی" ص۲۰۳۔ مقدمے میں ان کی یہ عبارت ملتی ہے :۔ "بڑے پائے کے درویش تھے ... ان کے قدم چھوتے اور ہاتھ چومتے تھے، بڑے بڑے لوگ ان کے ملنے کی تمنا کرتے تھے"۔ علی متقی کا روحانی مقام کیا تھا، یہ ایک شخص ہی بتا سکتا ہے۔ ایسے لوگ جنہیں میری طرح کسی درویش سے ملنے کا بھی اتفاق نہیں ہوا وہ اس کا حال کیا جان سکتے ہیں، رہا ان کا شہرۂ آفاق ہونا تو یہ غلط محض ہے۔ ان کے زمانے سے لے کر اس وقت تک نہ جانے کتنے صوفیوں کے تذکرے لکھے گئے ہیں۔ جہاں تک میرا علم ہے کسی ایک میں بھی ان کا ذکر نہیں، تاریخ کی کتابوں میں بھی صوفیہ کے حالات ملتے ہیں، ان کے صفحات بھی ان کے ذکر سے خالی ہیں، تاریخ محمدی کے مصنف نے ان کا زمانہ پایا ہے اس نے اپنی کتاب میں سینکڑوں معاصرین کے سنین وفات دیئے ہیں، چنانچہ ان کے شاہ کلیم اللہ کا سال رحلت اس میں موجود ہے، لیکن یہ اس کتاب سے بھی غیر حاضر ہیں۔ لطف یہ ہے کہ حال کی کتابوں سے قطع نظر کسی کتاب میں باستثنائے ذکر و قاموس[۴] بیل میر کے والد کی حیثیت سے بھی ان کا نام نہیں۔ اگر یہ واقعی اپنے زمانے کے بڑے نامی درویش ہوتے تو ان کا عرس ہوا کرتا اور ان کا مزار زیارت گاہ خلائق ہوتا۔ آج یہ حال ہے کہ کسی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی قبر کہاں ہے۔ پہلے یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ محسن اپنے کو ان کا پوتا نہیں، اپنے باپ کے ماموں کا پوتا کہتا ہے۔ علی متقی کسی لحاظ سے بھی بڑے آدمی ہوں لیکن ... نہ تھا۔ دو باتیں اور قابل توجہ ہیں :۔ دفن کے لئے ہنڈی کا انتظار ہے، مگر مریدوں میں سے کسی کو توفیق نہیں ہوتی۔ اس کا نام کیا ہے، "بدلان بازار" کار پہلے لانا مریدوں کا فعل نہیں (ص۶۱) بڑے بزرگوں کی موت کے بعد سجادہ نشینی کا سوال بڑا اہم سوال ہے۔ ذکر میں اس کے متعلق صرف اس قدر ہے :۔ "از ؛ تف اولادی ہم گذشتم سجادہ نشینان او سلامت باشند ... کنند وجہ فراخند" ...... علی متقی کو تصوف سے دلچسپی ہوگی ممکن ہے دو چار مرید بھی ہوں مگر ان میں کوئی بات ایسی نہ تھی کہ معاصرین ان کی

---

۱ یہ صحیح ہے۔ یاد آتا ہے کہ میں نے کہیں "برت" کی جگہ کچھ اور تجویز کیا تھا۔

اس موقع پر بہن کا ذکر نہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق مقدمے میں علی متقی، احسان اللہ وغیرہ کے اقوال کے مدح سرا ہیں، مگر یہ محض پیش افتادہ باتیں ہیں جو نہ جانے کتنی تصوف کی کتابوں میں ہیں۔

عجب نہیں اگر ذکر بیل کی نظر سے گذری ہو، علی متقی کا پسر ہوتا بیل نے ذکر میں دیکھا ہوگا۔

اہمیت کے حسرت ہوتے اور بعد کی نسلیں انہیں یاد رکھیں۔

(۲) ایک درویش کی حیثیت سے خود اپنا احترام کرانے کی خواہش ــــــ

میر ی درویشوں کے متعلق لکھتے ہیں :- "ملاقات ایشاں برکت بسیار سے دارد" ص۲۴: "کیمیا گر اند کہ خاک ناچیز را بنظر بازر دہ اندر تصرف ایں کارخانہ درویشانند یعنی ہر چہ ہستند ہمیں ایشانند انچہ خواہی بدست مدعا افراشتہ می دہند" ص۳۱: "در صحبت ایں طائفہ شیشہ بند کردن سنگ بدان زدن است زبان را نگہ باید داشت کہ شکر آب ایشاں شربت شہادت بے ادب می شود" ص۴۳ ــــ شاعر اور انشاپرداز کی قدر ہوسکتی ہے، مگر قدم بوسی کہاں، اب میر کے متعلق دوسروں کے اقوال دیکھیے جو ذکر میں ہیں :ــــ "ایں چہ آتشے است کہ در دل تو نہاں است، چہ سوزیست کہ ترا با جاں نسبت؟" (خطاب پدر میر ص۶) "ایں بچہ نو سوزندہ باست اما چنیں معلوم می شود کہ اگر بخوبی پرورش برآورد، ہمیں یک پروانہ آں مرتبہ تا آسماں خواہد رفت" (قول احسان اللہ ص۱۵) "بہ ایک بہت بڑے درویش، تربیت کرنے والے، فقیہ کامل اور بہت ابتدا ہی سے بڑے بڑے صوفیوں کی صحبت پائی" نسخۂ رامپور کے عبارات جو میر میں نقل ہوتے ہیں (نسخہ مطبوعہ سے خارج) ان میں یہ بھی ہے کہ "کہ فقیر و شاعر و متوکل دانستہ اطریق تذ چینت نی کو" ص۲۰۵، کلیات میں یہ شعر بھی ہے :-

سینہ میں میرا حساب دو درویش ود ردمند ــــ سر رکھتے ان کے پاؤں پہ جلتے اور ہے یہ (کذا)

میر کو ان درویشوں کے باوجود بھی لوگوں نے پہنچا ہوا درویش نہ مانا تو یہ ان کا قصور نہیں۔

(۳) سوتیلے بھائی کو بدنام کرنے کی خواہش ــــ

کتابیں حوالہ حافظ ... حسن کرنے کے وقت باپ نے جو اقوال میر از مزاج اسا زاو خبر بود " ابت کیا وہ ... پر تر کی اس کردہ لیکن کی پاسی تو ہنوز نہ رفتہ است ، میخواہی کہ لقمان بیچارہ بازی دہی ... غالب کہ میر محمد تقی دست نگر نو نہ شود ، اگر نو دیگہ تشویش خواہی آ ... کاسہ برسر بستہ خواہد شکست و انشر حرمت تو بیش ... با ما نخواہد نشست، آنچہ او خواہی رسید ، ... یا ... جلد کتاب پوست تو خواہد کشید ص۵۹ ـ وفات پدر کے بعد کی بات :ــــ "دیدہ کہ پدر آستین گرد داشت ... قرض خواہاں دامن گیر خواہند شد ... اگر کسا نیک ہمگیں زاد و ام بر وند آنہا را نند و کار آنہا من در حیثیت پسر خیل کار نگذشتم ازو وقف والد ہم گذشتم سجادہ نشین ان او سلامت باشد ... آنچہ مصلحت وقت خواہد بود خواہند نمود" ص۶۰ اس کے بعد ص۶۱ اور ص۶۳ میں آتا ہے ایک جگہ لکھا ہے کہ باپ کے مرنے کے بعد بھائی کا جو کینہ رکھتے تھے دست نگر نہ ہوا ، دوسری جگہ یہ کہ جب میں دہلی جا کر ان کے ماموں آرزو کے یہاں ٹھہرا اور بیاران شہر سے چند کتابیں پڑھ کر اس قابل ہوا کہ کسی کا منہ دیکھ سکوں تو ان کا خط آیا کہ میر محمد تقی فتنۂ روزگار ہے اس کی تربیت نہ کیجیے اور دوستی کے پردے میں اس کا خاتمہ کیجیے ، اور ذیل تو بہ طلب ہیں :- (الف) باپ کا سلوک بڑے بیٹے کے ساتھ نازیبا تھا مرتے وقت بھی بھائیوں میں فساد کا بیج بو گئے (ب) خیر نہیں سوتیلی ماں کا برتاؤ محمد حسن کے ساتھ کیسا رہا تھا (ج) محمد حسن نہ زندگی میں کسی معاملے میں دخیل تھا نہ باپ کی موت کے بعد وقف وادی سے فائدہ اٹھاتے ، سجادہ نشین ہونے کا خواہش مند تھا (د) باپ کے وصی میر تھے ، محمد حسن نہیں ، (ر) یہ ایک مہمل سی بات تھی کہ جب تک قرض ادا نہ ہو لاش دفن نہ ہو ، اس کے لیے اگر ہنڈی نہ بھی آتی تو بقال روپے لے آتے تھے ۔ محمد حسن کے لیے قرض ادا کرنے کی دو ہی صورتیں

اپنے پاس سے روپے نکالنا یا کتابیں فروخت کرنا۔ اس کی مالی حیثیت کا ہمیں علم نہیں کتابیں اگر فورا بیچی جاتیں تو بہت کم دام ملتا۔ دو
شیخ کی جو باتیں اس کی طرف منسوب ہیں وہ نہ معلوم کہاں تک صحیح ہیں میر نے راست گوئی سے کام لیا ہے (امور بالا میں سے کسی کے متعلق
طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا) تو یہ البتہ قابل اعتراض ہے یہ الزام بہت سنگین ہے کہ اس نے آرزو کو یہ لکھا تھا کہ دوستی کے پردے میں میر
کیا جائے۔ میں اسے ہرگز باور نہیں کر سکتا۔ بات یہی اس سلسلے میں توجہ طلب ہے کہ میر دہلی میں اپنے سوتیلے بھائی کے یہاں خود
ل کے مطابق بغیر اس کے کہ وہ انہیں نقصان پہنچانے کی تحریک کرے اتنی مدت تک رہے کہ کسی کے "مخاطب صحیح" ہو سکیں میرا
ہے کہ جو مواد ہمارے پاس ہے وہ اس کے لئے کافی نہیں کہ ہم ڈاکٹر عبدالحق کی طرح اسے ظالم اور میر کو مظلوم قرار دیں۔

آرزو کو بدنام کرنے کی خواہش

میر بقول صاحب نوادر الکملاء[۲] ۱۷ برس کی عمر میں (دوسری بار) دہلی گئے (مقدمہ کلیات میر) یہ ۱۱۵۳ھ کے اوائل کا زمانہ
ذکرہ ۶۳ میں ہے "بار دیگر دہلی رسیدم و منتہائے (ذکر منتہائی) بے منتہائے (ذکر منتہائی) خالوے برادر کلاں ... کشیدم
سے پیش او ماندم و کتابے چند از یاران شہر خواندم چوں قابل ایں شدم کہ مخاطب صحیح کسے می تواند شد، نوشتہ اخوان
ید (وہی جس کا ذکر آچکا ہے) ... نظر بہ خصومت ہمشیر زادہ خود بدی اندیشید اگر روزے چار می شدم چار چار می زد و اگر
بہ دم، نواخوانی می نمود ... اکثر سلوک معاندانہ می کرد ... با مدا حتیاج یک سر مو از و کمی خواستم اما سلامتی نمی گذاشت
گر بتفصیل بیان کردہ آید، دفترے جداگانہ می باید" اس بد سلوکی کا اثر یہ ہوا کہ میر کو سودا ہو گیا (اسی کا حال خواب و خیال میں نظم
ذکرہ میر میں میر جعفر کی شاگردی (کتب درسی) اور سعادت کی ترغیب سے ریختہ گوئی کا ذکر ہے لیکن اس میں ایک لفظ آرزو
اکے علمی استفادے کے متعلق نہیں (ص۶۲ تا ص۶۶)۔ اس کے بعد ایک دن کھانے پر بیٹھے تھے کہ کچھ بے مزگی کی بات ہوئی "
وشنیدم" کھانے پر ہاتھ بھی نہیں ڈالا تھا کہ منہ کھڑے ہوئے۔ اور حسن اتفاق سے اسی دن رعایت خان کے ملازم ہو گئے
ت تک تو ظاہرا انہیں کے ساتھ تھے یہ بات صراحتہ نہیں لکھی کہ کب تک بعد میں رہے یا ان کے یہاں سے اٹھ گئے ۱۱۶۵ھ میں نکات الشعرا
انہوں نے ایک جگہ آرزو کو "استاد و پیر و مرشد بندہ" لکھا اور دوسری جگہ یہ الفاظ ان کے بارے میں ان کے قلم سے نکلے۔
ند تعالیٰ ابقاء شاعر زبردست ... عالم فاضل تا حال ہمچو ایشاں بہ ہندوستان ... بہم نرسیدہ، بلکہ بحث در ایران می برد ...
شاں از چیزہا (چیزے) بیان بیرون ست ہمہ استادان ضبوط ... ریختہ ہم شاگرد آں بندہ گوار اند۔ گاہے برائے تفنن طبع و ریختہ شعر ریختہ فرمود،
اعتبار را کہ ما اختیار کردہ ایم اعتبار دادہ اند" ص۲۵۔ جاوید خاں کے قتل (۱۱۶۵ھ) کے ذکر کے کچھ بعد انہوں نے ذکر میں لکھا کہ "میں
خالو گذاشتہ نظر بریں کہ مرا بچشم کم خواہند دید در حویلی امیر خاں ... سکونت اختیار کردم و بلطائف الحیل بسر بردم" ص۷۳۔ ہماگی سے

ں کے معنی یہ کہ محمد حسن اور آرزو میں میر کی زندگی کا خاتمہ کر دینے کیلئے سازش تھی۔ یہ بات میر کے منہ کیطرف دیا وہ تسلیم نہیں کی جا سکتی
ں کتاب میں دوبار دہلی جانے کا ذکر نہیں
یا تلخ؛
فاصیل سے گریز کیا ہے۔

پڑوس مراد ہے تو چاہئے تھا کہ اس سے قبل آرزو کے یہاں سے چلے جانے کا ذکر ہوتا۔ میر سے یہ بعید نہیں اگر ان کا مطلب یہ ہو کہ اس موقع پر انہوں نے آرزو کے یہاں کا قیام ترک کیا، میر نے آرزو کے اودھ جانے اور وہاں فوت ہو جانے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: ۔ خالوئے من بادیہ پیماستہ طمع شد یعنی در لشکر شجاع الدولہ بایں توقع رفت کہ برادران اسحاق خاں ۔۔۔ نظر بر حقوق سابق رعایتے خواہند کرد، چیزے بادبدستش نیامد، لکد زمانہ خوردہ وہم آنجا مرد، مردۂ اورا آوردند و در حویلیش نجاک سپردند" ذکر میرؔ ۵۰

ڈاکٹر عبدالحق آرزو کو بھی ظالم سمجھتے ہیں اور شاگردی کو افسانہ۔ تلمذ کے متعلق مقدمے کی عبارت یہ ہے: — یہ جو مشہور چلا آتا ہے کہ ۔۔۔۔ آرزو ۔۔۔۔ میر کے استاد تھے، صحیح نہیں، ہاں وہ اتنی بات کے تو ضرور دار مزور ہیں کہ دوبارہ جب دلی آئے تو ماموں کے یہاں ٹھہرے (یا ان شہر) میر جعفر کے تلمذ کے ذکر کے بعد ۔۔۔ میر سعادت علی ۔۔۔۔ نے میر ۔۔۔ کو ریختے میں شعر موزوں کرنے کی ترغیب دی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ کسی کے شاگرد نہ تھے بلکہ شاعر پیدا ہوئے تھے"

ڈاکٹر عبدالحق نے یہ نہیں بتایا کہ نکات میں جو اقرار ہے، میر اس کے کیوں پابند نہیں محسن کی شہادت حسب ذیل ہے:۔

"رئیس شعرائے ریختہ گویاں، عم راقم میر محمد تقی میرؔ ۔۔۔۔ از فیض تربیت آنجناب در ۔۔۔۔ ریختہ صاحب کمال شدند در زبان فارسی نیز از صحبت آن سراج المحققین استعداد کلی پیدا نمودند (محاکمات الشعراء)

قائم کا قول ہے کہ:۔ "در خدمت ۔۔۔۔ آرزو حظے دانش اندوختہ" حسن و مبتلا دونوں نے شاگرد آرزو لکھا ہے لطف کہتا ہے کہ "خان مذکور کے فیض صحبت سے نظم ریختہ کی کیفیت باریکیوں کے ساتھ اٹھائی ہے" قاسم نے شاگردی کے انکار پر یک گونہ ملامت کی ہے:۔ "نسبت تلمذ ہم جناب ۔۔۔ خاں ۔۔۔ دارد، اما نبا بر نخوتیکہ در سرش جا گرفتہ، ازیں امر کہ فی الحقیقت فرولیت ابائے کلی بمیان آرد"

محسن نے محاکمات الشعراء میں لکھا ہے کہ شعرائے ریختہ آرزو سے اپنے کلام پر اصلاح لیا کرتے تھے۔ ایہام بندوں میں اس نے آرزو و مضمون و احسان کے بعد کے شعراء میں سودا و میر و درد کا نام لیا ہے، میر سے متعلق اس کی عبارت نقل ہو چکی ہے۔ سودا کے بارے میں اس کا قول ہے:۔ "از جناب حضرت ۔۔۔۔ دقائق محاورۂ زبان ریختہ را تحقیق نمود و اشعار خود را برائے اصلاح از نظر مبارک ۔۔۔ میگذرانید" ۔۔۔ درد کی نسبت اس کا بیان ہے کہ ۔۔۔ "از یمن تربیت حضرت ۔۔۔۔ در زبان ریختہ استاد گردیدہ"۔

آرزو نے تنبیہ الغافلین میں خود کہا ہے کہ آبرو، مضمون اور یکرنگ ان سے اصلاح لیا کرتے تھے آرزو اپنے عہد کے بڑے ایران شناسوں میں محسوب تھے بقول قاسم انہیں "علوم رسمیہ" پر بھی "عبور" تھا اور وہ شرح مطالع اور شرح حکمت العین وغیرہ کا درس دیا کرتے تھے۔ مجموعہ نغز ص۲۴

\+ \+ \+ \+ \+ \+ \+ \+ \+ \+

ﮯ۵ یہ بات صحیح نہیں، معقول مشاہرہ مقرر ہوا تھا، لطف یہ ہے کہ آرزو اپنی وفات کے بعد بھی میر کے کام آئے۔ آصف الدولہ میر کو بلوانا چاہتے ہیں، سالار جنگ کے متعلق میر نے خود لکھا ہے کہ۔ نظر بر ربط قدیم کہ خالوئے من (کذا) بایشاں (با ایشاں چاہئے) بود گفتند ۔۔۔ میر البتہ بیاید" ص۱۳۱

شاہ ولی الرحمٰن کاکوی

غلطیہائے مضامیں مت پوچھ

اردو ادبیات میں غزلگوئی اور تذکرہ نگاری کی رفتار تقریباً متوازی رہی ہے اگرچہ ولی سے قبل بھی دکن میں بہت سے اردو [شاعر] ہوئے اور انہوں نے غزلیں بھی لکھیں اور مرثیے اور مثنویاں بھی لیکن یہ واقعہ ہے کہ ولی کی شاعری انکے پیشرو شعراء سے زیادہ [بلند] اور "البدر کالنجوم" کی حیثیت رکھتی ہے۔ لسانی حیثیت سے دکنی شاعری کی اہمیت مسلم ہے لیکن ادبی حیثیت سے [ولی کی] شاعری زیادہ اہم ہے۔ ولی کے انتقال (۱۱۱۹ھ) کے بعد محمد شاہی و احمد شاہی دور میں تذکرہ نگاری شروع ہو گئی۔ سب سے [پہلے] امام الدین [illegible] نے محمد شاہی دور میں ایک تذکرہ لکھا مگر یہ تذکرہ نایاب ہے اس کا سال تصنیف بھی معلوم نہیں آرزو نے ۱۱۶۲ھ میں تذکرہ شعرائے فارسی (مجمع النفائس) مرتب کیا۔ سودا کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ایک [تذکرہ مر]تب کیا تھا چنانچہ مجموعۂ نغز میں اسکا ذکر ہے۔ بہرحال یہ تذکرہ عالم مثال میں ہو تو ہو عالم اجسام میں اسکا وجود مفقود ہے۔ [میر،] قائم، اور خواجہ حمید الدین نے ۱۱۶۵ھ میں اپنے اپنے تذکرے لکھے جنکا نام نکات الشعراء، تحفۃ الشعراء اور مخزن نکات ہے۔ اسکے بعد تو تذکروں کا انبار لگ گیا جن کا ذکر طوالت سے خالی نہیں۔ ان تمام تذکروں میں محاسن بہت کم اور [معائب] بہت زیادہ ہیں۔ انکی ترتیب علمی نہیں اشعار کے حالات بہت مختصر ہیں اور کام کی باتیں بہت کم ملتی ہیں۔ ایک بڑا عیب ان تذکروں میں [یہ ہے کہ] عموماً شعراء کی پیدائش و وفات کا سال درج نہیں کیا جاتا ہے۔ اگر دیزی، خواجہ حمید الدین اور قائم کے تذکروں میں کسی شاعر کا سال ولادت مذکور نہیں۔ حسن نے صرف ایک شاعر (افصح شاگرد بیدل) کا سنہ وفات ۱۱۹۲ھ درج کیا ہے۔ شفیق، مصحفی، لطف، علی [ابراہیم] خان خلیل وغیرہ نے اپنے تذکروں میں کہیں کہیں تاریخیں بھی دی ہیں۔ لیکن بہت سی تاریخیں غلط ہیں۔ میں ان اغلاط کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔

(۱) عقد ثریا مصحفی (۱۱۹۹ھ) "آرزو" در سنہ یک ہزار و یک صد و یک (۱۱۰۱ھ) بطون عدم بہ بارگاہ ظہور گذاشتہ۔ آرزو کی [تار]یخ ولادت ۱۰۹۹ھ ہے۔ "[illegible] غیب" مادہ تاریخ ہے۔ خوشگو نے سفینۂ خوشگو میں آرزو کا جو ترجمہ شامل کیا ہے وہ خود [آرزو کا] نظر کردہ ہے اس میں بھی یہی سال ہے مادہ تاریخ درج ہے۔ بیدل عظیم آبادی کا سال رحلتش یک ہزار و یک صد و چہل و سہ ۱۱۴۳ھ [ا]ن کا صحیح سال وفات ۱۱۳۳ھ ہے۔ اور آزاد بلگرامی کے مصرع سے "میرزا بیدل از عالم رفت" سے یہی سال نکلتا ہے۔

(۲) چمنستان شعراء شفیق اورنگ آبادی (۱۱۷۵ھ) "امیر خان انجام" در سنہ تسع و خمسین و مائۃ و الف ۱۱۵۹ھ تاریخ قتلش [ن]دھیہ بالکل صحیح ہے کہ انجام ۱۱۵۹ھ میں مقتول ہوئے چنانچہ "نیم جیدہ" مادہ تاریخ ہے لیکن شفیق نے جو قطعہ تاریخ درج کیا ہے

آن عمدہ صنع آفرینان ٭ درخلد بریں نمود آرام
وقت آن یگانہ گشت تاریخ ٭ جان داد امیر حسان انجام

اسکے آخری مصرعے کے اعداد ۱۱۲۰ ہوتے ہیں۔ تیسرے مصرع میں ایک عدد کے تخرجہ کا اشارہ دیا جاتا ہے۔ یہ ایک عدد کم کرنے سے ۱۰۵۹ اعداد باقی رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سو اعداد کی کمی ہو گئی۔ یہ کمی ... ہوتی ہے۔ لہذا مصرع تاریخ غلط ہے۔ حاجی میر علی اکبر دال حاجی کے ترجمے میں انکے پیر شاہ یسین کی تاریخ وفات سے متعلق یہ قطعہ درج ہے۔

شیخ عالی قدر صاحب معرفت ٭ رحلتش آمد دل ما را بدرد
گفت تاریخ وصال او خرد ٭ شاہ یسین یگانہ فوت کرد

آخری مصرع سے ۱۱۲۵ برآمد ہوتا ہے البتہ یسین یہاں پر "یٰس" کے معنی میں ہے کیونکہ یسین کے اعداد ۱۳۰ ہوتے ہیں اور یٰس کے صرف ۷۰۔ یسین کے ۱۳۰ عدد لینے سے ۶۰ عدد کی زیادتی ہو جاتی ہے۔ ورایں حالت میں مصرع آخر کے اعداد ۱۱۸۵ ہو جائیں گے۔ چونکہ یہ تذکرہ ۱۱۷۵ھ میں تمام ہوا اس لئے یہ ماننا پڑیگا کہ شاہ یسین کی وفات ۱۱۲۵ھ میں ہو چکی تھی۔ اسکے بعد شفیق لکھتے ہیں کہ عبدالقادر مہربان نے بھی سات عدد کے تعمیہ سے یہ قطعہ لکھا۔

شاہ یسین آیت روشن ز آیات الٰہ ٭ کرد رو از عالم فانی بفردوس بریں
ہاتفے از چشم خود سیارہا افشاندہ گفت ٭ سال تاریخ "آیۂ یسین را تا مرسلین"

لیکن مصرع آخر سے ۱۱۳۸ برآمد ہوتا ہے اگر یسین کے ۱۳۰ عدد لئے جائیں ورنہ ۶۰ اعداد اور کم کرنے ہونگے۔ تیسرے مصرع میں اس بات کا اشارہ ہے کہ آنکھوں سے سیارے (آنسو) گرے جن کی تعداد سات ہے تو سات عدد مصرع آخر کے اعداد سے اور کم کرنا ہوگا۔ بہرحال مصرع تاریخ غلط ہے۔ یہاں پر شفیق نے تخرجہ کی بجائے لفظ تعمیہ استعمال کیا ہے جو صحیح نہیں۔ واضح رہے کہ اگرچہ شفیق نے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی تھی تذکرہ کی تکمیل کے وقت انکی عمر صرف ۱۸ سال کی تھی۔ اس عمر میں ایک سال کے اندر ایسے ضخیم تذکرہ کی تکمیل کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ ظاہر ہے کہ عجلت کی وجہ سے لغزش قلم اور سہو نظر کا کافی امکان تھا۔

داؤد کے ترجمے میں شفیق رقم طراز ہیں کہ داؤد کے صاحبزادے مرزا جمال اللہ عشق سے انہیں معلوم ہوا کہ مرزا داؤد در سنہ سبع و خمسین و ماۃ و الف (۱۱۵۷ھ) وفات یافت۔ لیکن شفیق نے دو شعروں کا جو قطعہ تاریخ لکھا ہے اسکے آخری مصرع سے ۱۱۶۹ برآمد ہوتا ہے اور یہی داؤد کا صحیح سال وفات ہے۔ لہذا عربی الفاظ میں جو سال وفات دیا گیا ہے وہ غلط ہے۔ یہ غلطی خود شفیق کے سہو نظر یا لغزش قلم سے ہوئی ہو یا کاتب کی تحریف ہو۔ سبع و خمسین کی بجائے ثمانیہ و ستین ہونا چاہئے۔ محمد شاہ کی تخت نشینی کے بارے شفیق لکھتے ہیں کہ "بتاریخ یازدہم ذیقعدہ سنہ تسع و عشرین و ماۃ و الف (۱۱۲۹ھ) بر تخت شاہی جلوس فرمودہ" محمد شاہ ۱۱۲۹ھ میں نہیں بلکہ ۱۱۳۱ھ م ۱۷۱۹ء میں تخت پر بیٹھے تھے۔ لہذا تسع و عشرین کی بجائے اثنین و ثلاثین ہونا چاہئے۔

میر عبدالقادر مہربان کے ترجمے میں میر نورالدین علی خاں رنگین کا ذکر آیا ہے۔ مگر انکا نام نورالدین کی بجائے ضیاء الدین ہے۔ یہ

معلوم نہیں یہ تصنیفی غلطی ہے یا کتابت کی۔ ضیاءالدین حسین خاں تو رنگین کے والد کا نام تھا (تحفۃ الشعرا)۔ لطف یہ ہے کہ رنگین کے بیان کے والد کا نام ضیاءالدین حسین خاں خود شفیق نے بھی بتایا ہے میر نورالدین حسین خاں رنگین (تحفۃ الشعرا میں نورالدین علی) رنگین ہے) کے ترجمہ میں [illegible] وفات ۱۱۷۳ھ بتایا گیا ہے۔ اور ثبوت میں مہربان کا قطعہ درج ہے جس کے پہلے مصرع سے
رفت از جہاں رنگین [illegible] ۱۱۷۳ھ کی بجائے صرف ۱۱۴۳ھ برآمد ہوتا ہے۔ آگے چل کر شفیق لکھتے ہیں کہ کوئی [illegible] موت نہیں سمجھتے ہیں کہ کسی نے [illegible] ہوگا [illegible] ان کو ___________ [illegible]

[illegible] رفت از جہاں [illegible] کیونکر تاریخ لکھی [illegible] تعجب [illegible] ہے کہ شفیق تحریر [illegible] اتمام چمنستان شعرا بہ بانی تواریخ رنگین کر بوقت موت [illegible] تاریخ [illegible] جمادی الاول [illegible] ۱۱۷۰ [illegible] روز جمعہ یک پاس روز برآمدہ در بلدہ رنگین [illegible] مفاجات [illegible] انشا [illegible] (تاریخ)

[illegible] معنی [illegible] رنگین ۔۔ جو شد بہ گلگشت گلزار عقبیٰ
ندا داد ہاتف [illegible] سال [illegible] ۔۔ [illegible] رنگین غایبانہ از شد ز دنیا

[illegible] کہ شفیق [illegible] دونوں بیانوں میں اختلاف [illegible] ہے اور رنگین کی وفات ۱۱۷۰ھ میں واقع ہوئی تھی یا ۱۱۴۳ھ [illegible] صاحب اس پر روشنی ڈال سکیں گے۔

(۳) تذکرہ ہندی مصحفی [illegible] محمد [illegible] ناگرے جو شش عظیم آبادی کا نام محمد روشن [illegible] [illegible] تذکرہ ریاض الفصحا میں موجود ہے [illegible] عمر تقریباً [illegible] سال [illegible] شاہجہان آباد [illegible] حاتم کی پیدائش ۱۱۱۱ھ میں ہوئی تھی خود مصحفی [illegible] اور [illegible] مصحفی نے اپنی عمر کا اندازہ غلط لیا [illegible] لکھدیا کہ سو برس کے قریب عمر ہوگی۔ یہ تذکرہ [illegible] شروع ہوا اور ۱۲۰۹ھ میں اس کی تکمیل ہوئی [illegible] اس [illegible] سال [illegible] حاتم کا انتقال ہو گیا ایسا معلوم ہوتا ہے [illegible] ۱۲۰۷ھ میں پیر [illegible] حاتم کا انتقال ۱۱۹۷ھ میں ہوا تھا۔ تاریخ انتقال کا ثبوت خود تذکرہ [illegible] شعرا [illegible] قطعہ [illegible] درج ہے جس کے آخری مصرع سے یہی سال برآمد ہوتا ہے
شاہ حاتم [illegible] قطعہ [illegible] ۔۔۔ رحلت کرد [illegible] لہٰذا انتقال کی عمر ۸۶ سال کی تھی۔ [illegible] ترجمہ میں مصحفی لکھتے ہیں [illegible] سال است کہ درد [illegible] شفا یافتہ [illegible] اس سے معلوم ہوتا ہے ۱۲۰۰ھ میں [illegible] درد کا سال وفات ۱۱۹۹ھ ہے۔ ضیاءالدین ضیا کے متعلق مصحفی نے لکھدیا ہے کہ ابتدا میں [illegible] قاضی عبدالودود صاحب کا خیال ہے کہ اس کی [illegible] سند نہیں مصحفی نے تین ہمنام شاعروں کا یک جا ذکر کیا ہے [illegible] قدرت اللہ قدرت جس سے حکیم قدرت اللہ خاں قاسم مراد ہیں جن کا تذکرہ شعرا مجموعۂ نغز ہے۔ (۴) مولوی [illegible]

جس سے قدرت اللہ شوق مؤلف طبقات الشعرا مراد ہیں۔ (۳) شاہ قدرت اللہ قدرت دہلوی میر شمس الدین فقیر کے رشتہ دار تھے اور جنکا انتقال ۱۲۰۵ھ میں مرشدآباد میں ہوا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت اللہ علے و قدرت اللہ مے دونوں پہلے قدرت تخلص کرتے تھے بعد کو قاسم اور شوق تخلص اختیار کیا۔ مصحفی نے میر قمرالدین منت کے انتقال کا ایک قطعہ تاریخ درج کیا ہے جس کے آخری مصرع سے ۱۲۰۳ھ برآمد ہوتا ہے ــــ منت کجا و زمزمہ شاعری اد۔ لیکن حسین علی خاں عاشق عظیم آبادی کے تذکرہ نشتر عشق سے معلوم ہوتا ہے کہ منت نے ۱۲۰۸ھ میں انتقال کیا تھا اور یہی صحیح ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب بھی تحقیق کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں۔

(۴) ریاض الفصحا مصحفی (۱۲۳۶ھ) مصحفی نے نواب علی ابراہیم خاں خلیل عظیم آبادی کا تخلص "حدت" تحریر کیا ہے۔ جیسا کہ قاضی عبدالودود صاحب کا خیال ہے "حدت" "حال" کی تحریف ہے کیونکہ خلیل کا تخلص حال بھی تھا۔ میر حسن عسکری پسر دوم میر تقی میر کا تخلص "زار" لکھا ہے۔ ممکن ہے پہلے یہی تخلص ہو اور بعد میں عرش تخلص اختیار کیا ہو۔ انکی عرفیت میر کلو تھی۔ مصحفی کا یہ بیان کہ عسکری نے ناسخ سے اصلاح لی تھی صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ میر کا فرزند ناسخ کا شاگرد کیونکر ہو سکتا ہے۔

(۵) گلشن ہند۔ مرزا علی لطف (۱۲۱۵ھ) شاہ عالم آفتاب کے ترجمہ میں ہے۔ "کہ شاہزادۂ عالی تبار عالی گوہر کرم ناسا کی ندی پاس کہ صوبہ عظیم آباد کی سرحد میں ہے۔ مجبور ہو کے تھوڑی دور رہ گئے تھے"۔ اس پر حاشیہ میں نوٹ ہے کہ: "یعنی اس ندی سے جس کا نام کرم تھا۔ یوپی اور بہار کی سرحد پر جو ندی ہے اسکا نام کرم ناسا ہے اور اسی نام کا ایک اسٹیشن بھی ہے جو گرینڈ کارڈ لائن پر واقع ہے۔ اس ندی کے پورب کا علاقہ ضلع شاہ آباد (بہار) میں پڑتا ہے اور پچھم کا حصہ یوپی میں ہے۔ میں کئی بار پیدا تک گیا ہوں۔ خان آرزو سراج الدولہ کے انتقال کا سال ۱۱۶۹ھ درج ہے حالانکہ ان کا انتقال ۲۳ ذیقعدہ ۱۱۶۹ھ کو ہوا تھا۔ امیر خاں انجام کی شہادت کا ۱۱۶۹ھ بتایا ہے حالانکہ وہ ۱۱۵۹ھ میں مقتول ہوئے تھے۔ شاہ ولی اللہ اشتیاق سرہندی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو ایک ہی ہستی سمجھ کر بے حد طعن و تشنیع اور طنز و ہجو سے کام لیا ہے جو ایک تذکرۂ شعرا کے مؤلف کو ہرگز زیبا نہیں۔ شاہ ولی اللہ اشتیاق (متوفی ۱۱۵۰ھ) اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ) دو مختلف ہستیاں گزری ہیں۔ آخر الذکر اردو کے شاعر اور نہ ان کا کوئی تخلص تھا۔ ابطال شہادت امام حسین علیہ السلام اور مناقب معاویہ انکی کوئی تصنیف نہیں۔ خدا جانے مرزا اور افترا پردازانہ باتیں انہوں نے کیوں لکھدیں۔ اظہر دہلوی سے متعلق محمد یار بیگ کی جو عبارت درج کی گئی ہے اس پر نام میر غلام علی آزاد بتایا گیا ہے۔ غالباً کاتب نے غلطی سے آزاد کا لفظ بڑھا دیا ہے۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی کی شخصیت الگ ہے۔ جعفر علی حسرت کا سال ولادت ۱۲۱۱ھ درج کیا گیا ہے حالانکہ صحیح ۱۲۰۹ھ ہے۔ میر حسن (مصنف سحرالبیان) کا سال وفات لکھا ہے۔ انکا انتقال ۱۲۰۱ھ میں ہوا تھا۔ شاعر شیریں زبان سے مصحفی نے تاریخ نکالی تھی۔ خواجہ میر درد کی تاریخ وفات ۱۲۰۲ھ لکھی گئی ہے۔ انکے انتقال کا سال ۱۱۹۹ھ ہے۔ "وصل خواجہ میر درد" مادۂ تاریخ ہے (نشتر عشق)۔ راے سرب سکھ دیوانہ کا سال ۱۲۱۳ھ جو درج کیا گیا ہے غلط ہے صحیح ۱۲۰۳ھ ہے اور "بہشت یافتہ" مادہ تاریخ ہے۔ مہتاب راے رسوا بھی آفتاب ــ مخزن نکات، تذکرہ حسن)۔ کیا تماشا ہے کہ "آفتاب" ماہتاب بن گیا۔ میر شمس الدین فقیر ۱۱۸۳ھ رگیا ہوئے غرق ہو گئے تھے۔

دیانت کی تعریف سے محروم تھیں ۱۱۱۰ھ میں پیدا ہوئے تھے دو سال کی عمر میں دیانت کے لئے یکتا کے ۱۱۱۳ھ
کی تعریف ہوا انکا سال وفات ۱۱۸۸ھ ہے۔ قائم کا سال وفات ۱۲۱۰ھ درج کیا گیا ہے جبکہ سال وفات ۱۲۰۸ھ ہے جو اس کا قطعہ
تاریخ ہے ۔

جہاں سے نہ کی بیعت کے تاریخ وفات ٭ یکتائی کے ساتھ
قائم بنیاد شعر ہندی نہ رہی ٭ کیا کیجئے اب آہ

۱۲۰۷ + ۱ = ۱۲۰۸ھ

مظہر کا سال وفات ۱۱۹۴ھ غلط ہے۔ انکی شہادت محرم ۱۱۹۵ھ میں واقع ہوئی تھی مظہر کل ۱۱۹۵ مادہ تاریخ ہے۔ سید امام الدین خلوم کا تخلص غلطی سے "مضمون" درج ہو گیا ہے۔ منت کے متعلق لکھتے ہیں کہ ۱۲۰۳ھ بارہ سو چھ ہجری میں نواب معزز الدولہ میرزا حسن رضا خان بہادر اور مہاراجہ ٹکیت رائے واسطے کچھ سوال و جواب معاملات کے لکھنؤ سے گئے تو تعریف لانے تو میر قمر الدین منت بھی ساتھ گئے۔ ایک تین چار روز تپ محرق ان کو عارض ہوئی اور زیر جان سے نہ گئی۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ لطف انکا سال وفات ۱۲۰۶ھ سمجھتے تھے صحیح سال ۱۲۰۸ھ ہے۔ میر وارث علی نالاں (متوفی ۱۱۹۹ھ)۔ اکثر ابراہیم کی عبارت صحیح کی گئی ہے اس میں مندرجہ سال (یکہزار و یکصد و پنج ہجری باشد و رسال یک صد و بست و دو) یقیناً غلط ہے۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ گلزار ابراہیم میں بھی غلط ہے یا گلشن ہند کے مدون نے یہ غلطی کی۔

قاضی عبدالودود صاحب نے "ہمیشہ بہار" (۱۱۳۶ھ) مؤلفہ کشن چند اخلاص، "باغ معانی" (رم ۱۱۶۴ھ) مؤلفہ نقش علی، "انیس الاحبا" (۱۱۹۷ھ) مؤلفہ موہن لال انیس، "سفینۂ خوشگو" (۱۱۴۷ - ۱۱۴۲ھ) مؤلفہ بندرابن داس خوشگو اور "سفینۂ ہندی" (۱۲۱۹ھ) مؤلفہ بھگوان داس ہندی کے اقتباسات اپنے ادب بہار کے اپریل، جولائی و اکتوبر نمبر ۱۹۵۳ء میں درج کئے ہیں۔ یہ اقتباسات بہت اہم و مفید ہیں۔ ہمیشہ بہار، باغ معانی اور سفینۂ خوشگو کے اقتباسات میں کچھ تاریخیں بھی درج ہیں جن کا جائزہ لینا چاہئے۔

(۱) ہمیشہ بہار میں شیخ سعد اللہ گلشن کے ترجمہ میں خود اخلاص نے لکھا ہے کہ ان کی وفات کا مادہ تاریخ "گلشن" ۱۱۴۰ھ ... ۱۱۴۰ھ برآمد ہوتا ہے لیکن سفینۂ خوشگو کی عبارت ہے کہ در سال ہزار و صد و سی و ششم (۱۱۳۶ھ) در دار الخلافہ ... نہیں کہہ سکتا کہ کون تاریخ صحیح ہے۔ میرزا معز موسوی خان فطرت کے ترجمے میں ہے کہ ان کے انتقال پر ... نے یہ قطعہ تاریخ لکھا۔

معز الدین محمد موسوی رفت ٭ ز عالم سوئے ملک معنوی رفت
کشید آہ و بگفتا عقل تاریخ ٭ معز الدین محمد موسوی رفت

لیکن آزاد نے نگارستان فارس میں اس قطعہ کو نقل کرنے کے بعد ایک اور قطعہ کا آخری مصرع بھی درج کیا ہے جو گفتا کہ شد موسوی خان از جہاں جس سے ۱۱۰۱ھ برآمد ہوتا ہے۔ آزاد کہتا ہے لفظ معز کے ۱۱۰۱ھ اعداد ... ۱۱۰۱ھ صحیح ہے کیونکہ شفیق نے بھی یہی لکھا ہے اسکے علاوہ تاریخ کے آخری مصرع سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔

ندا۔ آں سحر طرازِ شاعر دہر (۱۱۰۰ھ)

(۷) باغِ معانی : سراج الدین علی خاں آرزو کے ترجمہ میں ہے کہ "بعد یک سال سنہ ہزار و یک صد و شصت و ہشت (۱۱۶۹ھ) در لکھنؤ حیات منقطع نمود۔" مؤلف نے اپنا ایک قطعۂ تاریخ بھی درج کیا ہے جس کا آخری مصرع یہ ہے۔ رو رفت از جہاں افسوس، اس مصرع سے ۱۱۶۸ھ برآمد ہوتا ہے۔ آرزو کا انتقال ۱۱۶۹ھ میں ہوا تھا۔ آزاد بلگرامی کا قطعہ ۔

سراج الدین علی خاں نادرِ عصر ٭ ز ہرگ انجمن را آبرو رفت

اگر جویند کس سال وفاتش ٭ بگو آہ جان معنی آبرو رفت

۱۱۶۹

مصحفی نے بھی عقد ثریا میں یہی سال انہی الفاظ میں درج کیا ہے اور یہی صحیح ہے۔ سید غلام علی آزاد بلگرامی کے ترجمہ میں ہے "ولادتش بست و نہم صفر سنہ ہزار و یک صد و ہفدہ ہجری (۱۱۱۷ھ) در بلگرام اتفاق افتاد۔ صحیح سال ۱۱۱۶ھ ہے۔
(معارف جلد ۶۵۔ مارچ ۱۹۵۰ء)۔

(۸) سفینۂ خوشگو : عطاء اللہ مقالے کے ترجمہ میں ہے کہ "بندہ سے تاریخ وفات مرزا بیدل در مجمع شعرا می خواندم و می گفت ، مصرعے آں است کہ در وزن خالق باری گفتہ ام ۔ عبد القادر بیدل رفت" اس مصرع کے اعداد ۱۱۳۸ ہوتے ہیں۔ بیدل کی وفات ۱۱۳۳ھ میں واقع ہوئی تھی۔ لہٰذا مصرع میں ۵ عدد زیادہ ہیں تاریخ کیونکر ہوئی۔ ممکن ہے کہ پہلے مصرع میں کسی لفظ یا حرف سے تخرجہ کا اشارہ کیا گیا ہو جس کو مؤلف نے درج نہیں کیا۔ شاہ سعد اللہ گلشن کا سال وفات خوشگو نے مصرع "جانے گلشن بہ بہشت آہ بری" سے نکالا ہے جس سے ۱۱۴۰ھ مستخرج ہوتا ہے مگر ڈاکٹر مدنی نے "دکنی گجراتی" میں ۱۱۴۱ھ درج کیا ہے۔ اگرچہ کوئی ثبوت نہیں دیا ہے۔ ممکن ہے کہ خوشگو کا بیان صحیح ہو۔ مرزا گرامی خلف ارشد و شاگرد رشید میرزا عبدالغنی بیگ قبول کی وفات کا سال اس مصرع سے نکالا ہے ۔ افسوس گرامی از جہاں رفت۔ لیکن اس مصرع سے سال وفات (۱۱۵۹ھ) برآمد نہیں ہوتا بلکہ ۱۲۲۵ھ برآمد ہوتا ہے۔ تاریخ کیونکر ہوئی؟ آپ نے قزلباش خاں امید کا سال وفات ۱۱۴۰ھ درج کیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں: بسال ہزار و صد و شصت جہاں بے مدار را گذاشت۔ حالانکہ صحیح ۱۱۵۹ھ ہے اور جلال الدین قزلباش خاں سے یہی سال برآمد ہوتا ہے (چمنستان شعرا)۔ امیر الامرا صمصام الدولہ خواجہ عاصم کے بارے خوشگو لکھتے ہیں کہ ۱۱۵۱ھ میں شہید ہوئے یہ بالکل صحیح ہے لیکن مادۂ تاریخ ۔ امیر الامرا شہید شد ۔ سے ۱۱۵۲ھ برآمد ہوتا ہے۔

(۹) سفینۂ ہندی : آرزو کے سال وفات کے ثبوت میں ہندی نے بھی وہی مصرع نقل کیا ہے جو باغ معانی میں ہے جس سے ۱۱۶۸ھ برآمد ہوتا ہے۔ صحیح سال اوپر درج کر چکا ہوں۔ گلشن کا سال وفات بھی وہی دیا ہے جو سفینۂ خوشگو میں ہے ایسی غلطیاں متقدمین و متاخرین کے تذکروں میں تحقیق کے فقدان، سہل نگاری اور بے پروائی کی وجہ سے عموماً ہو جاتی ہیں

اردو افسانے کا مستقبل

آج کل ہمارا ادب ایک عجیب دور سے گزر رہا ہے۔ ایک ہنگامے کے بعد جو فضا قائم ہو جاتی ہے وہی فضا ہمارے ادب پر بھی چھائی ہوئی ہے لیکن وقتی ہے کیونکہ ایسی کبھی کوئی پائیدار [illegible] ہوتی ہے۔

آجکل یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ ادب کا مستقبل کچھ بھی نہیں۔ اس سائنسی اور مشینی دور میں جبکہ زندگی بے انتہا مصروف ہو گئی ہے کسے فرصت ہے کہ افسانہ اور ناول وغیرہ پڑھے۔

ادب کے مستقبل سے مایوس ہونے میں یہ عنوانات کی بحث چھڑ جاتی ہے۔ کہ ادیب کو نئے موضوع نہیں مل رہے ہیں۔ اور اس میں کوئی خاص [illegible] رونما نہیں ہو رہی ہے۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم لوگ مشرقی تہذیب کے تنوطی بن گئے ہیں اور ادب اور اس کی صحیح قدروں سے روگردانی کر رہے ہیں اور ہر چیز کو مادی اقدار پر جانچنے کے عادی ہو گئے ہیں!

اس قسم کے خیالات انسانی ذہن میں کیوں پیدا ہو رہے ہیں۔ ان کا راز ڈھونڈ لینا مشکل نہیں ہے۔ دنیا میں تہ بہ تہ جو غیر معمولی تبدیلیاں ہو رہی ہیں انسانی ذہن نا آشنا تھا لیکن اب [illegible] کی وجہ تلاش کرنا چاہتا ہے۔ اور ایک ذہنی الجھن (Mental Fatigue) یہ Mental complexes میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اور ذہنی الجھن میں جو بھی بات کی جائے گی اس پر شدید یاسیت PESSIMISM [illegible] ہونا ہوگا۔

اور میں سمجھتا ہوں کہ ادب کے مستقبل کا بارہ بھی انہی ذہنوں کی پیداوار ہے جو کسی نہ کسی قسم کے complex میں مبتلا ہیں۔ ادب سے مایوس ہونا بھی دانشوروں کے نزدیک [illegible] احساس کمتری INFERIORITY Complex کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ادب بہرحال ہر زمانے میں پائندہ رہا ہے اور مستقبل میں بھی وہ بہرحال پائندہ رہے گا۔

اس چھوٹی سی تمہید کے بعد میں اپنے موضوع کی جانب پلٹتا ہوں۔ اردو ادب کی تاریخ بڑی دلچسپ ہے۔ اور ادب کا ایک معمولی سا طالب علم بھی اس سے بخوبی واقف ہے کہ ہمارے ادب میں ہنگامے ہوتے رہے ہیں۔ اور مختلف اصناف سخن پر عتاب نازل کرنا ہمارے ادب کا ایک خاصہ رہا ہے۔ اور عتاب و قہر [illegible] اور تنقید [illegible] کا شکار ہوا ہے۔ اور ہر دور میں ایسے نام نہاد نقاد ہوتے ہیں جن کا کام [illegible] ہی رہا ہے۔

چنانچہ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب آزاد نظم اور Blank Verse کا خوب خوب مضحکہ اڑایا گیا تھا۔ اور اسے مغربی شاعری [illegible] جب آزاد نظم نے [illegible] سے اپنی منزل کی طرف [illegible] [illegible]

صنف قرار دیکر اس سے ادب کا دامن بچانے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں غزل کی مخالفت اور موافقت میں ہر کس و ناکس نے اپنی سمجھ کے مطابق مضامین لکھے لیکن بہت جلد غزل نے اپنے شعراء کے ذریعے یہ ثابت کر دیا کہ نفرت، مخالفت اور الزام تراشی سے کوئی صنف ختم نہیں ہو سکتی۔

ادھر کچھ دنوں سے افسانے کے متعلق بھی اسی قسم کی باتیں کی جا رہی ہیں۔ اور ہمارے بعض بڑے لوگ اس کو محسوس کرنے لگے کہ افسانے کا مستقبل جیسے تابناک ہونا چاہیے ویسا نہیں رہے گا۔

سنہ ۱۹۴۵ء کے قریبی سالوں میں یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ افسانہ اپنا رول ختم کر چکا ہے اور اس نے کافی ترقی کر لی ہے۔ اب اسے ختم ہو جانا چاہیے ورنہ افسانے کی مقبولیت کے پیش نظر یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ اس کی وجہ سے دوسری صنفیں خصوصاً ناول اور ڈرامہ ختم ہو رہی ہیں۔ اور اصرار کیا گیا تھا کہ ناول اور ڈرامے کو اردو ادب میں پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہو تو افسانے کو ختم کر دو۔ لیکن یہ آواز صدا بصحرا ہو کر رہ گئی کسی قسم کا ردعمل اس آواز پر ادبا کی جانب سے نہیں ہوا۔ لیکن پھر بھی احتشام حسین نے کچھ مقالے افسانے کی حمایت میں پیش کئے تھے جو ان باتوں کو کھول دیتے ہیں۔ جو ۱۹۴۵ء اور اس کے قریبی سالوں میں افسانے کے بارے میں کہی گئی تھیں۔

یہاں ایک بات کا ذکر میں خاص طور پر کرنا چاہتا ہوں۔ اردو میں پہلا افسانہ ۱۹۲۰ء کے قریبی سالوں میں لکھا گیا یا چھپا ممکن ہے۔ اور سنہ ۱۹۴۵ء میں اسے ختم کرنے کا مطالبہ کیا گیا یعنی صرف ۲۵ سال کے مختصر عرصے میں افسانہ ادب میں اپنا رول ختم کر چکا تھا جب کہ دوسری صنفیں جب سے ... قبل سے اردو میں رائج ہیں۔ اور وہ اپنا رول ختم نہ کر سکی ہیں ـــ ان ۲۵ سالوں میں (یعنی ۱۹۲۰ء سے لیکر ۱۹۴۵ء تک) اردو افسانے صرف ابتدائی مدارج طے کئے تھے اور ۱۹۴۵ء کے بعد سے لیکر آج تک جتنی ترقی اس نے کی ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں!

اب یہ بات بھی بہت جلد صاف ہو جاتی ہے۔ کہ سنہ ۱۹۴۵ء میں اردو افسانے کو ختم کرنے کا مطالبہ کیوں کیا گیا تھا۔

ہمارے معاشرے کی یہ بھی ایک کمزوری رہی ہے کہ ہم میں سے چند ایک لوگ اپنی زندگی میں نئی باتوں کو اور نئی تبدیلیوں کو بہت کم رونما ہونے دیتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ ادب پر بھی پڑا اور ادب میں بھی نئی باتوں کو داخل ہونے کی اجازت کم ملی۔ اور خصوصیت سے ہم لوگ روایت پرست و ماضی پرست واقع ہوئے ہیں۔ اور ہم ان باغی عناصر کو کسی حال میں بھی برداشت نہیں کر سکتے جو روایات کہنہ کو توڑیں۔ پھر ایک حد تک ہم لوگ خوش عقیدہ بھی۔ جتنا بناوٹ پسند کرتے ہیں اور خوش رہتے ہیں حقیقت بڑی تلخ و ناگوار گزرتی ہے۔ چنانچہ یہی حال ہمارے افسانے کا بھی ہوا۔ اردو افسانہ ابتدا ہی سے حقیقت پسند اور روایات کا باغی رہا ہے۔ ہمارے قارئین نے اس نئی صنف کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور بہت جلد یہ صنف مقبول عام ہو گئی۔ ہمارے نقادوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں یہ صنف قابض ادب نہ ہو جائے۔ اس لئے انھوں نے اسے ختم کرنے کا مطالبہ کیا اور اس کا رول ادب میں ختم ہو چکا ہے یہ راگ الاپنا شروع کیا۔ اور ہمارے ادب میں بعض نقادوں کا کام بس صرف اتنا ہی ہے کہ مختلف صنفوں میں جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس کی تنقید کریں اور اچھے اور برے کی نشاندہی کریں۔ بلکہ وہ ایک حد تک حاسد و متعصب بھی کہلائے جا سکتے ہیں۔

ویسے اردو ادب کا دامن ابتدا ہی سے ناول اور خصوصیت سے ڈرامے سے خالی ہی رہا ہے اور کسی صنف کے مقبول ہو جانے سے دوسری صنف کبھی دب نہیں سکتی۔ ہمارے ادب کے ناولوں کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ اور یہ ناول بھی انھیں افسانہ نگاروں نے لکھے ہیں۔ جن کے افسانے بہت مقبول اور پسند کئے گئے۔ چنانچہ پریم چند، عزیز احمد، کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی اور سہیل عظیم آبادی وغیرہ نے (یہ فہرست مکمل نہیں ہے) افسانے کی انتہائی مقبولیت کے زمانے میں ناول لکھے اور یہ بات صاف کر دی کہ کسی صنف کی دوسری صنف پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح ایک ڈرامہ نگاروں نے بھی ڈرامے لکھے ہیں۔ چنانچہ بیدی، اشک، منٹو، عصمت، کرشن اور مرزا ادیب وغیرہ نے اس زمانے میں ڈرامے لکھے۔ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں کہ افسانے کی وجہ سے یہ اصناف ختم ہو رہی ہیں۔ وہ یا تو ادب کا سطحی طور پر مطالعہ کرتے ہیں یا کسی غرض سے یہ بات کہنے کے عادی ہو گئے ہیں۔

سن ۱۹۵۱ء اور سن ۱۹۵۲ء میں، ادب میں جمود کا نعرہ [illegible] گو آگے چل کر جمود اور متنوع [illegible]
پیدا:-

اس ضمن میں جمود سے متعلق بھی دو چار باتیں کر لی جائیں تو میں سمجھتا ہوں بے جا نہ ہوگا۔ یہ نعرہ بھی ان ہی ذہنوں کی پیداوار ہے۔ جو صرف چند شخصیتوں کو ہی ادب سمجھتے ہیں۔ اور ادب کی اچھائی برائی انحطاط کا انحصار ان ہی شخصیتوں کے کام سے کرتے ہیں۔ حالانکہ ادب کبھی بھی Monopoly بن کر نہیں رہا ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں ان شخصیتوں نے یا تو لکھا نہیں لکھا، اگر لکھا بھی تو انتہائی پھسپھسا اور ہمارے نقاد حضرات نے جانا کہ ادب میں جمود آ گیا ہے کیونکہ عظیم شخصیتیں نہیں لکھ رہی ہیں، چنانچہ دو سال تک ہمارا ادب جمود کی بحث میں رہا اور آخر میں یہ بحث بھی ختم ہو گئی۔ ادب میں جمود، ایسے نعرے، ان ذہنوں کی ہی پیداوار تھی۔ جو صرف چوٹی کا جانتے ہیں (یہاں میرا اشارہ [illegible] نہیں ہے)

سن ۱۹۵۴ء کے قریبی سالوں میں یہ بات کہی گئی کہ ہمارے افسانے میں تنوع نہیں رہا۔ اور محبت کا فرسودہ موضوع اس میں پھر گھس آیا ہے۔ پیدا ہونے لگا کہ کہیں افسانہ اپنی ابتدائی شکل نہ اختیار کر لے اور کہیں اس کا Dimension پھر ایک بار محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ اس سانحے پر محمد حسن عسکری کی طرف سے "نقوش" کے افسانہ نمبر میں رو دیا گیا تھا۔ جو اس سے قبل اردو ادب کی موت کا بھی اعلان کر چکے ہیں اور جنہیں ہمیشہ ادب میں کمی کا احساس لاحق رہا ہے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے جو عسکری صاحب نے کہی ہے۔ لیکن اس پیمانے کا [illegible] سراسر حماقت ہوگی۔ [illegible] میں زیادہ تر چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو بکنے کے لئے گھڑی جاتی ہیں اور چھپ چھپا بھی جاتی ہیں۔ اس میں واقعی نئی یا نئی بات تلاش کرنا بے سود ہوتا۔ [illegible] چیز اول درجے کی چیز نہیں ہو سکتی۔ دوم اور سوم درجے کی چیزیں زیادہ ہوتی ہیں اور بمقابلہ اول و دوم درجے کے سوم درجے کی چیزیں [illegible] ہوتی ہیں۔ یہی حال ہمارے افسانے کا بھی ہے۔ اس میں اول درجے کے افسانے کم لکھے گئے۔ دوم درجے کے نسبتاً زیادہ اور سوم درجے کے [illegible] آج بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔ افسانوں کی زیادہ تعداد تیسرے درجہ کی ہے۔ لیکن اول اور دوم درجے کے افسانے بھی لکھے جا رہے ہیں۔ اور ناقدان پر برابر نظر رکھے ہیں۔

آج کل اردو افسانے کے مستقبل سے بدگمانی کے چند در چند خاص وجوہات ہیں۔ یہ خیال بھی غلط ہے کہ آج کل اچھے افسانے لکھے نہیں جا رہے ہیں [illegible] کا ثبوت ہے یا بڑے بڑے ناموں سے عقیدت کا نتیجہ ہے۔ اگر بڑے افسانہ نگار نہ لکھ سکے) "افسانہ" لکھنا چھوڑ کر [illegible] فرمائے تو اس کا یہ نتیجہ نہیں اخذ کر لینا چاہئے کہ افسانے کی صنف ختم ہو رہی ہے۔ پرانے لکھنے والوں کے ساتھ جدید تر نسل کے لوگ برابر بہتر [illegible] اور اس میں بھی شک نہیں کہ ایک عام قاری کی نگاہ نئے افسانہ نگاروں کی تخلیقات تک نہیں پہونچتی۔ اس میں کچھ ہمارے بڑے ادیبوں کا بھی [illegible] اور کچھ ہمارے پبلشروں کا بھی!

آج کل عام طور پر یہ بات کہی جا رہی ہے کہ مارکیٹ میں ناول چل رہے ہیں۔ اور خصوصیت سے جاسوسی ناول۔ اکثر کمرشل پبلشرز جیسے [illegible] اور [illegible] مارکیٹ میں چلا رہا ہے اور جو ادب معرض سے قارئین کے سامنے آئے گا۔ اس کی مانگ [illegible]۔

یہی ہمارے ادب کا المیہ رہا ہے کہ ہر دور میں تیسرے درجے کے ادب کی مانگ زیادہ رہی ہے۔ چونکہ علم کی کمی کی وجہ [illegible] پیدا ہو گئی ہے۔ اور ہمارے یہاں ادب بمقابلہ تعمیری صلاحیت کے وقت گزاری کا ذریعہ زیادہ بنا ہے اور [illegible] ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمارے ادیبوں نے بھی ادب کو [illegible] استعمال کیا ہے۔ چنانچہ آج بھی [illegible] Publishers [illegible] ناول کی فرمائش ہر ادیب سے کرتا ہے۔ اور ہمارے ادیبوں کی [illegible] Publishers حضرات اپنی دانست میں یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ مارکیٹ ناول کا ہے: گر [illegible] اس بات کو [illegible]

/ یہ نہ ذہن ہے کہ ناولوں کا دور صاحبِ بہت بڑھ گیا ہے جس کے بعد ہی ناول اچھے آئے۔ وہ بھی ایسے ناول نگاروں کے جو پہلے ہی ناول لکھ چکے ہیں۔

ناولوں کی کوالٹی (Pace ...) کو دیکھ کر یہ خیال کر لینا کہ افسانہ ختم ہو رہا ہے بالکل غلط بات ہوگی۔ اور سوچنے کا یہ انداز انتہائی ہے۔ بہت اچھے افسانہ نگار جیسے غلام عباس وغیرہ کے بہترین افسانے لکھ رہے ہیں۔ لیکن یہ عام قاری کی نگاہ ان افسانوں تک نہیں پہنچی۔ اس کی وجہ یہ ... ہے کہ ایک آنہ روزانہ سے ناول لکھڑوں میں دستیاب نہیں ہو سکتے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ قاری ایک آنہ روزانہ ابھی بری کتابیں لائبریری سے لا کر پڑھ چکے ہیں۔ ان ناول گھروں میں سستی غیر معیاری کی کتابیں بقدر ارزاں مل سکتی ہیں۔ یا پھر تیسرے درجے کے ... اور ہمارا قاری ان کو لے جا کر پڑھ ڈالتا ہے اور خوش ہو جاتا ہے اور وہ سمجھتا ہے بس ادب نام ہے سستی پھیلانے کا جیسی باتیں لکھنے کا ...... اور کچھ فلموں والی باتیں پھر قاری ناول پڑھتا ہے بھول جاتا ہے۔ اور ایک صداسی آتی ہے۔ کہ وہ تیسرے درجے کا پورا ادب پڑھ ڈالتا ہے اور اسے کچھ بھی یاد نہیں رہتا۔

اب اگر ... ہم یہ نتیجہ اخذ کریں۔ کہ حقیقی ادب تو وہی ہوگا جو زیادہ سے زیادہ پڑھا جائے۔ تو یہ بہت غلط معیار ہوگا۔ اور پھر نہ جانے کیسی کیسی چیزوں کو ادب میں داخل کرنا پڑے گا۔

یا پھر ہم یہ بھی سوچ سکتے ہیں کہ ادب صرف وقت گزاری کا ذریعہ ہے۔ ہمارا ایسا سوچنا بھی بالکل غلط ہوگا۔

ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ادب کبھی بھی ان لوگوں کے ہاتھوں کا ... نہیں رہا۔ جو محض وقت گزاری کے لئے ضخیم سے ضخیم ناول گھنٹوں میں ختم کرتے ہیں۔ اگر ادب ان لوگوں کے ہاتھوں کا کھلونا بن جاتا۔ تو آج کسی عظیم شاعر یا ادیب کا نام کہیں یاد نہ ہوتا۔

آج افسانہ اپنے CLIMAX پر پہنچ چکا ہے۔ اس میں رنگا رنگی۔ تنوع۔ اور بلا کی بوقلمونی پیدا ہو چکی ہے آج افسانے کا دامن ہر موضوعات سے بھرا پڑا ہے۔ محبت، نفرت، نفسیات، جنسیات، رومان، بغاوت، تعلیم و بے کاری، سماج اور اس کی خرابیاں جنس کی باتیں۔ تاریخ، معاشرت، جنگ و امن۔ اخلاق و آداب، فسادات و آزادی، مذہب، طنز و مزاح اور رجزیت یا symbolism غرض ہر قسم کے موضوعات افسانے میں جگہ پا چکے ہیں۔

پرانے لکھنے والوں میں آج بھی احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ، دیوندر ستیارتھی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، ممتاز مفتی، غلام عباس، ... صدیقی، عزیز احمد، حسن، ... اور شفیق الرحمان وغیرہ لکھ رہے ہیں۔ اور غضب کا لکھتے ہیں۔

بیچ کی پود میں سلمیٰ حمید، اشفاق احمد، انتظار حسین۔ دیوندر اسر، آغا بابر، رضیہ سجاد ظہیر، شوکت صدیقی، تسنیم سلیم چھتاری، ممتاز شیریں، قرۃ العین حیدر، جیلانی بانو، الطاف عظیم، مجندر سنگھ اور غیاث احمد گدی وغیرہ بہت اچھے افسانے ... مانے جاتے ہیں۔

جدید تر نسل میں شام ملک، عزیز اثری، اقبال مجید، جوگندر پال، بانو قدسیہ بیگم، ریاض رضوی، ضمیر الدین اور واجدہ تبسم نے مختصرت میں کافی اچھے افسانے لکھے۔

کچھ پرانے لکھنے والے یا تو تھک کر بیٹھ گئے یا اگر لکھتے بھی ہیں تو بالکل پھیکا۔ ان کی کمی ایک حد تک نئے لکھنے والوں نے پوری کر دی ہے۔ حمید نے کرشن چندر کی کمی پوری کر دی۔ منٹو کے انداز میں آغا بابر، شوکت صدیقی، اور ممتاز شیریں وغیرہ لکھتے ہیں۔ لیکن ابھی منٹو کی کمی باقی ہے اس کا اندازہ کسی کو نہ مل سکا۔

عصمت چغتائی کی کمی کو ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اور واجدہ تبسم پیدا کر رہی ہیں۔

ادھر اردو افسانے میں نئے تجربات ... کافی مقبولیت حاصل کی ہے۔ کرشن چندر کے طویل مختصر افسانے اور ... اور محمود ہاشمی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ... کافی شہرت پائی۔

عزیز احمد نے ناول نگار کی حیثیت سے کافی شہرت پائی لیکن ان کی حیثیت ہمارے ادب میں ایک کامیاب افسانہ نگار کی بھی ہے۔ انھوں نے "رقص ناتمام" - اور "بے کار دن بے کار راتیں" میں کافی اچھے تجربے کیے ہیں۔ "مدن سینا اور صدیاں" "اور لیتی نہیں ہے ....." "زریں تاج" "رقص ناچو" "ایک شام" - اور "رقص ناتمام" صرف عزیز احمد کے ہی اچھے افسانے نہیں بلکہ اردو ادب کے بہترین افسانے ہیں۔ اسی طرح عسکری صاحب کے "ذکر الزہ" "اور "قیامت ہمرکاب آئے نہ آئے" ہمارے افسانوی ادب کے عروج کی نشانی ہے۔

ل۔ احمد کے ترجمے اردو ادب میں ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ دیوندر ستیارتھی کی کہانیاں جو انھوں نے گھوم پھر کر لوک گیت جمع کر کے لکھی ہیں وہ ہمارے افسانوی ادب کی خوش بختی کی ترجمان ہیں۔

خطہ داری ماحول کو افسانوی روپ میں پیش کرنے میں بھی ہمارے افسانہ نگاروں نے کافی محنت کی ہے۔ کرشن چندر نے کشمیر، عصمت چغتائی نے ... اور خدیجہ مستور نے یو۔پی، جونت سنگھ اور احمد ندیم قاسمی نے پنجاب اور سہیل عظیم آبادی نے عظیم آباد کے اطراف و اکناف، مہندر ناتھ و دیگر افسانہ نگاروں نے بمبئی و کلکتہ جیسے تجارتی شہروں، اور عزیز احمد و جیلانی بانو وغیرہ نے حیدرآباد اور شفیق الرحمن نے بیرونی ممالک کے جو مشاہدات اپنے افسانوں میں پیش کیے ہیں وہ قابل تحسین ہیں۔

اب جبکہ ہمارا افسانہ حاسے عروج پر پہنچ چکا ہے۔ اس کے مستقبل سے مایوس ہونا یا طوفانی ادب کی ہیبات سے گھبرا کر افسانے کے مستقبل کی طرف سے متفکر ہونا فضول کی بات ہوگی۔

ہمیں عسکری صاحب کی بات سے مایوس یا پریشان ہونا چاہیے اور افسانے کے ماضی و حال کا تفصیلی جائزہ لے کر یہ سوچنا چاہیے کہ اس کا مستقبل ایک یا درخشندہ !

میں کوئی مفتی نہیں کہ فتویٰ صادر کروں یا منصف نہیں کہ فیصلہ سنا دوں کہ افسانے کا مستقبل بہت شاندار ہے۔ البتہ میں ادب کا ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ اردو کی دوسری اصناف سخن کے مقابلے میں اردو افسانے کا مستقبل بہت روشن ہے۔ اور ہمیں کسی طرح مذمت کی ضرورت نہیں۔ تیسرے درجے کا ادب تو بہت جلد اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔ ("مطلع ادب" اورنگ آباد میں پڑھا گیا)

جوش ملیح آبادی

اپنا مرثیہ

جوش کی ایک تازہ نظم ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں موردِ عتاب ٹھہری ہے۔ ہندوستان میں گوپال مثل رسالہ "تحریک" دہلی" نے اس پر سخت تنقید کی ہے اور لکھا ہے کہ کوئی شخص اسیرِ کارواں ہونے کا اعلان کر کے اسیرِ کارواں نہیں جاتا۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ "شاعرِ انقلاب کی حیثیت سے ان کا اپنے آبا و اجداد کی حقیقی یا قیاسی عظمت کا ماتم مزاج کے ذیل آتا ہے کیا ان کا بھی یہی خیال تھا کہ جہاں انقلاب کی آندھی باقی فلک بوس عمارتوں کو ہموار کر دیگی وہاں ان کی جاگیرداری کا قصر وظارہ جائے گا؟" ادھر پاکستان میں ثاقب زیروی کے ہفتہ وار "لاہور" نے کڑی گرفت کی ہے کہ "ان سب کے پاس رہنے کو کوٹھی گھومنے پھرنے کو کار ہے، ایک برائے نام سرکاری کام کے ڈیڑھ دو ہزار دیگر یافتوں کے علاوہ ملتے ہیں اور اس عزیب ہیں (ان کی تمام موہومہ کمیوں کے باوجود) ان کے جو ٹھاٹ ہیں وہ ان کے کسی دوسرے ہمعصر کو نصیب نہیں پھر بھی کسی دن نہ اس دامن کو کستے ہی گزرتی ہے، ان کی نظر سے ہندوستان تو گرا ہی تھا پاکستان بھی نہیں جچتا ـــــ پوری نظم کے یہ بند پیش ہیں ـــــ

(ادارہ)

مجھے اے ہم نشیں اس زندگی نے ✦ ہنسایا جب تو رونے کو ہنسایا
بھری برسات کی راتوں میں اکثر ✦ مقدر نے مجھے تنہا جگایا
یکایک آندھیوں نے بال کھولے ✦ چراغِ عیش جیسے ہی جلایا
گلے میں کلبلائیں سسکیاں سی ✦ طرب کی موج میں جب گنگنایا
تھا سر پہ چلی شمشیرِ دوراں ✦ کبھی جب شاخِ گل کے پاس آیا
پگھل کر بہہ گیا عبرت کا آنسو ✦ بشاشت کا کوئی موتی جو پایا
مجھے عزفوں سے اکثر عشرتوں نے ✦ چھپانے کے لئے مکھڑا دکھایا
اور اس صورت سے گویا فاصلے پر ✦ دیا آندھی میں کوئی ٹمٹمایا
ہنسا تو ڈبڈبائے آنسوؤں نے ✦ مسرت کی پہیلی کو بجھایا
ہلالِ عید جب ابھرا بصد ناز ✦ تو اک خنجر کلیجے میں در آیا
دھواں نکلا کیا دل سے جب اکثر ✦ تو دم بھر آنکھ میں کاجل لگایا

سنا گو نبھی شکستِ دل کی آواز ✦ جو شیشوں کو ذرا سا کھنکھنایا
مجھے ہر رات کی رنگینیوں کا ✦ ادا کرنا پڑا دن کو کرایا
خوشی کی زلف جب شانوں پہ بکھری ✦ تو غم کا ناگ دل میں سرسرایا
میسر جب ہوا پھولوں کا بستر ✦ تو جم کر صبح تک سونے نہ پایا
جو توڑے پھول صد ہا روز قربِ ✦ تو صرف ایک آن کو دولہا بنایا
نہ پہنچائی کسی غم نے وہ ایذا ✦ نشاطِ رفتہ نے جتنا ستایا
ہو لئے جشن صرف اک بار سنگی ✦ چراغِ زیست برسوں جھلملایا

(۲)

مرے آباء کے قصرِ منزلت کو ✦ بڑی عجلت سے اس دنیا نے ڈھایا
علم اجداد کے جنباں تھے جن پر ✦ فلک نے ان مناروں کو گرایا
جہاں پر تو فگن تھی کج کلاہی ✦ مجھے پروان اس گھر میں چڑھایا
مری طفلی کو سلطانی عطا کی ✦ جوانی کو غلامی پر لگایا
پھر اُس کڑھتی جوانی کو بالآخر ✦ بڑھاپے کی حدوں تک کھینچ لایا
مرے گلزار میں کانٹے اگائے ✦ مرے شعلوں کو خاکستر بنایا
چراغِ دیر تھا جو چہرہ اک روز ✦ اسے کعبے کے حجرے میں جلایا
بتوں نے پھیر لیں مجھ سے نگاہیں ✦ خدا کے فضل نے یہ دن دکھایا
مری حالت پہ طاری کی گدائی ✦ مری فطرت کو شاہانہ بنایا
مجھے بزمِ سلاطیں میں بٹھا کر ✦ مری خودداریوں کا منہ چڑھایا
سفیہوں سے مجھے وابستہ کر کے ✦ مری نظروں سے خود مجھ کو گرایا
مری ہر شام کو تسکین دے کر ✦ مری ہر صبح کو در در پھرایا
جو تھا مجھ میں غرورِ کبریائی ✦ بجھدِ بندگی اس کو گرایا

(۳)

زن و فرزند کی وابستگی نے ✦ وطن سی چیز کو آخر چھڑایا
رہا میں ہند کی نظروں میں مسلم ✦ بنا کافر جو پاکستان آیا
وہاں کوؤں نے ارجن بان مارے ✦ ادھر ہوں نے یہاں خنجر چلایا
وہاں دیوتک نے سمنی ڈکارا ✦ یہاں عفریت وحشت غرغرایا
وہاں پانڈؤں نے سمہا کی قیامت ✦ یہاں پیروں نے اک طوفاں اٹھایا

ہلاشنے وہاں پھنکار ماری ✦ مؤذن نے یہاں غوغا مچایا
نہ ہندو ہی نے پہلو میں جگہ دی ✦ نہ مسلم ہی نے سینے سے لگایا
وہاں زنار نے پہلو تہی کی ✦ یہاں تسبیح نے دامن بچایا
نہ کاشی میں نظر آئی فراغت ✦ نہ صحنِ کعبہ مجھ کو راس آیا
خفا دیر و حرم والے ہوں جس سے ✦ اُسے کس نے بنایا کیوں بنایا
دُہائی عالمِ تعجیل خو کی ✦ دیا میرا بہت جلدی جلایا
جہاں سو سال بعد آنا تھا مجھکو ✦ وہاں سو سال پہلے کھینچ لایا
سخن نا سنج ادیبوں کے قلم نے ✦ مری نظموں کو سولی پر چڑھایا
مرے اشعار پر کی سنگ باری ✦ اور اتنی کوئی پھل رہنے نہ پایا
دیارِ ناخرد منداں میں لاکر ✦ خرد کا منہ آٹھ آٹھ آنسو رلایا
ہزاروں بار مجھ پر مفتیوں نے ✦ بگڑ کر کفر کا فتویٰ لگایا
ان اہلِ خلد کی "فرزانگی" نے ✦ مری دیوانگی پر منہ بنایا
کمر میرے تجسس کی جھکا دی ✦ گلا میرے تفکر کا دبایا
سبک اوہام کے پالے ہوؤں نے ✦ مرے افکار کو نکو بنایا
ہر اک "بقراط" آنکھیں بند کر کے ✦ مری نادانیوں پر مسکرایا
مجھے بہروں میں قدرت نے زباں دی ✦ مجھے اندھوں میں قسمت نے بٹھایا
مجھے بونوں کے پہلو میں جگہ دی ✦ مجھے مُردوں کی بستی میں بسایا
گلے پر حصر ہے جس کے سخن کا ✦ کلام اس قوم کا مجھ کو سنایا
درایت کے اجالے کو مسلسل ✦ روایت کے اندھیرے میں گھمایا
میں تھا بھی شاید اک ایسا معمہ ✦ کہ یاروں کی سمجھ ہی میں نہ آیا
عطا کر کے مجھے برقِ تخیل ✦ مری فطرت نے بھی مجھکو ستایا
مری بیداریاں ظلمت میں ڈبو دیں ✦ مرے خوابوں کو اتنا جگمگایا
یہاں المختصر ابرِ سعادت ✦ جو چھایا بھی تو کچھ اس طرح چھایا
دہکتی خاک پہ جس طرح پل بھر ✦ کسی اڑتے ہوئے طائر کا سایا
نفس کی آمد و شد اللہ اللہ ✦ مسلسل میں کبھی جینے نہ پایا

اسی کا نام ہے شانِ کریمی
رحیما، عادلا، مولیٰ خدایا

وفا امتموی

ایک مشاہدہ

ہمنشیں امیسری الجھنیں نہ بڑھا
دل میں کیسی خلش ہے آج نہ پوچھ

دیکھ! وہ سامنے ہے ایک وجود
حسن تخئیل کا مزاج نہ پوچھ

ابھری قوسِ قزح، شفق پھولی
لگ رہی ہے نظر کو لاج نہ پوچھ

تنِ سیمیں پہ رنگ سرخ و سیاہ
ہائے کچھ حسن امتزاج نہ پوچھ

مدھ بھری دل ربا جوانی نے
کس سے کس سے لیا خراج نہ پوچھ

شرح و تفسیر کائنات نہ دیکھ
معنیٔ سنگ اور زجاج نہ پوچھ

کیا ہے تخلیق کون ہے خالق
کون کرتا ہے کس پہ راج نہ پوچھ

دل میں کیسی خلش ہے آج نہ پوچھ

وارث میر

دوسرا رُخ

تیزی سے گھومتا ہوا بجلی کا پنکھا اور بھی تیز ہو گیا اور سکوت کی پُر اسرار فضا اور بھی پُر اسرار ہو گئی۔ اور ہمارے ہونٹوں پر سوچتی ہوئی مسکراہٹیں بھی پھیل گئیں۔ اسکی پاٹ دار آواز نے ماحول کو بڑے سنسنی خیز طریقے سے مسحور کر رکھا تھا۔ کئی تمہیدی گھاٹیوں کو پھلانگتے ہوئے حسب توقع ب کی گفتگو عورت تک آپہنچی تھی۔ اس نے زور سے کھنکھار کر حلق صاف کیا اور بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلا۔ علیم کو مخاطب کرتے ہوئے میں بازو لہرایا۔

"علیم بھائی! عورت! ـــــ عورت کا وجود اسکی کشش سے ہزار درجہ مہلک ہے۔ میں عورت کی رفاقت سے سانپ اور بچھو کی ت کو زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔ عورت سے کسی ایسی بات کی توقع رکھنا جو باعث مسرت ہو، بہت بڑی حماقت ہے۔ عورت ایک دلفریب ہے۔ ایک خوفناک اژدہا ہے ایک خطرناک مجسمۂ فریب ہے۔ ایک ایسی لغزش ہے جو صرف خلوت ہی میں اچھی معلوم ہوتی ہے ایسی غلطی ہے جو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

حبیب خلافِ معمول کئی دنوں سے غیر حاضر تھا اور آج کافی عرصے کے بعد ہمارے ننھے منے کیفے میں پھر آیا تھا۔ اور آتے ہی ت کے خلاف بڑے بڑے لوگوں کے اقوال اپنے تقریری انداز میں بیان کرنے شروع کر دیئے تھے [illegible] آنکھوں اس تھکے ہوئے عمر رسیدہ نوجوان کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ! اولوں کی بوچھاڑ سے مرجھایا ہوا پُر فضا دو بیر یاد آجاتا ہے۔ جبکہ [illegible] اسلیم کے ہاتھ میں ("مولانا" کی وجہ تسمیہ وہ خود بھی نہیں جانتے) ہمکتا دیکھ کر فیصل نے حبیب کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے ا ـــــ عورت اس وقت تک آپ کی عورت ہے جب تک اس پنچھی بٹیر کی طرح آپ کی مٹھی میں بند ہے۔ محفل میں پھوٹ پڑے تھے۔ اور حبیب نے چوٹ کے ہدف کو سمجھے بغیر اپنی چھوٹی چھوٹی خالی خالی اور بے رونق آنکھوں کو بے تابی سے طرف گھمانا شروع کر دیا تھا۔ دراصل اس کے لئے کیفے میں اٹھنے والے بے ہنگم شور کے بند ہونے کا انتظار کرنا بڑا مشکل تھا۔ کیونکہ وہ عورت کا نام سن کر عورت کے فلسفۂ بے وفائی پر ایک عدد لیکچر جھاڑ کر اپنی وسیع معلومات سے ہم سب ب کرنا چاہتا تھا۔

قبرستان کے بالمقابل جہاں ہماری گلی اور سڑک کا ملاپ ہوتا ہے دائیں طرف نکڑ پر ایک چھوٹا سا کیفے ہے با ذوق حضرات جن میں سے بیشتر جرنلزم کے پیشے میں ہیں۔ اپنی اکثر شامیں گپیں لڑاتے ہیں۔ اور دن بھر کی ذہنی تھکاوٹ کی طرح گرم گرم بحث بدل بدل کر دور کرتے ہیں۔ بحث شروع ہو جانے کو ایک بہانہ چاہیے ہوتا ہے۔ کہ مذہب، فلسفہ، ادب

سیاست اور نظم سب کا تیا پانچہ ہو جاتا ہے۔ ہر کوئی اپنی انفرادیت کو منوانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے۔ میری طرح کنوارے ہیں اور ہماری گفتگو کی تان گھوم گھام کر جنسیات پر آ کر ٹوٹتی ہے۔ مولانا سلیم، فیصل اور بشیر تو سال خوردہ اور عیال دار لوگوں میں سے ہیں۔ اس لئے وہ ہماری ساری گفتگو کو سنجیدہ اور ستے ہوئے چہرے کے ہیں۔ سن سنا کر ہلکے سے مسکرا دیتے ہیں۔ وہ اس سارے جوش و خروش کو جوانی کا ابال سمجھتے ہیں۔ اور یہیں کٹی ہوئی پتنگیں ؛ لیکن جب کبھی آگ کی باسی ہانڈی میں ابال آ جاتا ہے۔ تو پھر تو وہ پیچھے لٹکتے ہیں۔ کہ یہ تمیز ہی اٹھ جاتی ہے کہ کون بچا ! غصے سے ان کے چہرے سرخ ہونے کی بجائے زرد ہو جاتے ہیں، منہ سے جھاگ چھوٹ چھوٹ پڑتے ہیں۔ ایسی ایسی دی جاتی ہیں، کہ "وہ کہیں اور سنا کرے کوئی " بدقسمتی سے کیٹنے کا پروپرائٹر جس کو ہم سب شاہ صاحب کہہ کر پکارتے غریب سا آدمی ہے۔ ریڈیو خرید لینے کی سکت نہیں۔ اس لئے اس شیطانی مشین کی سمع خراشی چیخوں سے بحمد اللہ ہم بچے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی گالیاں اور بد کلامیاں "تلفظ و ترنم اور وزن کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے کانوں گھولتی ہیں۔ اور حبیب صاحب ——— یا دشمن بخیر ——— اتاؤں کی یہ کشمکش اور کھینچا تانی اپنے عروج پر ہوتی ادھر آ نکلتا۔ وہ بندر کی طرح اچک کر اپنی مخصوص کونے والی کرسی پر اکڑوں بیٹھ جاتا۔ شاہ صاحب بلند آواز سے پکا پر جا نکتے۔ آگے کو جھکی کمریں پیچھے جا لگتیں۔ پرانی اور ڈھیلی ڈھالی کرسیوں کے انجر پنجر ایک دم سے چیخ پڑتے اور پھر ایک دم ہو جاتے مولانا سلیم کے ادھ کھلے لب، جو ہمیشہ کوئی خوبصورت بات کہنے کو تیار رہتے ہیں۔ دفعتاً بند ہو جاتے۔ اور ہم کے خشک پپڑی جمے لب جو کھلتے تو گویا مدتوں سے رکے ہوئے دریاؤں کے بند کھل جاتے۔

"عورت! ——— عورت سونے کا برتن ہے جس میں ترش سرکا بھرا ہوا ہے۔ عورت دنیا کا سب سے خوبصورت عورت خود ہی فتنہ ہے اور اس کا لکھنا سیکھنا سخت ترین فتنہ"

وہ ہمیشہ عورت پر گفتگو کرتا جو عموماً بے ربط فقروں پر مشتمل ہوتی۔ خوبصورت الفاظ اور اچھوتی تشبیہوں سے دا کو ایسے کریہہ انداز میں پیش کرتا کہ فیصل صاحب کی جمالیاتی حس پھڑک پھڑک کر دم توڑ دیتی۔ چوہدری بشیر کی ساری ہ بیٹ کر رہ جاتی اور میں حبیب کے ہاتھوں عورت کے مسخ شدہ آئوسٹش کی دلکشی کو اپنے ذہن میں اجاگر کرنے کی ایسی نا ہی کر رہا ہوتا کہ اس کی آواز پھر چونکا دیتی ——"

"فیصل صاحب! ——— یہ میں نہیں کہہ رہا یہ افلاطون کہہ رہا ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ نپولین اور افلا وہ اندر کی جیب سے ولز کا سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبا لیتا۔ ندیم اس کا سگریٹ اپنے سعودی عرب والے سلگاتا۔ لائٹر سے ہلکی ہلکی موسیقی کی لہریں اٹھتیں۔ وہ سگریٹ کا زور سے ایک کش لگاتا۔ اور دھوئیں کو نتھنوں سے ہوئے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے چٹکی بجا کر راکھ کو ایش ٹرے میں جھاڑتا۔

"——— سقراط ——— سقراط نے ایک شکاری کو جس کے کاندھے پر جال رکھا ہوا تھا۔ ایک شکیل عورت کو گھورتے ہوئے دیکھا۔ اس نے شکاری سے کہا ——— لیکن ٹھہریئے ——— اس سے پہلے دیو جانس کلبی کا ہے ——— دیو جانس کلبی نے ایک عورت کو سر پر تنور میں آگ رکھ کے لے جاتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگا۔ آگ

انی ہے۔ اور بوجھ اٹھانے والا بوجھ سے زیادہ سخت ہے۔"

وہ ذرا سا دم لیتا۔ ادھورا واقعہ بیان کرنا بھول جاتا۔ دونوں ہتھیلیوں کو زور سے آپس میں رگڑتا اور مسلی ہوئی میل کو بڑی
ی سے میز پر بکھیر دیتا۔ ایک مبہم سی مسکراہٹ اس کے کانپتے ہوئے لبوں پر بکھر جاتی —— ایک ایسی مسکراہٹ جو طویل افسانہ
مکمل کر لینے کے بعد کسی فنکار کی روح میں پھیل جاتی ہے۔ زور سے سانس لیکر وہ اپنی منتشر ہوتی ہوئی انرجی کو ایک بار سمیٹنے
ش کرتا۔

"مولانا! آپ کو معلوم ہے کہ دیو قریطس کتنا بڑا فلسفی تھا۔ اس سے کسی نے پوچھا کہ تم نے خوبصورت اور ذی وجاہت ہو کر
ی اور بدسیرت عورت اپنے لئے کیوں پسند کی۔ جواب دیا کہ برائی میں سے میں نے صرف تھوڑی ہی اختیار کی ہے۔ اور وہ
ہے اس کا —— سیا فیدس —— اس نے کہا ہے کہ —— نہیں شاید فیثا غورث نے کہا ہے —— ہاں ہاں
—— بہر حال ——"

حبیب کئی دفعہ معقولوں اور حوالوں کی ترتیب بھول جاتا۔ سکندر اعظم کو شیکسپیئر اور شیکسپیئر کو سکندر اعظم بنا دیتا۔
ل موقعوں پر اکثر سے وسوئیں کا اچھو لگ جاتا اور وہ کھانس کھانس کر آنکھوں سے آنسو جاری کر لیتا اور ہم موقع کی نزاکت
سا کر خوب خوب تالیاں پیٹتے۔ "زندہ باد حبیب صاحب" —— ندیم نعرہ لگاتا اور علیم کا ابھرتا ہوا چہرہ بھی کھکھلا اٹھتا اور احمد
کے متعلق میرے کان میں سرگوشیاں شروع کر دیتا جو اس نے کل ہی اپنے پروفیسر کے گھر سے چرائی ہوتی اور جب کوئی فقرے
سٹ کر آتا۔

حبیب کوئی غیر معمولی ذہین لوگوں میں سے نہیں تھا بی اے اس نے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا تھا۔ لیکن سوائے عورت
ی موضوع پر وہ کھل کر بات نہ کر سکتا تھا۔ مرد کی سب سے بڑی کمزوری "عورت" ہے۔ لیکن حبیب کا سب سے اہم مسئلہ
ی —— شخصیت کی تعمیر میں عورت کا حصہ —— بچپن کے نفسیاتی حادثوں میں عورت کی اہمیت ——
ی عورت کے پیار کے تخریبی اثرات —— ان تمام موضوعات پر نہایت عالمانہ بحث کرتا۔ ایک ایک پہلو اور ایک ایک
واضح کرتا چلا جاتا۔ عورت کا نام سنتے ہی حبیب اس نیم مردہ مچھلی کی طرح از سر نو زندہ ہو جاتا جسے دوبارہ پانی میں پھینک دیا جائے۔ اس کے نزدیک تو
کو طرح سے ہی واہیات تھے جن کے اصل میں عورت کا ہاتھ ہوتا تھا۔ خود منٹو ہی نے اصل عورت اور جنس کو ہوا بنا رکھا تھا۔

آج جب وہ آیا تو کچھ زیادہ ہی موڈ میں تھا۔ بڑی اداکاری کر رہا تھا۔ منٹ منٹ بھر اپنی انگلیوں کو چٹخاتا، گنجے سر پر
ہاتھ پھیرتا۔ ابروؤں کو عجیب انداز میں سکیڑتا اور بغیر پلکوں کی آنکھوں کو جھپکاتے ہوئے بڑے رومانی انداز میں سگریٹ
تا اور عورت کی نفسیات پر بحث کرتے کرتے یکایک بے ڈھنگے پن سے مسکرا پڑتا جس سے اس کے چہرے کی جھریاں
زیادہ گہری ہو جاتیں۔ آج میں بھی بے اختیار ہو کر بول ہی اٹھا۔

"حبیب صاحب! یہ تو ہوئی عورت کی اجتماعی نفسیات —— دنیا کی تمام عورتوں کی مشترکہ نفسیات —— عورت
ایک عالمگیر نظریہ —— مگر کچھ اپنی عورت —— خاص اپنی عورت کا بھی کہئے کیا حال ہے؟ آج تو کوئی خاص بات
ی ہے —— بڑے موڈ میں دکھائی دے رہے ہیں۔"

"بتاتا ہوں یار" ـــــ اس کے لئے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ میرے لئے چائے اور سگریٹ کا آرڈر دیتے ہو
پتلون کے پائنچوں کو اوپر اٹھاتے ہوئے بولا "آج میں بہت خوش ہوں ـــ آج معلوم ہوا کہ عورت ۔۔۔۔۔۔ "ـــ و
حاضرین پر ایک گھومتی ہوئی نگاہ ڈال کر اصل فقرہ مکمل کیا ـــ "کہ عورت ایک سایہ ہے۔ اس کا تعاقب کرو تو وہ بھاگتی ہے
سے بھاگو تو وہ تعاقب کرتی ہے" اور داد طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔
"خوب ـــ وہ کیسے حبیب صاحب" میں نے بات بڑھاتے ہوئے کہا۔
"تم تو جانتے ہی ہو یار ـــ اس کھمبے کے سامنے والی لڑکی ـــ اختری کو۔ بجا سنتے تھے کہ کسی کو منہ نہیں لگاتی
خدا کی قسم ـــ مولانا جھوٹ نہیں کہتا ـــ سارے کس بل نکال کر رکھ دیئے ہیں۔ لوٹن کبوتر ہو رہی ہے لوٹن کبوتر ہ
گھر کے چکر لگا رہی ہے۔ لیکن ما بدولت نے بھی کھڑکی کا پٹ ایک سیکنڈ کے لئے نہیں کھولا۔ وہ بھی کیا یاد کرے گی
مرد سے پالا پڑا تھا"
"ہوں ـــ" مولانا سلیم نے پہلو بدلتے ہوئے اپنی اس "ہوں" کو زور سے کھینچا اور اس نے بات کو جاری رکھتے
کہا "کل اپنے چھوٹے بھائی کے ہاتھ ایک رقعہ بھی بھیج ڈالا۔ لکھا تھا کہ خدا کے لئے اتنے ظالم نہ بنو تمہارے فراق میں مر
رہی ہوں کسی پہلو چین نہیں پڑتا۔ ہر وقت تمہاری پیاری پیاری صورت آنکھوں میں بسی رہتی ہے۔ صرف ایک دفعہ مسکرا کر بات
ورنہ زہر کھا کر مر جاؤں گی۔ ایک پھڑکتا ہوا شعر بھی تو لکھا تھا ـــ "شیشی بھری گلاب کی پتھر پہ توڑ دوں ـــ تم نہ آئے تو
سر پھوڑ دوں ـــ یہی تا؟" علیم بات کو اچکتے ہوئے چہکا اور پھر دفعتاً چہرے پہ سنجیدگی پیدا کرتے ہ
"لیکن حبیب صاحب عورت کا دل توڑنا تو مہا پاپ ہے"
"یہ کیا کہتا ہے تو ـــ عورت کا دل کیا اور دل کا توڑنا کیا" حبیب نے ترشی سے جواب دیا۔ "عورت بے رحم کھا
ہی چادر میں شیرنی کو پالنا ہے شاد فرتیش کا کہنا ہے کہ ۔۔۔۔۔ ـــ"
وہ چل نکلا اور میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں علیم سے خاموش رہنے کی درخواست کی ـــ"
"شاد فرتیش کہتا ہے کہ عورت ایک ایسی جنگ ہے جس میں مہلت ہی نہیں۔ اگر اسکو سر چڑھا دو تو تم کو نیچا دکھا
"ہاں ـــ اگر اسکو شریک بہار بناؤ تو تمہاری جان پر بن آئے۔ اگر راز دار بناؤ تو طشت از بام کر دے" علیم
سکا "لیکن حبیب صاحب! عورت اگر یہ ہے تو وہ بھی ہے"
علیم نے میری درخواست کی کوئی پرواہ نہ کی۔ آج وہ بھی سارا دن میری بیاض سے خوبصورت شاعرانہ تشبیہیں یاد کر
تھا۔ اور اب وہ بحث سے باز نہ آ رہا تھا۔
"جناب عورت کانٹا ہے تو پھول بھی ہے۔ عورت شعلہ ہے تو شیشہ بھی ہے۔ عورت شمعِ محفل ہے تو مریم دو
ہے۔ عورت مرد کی ماں ہے۔ بیوی ہے۔ شریک حیات ہے۔ اور بیٹی ہے۔ جب تک مرد زندہ ہے۔ عورت ہر وقت قد
کی مستحق ہے"
"نہیں ـــ ہرگز نہیں۔ میں کہتا ہوں۔ تم کیتے ہو "حبیب بھائی کے اعصاب قابو سے گئے۔ اس کی سانس میں تیزی آ گئی وہ اشتعال انگیز!

میں پھنا۔ عورت ایک ایسی پھانسی ہے جس سے گلو خلاصی نہیں۔ یہ وہ غم ہے جس سے تا مرگ چھٹکارا نہیں یہ وہ تناور درخت ہے جس کی جڑیں قیامت تک جمی رہیں گی۔ یہ وہ مرض ہے جس کے علاج حکیم ۔۔۔۔۔۔"

"جی ہاں ۔۔۔۔۔ حکیم ارسطا طالیس نے فرمایا ہے ۔۔۔۔۔۔ علیم بڑ بڑ کر تمام پر عمل کرتے ہوئے بیچ میں کود پڑا۔ حبیب اپنے آپ کو پرسکون بنانے کے لیے میز کو انگلیوں سے بجانے لگا۔ اسکی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ علیم چپ نہ ہوا ۔۔۔۔۔ حکیم ارسطا طالیس نے فرمایا ہے کہ عورت وہ سانپ ہے جس کے بغیر صدا کے بغیر مغنی کا نغمہ تنگ رہتا ہے یہ وہ کیف ہے جس کے بغیر حریم رنگ و بو کی لہلہاہٹ بیرنگی ہے پردہ ساز میں وہ آہنگ ہے جس کے بغیر موسیقی کی خوشگوار تھرتھراہٹ گونگی ہے۔ سائبیریا کے وحشی آشفتہ مزاج کا وہ خیابان ہے جس کے بغیر ۔۔۔۔۔۔" علیم کے منہ میں اگر حبیب رومال نہ ٹھونس دیتا تو جس کے بغیر" کی گردان کرتے کرتے شاید وہ حبیب سے دو گھونسے کھائے بغیر، کیفیت نہ اٹھتا

رات میں جلد ہی سو گیا تھا۔ اس لئے مرغ کی اذان کے ساتھ ہی میں نے بستر چھوڑ دیا۔ سیر کا وقت ابھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے گھڑا اٹھایا اور نلکے کی طرف چل دیا۔ نلکا ابھی دور ہی تھا کہ مجھے دو عورتوں کی کھسر پھسر سنائی دی۔

"غضب خدا کا ۔۔۔۔۔ اتنی رات گئے گھر میں گھس آیا! اور ذرا خوف نہ آیا لفنگے کو! قیامت کے آثار ہیں بی قیامت کے آثار"، ایک عورت کانپتے ہوئے تعجب آمیز لہجے میں دوسری عورت سے کہہ رہی تھی۔ میں نے اپنی رفتار آہستہ کر لی۔

"اور ماں جی! پھر ۔۔۔۔۔ دیکھو تو ۔۔۔۔۔ بے حیا نے میرے پاؤں پکڑ لئے اور کہنے لگا۔ اختری اتنی ظالم نہ بنو۔ کسی کا دل توڑنا مہاپاپ ہے"۔ دوسری عورت نے گھڑا سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

چاند کی دودھیا چاندنی میں اب وہ صاف نظر آ رہی تھی۔ وہ اختری تھی کھمبے کے سامنے والے لڑکی ۔۔۔۔۔

"اب تم سے کیا چھپانا ماں جی وہ پھر بولی، مہینہ بھر سے ناک میں دم کر رکھا تھا اس مسٹنڈے نے۔ اب پولیس کے سپاہی بھی ہڈی پسلی ایک کر کے دم لینگے"

"اے وہ تو ایسے بدمعاشوں کا کچومر ہی نکال دیا کرتے ہیں"۔ بڑی بی نے مجھے قریب آتا دیکھ کر زور سے کہا

"کس کا کچومر نکال رہی ہو ماں جی" میں نے ہنستے ہوئے بڑی بی سے پوچھا۔

"اسی تمہارے ریگل بھگت یار حبیب صاحب کا اور کس کا!"

"ہائیں ۔۔۔۔۔ کیا کہتی ہو! حبیب کا! وہ تو ۔۔۔"

اور گھڑا میرے ہاتھ سے نیچے آ رہا۔

قمرالدین آبل

رات کی بات

"زندگی کے بھیانک اور طوفانوں کو میں بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں —— اور اب سوائے ایک بھرپور تاسف کے میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ بڑھاپا میرے ... شت ہے اور دل نے بچوں کا روپ دھار لیا ہے —— مگر میرے عزیز یہ حقیقت ہے۔"

یہ کہکر وہ مسکرایا اور نا ... بنی سے گوندی کے پیڑوں کو تکنے لگا۔

میں بڑے اشتیاق ... اس کی باتوں کو سن رہا تھا اور اسکی بظاہر سادہ سی زندگی پر غور کر رہا تھا جو صرف بچوں اور جوانوں کے قرب و جوار ... بسر رہی تھی —— کیونکہ یہی کچھ اس نے مجھے بتایا تھا۔

میں نے دھوپ ... تنہا کھڑے شاہی مسجد کے بلند و بالا مینار پر نگاہ ڈالی اور منٹو پارک کی طرف جاتی ہوئی خوابیدہ سڑک کو دیکھا —— دھوپ پھٹنے لگی تھی اور جسم پسینے سے تر ہوا جاتا تھا۔

وہ پھر بولا۔

"وہ میرا دوست تھا اور اس نے مجھے کھو دیا —— ایک بیش بہا اور گراں قدر جذبے کو —— اور میرا خیال تھا کہ کبھی وہ سکوت شب کی تیرگی میں تنہا بیٹھے آہ بھرنے سے پہلے ضرور مجھے پکاریگا اور میں اسے کہونگا کہ آؤ آج ماضی کے سوگوار لمحات کو بہا دیں —— مگر میرا خیال غلط تھا —— وہ مجھے کھو کر تلاش کرتا رہا اور کھوتا رہا —— اور اس کی تلاش جاری رہی۔ اس ... میں اسے بہت سے اچھے لوگ بھی ملے ہونگے اور چھن گئے ہونگے۔ برے بھی ملے ہونگے جنہوں نے اسے پریشان کیا ہوگا۔ مگر یہ ٹھیک ہے کہ اس حاصل میں جو وقتی ہی ہوگا —— اسے سکون اور راحت ضرور میسر آتی ہوگی —— اور شاید آ ... وہ خوش ہی ہوگا —— زندگی ایک ایسے سمندر کی طرح ہے جسمیں مد و جزر کا برقرار رہنا اشد ضروری ہے —— ... کے اچھال کے بعد ہی سمندر نکھرتا ہے —— مگر میں نے زندگی کو ایک ٹھہرا ہوا تالاب بنا لیا —— ایسا تالاب جس ... پانی کی گہری تہیں جم جاتی ہیں —— اور جو وقت کے ساتھ ساتھ سڑنا شروع ہو جاتا ہے —— پھر سوکھ جاتا ہے ... دیواروں کے پلستر اکھڑنے لگتے ہیں اور پھر نہ وہ تالاب ہی رہتا ہے۔ نہ ہی سمندر کے لفظ کا اطلاق اس پہ ہو سکتا ہے ... راہگیر گزرتے ہوئے اسمیں پتھر پھینک جاتے ہیں۔ تھوک جاتے ہیں۔ اسکی بو اور سڑاند سے ناک پہ رومال رکھ لیتے ہیں ... اور بڑھ جاتے ہیں —— میں نے خود کو ایک ایسا ہی تالاب بنا لیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ زندگی تنہائی میں بیٹھ ... کر گزاری جا سکتی ہے۔ خاموشی میں اور سکوت میں —— اسلئے میں نے اس دن —— ماضی کی اس تلخ گھڑی جب

کے متعلق میں تمہیں ابھی بتاؤں گا ــــ یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آج کے بعد میرا کوئی دوست ــــ کوئی ہم راز ــــ کوئی میری باتوں کو سننے والا نہیں ہوگا ــــ میرے گالوں پر جلن تھی اس کے بھرے ہوئے ہاتھوں کی انگلیاں میرے گالوں پہ نشان بنا کر ہٹ چکی تھیں اور تھوڑی ہی دور اس کا چار سالہ بچہ خوف سے زرد کمرا سسک رہا تھا۔

"مجھے ایک بات بتاؤ ــــ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے ــــ میں نے سوال کیا تو وہ چیخا ــــ تم کمینے ہو ــــ تم ذلیل ہو۔ یہی تمہاری دوستی کا صلہ تھا"

یہ کہکر وہ بچے کو گھسیٹتا ہوا چلا گیا ــــ

اپنے جرم کی نوعیت سے بے خبر میں نے بیس سال گزار دیئے ہیں اور وطن سے دور رہ کر میں نے بے بسی کے ہر لمحہ کو پہچان لیا ہے ــــ اور بالآخر اسی وطن کے مقدس مگر سسکتے ہوئے اندھیروں کی آہیں مجھے واپس لے آئی ہیں ــــ تم میرے پاس بیٹھے ہو ــــ تم جو کل کے معمار ہو ــــ اور میرا دل خوشی سے پاگل ہوا جاتا ہے ــــ

ہاں تو سنو۔ جب میں اپنے پہلے سفر سے پانچ سال کی طویل مدت کے بعد اور وقتی تفریحات سے تھک کر گھر لوٹا تو اس نے بڑی گرمجوشی سے میرا استقبال کیا۔ عرصے کی جدائی کا احساس آنکھوں میں آنسو لے آیا میں نے رومال دانتوں تلے دبا لیا۔ ہم بچپن سے ایک ساتھ کھیلے تھے۔ اکٹھے ہی جوان ہوئے تھے۔ ساتھ ساتھ ہی تعلیم حاصل کی۔ مگر وہ تعلیم کو ادھورا چھوڑ کر کاروبار میں پڑ گیا اور معاشی لحاظ سے مطمئن ہو گیا۔

اس نے مجھے اپنے قریب ہی ایک مکان کرائے پر لے دیا اور ہم اپنا وقت ہنسی خوشی گزارتے رہے میں اسے بیرونی ممالک کی باتیں سناتا رہتا اور وہ مجھے اپنی کاروباری باتیں۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ اس کی بیوی بھی گفتگو میں حصہ لیتی۔

ایک دن گفتگو کے دوران میں وہ غیر ملکی عورتوں کے بارے میں پوچھنے لگی۔ میں نے اسے ان عورتوں کے رہن سہن اور سوچنے کے انداز کے متعلق بتایا۔ اور پھر اچانک مجھے وہ واقعہ یاد آگیا جو دو چار دن پہلے شہر کی ایک بارونق جگہ تمہارے جیسے نوجوان کو پیش آیا تھا۔ وہ غریب ایک فیشن زدہ خاتون سے وقت پوچھ بیٹھا تھا جس کے عوض پہلے تو اسے گالیاں سننا پڑیں اور پھر منچلے راہگیروں نے اس کا گریبان تار تار کیا۔ وہ جوان بوکھلایا ہوا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور خون اس کے پھٹے ہونٹ سے بہہ رہا تھا۔

"وہاں کی عورتیں بُرا نہیں"، میں نے اسے بتایا ــــ اُن کے لئے یہ باتیں ــــ یہ استفسار بے عزتی نہیں۔ بلکہ معمولی باتیں ہیں جو اتنی جگہ کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ مگر ہمارے ملک میں ان باتوں کو کتنی غلط نیدگی سے سوچا جاتا ہے:

وہ دونوں میری باتیں سنتے رہے ــــ میں سناتا رہا۔

مگر یہ حادثے آئے دن ہی پیش آتے رہتے ہیں ــــ تم کسی خاتون سے وقت نہ پوچھ بیٹھنا۔ مناسب ہے کہ کسی گھڑی ساز کی شریف آدمی نے وقت پوچھ لیا جائے یہ کہکر وہ ہنس پڑا اور کہنے لگا ــــ بات کہاں سے چلی تھی اور کہاں پہنچ گئی ــــ

میرے وطن لوٹنے کے ایک سال بعد خدا نے اسے ایک کھلونا دیا۔ بڑا خوبصورت بچہ تھا۔

مجھے بچوں سے محبت ہے ــــ کسے نہیں ہوتی ــــ بچوں سے نہیں ان کی معصوم تجسس نگاہوں سے اور باتوں سے لگے

بچے سے بھی مجھے محبت تھی۔ انتہائی پیار میں جب بھی اسکے ہاں جاتا۔ گھنٹوں اسے گود میں لئے کھیلتا رہتا۔ بچوں کے ساتھ کھیل کر جو خبط اور لطف آتا ہے۔ وہ قابلِ بیان نہیں۔ میں اسے بازوؤں میں اٹھائے جھولا جھلاتا رہتا۔ ننھے کی ننھی ننھی ہنسی تھکا کو دور کر دیتی اور میں بھی اس کے ساتھ قہقہے لگانے لگتا۔

بچے کے ماں باپ میری اس والہانہ کیفیت کو بڑے تعجب سے دیکھتے اور مسکرا پڑتے مگر ماں کی نسبت باپ کا تعجب دیدنی تھا۔ وہ شروع شروع میں لاپرواہی کا اظہار کرتا رہا مگر جوں جوں وقت گزرتا جاتا اس کی یہ لاپرواہی ——
آج مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ اس لاپرواہی کے نیچے ایک بیزاری سی رہی تھی —— اسے میرا یہ پیار پسند نہیں تھا —— اور شاید یہی میرا جرم تھا۔ میں جب بھی کبھی اس کے بچے سے کھیل رہا ہوتا تو پریشان لگا ہوں سے مجھے دیکھتا۔ یہ وقفہ کافی طویل ہوتا تھا اور اسی وقفے میں اس کی بیوی کسی بہانے بچے کو لیکر چلی جاتی —— اور پھر جیسے وہ کسی نیند سے چونک پڑتا ——

کچھ دنوں کے بعد مجھے یہ محسوس ہوا جیسے وہ کوشش کرتا ہے کہ میں اس کے ہاں نہ جاؤں اگر جاؤں تو —— یہ عرصہ لمبا نہ ہو —— ایک دو دفعہ میں نے بچے کے بارے میں پوچھا۔

"ابھی ابھی سویا ہے" جیسے وہ مجھے ٹال رہا ہو —— حالانکہ فوراً بعد ہی اس کی آواز سنائی دے جاتی۔

مگر ان دنوں یہ احساس بہت ہی کمزور تھا۔ آج یہ بہت پختہ ہے۔ حال جب ماضی بن جاتے تو زیادہ واضح ہو جاتا ہے —— آج مجھے ماضی کی تصویریں زیادہ واضح نظر آتی ہیں۔ ان میں کوئی الجھاؤ نہیں۔

ہم آپس میں ملتے رہے۔ میں نے اس کے گھر جانا ترک کر دیا۔ وہ اکثر خود ہی میرے ہاں چلا آتا۔ کبھی کبھی بچے کو بھی لئے آتا۔ محبت کا ہوتا ہے۔ میرا پیار بچے کے خون پر قابض ہو رہا تھا۔ وقت گزرتا رہا —— وہ بیٹا پھرنے کے قابل ہو گیا اور اب میرے مکان کی بیٹھک تک چلا آتا۔ میں موجود ہوتا تو خوب کھیل کود ہوتا۔ میں اسے گود میں لئے باتیں کئے جاتا۔ الٹی سیدھی سوال چنیں۔ کتے کی بلی کی میاؤں۔ وہ کبھی میری گود سے اتر کر کندھوں پر سوار ہو جاتا۔ کبھی میری پشت پر چڑھ بیٹھتا کبھی ہم آنکھ مچولی کھیلتے صوفوں کے پیچھے۔ کرسیوں کی آڑ میں اور جب ہماری آنکھیں ملتیں تو قہقہے بلند ہو جاتے اور اس کی ننھی ننھی ہنسی کمرے کی ہر چیز میں رچ جاتی۔
جب کبھی اتفاقیہ مجھے اسکے بچے کو دیکھے کئی دن گزر جاتے تو میں صبح کو نکلتا تو راستے میں اسکے بچے کو آواز دیتا جاتا یا شام لوٹتا تو کوئی نہ کوئی کھانے کی چیز اسکے لئے لے جاتا۔ میں آواز دیتا۔ وہ بھاگا ہوا آتا۔ دو چار گھڑیاں ہو تیں اور میں اپنے گھر کی طرف بڑھ جاتا۔ کبھی کبھی اسکا باپ بھی آ جاتا تو مجھے زبردستی چائے کے لئے ٹھہرا لیتا۔

ایک شام ہم اسی طرح چائے پی رہے تھے۔ میں باتیں کئے جا رہا تھا۔ جب میں خاموش ہوا تو کہنے لگا "تم اپنے کسی سمندری سفر کی سوچ رہے تھے نا —— کب تک جانے کا خیال ہے ——؟"

میں نے بچے کو گود میں لیتے ہوئے جواب میں جب یہ کہا کہ میری طبیعت نہیں چاہتی —— فی الحال میں نے ارادہ ترک کر دیا ہے تو وہ یکدم کرسی پر پھرا اور کہنے لگا۔

"ہاں کافی عرصہ تم نے باہر گزارا ہے —— کیا ضرورت ہے دوبارہ جانے کی ——" پھر کچھ وقفے کے بعد بولا۔

بالنا ر ـــــ یہ تم مٹھائی وغیرہ یا کوئی کھانے کی چیز نہ لایا کرو۔ اس کی عادتیں خراب ہو رہی ہیں ـــــ اور آوازیں بھی نہ دیا کرو۔ کیونکہ گلی میں سے کوئی بھی آواز دے ـــــ یہ بھاگ پڑتا ہے ـــــ"

میں نے یہ عمل بھی ترک کر دیا۔ مگر جب حالات اپنے کلائمیکس کی طرف بڑھ رہے ہوں تو کوئی طاقت بھی انہیں روک سکتی ـــــ آج مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم سب اس کہانی کے کردار تھے ـــــ جو آج تک معمہ بنی ہوئی ہے۔ جسے میں حل نہ کر سکا۔ اسکے بچے کا میری بیٹھک تک آنا۔ کمیلنا کودنا۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہو سکتی تھی جو ہماری دوستی کی راہ میں حائل ہو ـــــ مگر نہیں شاید میرا پیار باپ کی حس کے لئے زہر ہلاہل کی کیفیت رکھتا تھا۔ کیونکہ ایک دن وہ آیا ـــــ میرے منہ پر طمانچہ مار کر خلوص اور پیار کے پرانے جذبات کو ابدی نیند سلا گیا۔ اس نے خود پر نہیں مجھ پر ظلم کیا تھا۔ میں جو ایک عظیم جذبے کا حامل تھا۔ ایک کھنڈر میں تبدیل ہو گیا اور میرا دماغ ماؤف ہو گیا۔

کھنڈر جیسے کہ میں نے تمہیں بتایا ہے۔ میں نے خالی ڈھانچے کو زندہ رکھنے کا نیا انداز سیکھا۔ سیر و تفریح کیلئے۔ تنہا کوئی چیز نہیں ـــــ اور نہ ہی خلوص کی قیمت دوستی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ کاروبار۔ دھوکا۔ فریب۔ تجارت ـــــ یہ مخلصی ہے ـــــ میں نے زندگی کے نئے اصول وضع کئے۔ مگر افسوس یہ اصول کھوکھلے تھے۔ ان میں زندگی کی رمق نہیں سینما ہال میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے میں سو جاتا ـــــ اور جب کبھی کسی اچھے سین پر تعریفی کلمات میرے ہونٹوں پہ آ کر میرا دل خون ہو جاتا ـــــ ایک آواز اٹھتی ـــــ کرب آمیز ـــــ مجھے زندگی دو ـــــ میرا گلا نہ دباؤ ـــــ تم مجھے رہے ہو ـــــ خدا کے لئے مجھ پہ رحم کرو۔ یہ آواز گونج اور شور پیدا کرتی اور میں سینما ہال سے باہر نکل آتا۔ سیر و تفریح بیس سال میں نے اپنے کھوکھلے اصولوں پر گزارے ہیں۔ میں نے اس آواز کو تڑپا تڑپا کر مارنے کی کوشش کی ہے مگر ـــ سوتے میں ـ جاگتے میں ـ چلتے پھرتے اپنی آہوں سے مجھے پریشان کرتی رہی ہے اور کر رہی ہے ـــــ مگر اب وہ کھوکھلی عمارت گر کر دھول میں تبدیل ہو گئی ہے۔

شاخ تو کبھی ننگی نہیں رہتی ـــــ اور جو پھول بھی لہرایا ـــــ میں نے اپنے نئے مگر غلط اصولوں پہ اسے قربان کر دیا اسے نوچ ڈالا ـــــ یہ وہ اصول تھا ـــــ ہاں یہ نظریہ جس کے سہارے میں نے زندگی کا بہترین حصہ بتا دیا ہے آج میں اکیلا ہوں ـــــ تنہا ـــ تالاب ـــ جہاں راہگیر تھوکتے ہیں۔ کھنڈر جہاں بے سکونیاں پلتی ہیں۔"

یہ کہکر وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا اور پھر رومال سے اپنے چہرے کی مدہم جھریوں پہ پھیلتے ہوئے پسینے کو صاف کرتے ہوئے بولا۔ "کل میں نمائش میں پھر رہا تھا۔ تنہا تھا اکیلا تھا ـــــ جھولے موٹر سائیکلیں ال۔ پھول جیسے چہرے جوان قہقہے معصوم ہنسی ـــــ یہ سب زندگی کی جاودانی کا پیغام سنا رہی تھیں ـــــ مسجد کی دیوار کے پیچھے سے ایک روشن ستارہ سرمئی بادلوں کو چیرتا ہوا نکلا

تمہارا حسن لازوال ہے" میرے ہونٹ یہ کہتے ہوئے رک گئے۔ کوئی سننے والا نہیں تھا۔ کوئی جواب دینے والا ماتمی وقت ـــــ یہ پرانی آواز پہلی بار طنزیہ ہنسی ـــــ اور میں سہم گیا۔

"تم میرے مجرم ہو ـــــ تم جوان ہو۔ تم اکیلے نہ پھرو۔ دنیا دیکھ رہی ہے۔ میں نے ایک دن تمہیں مجرم کے سامنے

میں تنہا بیٹھے دیکھا تھا۔ اس دن جب میں بچوں کو جامن تلاش کرنے دے رہا تھا۔ پھر میں نے تمہیں جناح باغ کے گھنے
تلے خاموش بیٹھے دیکھا تھا ——— اور آج تم نے یہ گرم دوپہر میرے جیسے آدمی کے ساتھ گزار دی ہے۔

تمہاری عمر ——— تمہارا زمانہ ہے خلوص سے بڑھو اور کھو کھو کر حاصل کرتے رہو۔ یہی زندگی ہے۔ تالاب جتنا
سمندر بننا بہادری ہے۔ جو تیر بھی تم پر گر پڑیگا۔ ڈوب جائے گا اور پھر تمہارے مضبوط ہچکولوں سے ذرات میں تبدیل
سورج کی سنہری کرنیں تمہاری رنگت کو آب دیتی رہینگی۔ تالاب تو کھنڈر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایک نہ سہی دو
بڑھ بڑھ کر رکو اور پھر بڑھتے رہو۔ میں نے اپنی زندگی کا طویل حصہ غلط اصولوں کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ آج جب
ہاتھ بڑھاتا ہوں تو میرے ہاتھوں کو جھٹک دیا جاتا ہے۔ عمر کی تقسیم کسی نے ٹھیک کی ہے اور اب میں زندگی کے تیسرے
ختم کرنے والا ہوں ——— اور یہ عمر دوست ڈھونڈنے کی نہیں۔ وسطی عمر میں اگر تم نے ماحول سے اپنا حصہ حاصل
کے بعد ——— صرف تلاش ہی رہ جائے گی ——— اس لئے وہی دوست ——— وہی خلوص ——— وہی محبت ——— وہ
پھول اور تمہارے جیسے جوانوں کے گرد و پیش رہتے ہوئے ڈھونڈتا ہوں ——— جو کبھی مجھے حاصل تھی ———
زندگی تمہارے سامنے ہے اور میری زندگی بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ میں تمہیں کچھ تو دے سکتا ہوں۔

بس یہی کچھ میں تمہیں کہنا چاہتا تھا۔ دوست بناؤ۔ جیسے بھی تمہیں مل جائیں کیونکہ درخت ہولے ہولے
پھلتا ہے۔ جب میں آٹھ سال کا تھا تو یہ گوندی کے پیڑ بالکل اسی طرح پھیلے ہوئے تھے جیسے کہ آج ہیں۔ اس وقت
پھل، پھلیں اور پتھر مارا کرتے تھے مگر یہ آج بھی پھل دیتے ہیں اور زیادہ سرسبز ہیں۔"

اتنا کہکر وہ خاموش ہو گیا اور اکا دکا راہگیروں کو دیکھنے لگا جو نمائش کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دوپہر ڈھل
اور اس کی آنکھوں کی پہلی چمک اور روشنی بجھ رہی تھی

"صاحب آپ نے مجھے اچھی باتیں بتائی ہیں مگر ابھی ایک چیز ادھوری ہے ...." میں نے سوال کیا۔
"مجھے علم تھا ——— تم یہی کچھ کہو گے بچپن کا تجسس ——— جوانی میں اشتیاق کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔
اصول تلاش کرنے کا ——— نتائج اخذ کرنے کا اور پھر ان کو زندگی گزارنے کی بنیاد بنا لینے کا ——— مگر اکثر ایسا
کہ ذہنی ناپختگی غلط اصولوں کو اپنا لیتی ہے ——— میں نے اس سے ادھار نہیں لیا تھا جو میں واپس نہ کر سکا
اس کی روزمرہ زندگی میں رخنہ اندازی نہیں کی تھی ——— یہ وجہ بھی نہیں ہو سکتی۔ ہاں مجھے اس کے بچے سے پیار تھا۔
بچے سے پیار ہے۔ یہی میرا جرم ہے ——— مگر چلو ——— شام ہو رہی ہے۔ نمائش دیکھیں۔ میں نے شاید بتایا تھا
ہے" ———

یہ کہکر اس نے میری بغل میں بازو دیدیا اور مجھے ساتھ لئے نمائش کی طرف بڑھنے لگا۔ مجھے اسکے بے تکلفانہ رویہ
پر حیرت ہوئی مگر ——— اس کی معیت اتنی بری بھی نہیں تھی۔ اگرچہ وہ میرے باپ کی عمر کا تھا ——— باپ نے
کبھی شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ نہیں رکھا تھا ——— اس وقت میرا ساتھی میری نظروں میں ایک
بن گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ جس خلوص، محبت کی تشنگی میری زندگی کا ایک جزو بن چکی تھی ——— وہ مٹ

— بکھر رہی ہے۔

"ٹھہرو۔ میں ٹکٹ لے لوں" یہ کہکر وہ کھڑکی کی طرف بڑھنے لگا میں نے اسے روک لیا۔

"میرے پاس ٹکٹ کے لئے پیسے ہیں —" میں نے قمیض کی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

وہ ایک لمحہ مجھے تکتا رہا — اس وقت اس کے چہرے پر خوشی اور مسرت ناچ رہی تھی۔

"میں نے بہت کمایا ہے اور تمہارے کپڑے تمہاری غربت کا افسانہ ہیں — مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم میری نظروں سے گر گئے ہو۔ جب میں نے پہلا سفر اختیار کیا تھا تو میری حالت تم سے اچھی نہیں تھی — مگر مجھے خوشی ہوتی ہے کہ میں اپنے پیار کا اظہار کرسکوں — اور یہ ٹکٹ تو کچھ بھی نہیں۔ تمہارے بوسیدہ کپڑوں میں جوان جسم اور گرم خون چھپا ہوا ہے۔ ان چیتھڑوں کو — وقت آئے گا — اتار پھینکنے کے قابل ہو جاؤ گے۔"

میں خاموش ہو گیا میرا دل پگھل رہا تھا۔ میں آنکھوں کی نمی کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا اور میری طبیعت چاہ رہی تھی اپنے بازوؤں کو ہوا میں لہراؤں۔ فضائیں مادی شکل اختیار کر جائیں اور میرے بازوؤں سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جائیں کیسی خواہش تھی یہ!

ہم نمائش میں گھوم رہے تھے۔ اسٹالوں پر رکتے۔ ٹھہرتے بڑھ رہے تھے۔ بھیڑ بڑھ رہی تھی۔ روشنیوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پیلی، لال روشنیاں جھولوں کا شور، بچوں کی چیخ پکار، کھیل تماشے، تھیٹریکل کمپنیوں کے ڈھولوں کا شور اور مسخروں کی باتیں۔ ہم ہنس رہے تھے۔ وہ بچہ بن چکا تھا۔ بچہ نہیں جوان کبھی وہ کسی حسینہ کے بالوں کی تعریف کرتا کبھی کسی کی مسکراہٹ پر مرتا۔ کسی کے لباس کے رنگ گنواتا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے ہنس پڑتا اور کہتا — "یہ زندگی ہے مگر صرف دیکھنے کے لئے — وقت پوچھنے کے لئے نہیں — یہ کتابیں مجھے دیدو۔ میں اٹھا لوں۔ کبھی میرے ہاتھوں میں بھی ایسی ہی کتابیں ہوا کرتی تھیں۔ اچھا زمانہ تھا وہ بھی — آج بھی کبھی کبھی میری طبیعت چاہنے لگتی ہے کہ کتابیں لے کر کسی کنج کے قریب بیٹھ جاؤں اور وہ دن واپس لوٹ آئیں —"

میں نے کتابیں دیدیں۔

"آؤ۔ جھولا جھولیں —؟" وہ یکدم ایک عمودی جھولے کے قریب رک گیا۔ میں نے پس و پیش کیا تو کہنے لگا "عورتیں اور بچے اس پر سوار ہو سکتے ہیں تو ہم بھی دو منٹ کے لئے وہی بن جاتے ہیں — نمائش کا سین اتنی اونچائی سے کیسا خوبصورت دکھائی دیگا — چلو — اسمیں شرمانے کی کیا بات! — وہ دیکھو ہنسی سے کیسی لوٹتی جا رہی ہے —"

جھولے کے چکروں میں کچھ وقت گزر گیا۔ اور ہم بالآخر ایک ہوٹل میں آ بیٹھے۔ "آج عرصے کے بعد یہ دن نصیب ہوا ہے میں آج بہت خوش ہوں — دودھ اور ڈالو نا" اسنے میرے کپ میں دودھ انڈیلتے ہوئے کہا۔ "ہم شاید پھر راہ میں مل جائیں گے اور پھر کسی پر رونق جگہ وقت گذاریں گے۔ میں تو خود کو دھوکا دے رہا ہوں پھر تم کو اس سے اپنا حصہ وصول کرنا ہے۔"

میں اس کی باتیں سن رہا تھا اور میری نگاہیں شاہی مسجد کے میناروں سے پرے اٹھتے ہوئے سیاہ بادلوں پہ پڑ رہی تھیں
اس نے میری نگاہ کو بھانپ لیا۔

"یہ موسمی بادل نہیں، پلک جھپکتے میں گزر جائیں گے۔ ایک آدھ بوچھاڑ سے یہ موسم کی حدت کو دور کر ہی جاتے ہیں
اور تم چلے ہی جاؤ گے ——— جلدی کیا ہے؟"

"نہیں جلدی تو نہیں ———" میں نے جواب میں کہا۔

ہوا کی سرسراہٹ بڑھی۔ اکا دکا بوندیں گریں۔ بادل پھیلے اور پھر موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ نمائش کے گاہک
ہوٹلوں، بستالوں اور دوسری پناہ گاہوں کی طرف بھاگے اور کچھ بارش میں بھیگتے ہوئے نمائش کے بڑے دروازے
طرف چل پڑے۔

وہ خاموش تھا اور لوگوں کو بارش میں تیز تیز چلتے دیکھ رہا تھا۔ میری نگاہیں بھی راہگیروں میں الجھی ہوئی تھیں
پھر پلک جھپکتے میں ایک آدمی اور ایک عورت ہماری آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ عورت اسکے بازو کا سہارا لئے کیچڑ سے بچ
چل رہی تھی اور وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔

وہ آدمی میرا باپ تھا اور وہ عورت میری ماں نہیں تھی۔ میری ماں تو پندرہ سال سے گندی اور تاریک کوٹھری
سسک رہی تھی اور اس کی امیدوں کے چراغ کو ہاتھوں میں لئے میں اچھے دنوں کی تلاش میں نکلا ہوا تھا۔

میرے ہاتھ کپکپائے اور چائے کی پیالی چھوٹ کر زمین پر جا گری۔ میرا ساتھی دروازے سے باہر کھڑا بھیگ رہا تھا
نے جلدی سے کتابیں اٹھائیں اور اسکے پاس سے گزر جانا چاہا۔

"ٹھہرو۔ تھوڑی دیر بیٹھو۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔ تمہارے سوال کا جواب دینا ہے۔ یہی تم چاہتے تھے نا؟" یہ
ہوئے وہ مجھے کرسیوں تک لے آیا۔ اس کی آنکھوں میں ٹمٹماتے ہوئے دیوں کی سی روشنی تھی اور اسکا چہرہ کسی لاش
سفید ہو چکا تھا۔

"اس بارش نے ایک بھولی ہوئی بدقسمت رات کی یاد دلائی ہے۔ میں نے اپنے جرم کو پا لیا ہے۔"

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ——— مجھے جانا چاہئے۔ میری ماں کو میرا انتظار ہوگا۔" میں نے پریشانی سے جواب

"ایک رات ——— وہ سردیوں کی رات تھی ——— ہم سینما گئے ——— وہ، اسکی بیوی اور میں۔ وہ بارشوں کے
تھے اور گلیوں میں کیچڑ تھا۔ ایسا کیچڑ جو دنوں کے گزرتے گزرتے موٹا ہو چکا تھا۔ واپسی پر ہم گلی میں داخل ہوئے
سے بتیاں بجھ چکی تھیں۔ وہ آگے تھا۔ اس سے گز بھر کے فاصلے پر اس کی بیوی اور اس کے پیچھے میں کیچڑ سے بچتے بچاتے
آگے بڑھ رہے تھے ——— اور پھر اسے گلی میں کوئی اپنا واقف کار مل گیا۔ وہ باتیں کرتے کرتے ہم سے کچھ فاصلے پر
مگر ——— وہ دن ——— اس کی بیوی کے مشکل دن تھے۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی تھی ——— کہیں
پھسلنے کی نظر نہ ہو جائے۔ کیچڑ بڑھ رہا تھا اور گڑھے منہ کھولے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ پھر وہ ایک چھوٹی سی
پر رک گئی۔ دیواروں کا سہارا لینا چاہا اور میں نے اسکے بازو کو تھام لیا۔ وہ جھجکی مگر چلتی گئی۔ کیچڑ گزرتا گیا اور ———

آگے آگے تھا کبھی کبھی مڑ کر دیکھ لیتا اور اس کی آواز مجھے سنائی دے جاتی۔

"کیچڑ کچھ اتنا زیادہ تو نہیں"

دوسری صبح وہ مجھے ملا تو اس کا رنگ زرد تھا ــــ نہ ہی اس نے مجھ سے کھل کر بات کی اور نہ ہی اپنی ہنسی سے مجھے نوازا ــــ

"کیسی فلم تھی ــــ مجھے تو بہت پسند آئی"

اس نے مجھے کوئی جواب نہ دیا۔

"تمہارا چہرہ زرد ہے ــــ؟"

وہ مسکرایا۔ "بیگم ہسپتال میں ہے۔ رات بھر سو نہیں سکا۔ رات کیچڑ نے بہت تنگ کیا"

"اور بچہ کیسا ہے ــــ لڑکی ــــ لڑکا؟" میں نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

"لڑکا" یہ کہہ کر اس نے مجھے گہری نظر سے دیکھا ــــ اور چلا گیا۔

اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس صبح اس نے پہلی بار مجھے طمانچہ مارا تھا مگر میرا خلوص اندھا تھا اور خلوص تو ہمیشہ اندھا ہوتا ہے ــــ

اور آج وہ ایک دوسری عورت کو سہارا دیتے ہوئے گزر گیا ہے۔ تم نے اسے نہیں دیکھا؟ وہ چلا گیا ہے ــــ شاید گزرنے والی عورت اسکی بہن ہو یا کوئی اور"

یہ کہہ کر ــــ وہ خاموش ہو گیا۔

میرا سر چکرا رہا تھا اور میں اس کے چہرے کو گھور رہا تھا ــ اس نے میری یہ حالت دیکھ لی۔

"چلو چلیں ــــ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ــــ میں تمہیں گھر تک چھوڑ آؤں"

میں کسی بت کی مانند اس کے ساتھ چلنے لگا۔ ہم مسجد کی پچھلی سڑک کے رخ پر چل پڑے۔ وہ کسی سوچ میں کھویا ہوا تھا ــــ

"تم نے نہیں دیکھا ــــ مگر یہ عورت اسکی بیوی نہیں ہو سکتی" وہ ہولے سے بڑبڑایا جیسے وہ خود سے ہی سوال کر رہا ہو ــــ

"وہ اسکی بیوی ہی ہے ــــ" میں نے بالآخر آہستہ سے جواب دیا۔

وہ چلتے چلتے رک گیا۔ دو تین منٹ میرے چہرے کو گھورتا رہا۔ پھر یکدم میرے بازو کو ننگا کر دیا۔

"میں تمہیں جانتا ہوں۔ میں تمہارے خال کو پہچانتا ہوں ــ تم وہی ہو ــــ" اس نے اپنے چہرے کو گھورتا رہا۔ پھر یکدم میرے بازو کو ننگا کر دیا۔

"میں تمہیں جانتا ہوں۔ میں تمہارے خال کو پہچانتا ہوں ــــ تم وہی ہو ــــ" اس نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور اسکا جسم کانپنے لگا۔

"تم وہی ہو جو میرے کندھوں پر سوار ہوا کرتے تھے — میرے ساتھ — آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے
تم وہی ہو — ظفر — تم وہی ہو —"

ہم سڑک کے اس موڑ تک پہنچ چکے تھے جس کے دائیں طرف گوندی کے پیڑ تھے جو بارش سے دھل کر گہرے سبز ہو چکے تھے اور دوسری طرف شاہی مسجد کا بلند و بالا مینار۔ میں نے مینار کی طرف دیکھا اور پھر گوندی کے پیڑوں کی طرف — پھر میری نگاہ اس پر پڑی جو سڑک پر جھکا ہوا سسک رہا تھا۔

"مجھے گھر تک چھوڑ آؤ —" میں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ کتابیں اٹھائے میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا — اور جب وہ گلی کے موڑ پر پہنچا تو مجھے کتابیں واپس دیتے ہوئے بولا — "بیٹے — اب ہم دوبارہ نہیں ملیں گے اس دیس کے انگاروں نے مجھے جلا کر راکھ کر دیا ہے۔ ماں سے کہنا کہ کسی بدقسمت نے تم سے معافی چاہی ہے — پر مجھے میرا خلوص مل گیا ہے بیٹے — میرا کھویا ہوا خلوص — اور تم جوان ہو — روشنیوں کی طرف بڑھو۔ تمہارے بازو بڑے مضبوط ہیں —"

یہ کہکر وہ چل پڑا۔ اس کی رفتار میں تیزی تھی — ہاں شاید ہم پہلی اور آخری بار ملے تھے — اُس وقت مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے فضائیں مادی شکل اختیار کر گئی ہیں — میرے بازو لہرا رہے ہیں اور سینے ہواؤں میں اڑ رہے ہیں۔
میری زبان سے جنبش کی — "تم عظیم ہو —"

صبا اکبر آبادی

دل اپنا بس ایک حال میں ہے — ہر وقت ترے خیال میں ہے
وہ چشمِ غضب خیال میں ہے — کیا کیف مرے ملال میں ہے
کچھ اُن کی عطاؤں میں کمی ہے — کچھ حوصلۂ سوال میں ہے
اترا نہ کمالِ بے زوالی! — تو دسترسِ زوال میں ہے
اے عذرِ جفا نہ سامنے آ — اس وقت وفا جلال میں ہے
مجھ سے نہ خیال کو بدلوا — تو بھی تو مرے خیال میں ہے
ہنس کر جو مزاج تو نے پوچھا — اس وقت کچھ اعتدال میں ہے
اے چشمِ خرد نجات تیری — دیوانوں کی دیکھ بھال میں ہے
سمجھاؤں تو کیا سمجھ سکو گے — وہ لطف جو عرضِ حال میں ہے
ماضی کا بیان کرنے والو — کیا بات ہمارے حال میں ہے
اجڑا ہوا آشیاں ہمارا — گلشن میں نہیں خیال میں ہے
یہ کس کی حنائے پا کی خوشبو — خاکِ دلِ پائمال میں ہے

خاموش صبا کو دیکھتے ہو
ہر وقت کسی خیال میں ہے

محشر بدایونی

تیری روش میں آسکے جب تک پہلو تھے
دیدہ و دل کے سارے تصور یکسو تھے

تصویریں بن بن کر آیا صبح و شام
اک وہ شخص کہ جس کے رخ پہ گیسو تھے

تھے تو سبھی کچھ پھول سے سپنے دل میں مگر
جانے کس کا رنگ تھے کس کی خوشبو تھے

کتنے سیہ چشمانِ غزل آنکھوں میں پھرے
ہاتھ بڑھے تو سب وہ رمیدہ آہو تھے

دشت بدشت آوارہ سب سے گمنام ہے
ہم کہ گلوں سے تھے منسوب اور خوشبو تھے

آخر شب تک دیکھے کیا کیا ہنستے خواب
آنکھ کھلی تو رخساروں پہ آنسو تھے

دن کو لگا رہے پرورش جان قلب چکاں
شب کو بجاں حاضر سرِ بزم گیسو تھے

دیکھ آئے ہم ڈوب کے خوب اُن آنکھوں میں
ایک حباب میں بے اندازہ آنسو تھے

آئے نہ محشرؔ تک بزبانِ غنچہ بھی
کام کے جو پیغام بخطِ ابرو تھے

پروفیسر آغا سرخوش

کرونظر سے ہے نہ زمان ومکاں سے ہے ◆ امکاں یقیں سے اسکا نہیں ہے گماں سے ہے
یورکرڑے ہیں عشق کے ضد آسماں سے ہے ◆ اب اسکا سامنا شکن کہکشاں سے ہے
بھرے ہیں دل کے داغ تو لگے ہیں لالہ زار ◆ جلوہ بہار کا مرے سوز نہاں سے ہے
منوان تیشہ کاریٔ فرہاد الاماں ◆ ملتا ہوا یہ باب مری داستاں سے ہے
لڑنا پڑے گا دل کے تقاضوں کا احترام ◆ اس کا سر در غم مژہ خونچکاں سے ہے
بجلی کو کیا غرض کہ جلاتے کسی کا گھر ◆ جو کچھ بھی لاگ ہے وہ مرے آشیاں سے ہے
پیا کہئے کیا ہے خوب و دورا ہہ ہے زندگی ◆ کچھ اس جہاں سے ربط ہے کچھ اس جہاں سے ہے
نزل کا عکس بنکے چمکتا ہے آفتاب ◆ رستہ کا نور گرد رہ کارواں سے ہے
غاز وانتہائے عدم جانتا ہے کون ◆ ہستی کا حادثہ تو کہیں درمیاں سے ہے
ہوبار ست کے بنتا ہے کامل یقیں کا نقش ◆ ذوق عمل کا لطف مسلسل گماں سے ہے

جو کچھ گلا ہے اپنی طبیعت سے ہے سرخوش
نا مہرباں سے ہے نہ کسی مہرباں سے ہے

آسی احمد اشک

شام سے امڈے ہیں جذبات
اور ہے باقی ساری رات

کہتی ہے ہر دھڑکن دل کی
مشکل ہے ، بدلیں حالات

کاش تمہارا غم ہی مجھ سے
چھین لے میرے احساسات

تم تو چپ ہو آگ لگا کر
میرے سر ہیں الزامات

دونوں ہی بدنام ہوئے ہیں
نگر نگر ہے پھیلی بات

اشک کی حالت کچھ مت پوچھو
پلکوں پر امنڈی برسات

سر سے بارِ غمِ حیات اٹھا!
لے اجل اپنی کائنات اٹھا

رنگ و بو ہی حقیقتاً گل ہے
امتیازِ صفات و ذات اُٹھا

میں تو رو بھی نہیں سکا ظالم
تو ہی کچھ مسکرا کے بات اٹھا

آشیانے کا غم نہیں لیکن
ہائے دستورِ حادثات اُٹھا

صبح تک مضطرب رہے تارے
دردِ دل میں تمام رات اٹھا

فتنۂ بے رخی کا رونا تھا
اور اک حشرِ التفات اٹھا

سیف حسن پوری

بیانِ حور و مئے کوثری نہیں مشکل
خیال و وہم کی صورت گری نہیں مشکل

لہکتے لمحوں کا آئینہ، اک نگاہ کرم
ترے لئے یہ کرم گستری نہیں مشکل

جگر میں اسکے بھی ہاں، ایک نرم انگارہ
ہوائے شام! یہ شعلہ گری نہیں مشکل

گئے زمانے کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھ
گئی بہار کی باز آوری نہیں مشکل!

بس ایک نیم شگفتہ کلی کا لمس خفیف
سلگتے ہونٹوں کی چارہ گری نہیں مشکل

خدا کے نام پہ مشکل سہی قیامِ امن
خدا کے نام پہ فتنہ گری نہیں مشکل

چڑھادے سیف حقیقت کا رنگ باطل پہ
نگاہ و فکر کی بازی گری نہیں مشکل

افسر ماہ پوری

تلخیٔ زیست کا یوں دور چلا جام کے ساتھ
زہر بھی پی گئے ہم بادۂ گلفام کے ساتھ

باتیں تنہائی میں کب تک ہوں در و بام کے ساتھ
شام آتی ہے کہ آتی ہے بلا شام کے ساتھ

لاکھ بدلے کوئی افسانے کا عنواں پھر بھی
آ ہی جاتا ہے مرا نام، ترے نام کے ساتھ

آنکھیں بھر آتی ہیں خود دیکھ کے حالت اپنی
کیا سے کیا ہو گئے ہم گردشِ ایام کے ساتھ

اذنِ پرواز لئے آتی ہے ہر روز صبا
دل لگی خوب ہے یہ مرغِ تہِ دام کے ساتھ

ہم ہیں وہ بادیہ پیما کہ ہماری منزل
دور ہو جاتی ہے کچھ اور بھی ہر گام کے ساتھ

بے نیازِ نگہِ ناز ہوئے ہیں جب سے
زندگی کٹتی ہے اکثر بڑے آرام کے ساتھ

موجؔ فرزی

سرخی بھی ان کے ہاتھ پہ رنگِ حنا کی ہے
اب دیکھنا ہے کون سی صورت بقا کی ہے

وہ بات بات پر مری تیزی بلا کی ہے
ظالم کی جو ادا بھی ہے جور و جفا کی ہے

کلیوں سینے چاک بہاروں میں اضطراب
شوخی ضرور کوئی یہ دستِ صبا کی ہے

کچھ اور بڑھ چلے ہیں مرے دل کے حوصلے
ہلکی سی ان کے رخ پہ جو سرخی حیا کی ہے

سرگوشیاں جو موجؔ ہوئیں مجھ کو دیکھ کر
میں جانتا ہوں بات یہ کس بے وفا کی ہے

رسالوں میں

(انتخاب)

ے ۲۷ر اکتوبر کے یوم انقلاب پر جو نمبر نکلے ہیں ان کا شمار بھی درحقیقت نومبر ہی میں ہونا چاہئے اور ہم ان کا تذکرہ نومبر کے
جوں کے ساتھ کر رہے ہیں۔ لاہور سے پندرہ روزہ نیا پیام نے رسالہ نما نمبر پیش کیا ہے، اور کراچی سے ماہنامہ خاتون پاکستان نے،

"نیا پیام" لاہور ـــــ رائٹرز پبلی کیشنز کا پرچہ ہے، اسّی صفحات کے اس نمبر میں فیلڈ مارشل ایوب خان اور مغربی
ستان کے گورنر اختر حسین کی تصویریں بھی شامل ہیں انقلاب سے متعلق نظم و نثر ہیں "تابندہ باد روشنیٔ انقلاب" جدید حکومت کے
ت ترقی کی منصوبہ بندی اور پروگرام کا ایک مختصر نقشہ ہے "صنعتی ترقی" پیداوار میں اضافے اور دیگر اقدامات کا خلاصہ ہے "غذائی صورت
ل" مغربی پاکستان میں غلہ کی فصل، درآمد اور ذخیرے کا ایک امید افزا جائزہ ہے اسی طرح "واضح اور مستحکم خارجہ پالیسی" میں روشنی
ل گئی ہے کہ ممالک عالم اور دنیائے اسلام کے ساتھ پاکستان کے روابط کیسے ہیں اور حکومت کی کامیاب تجارتی پالیسی" میں درآمد
آمد اور تجارت کے مفید امکانات واضح کئے گئے ہیں، مائل نقوی، احسان دانش، دلی وارثی، انور ظہوری، محمد اکرم نے انقلاب پر نظمیں
یش کی ہیں، ـــــ ان کے علاوہ ادبی مضامین بھی ہیں جن میں "فن اور فنکار" احسان دانش کے قلم سے ایک طویل مکتوب ہے۔
ں فنون لطیفہ پر سیدھی سادی مگر دلچسپ بحث کی گئی ہے ایک مضمون "شاعری وحشت پرستی اور آسیب زدگی" کے عنوان
ے سجاد حارث نے لکھا ہے اور تخلیق و تنقید کے بارے میں انہوں نے یہ کہا ہے کہ ہر زبان و ادب میں نقادوں اور دانش وروں کا
ب ایسا مستقل طبقہ موجود ہوتا ہے جسے آپ اصطلاحاً حافظ دستہ کہہ لیں، یہ دانش ور فلسفہ، نفسیات، عمرانیات، سائنس و ادب
الیات اقتصادیات اور سیاسیات جیسے علوم و فنون کی کمین گاہوں میں بیٹھ کر مسائل و معاملات کو الجھاتے ہیں، یہ دانش ور
د وحشت پرست اور آسیب زدہ ہوتے ہیں، یہ وحشت پرستی اور آسیب زدگی ایک شاعر کے حق میں اکثر بڑی مہلک ثابت ہوتی
ے، اور ایک مستقل داخلی گزیز، مایوسی، کلبیت، ایذا پسندی، فراریت، رجحان خودکشی، انسانیت دشمنی، خود غرضی وغیرہ ہوا
یا کرتی ہے، ہمارے ملک میں متوسط طبقہ آج مختلف النوع ذہنی جنسی اور نفسیاتی پیچیدگیوں میں مبتلا ہے اور متوسط طبقے
ے نوجوان دن رات اپنی قوتوں کو ضائع کرنے پر مجبور ـــــ اس لئے ان فنکاروں سے شعر و ادب کے کسی عظیم شاہکار
ا توقع عبث ہے "عثمان صدیقی نے اپنے مضمون "ادب اور زندگی" میں یہ سمجھایا ہے کہ ادب ہر دور میں زندگی کا عکاس رہا
ر قوموں کی زندگی کے ساتھ ان کے ادب میں بھی انقلاب آتا رہا ہے۔ مولانا مائل نقوی کا مضمون "مشاہیر شعراء کس طرح شعر
ہتے تھے" طویل مگر دلچسپ ادبی کہانی ہے، سودا سے لیکر اقبال تک کے تذکرے اس مضمون میں درج ہیں، احسان دانش کا ایک شعر

جنہیں ہم خوارج کہتے ہیں"، بھی اس نمبر میں شامل ہے، یہ ایک مختصر تاریخی تذکرہ ہے جس میں خارجیوں کی اصول پرستی اور پختگی بیان کی گئی ہے۔ کسریٰ منہاس نے فن تاریخ گوئی پر قلم اٹھایا ہے اور خاص طور پر یہ بحث کی ہے کہ اگر کسی مصرعے میں "ہو تی" کا لفظ آجائے تو اس کے اعداد کیا مقرر ہوں گے اس لفظ کو سہ حرفی مانا جائیگا یا چہار حرفی، وقار راشدی نے سلہٹ پر اور درشہوار نے کشمیر پر دلچسپ سادہ مضامین لکھے ہیں، اس نمبر میں افسانے اور غزلیں بھی موجود ہیں۔

خاتونِ پاکستان کراچی —— کوئی ڈیڑھ سو صفحے کے اس انقلاب نمبر میں جتنے مضامین افسانے اور نظمیں ہیں سب کسی نہ کسی پہلو سے انقلاب سے ہی تعلق رکھتے ہیں، صدر مملکت فیلڈ مارشل ایوب خاں، ان کی کابینہ کے تمام وزراء اور بیگمات کی تصویروں کے علاوہ چند اہل قلم حضرات کے فوٹو بھی شریک ہیں، پیلات شخصیات مقالات اور نظمیں افسانے ڈرامے الگ الگ حصوں میں تقسیم ہیں، اخیر میں حسن و صحت کا ایک حصہ بھی ہے اور ڈاکٹر عبدالحی کے قلم سے "کثرت اولاد کی روک تھام" کی حمایت میں ایک مضمون بھی درج ہے، اس عنوان سے ایک بحث کافی مدت سے چل رہی ہے۔ شخصیات کے تحت اڈیٹر نے صدر مملکت اور اراکین کابینہ کے حالات پیش کئے ہیں، مقالات میں پہلا مضمون مولانا جعفر شاہ صاحب پھلواری کے قلم سے ہے انہوں نے لکھا ہے کہ پچھلے دس بارہ سال میں ہم نے کیا دیکھا اور ہمارے مسائل زندگی کیا تھے ان مسائل کو پچھلے برسوں میں کس طرح حل کیا گیا اور انقلاب نے ان کو کس طرح حل کیا، شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ انقلاب کے تین کام سب سے بڑا کارنامہ ہیں لامحدود زمینداریوں کا خاتمہ، سیاسی لیڈروں کا خاتمہ، بے آبادوں کی آبادکاری اس مختصر مضمون کا عنوان ہے "لیکن دہان توپ سے"، دوسرا مختصر مضمون سید عبدالقدوس ہاشمی کے قلم سے ہے "مفید انقلاب"۔ انہوں نے انقلاب کے مفہوم و معنے اور اس کے مضر اور مفید پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور مضر انقلاب اور مفید انقلاب کی صورتیں اور پھر انقلاب کی شرائط بیان کی ہیں۔ آخیر میں یہ بتایا ہے کہ سب سے بڑا اور مفید انقلاب جو کم سے کم مدت اور وسیع سے وسیع تر پیمانے پر ہوا وہ پیغمبرانہ انقلاب تھا جس کے برابر مکمل نمونہ کہیں اور میسر نہیں آسکتا۔ تیسرا مضمون سید حسن مثنیٰ ندوی کے قلم سے ہے: "مردِ انقلاب" یہ ایک تصویر ہے مردِ انقلاب کی جس میں نامور پٹھان شیر شاہ سوری کے انقلابی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اس کے کارنامے گنوا کر بتایا گیا ہے کہ اس نے بگڑے ہوئے معاشرے اور ماحول کو سنبھالنے کی کوشش کس طرح کی اور نیا نظام کس طرح قائم کیا۔ چوتھا مضمون حامد اللہ انصاری کا ہے "مرا ہاتھ ہے انقلاب چمن میں" اور اپنے اس مضمون میں انصاری صاحب نے ٹیپو سلطان کی شخصیت و کردار کا نقشہ کھینچا ہے اور ٹیپو کی ان مفید اصلاحات کا تذکرہ کیا ہے جن کے اثرات آج تک ذہن و فکر پر مرتسم ہیں، اس نمبر میں حجاب امتیاز علی، سعیدہ عروج، رشیدہ رضویہ، شہلا ابوبکر، ایم اسلم، شوکت تھانوی، افسر ماہپوری، سلیم خاں گمی، عرش تیموری، انور عنایت اللہ، وقار راشدی، خالد لطیف اور سراج رضوی کے افسانے، اور خورشید آرا بیگم، رضیہ انور، طاہرہ کاظمی، ماہر القادری، شاعر لکھنوی، زیبا ردولوی، ثاقب زیروی، شان الحق حقی، نظر حیدرآبادی، ارشد تھانوی، ارشد کاکوی، جمیل نقوی اور گوہر حسین گوہر کی نظمیں شامل ہیں۔ اور اداریہ بھی مفید مباحث پر مشتمل ہے۔

ثقافت لاہور —— اس ماہ پروفیسر محمد عثمان نے "نظام مملکت کے متعلق قرآن حکیم کی حکیمانہ روش" کے ذریعہ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام میں دین و ریاست ایک ہیں بھی اور نہیں بھی، وہ کہتے ہیں کہ انسانی زندگی کا ایک حصہ تو وہ ہے جو ہماری نفسی اخلاقی اور منزل زندگی کے ابدی مسائل سے وابستہ ہے۔ دوسرا حصہ ہر دم متغیر اور وا التقاپذ

ئے تمدن پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ قرآن کا موضوع ہے اور دوسرا بر بنائے حکمت ہمارے فہم و تدبر پہ چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور
حت اسی دوسرے حصے کا جز ہے، وہ کہتے ہیں کہ قرآن حکیم طرز حکومت اور آئین و دستور وغیرہ کے بارے میں ایک
کومت پسند کرتا ہے،" اسی ضمن میں پروفیسر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ اقبال کے اس مصرعے سے کہ "جدا ہو دیں سیاست
جاتی ہے چنگیزی" بعض حلقوں نے بے سبب کے فائدہ اٹھایا ہے، ورنہ اقبال نے خود اعتراف کیا ہے کہ اسلام کے نظام
ں مذہب اور سیاست کو الگ رکھنے کی وسعت موجود ہے۔" اور پروفیسر صاحب نے ترکی کی آئینی تبدیلیوں پر اقبال
کے دو ٹکڑے بھی پیش کئے ہیں لیکن شاید یہ اقبال کے ساتھ انصاف نہیں ہے کیونکہ اقبال نے ترکی کے اس اقدام پر
سوئٹزرلینڈ کا قانون اپنے ہاں نافذ کر دیا بڑے افسوس کا اظہار کیا ہے اور اس کی غلطی بتائی ہے۔ اقبال نے جہاں اجتہاد
ت واضح کی ہے وہیں قوانین اسلام بالخصوص قانون وراثت کی اور یکجہتی اور اہمیت سے ترکی اور دوسرے تمام مسلم
ر مسلم ممالک کو نابلد بتایا ہے ——— پروفیسر صاحب نے طرز حکومت کے ساتھ آئین و دستور وغیرہ کے الفاظ
مضمون میں لکھے ہیں اور کہا ہے کہ قرآن نے ان مسائل پر حکیمانہ خاموشی اختیار کی ہے۔ لیکن آئین و دستور کا مطلب کیا
وغیرہ کیا چیز ہے، اگر اس سے مراد وہ مجموعہ ہے جس میں شعبہ جات حکومت کے علاوہ مقاصد ریاست، بنیادی حقوق
، انسانی اور اختیارات و حدود و قوانین کا اعلان درج ہوا کرتا ہے، تو ان مسائل میں تو قرآن حکیم نے حکیمانہ سکوت نہیں
، کلام پسند کیا ہے،" اور اس حقیقت کی وضاحت اقبال نے سب سے زیادہ کی ہے ——— اقبال کے اشعار میں دو معنے تو
ہیں لیکن اقبال کے لکچرز میں دو مفہوم نہیں پیدا کئے جا سکتے۔ اقبال کہتے ہیں کہ "دین و سیاست کی علیحدگی (جیسی یورپ میں
، اور جسے نیشنلسٹ ترکوں نے اختیار کر لیا) ایسی چیز ہے جو اسلام میں کبھی رونما نہیں ہو سکتی، اسلام آغاز ہی سے ایک
و سائیٹی ہے جس نے سیدھے سادے اصول قانونی کا مجموعہ قرآن سے پایا ہے ..... لہذا ریاست کی نیشنلسٹ تھیوری
ہے کہ دو ثنویت پیدا کرتی ہے ص ۱۴۸ ..... اسلام میں دین و سیاست کی علیحدگی، صرف دو دائرۂ عمل کی علیحدگی ہے
سازی کی بے لگامی مراد نہیں"، پروفیسر رشید احمد کے مضمون اقبال کے سیاسی افکار بھی اسی شمارے میں شریک ہے
سیاست، ملکیت زمین، خلافت، نظام حکومت، نظام معیشت، عورت اور سیاست، قانون بین الاقوامی حکومت
قبال کے خیالات جمع ہیں، مغربی اور اسلامی فکر کے دونوں دھارے الگ الگ ہیں، بشیر احمد ڈار نے عیسائی
پر روشنی ڈالی ہے اور اس مضمون کی پہلی قسط پیش کی ہے۔ محمد ثروت خان کا مضمون "عہد غزنوی کی علمی و ادبی سرگرمیاں"
قسط کی صورت میں سامنے ہے۔ اور نثر نگاروں کے تذکرے پر مشتمل ہے، جعفر شاہ صاحب پھلواروی نے "ہمارے
نماز کے عنوان سے راہ نمازوں کے فرائض اور دوائر عمل پر بحث کی ہے انہوں نے کہا ہے کہ جنگ سیاسیات معاشیات
، عسکریات بلکہ تمام سائنسی علوم پر بھی نظر نہ ہو کسی عالم کو عالم دین نہ کہو، دین میں یہ سارے علوم داخل ہیں اسے مفسر
کہو، پروفیسر کہو، مدرس کہو، اور یہ بھی تجویز پیش کی ہے کہ مبلغین و واعظین و مدرسین وائمہ مساجد وغیرہ اور صوفیا کی
بہت ضروری ہے، آخر میں "مہمان و میزبان" کی سرخی سے نواب وقار الملک کا ایک مضمون بھی شریک اشاعت ہے۔

انجمن کراچی ——— اس ماہ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے جوش ملیح آبادی کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے

انہوں نے لکھا ہے کہ "اردو شاعری میں ایسا متنوع اور ہمہ گیر شاعر پیدا نہیں ہوا، ان کی شاعری ایک نگار خانہ ہے محسوسات کے شاعر ہیں جوش جذبات کے شاعر ہیں اور بعض نے عقل و شعور کی باتیں بھی کی ہیں غور و فکر بھی کیا ہے نظریۂ حیات بھی رکھتے ہیں، ان کی شاعری میں جبر کا فلسفہ کہیں کہیں نمایاں ضرور ہے لیکن اس فلسفے نے انہیں قنوطی نہیں وہ شاعر انقلاب بھی ہیں "انہوں نے اظہار کے نئے سانچے بنائے ہیں اور بعض نئی علامتیں بھی ان کے یہاں ملتی ہیں، وہ تما شاعروں میں منفرد شاعرانہ شخصیت رکھتے ہیں"۔ اس شمارے میں نظموں اور افسانوں کے علاوہ ڈاکٹر سید پرکاش بالزک کا پہلا معاشقہ" بھی شریک ہے۔

خیال کامپٹی ــــــ یہ رسالہ ہندوستان کے صوبہ سی پی سے نکلتا ہے۔ اس ماہ عوض سعید نے شاہد صد قلم اٹھایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شاہد ہند و پاک کے ان چند غزل گو شعراء میں ہیں جن سے غزل کی آبرو قائم ہے، وہ زیادہ دل کے شاعر ہیں، گہری داخلیت، سوز و گداز اور کلاسیکی انداز ہے، کبھی کبھی نظم بھی کہتے ہیں اور ایک اچھے صحافی اس شمارے میں افسانوں اور نظموں اور غزلوں کے علاوہ فیض انصاری نے ایک اچھا مضمون کتھا کلی رقص پر لکھا ہے تفصیل پیش کی ہے۔

فکر و نظر کراچی ــــــ حلقۂ فکر و نظر کراچی شائقین علم و ادب کا ایک ادارہ ۵۲ء سے قائم ہے، او تقریباً انہیں مضامین نظم و نثر پر مشتمل ہے جو اس حلقے میں پڑھے جاتے رہے ہیں، تبرکاً حضرت جگر مرادآبادی کی نظم، اختر حیدرآبادی کی غزل اور ادب و تحقیق کے عنوان سے قاضی عبدالودود کی تقریر کے وہ نکات بھی شریک اشاعت قاضی صاحب نے حلقے کی نشست میں کی تھی، طنز و مزاح، "شمیم رضوی کا اچھا مقالہ ہے۔ اس نمبر میں یونس احمر امراؤ طارق، الیس منانی کے افسانے، شش صفی، قادر حنیظ، سرشار صدیقی، نوشاد نوری، حمایت علی شاعر، قمر فاروقی اور نسیم سوز کی نظمیں اور مسرور انور ادیب، عبدالغنی شمس، شاعر لکھنوی، لیث قریشی، اطہر نادر، رسا چغتائی جاوید، شاہد منصور، منظفر ملاھوی، سعید عباسی، واحد بشیر کی غزلیں شامل ہیں۔ نمبر میں دو جواں مرگ ارکان حلقہ، صہ اور مسرور انور ادیب کے حالات الیس منانی اور منظفر ملاھوی نے لکھے ہیں،

اس حلقے کے یہ تمام نام معروف ہیں، جو نامساعد حالات زندگی کی پریشانیوں اور مصروفیتوں کے باوجود ادب سے چمٹے ہوئے ہیں اور چراغ سے چراغ جلانے کی خدمت برابر انجام دے رہے ہیں۔



درد سر، داڑھ، ہر قسم کے درد اور
نزلہ و بخار کیلئے
انالجین ٹکیاں
Opal
ہر قسم کی کھانسی
سے فوری
نجات
کیلئے
کفسول شربت
صحت اور
توانائی
کیلئے

